

© جملہ حقوق بحق ناشر محفوظ

ABBAS RAZA NAYYAR KE ADABI SAR-O-KAR

Edited by: Dr. Muntazir Mehdi

Year of Edition 2018

ISBN 978-93-87829-67-1

₹ 500/-

عباس رضا نیر کے ادبی سروکار

نام : عباس رضا نیر کے ادبی سروکار
مرتب : ڈاکٹر منتظر مہدی
سنہ اشاعت : ۲۰۱۸ء
قیمت : ۵۰۰ روپے
تعداد : ۱۰۰۰ ایک ہزار : کاشف رضا عرشی
مطبع : روشن پرنٹرس، دہلی-۶

ملنے کے پتے

☆ امرین بک اینجی، احمد آباد-۰۸۴۰۱۰۱۰۷۸۶ M.08401010786
☆ حسامی بک ڈپو، حیدر آباد-۰۴۰-۶۶۸۰۶۲۸۵ Ph.040-66806285
☆ ہدی بک ڈسٹری بیوٹرس، حیدر آباد-۰۴۰-۲۴۴۱۱۶۳۷ Ph.040-24411637
☆ کتاب دار، بک سیلر، پبلشر، ممبئی Ph.09869321477
☆ عثمانیہ بک ڈپو، کلکتہ-۰۹۴۳۳۰۵۰۶۳۴ M.09433050634
☆ رائی بک ڈپو، الہ آباد-۰۹۸۸۹۷۴۲۸۱۱ M.09889742811
☆ ایجوکیشنل بک ہاؤس، یونیورسٹی مارکیٹ، علی گڑھ
☆ م.09441940752 M.09441940752
☆ م.09419003490 M.09419003490
☆ م.09450755820 M.09450755820
☆ م.09325203227 M.09325203227
☆ م.09419761773 M.09419761773
☆ م.09070340905 M.09070340905
☆ م.09797352280 M.09797352280
☆ م.09797352280 M.09797352280

پاکستان میں ملنے کا پتہ

☆ ملک بک ڈپو، چوک اردو بازار، لاہور (پاکستان) Ph: 0092-42-37247480, 37231388

Published by

EDUCATIONAL PUBLISHING HOUSE

3191, Vakil Street, Kucha Pandit, Lal Kuan, Delhi-6(INDIA)

Ph : 23216162, 23214465, Fax : 0091-11-23211540

E-mail: info@ephbooks.com, ephindia@gmail.com

website: www.ephbooks.com

منتظر مہدی

ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی

فہرست

۸	ڈاکٹر منتظر مہدی	اعتراف
		فنکشن
۱۳	ڈاکٹر عصمت ملیح آبادی	۱ معروف نیر، مصروف نیر
۱۶	عائشہ صدیقی	۲ عباس اور عباس
۲۱	ڈاکٹر عمیر منظر	۳ عباس رضانیہ کی تحقیقی کاوش: خواجہ احمد عباس
۲۶	ڈاکٹر مجاہد الاسلام	۴ ڈاکٹر عباس رضانیہ کی تنقید نگاری
۳۹	ڈاکٹر محمد ارشد ابن اسلم	۵ عباس رضانیہ کا تحقیقی و تنقیدی کارنامہ
۴۵	متھیو ڈالٹن	۶ خواجہ احمد عباس: عباس رضانیہ
۴۹	ڈاکٹر عبید الرحمن	۷ خواجہ احمد عباس: عباس رضانیہ ایک تجزیہ
۵۵	خوشتر زرین ملک	۸ ڈاکٹر عباس رضانیہ کی فکشن تفہیم و تنقید
۶۸	ڈاکٹر ساجد غفران ندوی	۹ آفریں باد بریں ہمت مردانہ تو ”ڈاکٹر عباس رضانیہ“
۷۲	وصیل خان	۱۰ ”خواجہ احمد عباس“ عباس رضانیہ کی ایک تجزیاتی تصنیف
۷۶	سیدہ فاطمہ عربی	۱۱ عباس شناس: عباس
۹۱	خیب احمد صدیقی	۱۲ سوانحی ناول کے امتیازات اور ”آزاد قیدی“
۹۹	عشرت ظفر	۱۳ آسمان میں سات قدم
۱۱۱	علی ظفر	۱۴ اردو فکشن کی تحقیق و تنقید میں عباس رضانیہ کی رہنمائی
		تنقید
۱۲۳	عباس رضانیہ بحیثیت ناقد اور تنقیدی بحثیں ایک جائزہ اسعد اللہ	

انتساب

مادر علمی

شعبہ اردو

لکھنؤ یونیورسٹی لکھنؤ

کے نام

۱۶	عباس رضانیہ کی ”تنقیدی بحثیں“ ایک جائزہ	حیدر علوی	۱۳۳
۱۷	تنقیدی بحثیں ایک نظر میں	عبدالرحمن جمال	۱۳۷
۱۸	ڈاکٹر عباس رضانیہ کی تنقیدی بصیرت	غلام نبی کمار	۱۴۰
۱۹	”تنقیدی بحثیں“ ایک جائزہ	ڈاکٹر آفاق فاخری	۱۵۹
۲۰	ڈاکٹر عباس رضانیہ جلال پوری کی ”تنقیدی بحثیں“	ڈاکٹر مسیح الدین خاں بکھنؤ	۱۶۶
۲۱	تنقیدی بحثیں: ایک جائزہ	افزاخاتون	۱۷۰
۲۲	رثائی تنقیدیں: ایک اجمالی جائزہ	سید علی احمد دانش	۱۷۷
۲۳	رثائی تنقیدیں: نئی تنقیدی جہت	احمد وحسی، ممبئی	۱۸۵
۲۴	ڈاکٹر عباس رضانیہ کی تنقیدی نظر: رثائی تنقیدیں کی روشنی میں	ڈاکٹر نسیم نکھت	۱۸۸
۲۵	ڈاکٹر عباس رضانیہ کی رثائی تنقیدیں ایک اہم کتاب	ایچ۔ ایم۔ یلین	۱۹۷
۲۶	یہ وہ صدا ہے جسے قتل کر نہیں سکتے	پروفیسر جمال نصرت	۲۰۲
۲۷	ادیب عصریہ جلال پوری کی ادبی پرواز اور حب الوطنی	مہدی حسن واعظ جلال پوری	۲۰۹
۲۸	نیر تاباں	ڈاکٹر ذیشان حیدر	۲۱۵
۲۹	ڈاکٹر عباس رضانیہ ”رثائی تنقیدیں“ کے آئینے میں	ڈاکٹر سید علی سلمان رضوی	۲۲۱
۳۰	رثائی تنقیدیں: ایک مطالعہ	کرار حسین	۲۳۲
۳۱	رثائی ادب کی افہام و تفہیم	سید غلام عباس رضوی	۲۳۹
۳۲	رثائی تنقیدیں: میری نظر میں	صبیحہ	۲۵۲
۳۳	رثائی تنقیدیں: ایک جائزہ	ڈاکٹر منتظر مہدی	۲۶۳
۳۴	ڈاکٹر نیر کی تنقیدی کتاب ادبی میزان پر ایک نظر	پروفیسر قمر رئیس	۲۷۳
۳۵	ادبی میزان: ڈاکٹر نیر کا ادبی و تنقیدی مراقبہ	افتخار امام صدیقی	۲۷۴

تدوین

۳۶	کلیات کیف اور عباس رضانیہ بھولی بسری یادیں	پروفیسر سید فضل امام رضوی	۲۷۷
۳۷	اردو ناول اور اودھ: ایک مطالعہ	ناصر جرولی	۲۸۳
۳۸	خطوط بنام ضمیر: ایک تبصرہ	ڈاکٹر سید علی سلمان رضوی	۲۸۸
۳۹	ڈاکٹر عباس رضانیہ: وادی ادب میں ’مجموعہ‘	اختر سعید	۳۰۰
	کچھ یادیں کچھ باتیں کے حوالے سے		

ترجمہ

۴۰	فن ترجمہ کے ماہر ڈاکٹر عباس رضانیہ	فرزانہ اعجاز	۳۱۲
۴۱	مظاہر تخلیقیت کا پاسدار مترجم عباس رضانیہ	سدا تھ سدیپ	۳۱۷
۴۲	ہندی مونو گراف آچاریہ رام چندر شکل کے	ڈاکٹر فردوس جہاں	۳۳۲
	اردو مترجم ڈاکٹر عباس رضانیہ		
۴۳	آچاریہ رام چندر شکل ترجمہ: ڈاکٹر عباس رضانیہ: ایک جائزہ	ڈاکٹر محمد آل احمد (ہندی)	۳۳۵
۴۴	ڈاکٹر عباس رضانیہ کی ترجمہ نگاری	محمد یاسر انصاری	۳۴۲
۴۵	ڈاکٹر عباس رضانیہ کی علمی ترجمہ نگاری	علی ظفر	۳۴۸

قائرات

۴۶	ڈاکٹر نیر کی تین کتابیں: ایک جائزہ	عزت مگھواڑ پرنشاپ ہائیک جی	۳۵۸
۴۷	”تین کتابیں“	پروفیسر شارب رودولوی	۳۶۷
۴۸	پیغام تہنیت	علامہ ڈاکٹر ضمیر اختر نقوی (پاکستان)	۳۷۰
۴۹	ڈاکٹر عباس رضانیہ کو اردو انجمن برلن کی مبارکباد	عارف نقوی	۳۷۵
۵۰	”تنقیدی بحثیں، رثائی تنقیدیں خواجہ احمد عباس“	فیاض رفعت	۳۷۹

اعتراف

عہد حاضر کے اہم ترین شعراء، ادباء، ناقدین اور دانشوران ادب کے درمیان عباس رضانیر نے اپنی بے پناہ ادبی اور علمی صلاحیتوں کی بنیاد پر ایک بلند مقام حاصل کیا ہے۔ مجھے یہ تو نہیں معلوم کہ اردو میں اس روایت کی بنیاد کس نے ڈالی کہ جن شعرا و ادبا نے اردو ادب کی تعمیر و تشکیل میں اپنا خون جگر شامل کیا ہے ان کی خدمات کا اعتراف ان کی زندگی میں نہ کر کے بعد میں کیا جائے۔ غالب اور منٹو دونوں اپنے اپنے فن کے لیجینڈ تھے لیکن دونوں کی ادبی زندگی کا جائزہ لیا جائے تو یہ نتیجہ اخذ کرنا مشکل نہیں ہوگا کہ ان دونوں فنکاروں کی زندگی بڑی کسمپرسی کا شکار رہی اور دونوں کا اعتراف ان کی زندگی کے بعد کیا گیا۔ اردو ادب کے چند ہی خوش نصیب ادیب و شاعر ایسے ہیں جن کی خدمات کا اعتراف ان کی زندگی میں کیا گیا۔ ان خوش نصیبوں میں عصر حاضر کے اہم شاعر و ادیب ڈاکٹر عباس رضانیر بھی ہیں جن کی ادبی خدمات کا اعتراف تقریباً ہر پہلو سے کیا گیا۔ اس اعتراف کے نتیجے میں ہندوپاک کے اہم قلمکاروں کے ذریعے عباس رضانیر کی ہشت پہلو شخصیت کی تعبیر و تفہیم کے لیے مضامین کی شکل میں ہندوپاک کے اہم جرائد و رسائل اور اخبارات میں سو سے زائد مقالے شائع ہوئے۔ ان مقالوں کی کتاب کی شکل میں شیرازہ بندی کی گئی تو تقریباً ایک ہزار صفحات پر مشتمل کتاب کی ضخامت کو کم کرنے کے لیے شعری حصے کو ”عباس رضانیر کی شاعری کے ابعاد و جہات“ اور نثری حصے کو ”عباس رضا نیر کے ادبی سروکار“ کی شکل میں دو حصوں میں تقسیم کیا گیا ہے۔

”عباس رضانیر کے ادبی سروکار“ آپ کے ہاتھ میں ہے جس کا پہلا جزو ڈاکٹر

۵۱	چراغِ وطن عباس رضانیر	ڈاکٹر انور جلال پوری	۳۸۲
۵۲	اعزازِ مسلسل	سہیل کاکوروی	۳۸۶
۵۳	بالائے سرش زہوشِ مندی می تافت ستارہ بلندی	مولانا اسد اللہ قاسمی	۳۸۸
۵۴	اعلیٰ قدروں کے پاسدار ڈاکٹر عباس رضانیر	ڈاکٹر محمد ہارون رشید	۳۹۱
۵۵	گو ناگوں صفات و کمالات کے حامل عباس رضانیر	محمد وحی اللہ حسینی	۳۹۴
۵۶	اکیسویں صدی کے روشن چراغ: ڈاکٹر عباس رضانیر	نوشاد مومن	۳۹۶
۵۷	ڈاکٹر عباس رضانیر کو ”بھاشا سمان“ سے نوازے	رضوان احمد فاروقی	۳۹۸
	جانے پر شہر نگاراں کے ادبی حلقوں میں خوشی کی لہر		
۵۸	ڈاکٹر عباس رضانیر: ایک ہمہ جہت شخصیت	مرزا محمد مہدی	۴۰۲
۵۹	ایک اجلا پیکر ڈاکٹر عباس رضانیر	فیروز جبین اعظمی	۴۰۷

زندگی

۶۰	ڈاکٹر عباس رضانیر: مختصر سوانحی خاکہ اور ادبی اجئے کمار سنگھ	۴۱۴
	خدمات ایک نظر میں	
۶۱	ڈاکٹر عباس رضانیر: ایک تاثراتی خاکہ	مجتبیٰ حسن صدیقی
۶۲	ابھی بچپن نظر آتا ہے تری باتوں میں	خورشید نگار
۶۳	ڈاکٹر عباس رضانیر: معاصر شعرا کی نظر میں	کلب عباس اشہر
۶۴	عباس رضانیر کی سرپرستی میں شعبہٴ اردو لکھنؤ	محمد شاہد رضا
	یونیورسٹی کی ادبی سرگرمیاں	

عباس رضانیہ کی فکشن تنقید پر مشتمل ہے۔ اردو ادب میں بارہا ہم نے یہ دیکھا ہے کہ کوئی قلم کار اگر شاعر ہے تو اس کو فکشن میں رغبت کم ہوتی ہے۔ اگر تخلیق کار ہے تو تنقید و تحقیق میں کم دسترس رکھتا ہے لیکن عباس رضانیہ کا ادبی کمال یہ ہے کہ وہ ایک باکمال شاعر و تخلیق کار ہونے کے ساتھ ساتھ شاعری کے نقاد بھی ہیں اور فکشن کی تنقید میں بھی کامل دستگاہ رکھتے ہیں اس کا بین ثبوت کتاب میں شامل وہ مضامین ہیں جن میں عباس رضانیہ کی فکشن تنقید کو ہر زاویے سے پرکھنے کی کوشش کی گئی ہے۔ کتاب کا دوسرا جزو عباس رضانیہ کی تنقیدی کاوشوں پر مشتمل ہے۔ نیر صاحب کی تنقید کا مابہ الامتیاز یہ ہے کہ وہ کسی بیت یا ازم سے متاثر ہوئے بغیر اور کسی ادبی گروہ بندی کا شکار ہوئے بغیر غیر جانبداری کے ساتھ تخلیق کے لطن سے اخذ نتائج کی کوشش کرتے ہیں۔ وہ اپنے اخذ نتائج میں کسی حد کامیاب ہوئے ہیں اس کا فیصلہ تو باشعور قارئین کریں گے لیکن عباس رضانیہ کی تنقیدی رجحان کا اندازہ کتاب میں شامل ان کی تنقید سے متعلق مضامین سے بخوبی لگایا جاسکتا ہے کیونکہ نیر صاحب کی تنقید سے متعلق جو مضامین کتاب میں شامل ہیں وہ بڑی عرق ریزی اور دقت نظر سے لکھے گئے ہیں۔

کسی بھی کتاب کی ترتیب و تدوین کے لیے استادانہ مہارت کی ضرورت ہوتی ہے۔ اگر کسی کتاب کے مرتب یا مدون کے پاس یہ مہارت نہیں ہے تو وہ کتاب ایک معمولی کتاب بن کے رہ جاتی ہے لیکن عباس رضانیہ نے جن کتابوں کی ترتیب و تدوین کا فریضہ انجام دیا ہے وہ کتابیں ادبی دنیا میں ایک حوالے کی حیثیت رکھتی ہیں۔

اردو میں ترجمے کی روایت کا آغاز ملا وجہی کی مشہور زمانہ کتاب ”سب رس“ سے ہوتا ہے اور جیسے جیسے اردو زبان وسیع ہوتی گئی ترجمے کی روایت میں بھی توسیع ہوتی گئی اور اس کے نتیجے میں دوسری زبانوں کی ہزار ہا کتابیں اردو زبان میں ترجمہ ہوئیں لیکن ان ہزار ہا کتابوں میں چند ہی کتابوں کو یہ امتیاز حاصل ہے کہ وہ ترجمہ ہونے کے

باوجود بھی تخلیق کا لطف دیتی ہیں۔ عباس رضانیہ کی ترجمہ شدہ کتابوں کے مطالعے کے بعد ہم اس نتیجے تک پہنچتے ہیں کہ انہوں نے اپنے ترجموں میں ترجمے کے تمام تقاضوں کو پورا کرتے ہوئے کوئی نہ کوئی ایسا نکتہ ضرور پیدا کرتے ہیں جس سے قاری متاثر ہوئے بغیر نہیں رہتا۔ نیر صاحب کے ترجمے کا اختصاص یہ بھی ہے ایک تخلیقی نثر جس طرح قاری کو متاثر کرتی ہے ویسے ہی عباس رضانیہ کی ترجمہ شدہ عبارتیں بھی قاری کو متاثر کرتی ہیں۔ عباس رضانیہ کی مترجمہ کتابوں پر جو مضامین کتاب میں شامل کیے گئے ہیں ان سے ان کے ترجمے کی صلاحیتوں کا اندازہ لگانا مشکل نہیں ہے۔

آج کی مصروفیت بھری زندگی میں جب ایک عام انسان کے پاس بھی پڑھنے کا وقت نہیں ہے۔ عباس رضانیہ کی جب متعدد کتابیں منظر عام پر آئیں تو پوری ادبی دنیا انگشت بہ دندان رہ گئی کہ اپنی بے پناہ مصروفیتوں کے باوجود نیر صاحب پڑھنے کے ساتھ ساتھ لکھنے کا بھی وقت کیسے نکال لیتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ ایک عام انسان کے لیے ایسا کرنا جوئے شیر لانے کے مترادف ہے۔ لیکن نیر صاحب اپنا ادبی وقار قائم رکھنے کے لیے اور اپنی علمی و ادبی صلاحیتوں کے اظہار کے لیے اپنے قیمتی وقت کا ایک ایک لمحہ استعمال کرتے ہیں۔ عباس رضانیہ کی اس کدو کاوش کا پوری علمی و ادبی دنیا میں اعتراف بھی کیا گیا جس کے نتیجے میں ان کی کتابوں پر تاثراتی مضامین کا ایک سلسلہ چل پڑا۔ مختلف جرائد و رسائل میں شائع شدہ مضامین میں سے کچھ اہم مضامین کو اس کتاب میں بھی شامل کیا گیا ہے تاکہ عباس رضانیہ کی تعین قدر میں زیادہ دقت پیش نہ آئے۔

ایک عام گھرانے میں پیدا ہونے والا انسان جب اپنی محنت و مشقت اور حوصلوں کے ذریعے ترقی کی اعلیٰ منازل کو طے کر لیتا ہے تو نفسیاتی طور پر اس کی ترقی یافتہ زندگی پر تو لوگوں کی گہری نگاہیں ہوتی ہیں لیکن ان اعلیٰ منازل تک پہنچنے کے لیے اس شخص نے کتنے آگ کے دریا پار کیے ہیں لوگ اس پہلو کو نظر انداز کر جاتے ہیں۔ لیکن

اس کتاب کے آخر میں ”زندگی“ کے عنوان سے کچھ ایسے اہم مضامین کو شامل کیا گیا ہے جن میں ڈاکٹر عباس رضانیر کی بچپن سے لے کر آج تک کی زندگی کے درمیان ان کی جہد مسلسل کا ایک خاکہ پیش کر دیا گیا ہے تاکہ قارئین اس سے یہ سبق حاصل کر سکیں کہ ایک عام انسان بھی ایمانداری کے ساتھ محنت و مشقت کے تسلسل کو برقرار رکھتے ہوئے ترقی کی اعلیٰ منزلوں کو طے کر سکتا ہے۔

ڈاکٹر عباس رضانیر کی شخصیت اور فن سے متعلق ہندوپاک کے مختلف جرائد و رسائل اور اخبارات میں بکھرے ہوئے مضامین کو کتابی شکل میں ترتیب دینے کے لیے انہوں نے مجھے اجازت دی جس کے لیے میں ڈاکٹر عباس رضانیر کا تہہ دل سے شکر گزار ہوں۔ جن قلمکاروں کے مقالے اس کتاب میں شامل ہیں ان تمام مقالہ نگاران کا صمیم قلب سے شکریہ ادا کرتا ہوں کیونکہ اگر یہ مقالے نہ ہوتے تو شاید یہ کتاب آپ کے ہاتھ میں نہ ہوتی۔

اس کتاب کی اشاعت کے سلسلے میں برادر عزیز ڈاکٹر محمد جعفر کے ساتھ ساتھ ان تمام احباب کا شکریہ ادا کرتا ہوں جن کا مجھے ہر موقع پر تعاون حاصل رہا ہے۔

منتظر مہدی

فکشن

معروف نیر، مصروف نیر

ڈاکٹر عصمت ملیح آبادی

نثر سوچ کر لکھی جاتی ہے، شاعری سوچنے سے خراب ہو جاتی ہے، نثر کھوٹا سکے ہے چل گئی تو چل گئی اور اگر بھینس کی طرح پانی میں بیٹھ گئی تو لاکھ دم پکڑ پکڑ کی اٹھائیے، اٹھنے کا نام نہیں لے گی۔ اس لیے تمام موزوں طبع لوگ شعر کہہ کر ادب کی بھوک مٹا لیتے ہیں، نثر کی طرف مائل ہونا پسند نہیں کرتے۔

جس طرح غریب آدمی دو جوڑے کپڑوں میں زندگی گزار دیتا ہے اسی طرح بہت سی یونیورسٹیوں کے پروفیسر صاحبان دو کتا میں لکھ کر سبک دوش ہو گئے۔ لکھنؤ ہی نہیں دلی میں بھی بیٹھے ہوئے کئی اردو بزرگ تو آج بھی ایک کتاب سے چار کتابیں بناتے ہیں اور تصنیفات کی تعداد میں اضافہ کرتے جاتے ہیں۔ یعنی ایک کی دو اور دو کی چار کرتے رہتے ہیں۔

نئی اور پرانی اردو نسل میں یہی بنیادی فرق ہے کہ نئے لکھنے والوں کا مال تازہ ہے اور انہیں کے کھیتوں میں پیدا ہوا ہے جبکہ پرانے لکھنے والوں نے بزرگوں کی اترنوں سے اپنا جسم سجایا ہے۔

نئے لکھنے والوں میں ڈاکٹر عباس رضا نیر کا ذکر کچھ زیادہ ہی ہو رہا ہے، ان کی تحریروں میں بزرگوں کے لیے احترام کی جھلک انھیں روشنی فراہم کر رہی ہے، ان کی نثر پر ترقی پسندوں، جدید یوں یا مابعد جدیدیت کے کوئی اثرات نہیں ہیں بلکہ سرسید احمد خاں

کے رفقاء کے بھرپور اثرات دیکھے جاسکتے ہیں، اس کا سبب ان کا ماضی اور خانوادے کے وہ اثرات ہیں جن کا تعلق علمی و ادبی ماحول اور مدارس کی رہنمائی سے ہے۔

عباس رضا نیر بڑے نستعلیق، انتہائی بااخلاق، نرم گفتار اور خوش مزاج شخصیت کے مالک ہیں، اپنے بزرگوں، ہم عصروں اور نوعمروں کو احترام دینے کی کوشش میں خود محترم ہوتے چلے جا رہے ہیں۔ وہ معتبر شاعر، مستند نثر اور منفرد ناظم ہیں، استاد کیسے ہیں، اس کا فیصلہ میں نہیں کر سکوں گا۔ ہاں اتنا ضرور جانتا ہوں کہ ان کے شاگردوں کی زبانیں ان کی تعریف کرتے نہیں تھکتیں۔

عباس رضا نیر کی کتاب ”خواجہ احمد عباس“ ۲۸۶ صفحات پر مشتمل ہے۔ بچپن میں خواجہ احمد عباس کا نام فلموں اور افسانوں کے حوالے سے سنا تھا اور یہ بھی سنا تھا کہ ان کی رشتہ داری کارل مارکس اور اسٹالن سے ہے لیکن ڈاکٹر نیر کی کتاب سے پتہ چلا کہ خواجہ احمد عباس کے پردادا خواجہ اظہر علی کے باپ کا نام خواجہ کبر علی تھا۔ خواجہ کبر علی بڑے دلیر اور بہادر آدمی تھے، ابھی عمر کی سولہویں منزل ہی طے کر پائے تھے کہ کسی نے ان کے باپ اور چچاؤں کو قتل کر دیا۔ جواب میں انہوں نے بھی قاتل کی جان لے لی۔ گرفتار ہو گئے لیکن فرار ہو کر لکھنؤ میں سکونت اختیار کر لی۔

عباس رضا نیر کی کتاب پڑھنے کے بعد یہ بھی اندازہ ہوا کہ وہ اپنے موضوع میں بالکل غرق ہو جاتے ہیں اور تہوں سے موتی نکال کر پیش کر دیتے ہیں، خواجہ احمد عباس کا خاندانی پس منظر، علی گڑھ یونیورسٹی میں ان کی تعلیمی سرگرمیاں، صحافی کی حیثیت سے ان کا تعارف، ایل ایل بی تک تعلیم حاصل کرنا، مہاتما گاندھی کے افکار و خیالات سے متاثر ہونا، گاندھی کی سوانح تلاش حق میں ڈوب جانا، دنیا کے اہم ممالک کا سفر، ممبئی کی فلموں پر تنقیدی مضامین، بلٹز اخبار سے وابستگی ”سرگم“ کا اجراء، مجتبیائی بیگم سے شادی، ان کی بیماری اور پھر مجتبیائی بیگم کا انتقال، دوسری بیوی سے ایک بیٹی روشنی کا ذکر، فلموں سے

وابستگی، ترقی پسند تحریک میں شمولیت، ان کی پہلی کہانی ”ابابیل“ کا ذکر، ان کی ذاتی زندگی کا تعارف اور پھر ۱۹۸۷ء میں ان کا انتقال یہ تمام واقعات عباس رضانیر نے انتہائی خوبصورتی اور وضاحت کے ساتھ پیش کر دیئے ہیں۔

کتاب خواجہ احمد عباس کے مطالعے سے ڈاکٹر نیر کی ادبی صلاحیتوں کا بخوبی اندازہ ہو جاتا ہے۔ تعجب اس بات پر ہوتا ہے کہ یہ ننھی سی جان والا شخص مجلسیں بھی پڑھتا ہے، نظامت بھی کرتا ہے، مشاعرے بھی پڑھتا ہے، سیمینار میں مقالے سناتا ہے، شعبے کی ذمہ داریاں بھی پوری طرح نبھاتا ہے، مضامین بھی لکھتا ہے اور کتابوں پر کتابیں سپردِ قلم کرتا چلا جا رہا ہے، انتظار کیجئے کہ یہ سیماب صفت شخصیت کہاں جا کر ٹھہرتی ہے۔

”ستاروں سے آگے جہاں اور بھی ہیں“

☆☆☆

عباس اور عباس

عائشہ صدیقی

محترم عباس رضانیر ایک خوش فکر شاعر بھی ہیں اور پر جوش مقرر بھی وہ بولتے ہیں تو لگتا ہے لفظوں کا آبشار سارواں ہے۔ لہجہ پر جوش ہوتا ہے لیکن انداز میں نرمی ہوتی ہے۔ آواز کا بہاؤ الفاظ کا رچاؤ اور خود ان کا ہاؤ بھاؤ دوسرے کو متاثر کئے بغیر نہیں رہتا۔ ان کی خطابت میں ثقافت بھی ہے لطافت بھی ہے۔ وہ شستہ بھی ہے شگفتہ بھی۔ وہ گرمی افکار میں نرمی گفتار کا دامن نہیں چھوڑتے۔ اس نرمی میں شربنی کی ملاوٹ سننے والے کو باندھ رکھتی ہے اور کسی بھی حالت میں بدمزہ نہیں ہونے دیتی۔ وہ عوام میں اپنے لفظوں کے بے بہا خزانے کا منہ کھول دیتے ہیں اور بڑی فنکاری سے یہ موتی بکھیرتے ہیں لیکن عقل و ہوش کی طنابیں ان کے ہاتھ میں رہتی ہیں۔ شاید یہی وجہ ہے کہ محفلوں میں خود کو اتنا مصروف رکھنے کے بعد بھی لکھنے پڑھنے کا وقت نکال لیتے ہیں۔ ایسا نہ ہوتا تو ایک ساتھ تین کتابوں کا منظر عام پر آنا کوئی معمولی کام نہیں ہے۔

عہد ساز شخصیت خواجہ احمد عباس پر ان کی تصنیف میرے ہاتھوں میں ہے۔ خواجہ احمد عباس اس شخصیت کا نام ہے جس نے نہ صرف زندگی بلکہ علم و ادب کے مختلف راستوں کو روشن کیا بلکہ وہ میل کے پتھر نصب کئے جن کی مدد کے بغیر ان راہوں پر چلنا آسان نہیں۔

خواجہ احمد عباس میں فنی کمالات کا ایک دریا موجزن تھا وہ عام بچوں کا سا ذہن

وعقل لے کر ہی پیدا ہوئے تھے۔ ان کے اندر کا Genius کم عمری سے ہی اظہار کی راہیں تلاش کرتا تھا یہی وجہ ہے کہ وہ تقریری مقابلوں میں حصہ لینے لگے اسی جستجو نے قلم کی طرف مائل کیا جسے انہوں نے بہت مضبوطی سے اپنی گرفت میں لے لیا۔

عباس رضا نیر صاحب کی تصنیف ”خواجه احمد عباس“ قابل تحسین ہے۔ اس کتاب میں انہوں نے احمد عباس صاحب کی زندگی کے نشیب و فراز کا مطالعہ بھی کیا ہے اور ان کے فن پر بھی مختلف زاویوں سے روشنی ڈالی ہے۔

پوری کتاب میں انہوں نے آٹھ (۸) باب قائم کئے ہیں۔ جو حسب ذیل ہیں:

۱۔ حیات و شخصیت

۲۔ افسانہ نگاری

۳۔ ناول نگاری

۴۔ ڈرامہ نگاری

۵۔ صحافت نگاری

۶۔ خودنوشت

۷۔ سفرنامہ

۸۔ ماحصل

ان ابواب سے پہلے انہوں نے ”حرف اول“ کے تحت کتاب کی اہمیت اور ضرورت بیان کی ہے اور ان اشخاص کے تئیں ممنونیت کا اظہار کیا ہے جو اس کتاب کی تکمیل و اشاعت میں Motivational Source ہے۔

۱۔ باب اول میں جہاں خواجه صاحب کی حیات و شخصیت سے بحث کی گئی ہے نیر صاحب نے وہ سارے حالات اکٹھا کر دیئے ہیں جو کسی شبیہ کو ابھارنے میں معاون ثابت ہوتے ہیں۔ گھر، خاندان کے افراد، ان کے اخلاق و عادات، گھریلو ماحول تہذیبی

ورشہ، مذہبی، سماجی، معاشی، اخلاقی حالات۔ وہ خواتین و حضرات جن کے نقش قدم کے سہارے وہ زندگی کی راہوں پر آگے بڑھتا ہے۔ ان حالات کو انہوں نے مختلف جگہوں سے اکٹھا کیا ہے۔ اس میں ”نقوش“ لاہور۔ کا آب ہیتی نمبر، پروفیسر زاہدہ زیدی، صالحہ عابد حسین، حیات اللہ انصاری، کمال احمد صدیقی، اپنیدر ناتھ اشک، پروفیسر آل احمد سرور، رام لعل، قمر رئیس، راجندر سنگھ بیدی، ڈاکٹر خلیل الرحمن اعظمی، سجاد ظہیر، ضمیر نیازی وغیرہ۔ خواجه صاحب سے لئے گئے انٹرویو سے بھی مدد لی گئی ہے۔ عباس رضا نیر صاحب نے سب سے زیادہ فائدہ خواجه احمد عباس کی خودنوشت سے اٹھایا ہے جو انہوں نے اردو کے بجائے انگریزی میں لکھی ہے۔ اس کتاب کا نام ہے ”I am not an island“ اس خودنوشت نے زندگی کے مستند حالات فراہم کرنے میں یقیناً بہت مدد کی ہے لیکن شخصیت کی صحیح تصویر دوسروں کی رائے سے ہی مرتب کی جاتی ہے۔ جیسے ان کی شخصیت کا کھراپن خود سری، محنت کرنے کی غیر معمولی صلاحیت، بچوں کی سی معصومیت، نیکی، ایمانداری وغیرہ۔ اس باب میں انہوں نے ان اعزازات، انعام و اکرام اور ایوارڈز کا بھی ذکر کیا ہے جو ان کی عظمت کے اعتراف میں انہیں پیش کئے گئے۔

دوسرا باب خواجه صاحب کی افسانہ نگاری کا احاطہ کرتا ہے۔ ان کے پہلے افسانے ”ابابیل“ جو رسالہ جامعہ میں ۱۹۳۶ء میں شائع ہوا تھا سے لے کر غالباً خواجه صاحب کے تمام افسانوں پر بات کی گئی ہے۔

خواجه احمد عباس کے دس افسانوی مجموعوں کی فہرست جو نیر صاحب نے فراہم کی ہے اس طرح ہے۔ ۱۔ ایک لڑکی ۲۔ زعفران کے پھول ۳۔ میں کون ہوں ۴۔ دیا جلے ساری رات ۵۔ کہتے ہیں جس کو عشق ۶۔ پیرس کی ایک شام ۷۔ گیہوں اور گلاب ۸۔ نیلی ساری ۹۔ بیسویں صدی کے لیلیٰ مجنوں ۱۰۔ نئی دھرتی نئے انسان۔ اور خواجه احمد عباس کے منتخب افسانے مرتب رام لعل ۱۹۹۳ء۔

عباس رضانی نے ان کے افسانوں کا تفصیل سے جائزہ لیا ہے۔ افسانوں کے تجزیے بھی پیش کئے ہیں جہاں ضروری ہوا افسانوں کے خاکے بھی دیئے ہیں۔ افسانوں پر بحث قائم کی ہے۔ ساتھ ہی ان کے ساتھی افسانہ نگاروں، نقادوں، اور دوسرے مشاہیر کے زاویہ نگاہ کو رکھ کر مدلل گفتگو کی ہے۔

افسانوں کی ہی طرح ناول نگاری پر بھی سیر حاصل گفتگو کی گئی ہے۔ خواجہ احمد عباس کے ناول ”انقلاب“ ہی نہیں بلکہ ان کے تمام ناولوں پر نیر صاحب نے توجہ سے کام کیا ہے۔ اور پوری کوشش کی ہے کہ تحریر کی شگفتگی قائم رہے اور اس کا سلیس انداز قاری کو باندھے رکھے۔

افسانہ نگاری اور ناول نگاری کی ہی طرح ڈرامہ نگاری کا جائزہ بھی بہ نظر غائر لیا گیا ہے۔ اس باب میں ان کے تحریر کردہ ڈراموں کا بیان بھی ہے اور اسٹیج پر پیش کیے جانے والے ڈراموں کا بھی۔ خواجہ صاحب اپنا (IPTA) کے بنیاد گزاروں میں سے تھے اور زندگی بھر اس کی ترقی کے لیے سرگرم رہے۔ یہاں انہوں نے اپنے ساتھی ادیبوں کے ڈراموں کو بھی پیش کیا۔ اپنا کے تحت انہوں نے ڈراموں میں ٹکنیک کے کئی تجربے بھی کیے۔ ان سب کا احوال اس باب میں ہے۔

باقی تین ابواب صحافت نگاری، خودنوشت اور سفرنامہ سے متعلق ہیں۔ ان ابواب میں بھی پہلے بیان کیے گئے ابواب کی طرح ہی عرق ریزی سے کام لیا گیا ہے۔ صحافت تو وہ بنیادی وصف ہے جس نے ان کی شخصیت کو بنانے اور نکھارنے کا کام کیا ہے۔ خودنوشت کے مواد سے انہوں نے حیات اور شخصیت کے باب میں پورا فائدہ اٹھایا ہے۔ خواجہ احمد عباس کا سفرنامہ ڈائری کے فارم میں ہے۔ اس کا عنوان ہی ”مسافر کی ڈائری“ ہے اس کا شمار اچھے سفرناموں میں ہوتا ہے۔

آخری باب میں ماحصل کے تحت نیر صاحب نے اس ساری گفتگو اور بحث کو

سمیٹا ہے جو انہوں نے اس کتاب میں مختلف ابواب کے تحت کی ہے۔ عباس رضانی کی یہ تصنیف اہمیت کی حامل ہے۔ جون ۱۹۸۷ء میں خواجہ احمد عباس کے انتقال کے بعد چند رسالوں نے ان پر گوشے یا نمبر نکالے لیکن اتنا موقع کام جس کے خواجہ صاحب مستحق تھے سامنے نہ آیا۔

ڈاکٹر ضیاء الدین اور غلام حسین کی کتابوں کے حوالے عباس رضانی نے دیئے ہیں لیکن ان کی تصنیف Pioneering تصانیف میں اہم گنی جائے گی خواجہ صاحب پر کام کرنے والوں کے لیے گائیڈ کا کام دے گی۔ کتاب کی طباعت صاف ستھری ہے اور پُرکشش ہے۔ نیر صاحب کو میرا مخلص مشورہ ہے کہ دوسرا ایڈیشن چھپواتے وقت خواجہ صاحب کی فلموں کا باب بھی الگ سے شامل کر دیں تو اچھا ہے۔ عباس رضانی صاحب اس تصنیف کے لیے مبارکباد کے مستحق ہیں۔



عباس رضانیہ کی تحقیقی کاوش:

خواجہ احمد عباس

ڈاکٹر عمیر منظر

ادب اور صحافت دونوں کے تقاضوں سے کما حقہ عہدہ برآ ہونا آسان نہیں۔ ادب کے ساتھ ساتھ صحافت کی ذمہ داریاں ادا کرنے والے ادیبوں کی تعداد کم نہیں ہے لیکن صحافت کے علاوہ ادب میں بھی اپنی اہمیت کو تسلیم کروانا اور وقتی شہرت کے بجائے ادب کی دائمی قدروں کو پیش نظر رکھنے والے ادیب بہر حال کم ملیں گے۔ البتہ اس نوع کی خدمات انجام دینے والے ادیبوں کی مختصر فہرست بھی خواجہ احمد عباس کے بغیر مکمل نہیں ہو سکتی۔ یہ کہنا مشکل ہے کہ ان کی شہرت کا مدار ادب ہے یا صحافت ہے۔ خواجہ احمد عباس نے کالم نگاری اور افسانہ نگاری کے ساتھ ساتھ ڈرامہ نگاری میں بھی کمال پیدا کیا۔ فلموں نے انھیں جو شہرت عطا کی وہ اس سے ماورا ہے۔ مجموعی طور پر انھوں نے فلم، صحافت اور ادب کی نمایاں خدمات کی۔ اس تناظر میں خواجہ احمد عباس کی مجموعی ادبی اور صحافتی خدمات کو موضوع بنانا ایک مشکل کام ہے۔ ڈاکٹر عباس رضانیہ نے اپنی تازہ ترین کتاب ”خواجہ احمد عباس“ میں مطالعہ کی جو جہت نمایاں کی ہے اس میں خواجہ احمد عباس کے کسی ایک پہلو کے بجائے ان کی مجموعی ادبی خدمات کا محاکمہ پیش کیا ہے۔

”خواجہ احمد عباس“ سات ابواب پر مشتمل ہے۔ حیات و شخصیت سے سفر نامہ

تک کا لمبا سفر ثابت قدمی کے ساتھ پیش کیا گیا ہے۔ جہاں ایک طرف ان ابواب میں معلومات بہم پہنچائی گئی ہیں وہیں کوشش کی گئی ہے کہ جو کچھ کہا جائے وہ مدلل ہو اسی لیے فاضل مصنف نے جگہ جگہ حوالوں کا خاص اہتمام کیا ہے۔ اس لحاظ سے یہ کتاب دستاویزی اہمیت کی حامل ہو گئی ہے۔ کوشش کی گئی ہے کہ خواجہ احمد عباس کی شخصیت اپنے جلال و جمال کے ساتھ سامنے آئے نیز ماورائے شخصیت بھی جو کچھ ہے اور اپنے عہد اور معاصرین سے سرگرم مکالمے کی جو صورتیں رہی ہیں ان کو بھی پیش کرنے میں کسی تردد یا تکلف سے کام نہیں لیا گیا۔ اور غالباً اسی لیے انہوں واضح کیا ہے کہ:

”خواجہ صاحب کافی پڑھے لکھے انسان تھے۔ ان کا کوئی فیصلہ

جلد بازی پر مبنی نہیں ہوتا تھا بلکہ عقل کی میزان پر تولا ہوا ہوتا تھا۔ خواجہ صاحب مارکسزم کو تسلیم کرتے تھے لیکن اس پر اندھا یقین نہیں رکھتے تھے۔ وہ تنقیدی ذہن رکھتے تھے اور جس بات کو غلط سمجھتے تھے اس کا برملا اظہار کرتے تھے۔ وہ پارٹی کی پالیسی کے مطابق ہاں میں ہاں ملانے والے نہیں تھے یہی سبب ہے کہ ترقی پسند تحریک کی پالیسیوں سے جب انھوں نے اختلاف کیا تو وہ تحریک سے نکالے گئے خواجہ صاحب تحریک کے ترجمان ”نیا ادب“ کے تین ایڈیٹروں میں سے ایک تھے۔“

(ص ۴۰)

خواجہ احمد عباس نے اپنے عہد اور زمانے سے سرگرم مکالمہ کیا اور جو کچھ لکھا اس میں اس عہد کو دیکھا اور محسوس کیا جاسکتا ہے۔ ترقی پسند تحریک کے افسانوی ادب میں خواجہ احمد عباس کا نام تادیر فراموش نہیں کیا جاسکتا انھوں نے افسانہ اور ناول کی شکل میں جو افسانوی ادب خلق کیا وہ آج بھی اہمیت کا حامل ہے۔ انھوں نے متعدد ناول لکھے جو زبان و بیان اور کردار نگاری کے حوالے سے یادگار ہیں۔ متعدد تنقید نگاروں نے

ان کی زبان اور بیان کو خاص طور پر سراہا ہے کہ چھوٹے چھوٹے جملوں میں بہت بڑی بات کہہ جاتے ہیں اور یہ وہ لوگ ہیں جن کے یہاں حسن و عشق کے علاوہ بھی بہت کچھ ہے۔ خواجہ احمد عباس کے ناولوں کی ایک خوبی وہ نفسیاتی نکتے ہیں جو جگہ جگہ ملتے ہیں، جس سے ناول کی معنویت میں اضافہ ہوتا ہے۔ ان کے ناولوں کے نام ہیں: انقلاب، بسمبلی نیند کی بانہوں میں، چار دل چار راہیں، اندھیرا اجالا، دو بوند پانی وغیرہ۔ ان ناولوں کے تفصیلی مطالعہ میں، ڈاکٹر عباس رضانی نے بالعموم ان کے زبان و بیان کی تعریف کی۔ البتہ بعض ناولوں کو جب انھوں نے تنقید کی کسوٹی پر پرکھا تو ان کی معنویت اور جواز پر بھی بحث کی اور ادب کے پارکھ کے طور پر جو کچھ کہ اس کے متن سے مترشح ہوا وہ یہ لکھنے پر مجبور ہوئے کہ:

”ناول (چار دل چار راہیں) میں کرداروں کی ذہنی سطح اور ان کے مزاج کے مطابق زبان کو برتا گیا ہے۔ بہر کیف سنجیدہ ناول میں اس ناول کا کوئی مقام نہیں ہے اور نہ ہی اس کا تاثر دیر پا ہے۔ لیکن خواجہ صاحب کے مخصوص انداز بیان اور کرداروں کی پیش کش کے اعتبار سے یہ یادگار ضرور ہے۔“

(ص ۲۰۴)

۱۹۳۶ میں ان کا پہلا افسانہ رسالہ جامعہ میں شائع ہوا جس نے اس عہد کے ممتاز ادیبوں کو اپنی طرف متوجہ کیا۔ یہی افسانہ ان کی پہچان بھی بنا کیونکہ اب تک اس افسانے کو اردو کے علاوہ دوسری کئی زبانوں میں منتقل کیا جا چکا ہے جبکہ بعض ادیبوں نے اس کے بارے میں لکھا ہے کہ یہ کہانی اب عالمی کلاسیکی ادب کا درجہ پا چکی ہے۔ تخلیقیت سے بھرپور خواجہ احمد عباس نے اسی کہانی پر بس نہیں کیا بلکہ نت نئے تخلیقی تجربے کیے اور غالباً اسی سبب سے ترقی پسند افسانہ نگاروں میں ان کا نام آج بھی اہمیت کا حامل ہے۔

خواجہ احمد عباس کے بیشتر ڈرامے اسٹیج ہوئے۔ اردو ادب کے بہت سے اچھے ڈراموں کا المیہ یہی رہا ہے کہ وہ اسٹیج نہیں ہو سکے اور اسی وجہ سے ان کو وہ شہرت نہیں مل سکی۔ پروفیسر محمد حسن اور شمیم حنفی کے ڈرامے اپنی تمام ترفنی خوبیوں کے باوجود اسٹیج نہیں ہو سکے۔ خواجہ احمد عباس کے ساتھ یہ صورت نہیں تھی اور انھوں نے فلمی دنیا کے توسط سے یہ فائدہ اٹھایا جس کی وجہ سے ایک بڑے حلقے میں ان ڈراموں کے توسط سے انہوں نے اپنی فکر کو عام کیا۔

بلنز کے آخری صفحہ (آزاد قلم) نے خواجہ صاحب کو جو شہرت دی اور خود انہوں نے اس کے لیے جو محنت کی وہ ناقابل بیان ہے۔ ان کا خیال تھا کہ ظلم و جبر کے خلاف آواز بلند کرنے میں صحافت بنیادی کردار ادا کرے گی۔ ویسے علی گڑھ کے زمانے سے ہی ان پر صحافت غالب تھی۔ کتاب میں خواجہ صاحب کے کالموں کے متن پر گفتگو کی گئی ہے اور بتایا گیا ہے کہ خواجہ صاحب کسی ایک موضوع کے اسیر نہیں تھے بلکہ قومی اور بین الاقوامی ہر طرح کے موضوعات پر وہ لکھتے تھے۔ ڈاکٹر نیر نے تاریخ وار موضوعات کا ذکر بھی کیا ہے وہ لکھتے ہیں:

”خواجہ صاحب کا کمال یہ ہے کہ کسی موضوع پر اظہار خیال کرتے ہوئے وہ قاری کو مسرت اور بصیرت دونوں سے ہم کنار کراتے جاتے ہیں۔ وہ بظاہر اپنے رواں دواں، سادہ، بے تکلف و بے ساختہ اسلوب سے قاری کے ادبی ذوق کی تسکین بھی کرتے جاتے ہیں۔ کبھی وہ کہانی کا انداز اپناتے ہیں تاکہ اپنی بات کو زیادہ دلکش انداز میں قاری تک پہنچا سکیں۔“

(ص ۲۴۳)

عباس رضانی کی عام پہچان ایک ناظم مشاعرہ کی ہے۔ اسٹیج پر ان کی گل افشانی

گفتار دیدنی ہے مگر انہوں نے اپنے اس انداز اور جانے پہچانے اسٹائل کی جھلک کتاب پر نہیں آنے دی بلکہ ایک اسکا لری طرح کام کیا۔ قاری کو ان کی رائے سے اختلاف کا حق حاصل ہے اور ویسے بھی علم و تحقیق کی کوئی بھی منزل، منزل آخر نہیں ہوتی لیکن جن راستوں سے گزر کر عباس رضا نے اپنی تحقیق پیش کی ہے وہ لائق صد مبارک باد ہے۔ یہاں یہ بات برائے مشورہ ہے کہ کتاب کی فہرست کچھ زیادہ ہی جامع ہوگئی ہے۔ بہتر ہوتا کہ ابواب کی ذیلی سرخیاں بھی فہرست کا حصہ بنیں تاکہ فہرست پر نظر ڈالتے ہی قاری کو مزید معلومات حاصل ہو جائیں اور فہرست سے ہی اندازہ ہو جاتا کہ خواجہ احمد عباس کے ناولوں پر نیر صاحب نے شرح و بسط کے ساتھ لکھا ہے۔ کتاب میں خواجہ احمد عباس کی تمام مطبوعات کے حوالے موجود ہیں بہتر ہوتا کہ آخر میں کتابیات کے ذیل میں ان کتابوں کے نام اور سن اشاعت دے دیا جاتا۔

اس بہترین اور قابل قدر کتاب کے لیے ڈاکٹر عباس رضا نیر کو بہت بہت

مبارک باد۔

☆☆☆

ڈاکٹر عباس رضا نیر کی تنقید نگاری

ڈاکٹر مجاہد الاسلام

اردو تنقید کا باقاعدہ آغاز اگر ہم مولانا الطاف حسین حالی کے ”مقدمہ شعر و شاعری“ سے کریں تو اس وقت اردو تنقید کی عمر کم و بیش ایک سو چوبیس سال بنتی ہے۔ حالی نے نظری تنقید کے ساتھ عملی تنقید کے میدان میں بھی کارہائے نمایاں انجام دیے۔ اس سلسلے میں ان کی تنقیدی تصانیف ”مقدمہ شعر و شاعری“ ”یادگار غالب“ اور ”حیات سعدی“ کلیدی حیثیت رکھتی ہیں۔ اور حالی کے ہی ”کاز“ کو امداد امام عصر نے ”کاشف الحقائق“ اور مسعود حسن رضوی ادیب نے ”ہماری شاعری“ کی شکل میں آگے بڑھایا۔ ان لوگوں نے جہاں شعر و ادب کے اصول و ضوابط کو آفاقیت بخشی، وہیں اس کا عملی انطباق (Practical) بھی پیش کیا۔ بہ الفاظ دیگر اصول و ضوابط کے ساتھ اس کی مثالیں بھی پیش کیں۔

حالی اور امداد امام اثر کے بعد جن لوگوں نے اس کوچے میں قدم رکھا انہوں نے تنقید کے اصول و ضوابط کو ضرور مرتب کئے مگر جب عملی طور سے انطباق کی بات آئی تو وہ یا تو خاموش رہے یا پھر صرف نمونہ پیش کر دیا اور اس کی تاویل و تحلیل سے عداً گریز کیا یا پھر اسی میں سے کسی نے تاویل و تحلیل بھی پیش کی تو ایسی زبان میں کہ وہ یا تو اصل کی تفہیم سے کوسوں دور تھی یا پھر قارئین کی فہم سے بالاتر۔ یہاں پر ہم صرف آل احمد سرور کا ذکر کریں گے۔ آل احمد سرور صاحب نے جہاں اردو تنقید کے اصول و ضوابط مرتب و منضبط کئے وہیں انہوں نے عملی تنقید کے نمونے بھی پیش کئے مثلاً ایک جگہ وہ سمجھانا چاہتے ہیں

کہ تنقید کیا ہے؟ اور اس کو کیا کچھ ہونا چاہیے؟ ان کا اقتباس ملاحظہ ہو:

”تنقید کا کام فیصلہ ہے۔ تنقید دودھ کا دودھ اور پانی کا پانی الگ کر دیتی ہے۔ تنقید وضاحت ہے، صراحت ہے، ترجمانی ہے تفسیر ہے، تشریح ہے تحلیل ہے تجزیہ ہے، تنقید قدر ہی نہیں متعین کرتی ہے ادب اور زندگی کو ایک پیمانہ دیتی ہے، تنقید انصاف کرتی ہے۔ ادنیٰ اور اعلیٰ جھوٹ اور سچ پست اور بلند کے معیار قائم کرتی ہے۔ تنقید ہر دور کی ابدیت اور ابدیت کی عصریت کی طرف اشارہ کرتی ہے۔ تنقید ادب میں ایجاد کرنے اور محفوظ رکھنے دونوں کا کام انجام دیتی ہے۔ وہ بت شکنی بھی کرتی ہے، اور بت گری بھی۔ تنقید کے بغیر ادب ایک ایسا جنگل ہے، جس میں پیداوار کی کثرت ہے، موزونیت اور قرینے کا پتہ نہیں۔“

(ص ۱۱، ارمغان تحقیق و تنقید۔ مرتبہ: شعبہ اردو، جامعہ ملیہ

اسلامیہ، نئی دہلی ۲۰۱۲ء)

یہ تو رہے سرور کے تنقید کے اصول و ضوابط سے متعلق خیالات۔ اب ہم ان کی عملی تنقید کی طرف آتے ہیں۔ ان کی ایک مشہور تنقیدی تصنیف ’مسرت سے بصیرت تک‘ ہے، جو کم و بیش ۱۳ مضامین پر مشتمل ہے اس میں غالب پر تین مضامین شامل ہیں۔ اس میں سے ایک کا عنوان ہے ’غالب کی شاعری کی معنویت‘ ہم یہاں پر اس مضمون سے ایک اقتباس پیش کریں گے اور پھر یہ دیکھنے کی کوشش کرتے ہیں کہ وہ اپنے اس تنقیدی اصول و ضوابط جس کا انہوں نے تفصیل سے ذکر کیا ہے اس کا اپنی اس عملی تنقید میں کس حد تک انطباق کرتے ہیں یا برعکس ہیں۔ اقتباس ملاحظہ ہو:

”حالی کا شاعری کا تصور میں اوپر بیان کر چکا ہوں۔ غالب کا شاعری کا تصور

ان اشعار سے واضح ہوگا:

زلف خیال نازک و اظہار بے قرار
یارب بیان شانہ کش گفتگو نہ ہو

شونی اظہار غیر از وحشت مجنوں نہیں
لیلیٰ معنی اسد محمل نشین راز ہے

حسن فروغ شمع سخن دور ہے اسد
پہلے دل گداختہ پیدا کرے کوئی

ہجوم فکر سے دل مثل موج لرزے ہے
کہ شیشہ نازک و صہبائے آب گینہ گداز

عرض کیجئے جو ہر اندیشہ کی گرمی کہاں
کچھ خیال آیا تھا وحشت کا کہ صحرا جل گیا

ہاتھ دھو دل سے یہی گرمی گرا اندیشے میں ہے
آگینہ تندی صہبا سے پگھلا جائے ہے

اسد ارباب فطرت قدر دان لفظ و معنی ہیں
سخن کا بندہ ہوں لیکن نہیں مشتاق تحسین کا

اور یہ شعر جو میرے نزدیک غالب کا ہی کلیدی شعر نہیں، بلکہ شاعری کے
بتکدے کی کلید ہے:

گنجینہ معنی کا طلسم اس کو سمجھئے
جو لفظ کہ غالب میرے اشعار میں آوے

پھر ان اشعار پر تبصرہ کرتے ہوئے وہ آگے لکھتے ہیں:

”یعنی شاعری الفاظ کا تخلیقی استعمال ہے یہاں لفظ، لفظ نہیں ایک جہان معنی ہے لفظ دنیا ہے لیکن اس دنیا کا دروازہ کھولنے کے لیے معنی اس طلسم کو فتح کرنے کے لیے ایک روح کی ضرورت ہے۔ پھر یہ ایک طلسماتی دنیا ہے جو سائنسی یا معلوماتی صداقت کے بجائے جذباتی صداقت رکھتی ہے مگر جو اپنی صداقت اور اپیل میں معلوماتی، مادی اور منطقی دنیا سے کم نہیں ہے۔ بلکہ جو انسان کو علامتی جانور اور دیو مالا کے ساز پر قرض کرنے والا جان کر، اپنی طلسماتی فضا کے ذریعہ سے اسے ایک نیا شعور دیتا ہے۔ اپنے خوابوں کے ذریعہ سے حقائق کی توسیع کرتی ہے۔ اپنے کلیات (Absolute) کے ذریعہ سے اسے جزو میں کل دکھائی دیتی ہے۔ اپنے خصوصی تجربے کے ذریعہ سے اسے ایک آفاقت بخشتی ہے۔“

(مسرت سے بصیرت تک: آل احمد سرور۔ مکتبہ

جامعہ دہلی۔ سن اشاعت۔ ۲۰۱۱ء غالب کی شاعری کی

معنویت۔ مضمون: ص ۱۰۹)

اس تبصرے کے بارے میں سب سے پہلی بات تو یہی کہی جاسکتی ہے کہ اگر کوئی شخص اس کا انطباق میر و سودا کی شاعری پر کرتا ہے تو کون سی ایسی چیز ہے جو اس کو ایسا کرنے سے روک سکتی ہے؟ ایک اہم بات یہ بھی ہے کہ اس کے لیے یہاں پر سرور نے جو الفاظ استعمال کئے ہیں وہ بھی پورے طور سے استعاراتی ہیں جو تنقید کی زبان قطعی نہیں کہی جاسکتی ہے۔ تنقید کا کام اصل میں ایک باٹ فراہم کرنا ہوتا ہے۔ جس سے کہ ایک قاری کھرے کھوٹے کی تمیز قائم کر سکے۔

ہونا تو چاہیے تھا کہ پہلے سرور ان اشعار کا تفصیل سے تجزیہ پیش کرتے، پھر کوئی

معنی اخذ کرتے، اس کے بعد کسی خاص نتیجے پر پہنچتے، مگر یہاں پر ایسا کچھ بھی نہیں ہے۔ ایک تو غالب کی شاعری مشکل و دقیق تر پھر سرور کا استعاراتی لہجہ۔ خلاصہ یہ کہ کریلا اور نیم چڑھا، نتیجہ قاری کی سمجھ میں کچھ بھی نہیں آتا اور کسی رائے پر پہنچنا تو دور کی بات رہی۔

موجودہ دور کا المیہ یہ ہے کہ اس میں تخلیقات کم ظہور پذیر ہو رہی ہیں اور تنقیدیں زیادہ لکھی جا رہی ہیں۔ اور پھر تنقید میں بھی جو چیزیں ہمارے سامنے آرہی ہیں ان میں جس شدت سے نظریات (Theories) کا عنصر غالب ہے اسی شدت سے عملی انطباق اور تعبیر و تحلیل کا فقدان ہے، وہ چاہے ساختیات کے علمبردار پرو فیسر گوپی چند نارنگ ہوں یا پھر رد تشکیل کے حوالے سے جانے جانے والے پاکستان کے ناصر عباس نیر یا پھر اکتشافی تنقید کے ذیل میں حامدی کا شیریں وہ اصول و نظریات کی بات تو کرتے ہیں مگر نمونے پیش کرنے سے قاصر رہتے ہیں۔

اس مختصر سی تمہید کے بعد اب ہم آتے ہیں اپنے اصل موضوع کی طرف۔ ڈاکٹر عباس رضا نیر تخلیق، تنقید، ترتیب، تدوین اور ترجمے کے میدان میں یکساں مہارت رکھتے ہیں۔ چونکہ یہاں پر ہمارا موضوع صرف ان کی تنقید نگاری ہے لہذا ہم خصوصیت سے اپنی باتوں کو ان کی تنقید نگاری ہی تک محدود رکھیں گے اور سب سے پہلے ذکر کریں گے ان کی چند تنقیدی کتابوں کا۔ اور وہ یہ ہیں ’ادبی میزان‘، ’خولجہ احمد عباس‘، ’تنقیدی بحثیں‘ اور ’رثائی تنقیدیں‘۔ یہ کتابیں اردو تنقید کے میدان میں ان کی حیثیت کو مسلم کرتی ہیں۔

ان کتابوں کے مطالعہ کے بعد چند ایک باتیں جو اول اول واضح ہو کر ہمارے سامنے آتی ہیں وہ ہے ان کی تنقیدی زبان۔ پھر آتی ہے بات ان کے تنقیدی رویہ یا طریقہ تنقید کی۔ اور تیسری ضروری اور اہم بات قدر کا تعین ہے۔ جہاں تک رہی تنقید کی زبان کی بات تو اس ذیل میں ناقدین فن کا خیال ہے کہ اس کو واضح اور سہل ہونا چاہیے کسی بھی طرح کے تصنع و تکلف سے اس کو دور ہونا چاہیے۔

جہاں تک رہی بات عباس رضا نیر کی تو وہ اپنی تنقید میں وہی زبان استعمال کرتے ہیں جو تنقید کے لیے موزوں و مناسب سمجھی جاتی ہے۔ وہ اس معاملے میں کسی بھی طرح کے تصنع و تکلف سے کام نہیں لیتے ہیں۔ وہ جو بھی کہنا چاہتے ہیں وہ ہو بہو قاری کے ذہن میں منتقل ہو جاتا ہے۔

رہی بات تنقیدی رویے یا تنقیدی طریقہ کار کی تو وہ پہلے اصول و ضوابط قائم کرتے ہیں پھر اس کا انطباق فن پارے پر کرتے ہیں اس کے لیے مثالیں تلاش کرتے ہیں اور پھر یہی نہیں بلکہ اس کا تجزیہ بھی کرتے ہیں۔ اس کو مزید مدلل بنانے کے لیے ناقدین فن کی آراء سے بھی استفادہ کرتے ہیں۔ اور پھر کسی نتیجے پر پہنچنے کی کوشش کرتے ہیں۔

بڑی نا انصافی ہوگی اگر یہاں پر ان کے تنقیدی مجموعہ ہائے مضامین سے اس کی کچھ مثالیں نہ پیش کی جائیں۔ ان کا ایک مضمون ہے بہادر شاہ ظفر اپنے نصیب کی تماشہ گاہ میں، بہادر شاہ ظفر پر سیاسی لحاظ سے جو کچھ گذرا اس کی اپنی ایک الگ داستان ہے ادبی لحاظ سے بھی ان کے ساتھ انصاف نہ ہو سکا۔ اکثر تنقید نگاروں نے ان کو شاعر ہی تسلیم نہیں کیا ان کی شاعری کو ان کے اساتذہ کی مرہون منت قرار دیا۔ جبکہ حقیقت یہ کہ بہادر شاہ ظفر کی شاعری کا ایک الگ ہی رنگ ڈھنگ اور انداز ہے۔ عباس رضا نیر نے اپنے تنقیدی مطالعہ میں ناقدین فن کے اس خیال کی شدت سے مخالفت کی ہے۔ اور مثالوں سے یہ بات واضح کرنے کی کوشش کی ہے کہ شاعری میں بہادر شاہ ظفر کا ایک مخصوص رنگ ہے جس میں ان کا کوئی دوسرا شریک نہیں ہے۔ اپنے اس مضمون میں وہ ایک جگہ بہادر شاہ ظفر کی تین غزلوں پر تبصرے و تنقید کے بعد رقمطراز ہیں:

”ہم نے بہادر شاہ ظفر کی زندگی کے پس منظر میں ان کی تین نمائندہ غزلوں کے محاکے کی کوشش کی اور تینوں غزلوں کے مسلسل شعروں کو تعبیر و تفہیم کے اس سلسلے میں شامل کیا جب کہ غزل کا ہر شعر ایک

اکائی ہوتا ہے اور یہ بھی ضروری نہیں کہ غزل کا ہر شعر شاعر کی زندگی کا تناظر بیان کرے لیکن یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ بہادر شاہ ظفر کی شاعری کے مطالعے کا تقاضہ بہر حال ذرا مختلف ہے۔ بہادر شاہ کی یہ غزلیں صرف اس لئے اہم نہیں کہ یہ اپنے شاعر کی زندگی کا پس منظر بیان کرتی ہیں بلکہ ان غزلوں کو سامنے رکھ کر اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ بہادر شاہ ظفر اپنے نفس مضمون کو اظہار کا پیرایہ عطا کرنے میں کہاں تک کامیاب ہیں اور یہ کہ بہ اعتبار مجموعی انہیں غزل کے فن پر کس قدر قدرت حاصل ہے۔ بہادر شاہ ظفر کے معاصر شعراء کو سامنے رکھ کر ظفر کی شاعری کا مطالعہ کرنا شاعر کے ساتھ بھی زیادتی ہے اور تنقید کے ساتھ بھی۔ ظفر کے ہم عصر شعراء نے اپنے خیالات اور مضامین کی ترسیل کے لیے اپنے عہد کے اجتماعی لاشعور کا سہارا لیا ہے لیکن بہادر شاہ ظفر نے اپنے تجربات و محسوسات کو بیان کرنے کے لیے سارے استعارے اپنی نجی زندگی سے تراشے ہیں چنانچہ کہا جاسکتا ہے کہ بہادر شاہ ظفر کی شاعری نہ کہیں سے درآمد ہے نہ کہیں سے استفادہ بلکہ بہادر شاہ ظفر کی شاعری اور بچل شاعری ہے۔“

(تنقیدی بحثیں: عباس رضا نیر۔ ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤ

س، دہلی۔ سن اشاعت ۲۰۱۶ء، ص ۲۳)

اس اقتباس سے جو چند چیزیں ہمارے سامنے کھل کر آتی ہیں ان میں سے پہلی یہ کہ ان کی شاعری خود ان کی ہی حیات و کائنات سے مخصوص ہے یا ان کی زندگی کا پس منظر بیان کرتی ہیں اسی طرح عباس رضا نیر اس بات پر بھی زور ڈالتے ہیں کہ بہادر شاہ ظفر اپنے عہد کے شعراء کے برعکس اپنے خیالات کی تبلیغ و ترسیل کے لیے خود اپنی ہی زندگی سے استعارات و علامت تراشتے ہیں۔ اس حقیقت سے عباس رضا نیر یہ بات ثابت کرنا چاہتے ہیں کہ ان کی شاعری کہیں اور سے مستعار نہیں ہے بلکہ اردو شاعری کو یہ ان کی اور بچل دین ہے۔

فراق گورکھپوری اردو کے ایک ایسے شاعر ہیں جن کی شخصیت جہاں شروع سے ہی مختلف فیہ، متنازع رہی وہیں ان کی شاعری کے بارے میں بھی متضاد و متناقض دعوے کئے گئے۔ شمس الرحمان فاروقی کو تو انہیں شاعر ماننے ہی سے گریز رہا مگر وقت و حالات نے ان کی شاعری کو اس مرتبے پر پہنچا دیا کہ آج ہم یہ کہنے میں کوئی باک محسوس نہیں کرتے کہ ان کی شاعری پہلے سے بھی زیادہ زندہ و تابندہ ہے۔ ڈاکٹر عباس رضا نیر کا ایک مشہور مضمون بہ عنوان ’اپنی زمین اور اپنی تہذیب کا شاعر فراق‘ ہے۔ اس مضمون میں وہ ایک جگہ رقمطراز ہیں:

”فراق نے جہاں اپنے ٹوٹے بکھرتے خوابوں کی کرچیاں سمیٹی ہیں وہیں نئی تعمیر کے خواب بھی دیکھے ہیں اور ثابت کیا کہ اگر دل میں زندگی کو سکون پہنچانے کا سچا جذبہ موجود ہو تو غم ہی مستقبل کی مسرتوں کا اشاریہ بن جاتا ہے، گویا غم کا دامن بھی امیدوں سے خالی نہیں ہوتا بلکہ غم کے پاس امیدوں کا وہ سرمایہ ہوتا ہے جس سے زندگی لہلہا سکتی ہے۔“

ہنوز وقت کے کانوں میں چھم چھماہٹ ہے
وہ چاپ تیرے قدم کی سنی سنائی ہوئی

ہنوز سینہ ماضی میں جگمگاہٹ ہے
دکتے روپ کی دیپاولی جلائی ہوئی

فراق درد کی وادیوں سے اس طرح گزرتے ہیں کہ ان کا غم ہی ان کا مرہم ہو جاتا ہے دکھ درد امید و ناامیدی، کامیابی و نا کامیابی غرض کہ مختلف احساس تحلیل ہو کر ایک وجدانی کیفیت اختیار کر لیتے ہیں:

تمام حسنگی و ماندگی ہے عالم ہو
تھکے تھکے سے یہ تارے تھکی تھکی سی یہ رات

پھر دل پہ ہے نگاہ کسی کی رکی ہوئی
کچھ جیسے کوئی یاد دلاتا ہو آج پھر

ہری بھری بھی ہو سکی دلوں کی سرزمین کہیں
پڑی تری نگاہ بھی کبھی کبھی کہیں کہیں

ان اشعار میں ذرا فراق کے لفظوں کے برتنے کا سلیقہ تو دیکھئے:

”ہر لفظ میں کس قدر غنائیت اور موسیقیت ہے۔ کیسی جھنکار

اور سر یلا پن ہے۔ سوز و گداز کی وہ کیفیت ہے کہ محسوس ہوتا ہے جیسے
زندگی گنگنا رہی ہو“

(تنقیدی بحثیں: عباس رضا نیر۔ ایجوکیشنل پبلشنگ

ہاؤس، دہلی۔ سن اشاعت ۲۰۱۶ء ص ۵۰)

یہی کچھ کہنا ہے ڈاکٹر جمیل جالبی کا میر کی شاعری میں پائے جانے والے حزن و یاس کے بارے میں، ظاہر ہے کہ خود فراق بھی شاعری کے معاملے میں میر کے بہت قریب رہے یہی نہیں بلکہ انہوں نے میر کی زمینوں میں اپنی کئی غزلیں بھی کہی ہیں۔ جمیل جالبی کا ایک اقتباس ملاحظہ ہو:

”سچا حزن (Pathos) اس وقت پیدا ہوتا ہے جب غم کا

اثر تزکیاتی ہو۔ ارسطو سے لے کر اب تک مغرب کی شاعری کا معیار یہ رہا ہے کہ اسے امید افزا اور رجائی ہونا چاہیے لیکن اگر دیکھا جائے تو غم بھی قنوطیت سے نکالنے اور علو ویت تک پہنچانے کا ایک موثر ذریعہ ہے۔ میر اپنے غم کے اظہار سے اپنے قاری کو پستی کے عالم سے اٹھا کر بلندی کی طرف لے جاتے ہیں، میر ہمیں رلاتے نہیں ہیں بلکہ غم کو

اس طرح بیان کرتے ہیں کہ ہم غم کے حسن اور حسن بیان سے خود غم کو اس طرح بھول جاتے ہیں کہ جیسے کسی بدنما چیز کی خوبصورتی دیکھ کر ہم اس کی بدنمائی کو بھول جاتے ہیں، میر نے غم کو اپنے فن میں سمو کر ہمارے لئے تسکین بخش بنا دیا ہے اور جب ہم ان کے شعر پڑھتے ہیں تو ایک قسم کی علوویت محسوس کرتے ہیں..... وہ زندگی سے ہمارا تعلق قطع نہیں کرتا بلکہ لطافت سے ہم کنار کر کے ہمیں احساس علوویت دیتا ہے اس لئے یہ ایک ایسا الم ہے جس میں نشاط کا مزہ ہے۔“

(تاریخ ادب اردو (جلد دوم) ڈاکٹر جمیل جالبی۔

ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس۔ سن اشاعت ۲۰۱۳ء، ص ۲۴۹)

اسی کے ساتھ عباس رضا نیر فراق کی شعری لفظیات اور ان میں پائے جانے

والی غنائیت اور موسیقیت کا بھی ذکر کرتے ہیں۔

جیسا کہ ہم سبھی جانتے ہیں کہ ن م راشد اردو نظم خصوصاً نظم معری کے اعلیٰ پائے کے شاعر ہیں انہوں نے اردو دنیا کو شاعری کے کئی مجموعے دیے ہیں۔ ان کی شاعری میں ایک بات جو قدر مشترک کی حیثیت رکھتی ہے وہ یہ کہ وہ ایشیائی عوام کی غلامی ان کی آپسی چپقلش اور بغض و عناد سے بہت زیادہ دکھی ہیں۔ نظموں میں ان کی خواہش یہ ہوتی ہے کہ ایشیائی اپنی صفوں میں اتحاد لا کر غلامی کے اس بندھن سے خود کو آزاد کر لیں۔ عباس رضا نیر نے ن م راشد پر اپنے ایک مضمون ”ہند، فارس اور ن م راشد۔ ایران میں اجنبی“ کا تجزیہ“ میں اس بات کی بخوبی وضاحت کی ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

”یہاں راشد اقتدار کے اس عفریت کی سازش کا انکشاف

بھی بڑے موثر لفظوں میں کرتے ہیں جس کی وجہ سے ایشیا عرصہ دراز

سے جنگ کی ہڈی بنا ہوا ہے۔ نظم کا یہ اقتباس دیکھئے:

محبت ناروا نہیں ہے

بس ایک زنجیر ہے

ایک ہی آہنی کمند عظیم

پھیلی ہوئی ہے

مشرق کے ایک کنارے سے دوسرے تک

مرے وطن سے ترے وطن تک

بس ایک ہی عنکبوت کا جال ہے کہ جس میں

ہم ایشیائی اسیر ہو کر ٹپ رہے ہیں

مغول کی صبح خوں فشاں سے

فرنگ کی جاں ستاں تک!

ٹپ رہے ہیں

بس ایک ہی درد لا دوا ہے

پھر وہ اس پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

”یہاں ایک شاعر حساس اور درد مند دل انسانی قدروں کے

اشتراک اور درد کے رشتوں کو محسوس بھی کرتا ہے اور اپنی اس نارسیدہ

خواہش کا اذعا بھی ہے کہ ہم ایک دوسرے سے کیوں لڑ رہے ہیں۔ ہم

اتنے دور کیوں ہو گئے ہیں ہمیں ہمارا درد بھی ایک دوسرے سے قریب

نہیں ہونے دے رہا ہے۔“

(تنقیدی بحثیں: عباس رضا نیر۔ ایجوکیشنل پبلشنگ

ہاؤس، دہلی۔ سن اشاعت ۲۰۱۶ء، ص ۷۰)

ہر امر کے کچھ نہ کچھ تقاضے ہوتے ہیں جس میں اس چیز کا ملحوظ رکھا جانا ضروری

ہے اسی طرح ادب و شاعری کے بھی کچھ تقاضے ہیں جس کا اس میں ملحوظ رکھا جانا ضروری ہوتا ہے۔ شعر و ادب کے لیے یہ بات بہت اہم ہے کہ اس کی زبان ادبی ہو۔ خصوصاً اس زبان میں پائے جانے والے محاورات، ضرب الامثال خصوصاً صنعتوں کا مناسب صرفہ، اگر اس کو ملحوظ نہیں رکھا گیا تو ادب سب کچھ ہو سکتا ہے مگر ادب نہیں ہو سکتا۔ مجروح کے ہم عصروں میں جن لوگوں نے ان قیود کی پابندی کی ان کی شاعری آج بھی زندہ و تابندہ ہے۔ جیسے فراق، فیض، مجاز، جذبی و جاں نثار اختر وغیرہ۔

ڈاکٹر عباس رضا نیر کا ایک مضمون مجروح پر 'مجروح کی شعری جمالیات' کے عنوان سے ہے اس میں انہوں نے اپنے مخصوص انداز میں اس حقیقت کی طرف اشارہ کیا ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

”مجروح نے ترقی پسند افکار و نظریات کو پیش کرنے کے لیے کچھ مخصوص الفاظ کا استعمال کیا ہے ان میں سے بعض الفاظ تو نہایت قدیم ہیں۔ شمع، چراغ، مشعل تو اردو فارسی غزل کے بھی نہایت روایتی الفاظ ہیں لیکن مجروح نے اپنی غزل میں ان الفاظ کو شمع و پروانہ والے تلازمات کے علی الرغم ترقی پسند اقدار سے لبریز بالکل نئے استعارے اور علامت کے طور پر برتا ہے۔ ذیل کے اشعار میں دیکھئے، مجروح کے یہاں وہی پرانے الفاظ کس قدر نئے معنوں کے ساتھ جگمگا رہے ہیں:

جاؤ تم اپنے بام کی خاطر ساری لوئیں شمعوں کی کتر لو
زخم کے مہر و ماہ سلاست، جشن چراغاں تم سے زیادہ

ستون دار پر رکھتے چلو سروں کے چراغ
جہاں تلک یہ ستم کی سیاہ رات چلے

شب انتظار کی کشمکش میں نہ پوچھ کیسے سحر ہوئی
کبھی ایک چراغ جلا دیا کبھی ایک چراغ بجھا دیا

مجھے سہل ہو گئیں منزلیں تو ہوا کے رخ بھی بدل گئے
ترا ہاتھ ہاتھ میں آ گیا تو چراغ راہ میں جل گئے

جگائیں ہمسفروں کو اٹھائیں مشعل شوق
نہ جانے کب ہو سحر کون انتظار کرے

پھر ان اشعار پر تبصرہ کرتے ہوئے وہ لکھتے ہیں:

”یہاں شمع، چراغ، اور مشعل جیسے الفاظ روایتی ہوتے ہوئے بھی روایتی نہیں ہیں۔ لفظوں کے التزامات و انسلالات نے معنی کے فریم کو یکسر بدل کر رکھ دیا ہے اور غزل کے قدیم لفظوں کو بھی مجروح نے عہد کی دھڑکن بنا دیا۔“

(تنقیدی بحثیں: عباس رضا نیر۔ ایجوکیشنل پبلشنگ

ہاؤس، دہلی۔ سن اشاعت ۲۰۱۶ء، ص ۹۵)

ان چند مثالوں سے ہمارے سامنے ڈاکٹر عباس رضا نیر کی تنقید نگاری کے بارے میں یہ بات واضح ہو کر آ جاتی ہے کہ پہلے وہ کوئی دعویٰ کرتے ہیں پھر اس کے لیے متعدد مثالیں پیش کرتے ہیں۔ پھر وہ تحلیل و تجزیہ بھی کرتے ہیں۔ اس کے فنی حسن و قبح پر بھی روشنی ڈالتے ہیں۔ اپنی آراء کو مشرقی و مغربی ناقدین فن کی آراء سے آراستہ کرتے ہیں۔ پھر جا کر کوئی نظریہ قائم کرتے ہیں۔ اور یہی ان کی تنقید نگاری کا اختصاص ہے۔

☆☆☆

عباس رضا نیر کا تحقیقی و تنقیدی کارنامہ

ڈاکٹر محمد ارشد ابن اسلم

عباس رضا نیر اردو شعر و ادب میں وہ ابھرتا ہوا نام نامی ہے جس نے اپنی تخلیقی صلاحیتوں کا اظہار کرتے ہوئے متعدد اصناف ادب میں طبع آزمائی کی ہے۔ وہ نہ صرف بہترین شاعر و ادیب، محقق و ناقد، مترجم و مبصر ہیں بلکہ باصلاحیت اور پسندیدہ ناظم کی حیثیت سے بھی کسی تعارف کے محتاج نہیں، انہوں نے نظامت کے فن کو ایک نیا اور انوکھا انداز عطا کیا ہے۔ آپ کی کئی کتب منظر عام پر آ کر شہرت و مقبولیت کا شرف حاصل کر چکی ہیں۔ نیز وہ ایک کامیاب استاد کی حیثیت سے طلباء میں بے حد مقبول اور ہر دلعزیز ہیں۔ انہوں نے درس و تدریس کا آغاز اعلیٰ تعلیم سے کیا یعنی ان کا پہلا تقرر مہاراجہ ہریش چندپنپ۔ جی کالج مراد آباد میں ۱۳ جولائی ۱۹۹۹ء کو بطور اسٹنٹ پروفیسر وجود میں آیا۔ اور اب ماشاء اللہ لکھنؤ یونیورسٹی کے شعبہ اردو جو کہ دنیا بھر میں مشہور شعبہ ہے میں ایسوسی ایٹ پروفیسر اور صدر شعبہ ہیں اور آپ کی نگرانی میں یہاں درس و تدریس اور تحقیق و تلاش کے ساتھ ایک ادبی فضا قائم ہوئی ہے اور جس طرح سے یہ شعبہ ہمیشہ اردو کی مایہ ناز ادبی شخصیات کی خدمات سے مستفید رہا ہے۔ آج بھی عباس رضا نیر جیسے مشہور و معروف شاعر و ادیب، محقق و ناقد اور لائق و فائق استاد اس شعبہ کو میسر ہیں جنہوں نے اپنی اعلیٰ صلاحیتوں سے شعبہ کی روایت کا تحفظ کیا ہے۔ ان کی نگرانی میں کئی اہم مقالے تحریر کیے گئے ہیں جن پر یونیورسٹی نے پی ایچ ڈی کی ڈگریاں تفویض کی ہیں ہنوز یہ سلسلہ جاری و ساری ہے۔

اگر ہم عباس رضا نیر کی تصنیفات و تالیفات پر غور کریں تو معلوم ہوتا ہے کہ ”خواجہ احمد عباس“، ”تنقیدی بحثیں“ اور ”رثائی تنقیدیں“ جیسی گرانقدر کتب سے قبل جو کہ بہترین تحقیقی و تنقیدی کارنامے ہیں، ”مجروح سلطان پوری کچھ یادیں کچھ باتیں“ اور ”ادبی میزان“ منظر عام پر آ کر شہرت و پذیرائی حاصل کر چکی ہیں۔ نیز چار سو صفحات پر مشتمل ”کانگریس لائبریری کے مخطوطات“ اور آٹھ سو صفحات کی ضخیم کتاب بعنوان ”خطوط بنام ضمیر“ پاکستان سے شائع ہوئی ہیں۔

کتابوں کی شہرت و مقبولیت نہ صرف ہندوپاک کے ادبی حلقوں میں بلکہ ساری اردو دنیا میں ہو رہی ہے۔ نیز کئی کتب زیر طبع ہیں، علاوہ ازیں نیر صاحب نے ایک کامیاب ترجمہ نگار کی حیثیت سے اپنی صلاحیتوں اور ادبی کاوشوں کا اعتراف کراتے ہوئے آچاریہ رام چندر شکل کے ہندی مونو گراف ”آچاریہ رام چندر شکل“ کنڈویکا کا پڑیا کے ضخیم گجراتی ناول ”ست پنکلا آکاش ماں“ ”سات قدم آسمان میں“ اتر پردیش کے گورنر شری رام نائیک کی مراٹھی یادیں ”چریوتی۔ چریوتی“ (چلتے رہو چلتے رہو) اور ”ویب سائٹس آدھار کارڈ“ پیش کر کے یہ ثابت کیا ہے کہ وہ اردو کے ساتھ ساتھ دیگر کئی زبانوں پر بھی مہارت رکھتے ہیں اور یہی وجہ ہے کہ انہوں نے اپنی صلاحیتوں کی بنا پر امریکہ، لندن، جرمنی، فرانس، اٹلی، ایران، عراق، شام، UAE، سعودی، جارڈن، مسقط، پاکستان اور بنگلہ دیش وغیرہ کے ادبی سفر کیے اور وہاں کی ادبی دنیا میں اپنی شناخت قائم کرنے میں کامیاب رہے۔

عباس رضا نیر کی صلاحیتوں اور ادبی خدمات کا اعتراف کرتے ہوئے متعدد ادبی و سماجی تنظیموں اور سرکاری اداروں نے انہیں انعامات و اعزازات سے سرفراز کیا جن میں لیش بھارتی سمان، بھاشا سمان، اتر پردیش اردو اکادمی ایوارڈ، عرفان صدیقی ایوارڈ لکھنؤ، ارشاد معصومی ایوارڈ پٹنہ، علامہ اقبال انٹرنیشنل ایوارڈ جرمنی، المرتضیٰ ایوارڈ امریکہ،

انیس ایوارڈ لندن اور عالمی رٹائی ادب ایوارڈ، حسن آرٹسٹ دہلی وغیرہ قابل ذکر ہیں۔

”خواجہ احمد عباس“ پروفیسر عباس رضا نیر کی کئی سال کی تحقیق و تلاش، محنت و عرق ریزی اور تنقیدی صلاحیتوں کا نتیجہ ہے، جس کو انہوں نے بہت سلیقے سے پیش کرتے ہوئے خواجہ احمد عباس کی حیات و شخصیت، افسانہ نگاری، ناول نگاری، ڈراما نگاری، صحافت، خودنوشت اور سفرنامہ نگاری پر قلم اٹھا کر تحقیق و جستجو کی نئی راہیں ہموار کی ہیں اور خواجہ احمد عباس شناسی کے سلسلے میں نئی بصیرت کی آبیاری کی ہے۔

حیات و شخصیت کے تحت مصنف نے دلائل سے ثابت کیا ہے کہ خواجہ احمد عباس کے اجداد اصلاً مدینے کے رہنے والے تھے اور ان کا تعلق مدینہ کے مشہور صحابی حضرت ابویوب انصاری کے خاندان سے تھا لیکن بعد میں ان لوگوں نے سیاسی وجوہ کی بنا پر مدینے سے ہجرت کر لی۔ فاضل محقق عباس رضا نیر نے اپنی تحقیق سے خواجہ احمد عباس کے والد اور والدہ دونوں کے خاندان پر بھرپور تحقیق کرتے ہوئے ان کے حسب و نسب اور خاندان کا تفصیلی و تجزیاتی جائزہ پیش کیا ہے اور یہ ثابت کیا ہے کہ خواجہ الطاف حسین حالی کے بیٹے خواجہ سجاد حسین، خواجہ احمد عباس کے نانا تھے جن کی شخصیت کا اثر خواجہ احمد عباس پر براہ راست پڑا، نیر خواجہ احمد عباس کی تعلیم و تربیت، ادبی مشغلوں، بمبئی کی شہری زندگی، فلمی دنیا کی مصروفیات اور متعدد بار یک سے بار یک گوشوں پر روشنی ڈالتے ہوئے سیر حاصل گفتگو کی ہے۔

افسانہ نگاری کا تحقیقی و تنقیدی جائزہ لیتے ہوئے یہ ثابت کیا ہے کہ خواجہ احمد عباس کا پہلا افسانہ جامعہ نئی دہلی میں جون ۱۹۳۶ء کے شمارے میں شائع ہوا، علاوہ ازیں ان کے سبھی افسانوی مجموعوں کو تلاش کر کے ان میں شامل اہم افسانوں کا تنقیدی و تجزیاتی جائزہ پیش کیا ہے اور ان افسانوں میں پوشیدہ فنی محاسن، سماجی قدروں اور تہذیبی و معاشرتی عناصر وغیرہ کی نشاندہی کرتے ہوئے تفہیم و ترسیل کے نئے نئے پہلوؤں پر روشنی ڈالی ہے۔

ناول نگاری کے حوالہ سے خواجہ احمد عباس کے ناول ”انقلاب“ اور ”بمبئی رات کی بانہوں میں“، ”سات ہندوستانی“، ”چار دل چار راہیں“، اندھیرا اجالا“، ”دو بوند پانی“ اور ”تین پیپے“، ”ایک پرانا ٹب“ اور ”دنیا بھر کا کچرا“ جیسے ناولوں کا جائزہ لیا ہے اور اپنی تحقیق سے یہ بھی ثابت کیا ہے کہ کس ناول کو فلم کی شکل میں پیش کیا گیا ہے۔ نیز محقق نے اس بات کی بھی وضاحت کی ہے کہ خواجہ احمد عباس ایک حقیقی ترقی پسند مصنف ہیں اور انہوں نے مظلوموں کی دردناک زندگی کی کامیاب مصوری کی ہے۔

ڈرامہ نگاری کے حوالے سے گفتگو کرتے ہوئے عباس رضا نیر نے اپنی تحقیق سے دلائل کے ساتھ ثابت کیا ہے کہ خواجہ احمد عباس نے زیادہ تر یک بابی ڈرامے تحریر کئے ہیں اور اپنی فنکارانہ صلاحیتوں کی بنیاد پر انہیں اس میدان میں خاطر خواہ کامیابی حاصل ہوئی ہے۔ اس باب میں نیر صاحب نے خواجہ احمد عباس کی فنکارانہ صلاحیتوں کا جائزہ لیتے ہوئے ان کے ڈراموں کا تفصیلی بیان کیا ہے۔ خواجہ احمد عباس کی صحافتی خدمات کا جائزہ لیتے ہوئے تحقیق کے ذریعہ یہ ثابت کیا ہے کہ انہوں نے اپنی صحافت سے ظلم و جبر اور استحصال کے خلاف آواز بلند کی اور اسے ایک مشن کے طور پر قبول کیا اور طالب علمی کے زمانے میں ”علی گڑھ میل“ کے نام سے ایک اخبار نکالا جو اس میدان میں ان کا پہلا تجربہ تھا۔ بعد ازاں ان کی صحافتی خدمات کا جائزہ ترتیب سے لیتے ہوئے صحافت میں ان کے مقام و مرتبہ کا تعین کرنے کی کامیاب کوشش کی ہے۔

خواجہ احمد عباس کی خودنوشت نگاری کا جائزہ لینے سے قبل مصنف نے ادبی خودنوشت کی تعریف اور روایت پر روشنی ڈالی ہے بعد ازاں خواجہ احمد عباس کی خودنوشت کا تحقیقی جائزہ لیا ہے اور آٹھ سو صفحات پر مشتمل اس خودنوشت کے ہر باب کا پس منظر بیان کرتے ہوئے اس کا تجزیاتی مطالعہ نہایت خوش اسلوبی سے کیا ہے اور ان کی فنکارانہ صلاحیتوں پر اپنی تنقیدی رائے دلائل کے ساتھ دی ہے۔

اس تحقیقی کتاب کا آخری باب خواجہ احمد عباس کے سفرنامہ سے متعلق ہے جس میں عباس رضائیر نے ان کے ترقی پسند نظریات کی روشنی میں اس کا تحقیقی و تنقیدی مطالعہ کیا ہے۔ ”مسافر کی ڈائری“ نام سے یہ سفرنامہ منظر عام پر آیا جس میں خواجہ احمد عباس کے مشاہدات و تجربات کا نہایت دلچسپ انداز میں بیان ملتا ہے۔ نیر صاحب نے عمیق نگاہ سے اس کو پڑھا اور سمجھا ہے اور دلچسپ انداز میں سمجھانے کی کوشش کرتے ہوئے واضح کیا ہے کہ خواجہ صاحب کو اس سفرنامہ کی تحریک کیونکر ہوئی اور کس طرح ان کا نظریہ تحریر میں زیریں لہر کی طرح چلتا ہے اور اس سفرنامے میں جب بھی موقع ملتا ہے اپنی پسند و ناپسند کے اظہار سے گریز نہیں کرتے۔ پروفیسر نیر نے اس سفرنامے کا بہت تفصیل سے جائزہ لیتے ہوئے اپنی دور رس نگاہ گوہر شناسی اور تحقیقی و تنقیدی صلاحیتوں کا بھرپور اظہار کیا ہے انہوں نے اپنے خوبصورت و دلکش اسلوب میں یہ واضح کیا ہے کہ خواجہ صاحب کے ذہن میں کولمبو کے بارے میں ایک نہایت رومانی تصور تھا کہ کولمبوراون کا اساطیری شہر اور مشرق کا موتی ہے لیکن ساحل کے کنارے دور تک ٹین کے بھدے شیڈز دیکھ کر ان کو دھکا لگتا ہے۔ اسی طرح انہوں نے سفرنامہ کے اگلے صفحات کے تجزیاتی مطالعہ سے واضح کیا ہے کہ خواجہ احمد عباس نے سنگاپور کے جغرافیائی حالات اور موسم کے ذکر کے ساتھ وہاں برطانوی جنگی جہازوں کی موجودگی کے اسباب پر روشنی ڈالی ہے۔ اسی طرح ان کے سفر سنگاپور، جاپان، امریکہ اور پیرس وغیرہ پر بھی بھرپور اور سیر حاصل گفتگو کی ہے۔ دلائل سے اپنی بات کو واضح کرتے ہوئے کہا ہے کہ خواجہ احمد عباس نہایت ذہین اور گہرا مشاہدہ رکھنے والے ہم سفر ہیں اور قاری کو حسین و خوبصورت مناظر کی بھی سیر کراتے ہیں اور بد صورت مناظر کو بھی نظر انداز نہیں کرتے۔ وہ چین، جاپان، امریکہ، فرانس، ترکی اور انگلستان کی سیاسی، اقتصادی اور سماجی صورت حال کا تجزیہ کرتے جاتے ہیں وہ دنیا کے مشہور و معروف ادیبوں اور دانشور سے بھی ملاقات کراتے ہیں۔ آخر میں نیر صاحب نے

خواجہ صاحب کی نثر نگاری و اسلوب نگارش کا تنقیدی و تجزیاتی جائزہ لیا ہے۔ نیز اس میں پوشیدہ تہذیبی و ثقافتی عناصر کی نشاندہی اپنے دلکش انداز میں کی ہے۔

کتاب کے آخر میں ماحصل کے طور پر مصنف نے اس کتاب کی تلخیص پیش کی ہے اور بہترین محقق و ناقد کی طرح اس بات کا اعتراف کیا ہے کہ کوئی بھی تحقیق حرف آخر نہیں ہوتی لیکن ہر تحریر میں نئے نکات اور نئے پہلوؤں کو اجاگر کرنے کی کوشش ضرور کی جاتی ہے۔ لہذا اس کتاب میں بھی خواجہ احمد عباس کے فکرو فن کی تعبیر و تفہیم کی کوشش کی گئی ہے۔

کتاب کے تفصیلی مطالعے کی روشنی میں یہ کہا جاسکتا ہے کہ یہ اپنے موضوع اور مواد کے اعتبار سے بھرپور ہے جس میں خواجہ احمد عباس کے فن اور شخصیت پر سیر حاصل گفتگو کی گئی ہے۔ پیش کش کا انداز نہایت دلکش ہے۔ چونکہ عباس رضائیر بہترین شاعر ہیں اور جب شاعر نثر لکھتا ہے تو فصاحت و بلاغت اور الفاظ کے انتخاب کا خاص خیال رکھتا ہے۔

نیر صاحب کی نثر نگاری کا بھی اپنا منفرد انداز ہے وہ تحقیق کی روشنی میں نہایت غیر جانبدارانہ انداز میں اپنی بات اور نظریہ کو پیش کرتے ہیں۔

یہ کتاب افسانوی ادب بالخصوص خواجہ احمد عباس شناسی میں اہم اضافے کی حیثیت رکھتی ہے جس سے اس میدان میں تحقیقی کام کرنے والے بھرپور استفادہ کریں گے۔

خواجہ احمد عباس: عباس رضائے

متھیو ڈالٹن

”خواجہ احمد عباس“ پڑھنے سے پہلے مجھے یقین تھا کہ میں سرسری طور سے پڑھوں گا تا کہ کچھ نہ کچھ معلوم ہو جائے کہ اس کتاب میں کیا ہے۔ مگر جب شروع کیا تو کتاب اتنی دلچسپ ثابت ہوئی کہ آخری صفحے تک ایک ایک لفظ پڑھنا پڑا۔

اس عمدہ اور علم میں اضافہ بخشنے والی کتاب کے بارے میں اپنے خیالات پیش کرنے سے پہلے چند معمولی تنقیدی باتیں قابل ذکر ہیں۔ اردو میری مادری زبان نہیں ہے، چنانچہ جب کسی بھی کتاب میں نہ زبر ہے نہ زیر اور نہ ہی پیش، تو پڑھنے میں کچھ دقت ہوتی ہے۔ شاید روایت یہی ہوگئی ہے، اور یہ سچ ہے کہ بہت زیادہ زیر زبر فضول ہیں، تو بھی میری معمولی رائے میں ان کا پوری طرح غائب ہونا اردو کے حق میں نہیں ہے۔ اس پوری کتاب میں مجھے (diacriticals) صرف وہاں نظر آئے جہاں لفظ ”صورتِ حال“ آیا۔ اس کے علاوہ، چند مختصر اقتباس انگریزی میں ہیں اور ان میں جو غلطیاں نظر آئیں کسی کتاب میں نہیں ہونی چاہیے۔ مثلاً ص ۲۴۵ پر جو اقتباس ہے، اس میں نہ صرف چند مس اسپیئلنگز ہیں، بلکہ اقتباس ایک اقتباس سے ہی ہے جو کہ اس معیار کی کتاب کے مطابق نہیں ہے۔

کتاب پڑھتے وقت، ایک معمولی تاثر یہ تھا کہ خواجہ صاحب کو کچھ حد سے زیادہ معصوم اور کامل دکھایا گیا ہے۔ بہتر ہوتا کہ ان کی بیٹی کا اثر و یو بھی شامل ہوتا تا کہ ان

کے ادب اور سیاست کے ساتھ ان کی ایک بہترین انسان کے طور پر بھی پہچان ہو جائے۔ اس کے متعلق نیر صاحب نے محض یہ درج کیا کہ خواجہ صاحب نے باپ کی حیثیت پوری کی جب اپنی بیٹی کو پڑھنے کے لیے دور بھیجا اور بعد میں اس کی شادی کی اخراجات برداشت کیے۔ میرے حساب سے باپ کی حیثیت اس مختصر انداز سے کہیں زیادہ اہمیت کی حامل ہے!

اب منفی باتوں کو چھوڑ کر کتاب کے اصل مواد کی طرف متوجہ ہوتا ہوں۔ جب کسی کی زندگی کے بارے میں کوئی مصنف لکھنے لگتا ہے تو چند ایک مقصد ممکن ہیں۔ کبھی کبھی مصنف اپنی تعلیم دوسروں کے سامنے پیش کرنا چاہتا ہے۔ یا تو وہ اپنی شہرت و مقبولیت بڑھانے کی کوشش میں ہو سکتا ہے۔ یعنی جو شخصیت کتاب کا موضوع ہے، اس کی شہرت کو مصنف اپنانا چاہتا ہے۔ یا تو وہ اس مرکزی شخصیت سے اتنا متاثر ہوا کہ وہ چاہتا ہے کہ دوسرے لوگ بھی متاثر ہو جائیں۔ اس میں سیاسی، معاشی، ادبی یا مذہبی تاثرات کی کوشش ہو سکتی ہے اور اکثر کتابیں اس طرح کے مختلف تاثرات آگے دینے کی بنا پر لکھی جاتی ہیں۔ بلاشبہ یہ کاوش اپنی اپنی جگہ معقول ہوں گی، مگر اس کتاب میں مجھے لگتا ہے کہ نیر صاحب کی کوشش کچھ اور ہے۔

میرے خیال میں نیر صاحب کی کوشش یہ ہے کہ خواجہ احمد عباس کی زندگی اور ادبی کامیابی کی گیرائی اور گہرائی کے بارے میں قارئین کو متاثر کریں۔ اور اس کوشش میں میں ان کی کامیابی کو سراہنا چاہتا ہوں۔ خواہ پڑھنے والے نے کبھی خواجہ احمد عباس کا نام تک نہیں سنا ہو، اگر وہ اس کتاب کو پڑھے، تو اس کو یقین ہوگا کہ بھارت کے بڑے بڑے ادیبوں میں اس شخص کا نام ضرور شامل ہے۔ اس کے علاوہ میں یہ کہوں گا کہ اس کتاب کے پڑھنے والے، یقیناً خواجہ احمد عباس کے وسیع ادب میں سے کچھ نہ کچھ خود ضرور پڑھنا چاہیں گے، جو کہ ایسی شخصیت کے سوانح نگار کی از حد کامیابی کا ثبوت ہے۔

ہمارے تجسس یا ضرورت کے مطابق ہے۔

یہ کتاب ایک بہت بڑی کامیابی ہے اور امید کرتا ہوں کہ زیادہ سے زیادہ لوگ پڑھ کر اردو ادب اور بھارتی تاریخ کی ایک نمایاں شخصیت کے بارے میں نہ صرف سیکھیں گے، بلکہ اُس کا ادب پڑھنے کے شوقین بن جائیں گے۔



بلاشبہ اس کتاب میں نیر صاحب کا علم ممتاز ہو گیا ہے کیونکہ وہ نہایت آزادی سے خواجہ احمد عباس کے افسانے، ناولیں، ڈرامے، فلمیں اور صحافت کے بارے میں گفتگو کرتے ہیں، مگر وہ بڑی کامیابی سے اپنے آپ کو سامنے لائے بغیر یہ سب کچھ کرتے ہیں اور پڑھنے والے کو یہی تاثر دیتے ہیں کہ خواجہ احمد عباس ان چند لوگوں میں ہیں جن کی قلم بند کی گئی باتیں پڑھنے کے لائق ہیں۔

اس کے ساتھ ساتھ آج کل کے حالات میں، جہاں اقلیت اپنی زبان کے علاوہ اپنی حیثیت کو غیر محفوظ سمجھتی ہے، بلاشبہ نیر صاحب کی یہ بھی خواہش ہوگی کہ بھارتیوں کو یاد دلائیں کہ مجاہدین آزادی کے مشہور و معروف گروہ میں مسلم اقلیت اور خاص کر شیعہ اقلیت کا ایک نمائندہ موجود ہیں۔ اس کتاب میں قارئین بہت دفعہ دیکھتے ہیں کہ خواجہ احمد عباس گاندھی جی اور خاص کر پنڈت نہرو سے تعلق رکھتے تھے اور ان کے خیالات اور فلسفے کو مانتے تھے۔

خواجہ احمد عباس معاشرے کی اصلاح کے لیے لکھتے رہتے تھے۔ وہ چاہتے تھے کہ عدل اور انصاف ہو۔ ان چیزوں کی کمی نے اُن کو برٹش راج کے خلاف لکھنے پر مجبور کیا اور خود مختاری کے بعد بھی حکومت اور معاشرے کی زیادتیوں کو بے پردہ کرنے پر اکسایا۔ معلوم ہوتا ہے کہ اُن کی زندگی بھر کی انتھک کوششوں نے کافی حد تک یہ بھارت بنانے میں حصہ لیا جو ہمارے سامنے موجود ہے۔

اس کتاب کی ایک بہت مفید بات یہ ہے کہ خواجہ احمد عباس کے تمام نہیں لیکن بہت سارے افسانوں اور ناولوں وغیرہ کے مختصر تجزیے پیش کیے گئے ہیں۔ طالب علموں کے لیے یہ بہت کام کی بات ہے۔ اور اس سے پڑھنے والا سیکھ سکتا ہے کہ مجھے کونسی کتاب یا افسانہ پڑھنا چاہیے۔ نیر صاحب نے بہت محنت کر کے ہم جیسے لوگوں کے لیے یہ کام آسان کیا کہ خواجہ احمد عباس کے پورے ادب کا جائزہ لے کر وہ کتابیں ڈھونڈیں جو

خواجہ احمد عباس: عباس رضا نیر ایک تجزیہ

ڈاکٹر عبید الرحمن

خواجہ احمد عباس کا نام آتے ہی ہمارا ذہن فوراً اس مختلف النوع تصانیف کی اہم شخصیت کی طرف منتقل ہو جاتا ہے کہ جس نے اردو ادب میں بہت سی اصناف پر بیک وقت قلم اٹھایا۔ یہی نہیں کہ اس نے مختلف اصناف پر صرف قلم اٹھایا اور ان اصناف کو چھو کر چھوڑ دیا۔ بلکہ اس کی تحریر و تصنیف کی دسترس نے ان تمام اصناف کو بحسن و خوبی پایہ تکمیل تک انجام دیا اور یہی نہیں اس کی جادو نگاری کا کمال یہ رہا کہ اپنے قاری اور اپنے سامع کو اپنی گرفت میں لے لیتا ہے۔ خواجہ احمد عباس کا قاری ان کی کسی تحریر کو اٹھانے کے بعد ختم کئے بغیر نہیں رہتا۔ یہ احمد عباس کی تحریروں پر گرفت اس کے ساتھ کئے گئے انصاف کا ہی نتیجہ ہے کہ قاری اس کو ختم کئے بغیر اس سے رشتہ ختم نہیں کرنا چاہتا۔ بلکہ جب ایک صنف مکمل کر لیتا ہے تو دوسرے کے لیے تجسس پیدا ہو جاتا ہے۔ اور قاری احمد عباس کی شخصیت پر غور و خوض کرنے لگتا ہے۔ غرض کہ احمد عباس نے جس صنف پر قلم اٹھایا اس کے ساتھ انصاف سے کام لیا ہے۔ خواجہ احمد عباس نے مختلف اصناف جیسے افسانہ، ناول، ڈرامہ، صحافت، خودنوشت اور سفرنامہ وغیرہ پر لکھا اور خوب لکھا۔ ان کی تصانیف ایسی ہیں کہ ان کے ساتھ کما حقہ انصاف کر دیا۔

ڈاکٹر عباس رضا نیر صاحب نے خواجہ احمد عباس کی اہمیت و خصوصیت کو محسوس کرنے کے ساتھ جس ترتیب سے ان کی زندگی کو بچپن سے وفات تک اور پوری زندگی میں پیش آئے اہم واقعات کے ساتھ ساتھ ان کی علمی ادبی خدمات کو جتنی تفصیل سے پیش کیا ہے یہ ان کی گہرائی، گیرائی اور علمی بصیرت ہے کہ خواجہ احمد عباس جیسی ہمہ جہت شخصیت پر ان کی علمی ادبی خدمات کو اس کے تمام تر جزئیات کے ساتھ یکجا کر کے خواجہ احمد عباس کے نام سے ہی معنون کیا۔ ایک نظر کتاب خواجہ احمد عباس میں پیش عنوان پر بھی اس کی اہمیت و افادیت کے پیش نظر اہم معلوم ہوتی ہے۔

خواجہ احمد عباس کو افسانہ میں زیادہ دلچسپی تھی اور اس سے بھی زیادہ ڈرامہ سے۔ خواجہ صاحب کو علم وراثت میں ملتا تھا۔ بچپن میں انہوں نے اپنے گھر میں عورتوں میں بھی اردو ادب سے کافی دلچسپی دیکھی تھی۔ بچے ہونے کی وجہ سے وہ حلقے میں شریک رہتے۔ یہیں سے ان کے اندر اردو ادب کے لیے ایک دلچسپی پیدا ہو گئی تھی۔ اس سلسلے میں وہ خود لکھتے ہیں۔ ”ہمارے گھر کا ماحول ایسا تھا۔ جس میں کتابیں تھیں، رسالے تھے، ہمارے گھر کی عورتیں اکثر ایسے ناول منگاتی تھیں جو عورتوں کے لیے لکھے جاتے تھے۔ وہ عورتیں یہ ناول زور زور سے پڑھتی تھیں۔ جب میں چھوٹا تھا تو ان عورتوں کی زبانی ناول سنا کرتا تھا۔ جب میں آٹھ سال کا ہوا میں نے پہلی دفعہ خود ناول پڑھا۔ جس کا نام تھا۔ ”گودڑ کا لعل“ اس کے بعد ”فسانہ آزاد“ پڑھا۔ یعنی سات آٹھ برس کا تھا میں کہ جب رضائی اوڑھ کر ”فسانہ آزاد“ پڑھا کرتا تھا۔ کیونکہ ابا ہمارے اجازت نہیں دیتے تھے۔ زیادہ رات تک پڑھنے کی اور ایک رات رضائی کے اندر آگ لگ گئی لالٹین سے۔“

(خواجہ احمد عباس از عباس رضا نیر ص ۱۹-۲۰)

خواجہ احمد عباس میں اردو ادب کے مطالعے سے دلچسپی کا یہ پہلا قدم تھا جس سے لگن نے ان کی شخصیت میں نکھار پیدا کیا اور وہ ہمہ جہت شخصیت کے مالک بن گئے۔ خواجہ احمد عباس کو گھر کے ماحول اور تعلیم دوست احباب کی وجہ سے علی گڑھ میں تعلیم حاصل کرنے کا موقع ملا۔ علی گڑھ کے علمی ماحول اور ان کی ذاتی دلچسپی بھی ان کے چھپے ہوئے جوہر کو بروئے کار کرنے میں مدد و معاون رہی۔ اور وہ زمانہ طالب علمی میں علی گڑھ میں مختلف مقابلوں میں حصہ لیتے تھے اور علم اور ذہن کی چابکدستی سے ان میں نمایاں رہتے تھے۔

خواجہ احمد عباس کو دور طالب علمی سے ہی اخبار نویسی سے دلچسپی تھی۔ نتیجتاً انہوں نے زمانہ طالب علمی میں ایک اخبار جاری بھی کیا جس کا نام ”علی گڑھ میل“ رکھا تھا۔ یہ ان کی صحافت سے دلچسپی کا ابتدائی نمونہ تھی۔ جس نے ترقی اس وقت کی جب ۱۹۳۳ء میں وہ گریجویشن کرنے کے بعد اپنے والد کے پاس دہلی پہنچے اور باقاعدہ ”نیشنل کال“ میں نوکری کی۔ خواجہ احمد عباس خود اس سلسلے میں کہتے ہیں:

”انہیں ہر روز سائیکل سے سارے شہر کا چکر لگانا پڑتا تھا۔ روزانہ صبح و شام ہر تھانے اور ہاسٹل سے رپورٹ لینی پڑتی تھی اور شام سے آدھی رات تک ایڈیٹنگ کرنی پڑتی تھی جس میں ہر طرح کے کام شامل ہوتے تھے۔“

(خواجہ احمد عباس از عباس رضا نیرس ۲۵-۲۶)

یہ ان کی صحافت کے ابتدائی نمونے ہیں۔ اور ان کی صحافت کا پہلا قدم تھا جس نے ان کی ابتدائی کوشش کی بدولت انہیں ایک اعلیٰ درجہ کا صحافی بنانے میں پوری مدد کی اور ان کے ذوق نے جلا بخشی جس نے صحافت کے بلند مقام پر فائز کیا۔ اور انہیں ایک شناخت عطا کی۔ کیونکہ ان کو صحافت سے عشق تھا۔

مصنف نے خواجہ احمد عباس کی صحافیانہ دلچسپی اس سے متعلق عام پہلوؤں کو یکجا

کر کے پیش کرنے سے متعلق اپنے کام کے لیے ان کی وابستگی اور انصاف، تحقیقی نقطہ نظر سے بھی اہمیت کی حامل ہے۔

خواجہ احمد عباس کو افسانہ نگاری میں بھی خاصی دلچسپی تھی جس کی ابتدا ان کی پہلی کہانی ”بابیل“ ہے جو رسالہ جامعہ نئی دہلی کے جون ۱۹۳۶ء کے شمارے میں شائع ہوئی۔ ان کی یہ کہانی بہت مقبول ہوئی جس کا شمار اردو ہی نہیں بلکہ دنیا کی بہترین کہانیوں میں کیا گیا۔ اس کہانی کا انگریزی ترجمہ بھی لندن سے Sparrow کے نام سے اشاعت پذیر ہوا۔ خواجہ صاحب کے بہت سے افسانے بہت مقبول ہوئے کچھ پر منفی رد عمل بھی ہوا۔ لیکن ان کے زیادہ تر افسانے مقبول ہی ہوئے۔ خواجہ صاحب کے افسانے ایک الگ اہمیت کے حامل ہیں۔ خواجہ احمد عباس کے افسانوں کی اہمیت و معنویت میں اس وقت مزید اضافہ ہو جاتا ہے۔ جب ان کے افسانوں کی افادیت و خصوصیت کی بنا پر رام لعل، خواجہ احمد عباس کے منتخب افسانے کے عنوان سے ۱۹۹۳ء میں دہلی سے شائع کراتے ہیں۔ خواجہ احمد عباس کو اپنے وطن ہندوستان اور اہل وطن دونوں سے بے پناہ محبت ہے۔ جس کا اظہار بھی ان کے افسانوں میں ہمیں نظر آتا ہے۔ قحط بنگال اسی وقت کا ایک اہم سانحہ تھا جس نے پورے ہندوستان کو ہلا کر رکھ دیا تھا۔ بہت سے ادیبوں نے اس پر افسانے لکھے لیکن خواجہ احمد عباس کا افسانہ ”ایک ہائیلی چاول“ بہت ہی موثر ہے۔ ۱۹۴۷ء کے واقعات و حادثات پر بھی خواجہ احمد عباس کے افسانے پُر درد اور پُر اثر ہیں۔ ان کے افسانے ”میں کون ہوں“ ”انتقام“ ”اجنتا“ اور ”سردار جی“ ہیں۔ جو ان کی حالات و واقعات سے تاثر اور ان کی افسانہ نگاری کے بہترین نمائندے ہیں۔

خواجہ احمد عباس کی انسانیت کے تئیں ہمدردی کا ذکر ضروری معلوم ہوتا ہے۔ جس کا رمانند ساگر کے ناول ”اور انسان مر گیا“ کے دیباچہ میں کیا ہے۔ جس کا تذکرہ ڈاکٹر عباس رضا نیر نے بھی کیا ہے: انہوں نے اس وقت فرقہ واریت کی مذمت کرتے

ہوئے یہ بھی لکھا کہ:

”یہ صحیح ہے کہ غیر ملکی حکمرانوں نے فرقہ واریت کا بیج بویا اور اسے ہوا دی۔ لیکن مذہب کے نام پر جو بریت درندگی اور قتل و غارت گری کا بازار گرم ہوا اس کے لیے، ہندو، سکھ اور مسلمان سبھی ذمہ دار ہیں، صرف ہندو مہاسبھا اور جن سنگھ ہی نہیں بلکہ کانگریس، مسلم لیگ اور کمیونسٹ پارٹی بھی اس حیوانیت کی اتنی ہی ذمہ دار ہیں۔ جتنے کہ فرقہ پرست عناصر۔ کیونکہ ان جماعتوں نے سیاسی نعرے تو لگائے لیکن سیاسی اور طبقہ واری شعور پیدا نہیں کیا اور نہ اپنے کارکنوں کو ادب، تہذیب اور اونچے انسانی آدرشوں سے روشناس کیا۔“

(خواجہ احمد عباس از عباس رضا نیر ص ۷۳)

خواجہ احمد عباس کی ناول نگاری سے دلچسپی بھی واضح ہے کہ انہوں نے ایک دو نہیں بلکہ کئی ایک ناول لکھے۔ ”چار دل چار راہیں“، ”بمبئی نیند کی بانہوں میں“، ”اندھیرا اجالا“، ”شیشے کی دیوار“، ”سات ہندوستانی“، ”انقلاب“، ”دوبوند پانی“، ”تین پیہے“ وغیرہ۔ ان کے مختلف ناولوں کو فلمایا بھی گیا جو انہوں نے خود کیا۔ ان کا بہترین اور نمائندہ ناول ”انقلاب“ ہے۔

خواجہ صاحب نے ڈرامے، سفر نامہ اور خود نوشت بھی لکھا۔ خواجہ صاحب ڈرامہ کو سیاسی، سماجی اور تہذیبی بیداری کے لیے طاقتور صنف اور ارسال و ترسیل کا بہترین ذریعہ خیال کرتے تھے۔ انہوں نے اپنے ڈراموں کو اپنے نظریات کے اظہار کے وسیلہ کے بطور استعمال کیا ان کے ڈراموں میں ”گاندھی اور غنڈہ“، ”بارہ بج کر پانچ منٹ“، ”لال گلاب کی واپسی“، ”یہ امرت ہے“ اور ”تان سین کی واپسی“ اہم ہیں۔ خواجہ احمد عباس کے ڈرامے صرف لکھے ہی نہیں گئے بلکہ اسٹیج بھی کئے گئے۔ ان کے ڈراموں

میں مختلف مسائل کو پیش کیا گیا ہے۔

”مسافر کی ڈائری“ خواجہ احمد عباس کا سفر نامہ ہے۔ اس کے علاوہ ان کی خود نوشت سوانح عمری انگریزی زبان میں am not an island ۱۹۷۱ء میں شائع ہو کر منظر عام پر آئی۔

خواجہ احمد عباس پر ڈاکٹر نیر صاحب کی یہ کتاب احمد عباس کی زندگی کے تمام گوشوں کو محیط ہے۔ ڈاکٹر عباس رضا نیر کی کتاب کے مطالعے کے بعد احمد عباس سے متعلق تشنگی نہیں رہتی۔ ہر تحقیق کے بعد کوئی نہ کوئی گوشہ ضرور اپنی جدت اور ندرت کے ساتھ ادب کے افق پر نمودار ہوتا ہے لیکن یہ کتاب احمد عباس پر کام کرنے والوں کے لیے بہت مفید ہوگی۔ اور خواجہ احمد عباس کی ذاتی اور ادبی زندگی کو سمجھنے میں معاون ہوگی۔ اور اردو ادب میں گراں قدر اضافہ کی حیثیت کی حامل رہے گی۔

☆☆☆

ڈاکٹر عباس رضانیر کی فکشن تفہیم و تنقید

خوشتر زرین ملک

تخلیق اور تنقید ادب کے دو زاویے ہیں۔ جس سماج اور قوم کا ادب نہیں ہوتا اس کا شعور بالیدہ نہیں ہو سکتا۔ ایک جہاں متعلقہ سماج کا آئینہ اور اس کی ترقی و تیزی کا اشارہ ہے تو دوسرا ادب کے منہاج اور اس کے مستقبل کا امین ہے۔ تنقید، تخلیق کے بغیر وجود میں نہیں آ سکتی لیکن تنقید کے بغیر تخلیق کی سمت بھی درست نہیں رہ سکتی ہے۔ تنقید کا وجود ہی اسی لئے ہوا کہ وہ تخلیق کے لیے خضر راہ بنے۔ اس کا کام صدف ریزوں اور خذف ریزوں میں چھان پھٹک کرنا اور ان دونوں کے مابین تمیز کرنا ہے۔ اردو ادب میں تنقید کی بنیاد حالی کی شہرہ آفاق تصنیف 'مقدمہ شعر و شاعری' سے ہوتی ہے۔ اس سے قبل تذکرے لکھے گئے جن میں عمومی انداز میں تبصرے کر دیئے گئے تھے مگر اردو ادب میں تنقیدی شعور نہ ہونے کی وجہ سے ان کو بڑی قدر کی نگاہ سے دیکھا گیا۔ دراصل سائنٹفک اصول تنقید نہ ہونے کی وجہ سے اس وقت کسی شاعر کے بارے میں تذکرہ نگار جو محسوس کرتا تھا اسے وہ تذکرہ کے ضمن میں تبصرہ کے طور پر بیان کر دیتا تھا۔ ان تذکرہ نگاروں کے پاس اس کا کوئی منطقی جواز بھی نہیں ہوتا تھا۔ اسی لئے تذکروں میں ذاتی پسند و ناپسند کو بہت دخل تھا۔ لیکن مقدمہ شعر و شاعری کے بعد دھیرے دھیرے اردو ادب میں بھی تنقیدی شعور بالیدہ ہونا شروع ہوا اور آج اس کے پاس نہ صرف تنقیدی اصول ہیں بلکہ تنقید کے اکثر و بیشتر شعبوں کی اپنی اپنی بوطیقا بھی ہے، جن کی روشنی میں تنقیدی عمل انجام

پارہا ہے۔ ادب کے دو دھارے ہیں ایک شعری دوسرا نثری۔ شعری تخلیقات کی تنقید کے لیے حالی آزاد جیسا شخص اس کو مل گیا، جس نے تنقید کے ابتدائی اصول منضبط کر دیئے لیکن نثری اصناف خصوصاً فکشن کو آج تک کوئی حالی اور آزاد نصیب نہیں ہو سکا، جس کی وجہ سے وہ آج بھی تنقیدی بوطیقا سے محروم ہے، البتہ متعدد تنقید نگاروں نے فکشن کی تنقید کی اور اس کو بے راہ روی سے اپنی حد تک بچانے کی کوشش کی لیکن یہ عمل ہنوز شخصی ہی رہا اس لئے اس کے لیے اصول و ضوابط ابھی تک منضبط نہ ہو سکے۔

دہلی اور لکھنؤ ادب کے دو اسکول رہے ہیں۔ شعر کے باب میں ان دونوں مقامات پر بڑے بڑے معرکے ہوئے کبھی دہلی کے سرتاج سجا تو کبھی لکھنؤ نے بازی ماری۔ تنقید کے معاملے میں دہلی، لکھنؤ سے دو قدم آگے رہا اور اس کی بوطیقا کی تیاری کا سہرا حالی نے دہلی کے سر باندھا جسے لکھنؤ آج تک حاصل نہیں کر سکا۔ البتہ ان کے بعد جو تنقید لکھی گئی اس میں لکھنؤ کا بڑا حصہ رہا۔ اس ضمن میں سب سے بڑے نام احتشام حسین اور مسعود حسین رضوی ادیب کے ہیں۔ ان کے پائے کے نقاد ہنوز دہلی نہیں دے سکا۔ انہوں نے ہر دو اصناف ادب کی تنقید لکھی اور اس کو راہ دکھائی۔ آج بھی ان کی لکھی تنقید کو بطور حوالہ پیش کیا جاتا ہے۔ ان کا تعلق لکھنؤ یونیورسٹی کے شعبہ اردو سے تھا لیکن احتشام حسین بعد میں پروفیسر ہو کر الہ آباد یونیورسٹی چلے گئے۔ اسی لکھنؤ یونیورسٹی کے صدر شعبہ ڈاکٹر عباس رضانیر بھی ہیں جنہوں نے تخلیق اور تنقید دونوں میدانوں میں خدمات انجام دی ہیں اور دے رہے ہیں۔ ان کے شعری مجموعوں کے ساتھ ہی ان کی متعدد کتابیں بھی منظر عام پر آچکی ہیں۔ حال ہی میں خواجہ احمد عباس کے فن پر محیط ان کی ایک کتاب 'خواجہ احمد عباس' بھی منظر عام پر آئی ہے جس میں انہوں نے خواجہ احمد عباس کے فن کو ہر زاویہ سے پرکھنے کی کوشش کی ہے۔ وہ اپنے عمل میں کہاں تک کامیاب رہے یہ تو قاری ہی بتائے گا لیکن خواجہ احمد عباس کی زندگی اور ان کے فن پر میرے علم کے مطابق

یہ پہلی مبسوط کتاب ہے۔ اس سے اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ ان کی نظر ان گوشوں کی طرف رہتی ہے جن کو درخور اعتنا نہیں سمجھا گیا۔ اس کتاب میں انہوں نے خواجہ احمد عباس کی افسانہ نگاری، ناول نگاری، ڈرامہ نگاری سمیت ان کے ذریعہ دیگر اصناف پر لکھی گئی تحریروں پر سیر حاصل گفتگو کی ہے۔

ڈاکٹر عباس رضا نیر خواجہ احمد عباس کی افسانہ نگاری کو زیر بحث لاتے ہوئے جب افسانہ ”ابابیل“ کا تجزیہ کرتے ہیں تو وہ لکھتے ہیں:

”ابابیل“ ظلم و ستم کے احساس سے آلودہ، ضمیر کے رستے

ہوئے زنجیروں اور زبردست ذہنی اذیت کی بڑی بھیا تک تصویر ہے۔ فرد کی اندرونی کیفیت کو ایک الگ ہی چیز کہا جاتا ہے۔ اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ کس طرح اندرونی کیفیت بھی خارجی ماحول کی پیداوار ہے۔ خواجہ صاحب کی کہانی ”ابابیل“ کے بارے میں مختصراً یہ کہا جاسکتا ہے کہ یہ ایک نفسیاتی کہانی ہے اس کہانی میں انہوں نے نفسیات کی کئی گرہیں کھولنے کی کوشش کی ہے۔“ (خواجہ احمد عباس: ص ۶۱)

خواجہ احمد عباس ایک ایسے فنکار ہیں جن کے فلشن کی تفہیم اتنی آسان نہیں ہے جتنی سمجھا جاتا ہے۔ ان کہانیوں کی تفہیم کے لیے دیگر کئی علوم پر درک حاصل ہونا ضروری ہے۔ جس میں علم نفسیات سرفہرست ہے۔ یہ کوئی واحد کہانی نہیں ہے جس میں انہوں نے نفسیات کو موضوع بنایا ہو اور اس کے ابعاد کو گرفت میں لانے کی کوشش کی ہو۔ خواجہ احمد عباس کی دوسری کہانی ”سلمہ اور سمندر“ ہے یہ کافی طویل کہانی ہے۔ جس کی تفہیم کرتے ہوئے انہوں نے اس کے مخفی گوشوں کو قاری پر وا کرنے کی کوشش کی ہے اور ایک تنقید نگار کا یہی کام ہوتا ہے کہ وہ تخلیق کے اندر پنہاں راز کو واشگاف کرے اور اس کے ابعاد کو گرفت میں لا کر قاری کے سامنے پیش کر دے۔ ڈاکٹر عباس رضا نیر اس کہانی کو خواجہ احمد

عباس کی ممتاز کہانیوں میں شمار کرتے ہیں۔ ان کا کہنا ہے کہ اس کہانی کے دونوں کردار انور اور سلمہ کی فکری جہات کو انہوں نے مونو لاگ کے انداز میں پیش کیا ہے جو اس وقت کہانی کے کرافٹ کا بالکل نیا انداز تھا۔ وہ لکھتے ہیں:

”انور کی سوچ کے ذریعہ دونوں کا خاندانی پس منظر بھی بیان کر

دیا گیا ہے۔ پوری کہانی اس طرح کی طویل سوچوں پر مبنی ہے کبھی انور سوچتا ہے اور کبھی سلمہ۔ دونوں ایک دوسرے کے بارے میں سوچتے ہوئے ایک دوسرے کی سوچ میں گم ہونے کے اسباب پر غور کرتے ہیں۔“

(خواجہ احمد عباس: ص ۶۳)

اس کہانی کا انھوں نے مختصر انداز میں مگر بہت جامع تجزیہ کیا ہے، اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ فلشن تنقید پر ان کی اچھی گرفت ہے اور کم الفاظ میں بھی وہ فلشن تنقید کے قاری کو مطمئن کرنے کا ملکہ رکھتے ہیں۔ وہ اسی کہانی کے بارے میں آگے چل کر لکھتے ہیں:

”طوالت کے باوجود کہانی بے حد موثر ہے۔ خواجہ صاحب نے

سلمہ کے کردار کو ابھارنے میں بڑی فنکاری کا ثبوت دیا ہے۔ خاص طور سے اس کے بچپن کے حالات اور پھر انور سے متاثر ہونے اور شادی کے بعد کے محبت بھرے واقعات کو بڑی کامیابی کے ساتھ بیان کیا ہے۔ اس اعتبار سے اس کہانی کو خواجہ صاحب کی نمائندہ کہانی قرار دیا جاسکتا ہے۔“

(خواجہ احمد عباس: ص ۶۵)

ڈاکٹر عباس رضا نیر کی نظر ہمیشہ ان گوشوں کی طرف رہتی ہے جس طرف عام طور سے دوسرے لوگوں کی نظریں نہیں جاتی ہیں۔ اس کی ایک وجہ یہ بھی ہو سکتی ہے کہ جس ضمن میں وہ کہانی یا وہ واقعہ ہو اس کے بالمقابل اس سے اہم کوئی واقعہ رہا ہو جس کی وجہ سے دوسرے لوگ اس جانب خصوصی توجہ نہ دیتے ہوں مگر ڈاکٹر عباس رضا نیر اس کو کم اہم

نہیں مانتے ہیں۔ ان کا ماننا ہے کہ ادب میں جو لکھا جا رہا ہے اگر اس میں ذرا بھی جدت ہے تو اسے سامنے آنا چاہئے تاکہ قاری کو یہ معلوم ہو سکے کہ ادب کا یہ بھی ایک زاویہ ہے یا اس دور میں جب دوسرے لوگ ایک خاص انداز میں ادب تخلیق کر رہے تھے تو کوئی ایسا بھی باغی تھا جو دوسرے انداز میں سوچ رہا تھا مگر لوگوں نے اس پر توجہ نہیں دی۔ آزادی اظہار کے باب میں رشید جہاں کے بعد عصمت چغتائی پہلی ایسی خاتون فکشن نگار تھیں جنہوں نے سماج کی پروا کیے بغیر لکھا۔ انہوں نے ایسے موضوعات پر بھی قلم اٹھایا جب دوسرے کے ہاتھوں میں صرف موضوع سوچ کر ہی رعب طاری ہو جاتا تھا۔ فسادات کے ضمن میں رام آنند ساگر نے اور انسان مرگیا، لکھا جس کی بڑی پذیرائی ہوئی۔ سعادت حسن منٹو نے ایسے افسانے تخلیق کئے جن سے اندازہ ہوتا ہے کہ اس وقت انسانیت مر گئی تھی۔ منٹو ہی کیا اس وقت جتنے بھی ادیب تھے اکثر و بیشتر نے ایسا ہی ادب تخلیق کیا جس سے لگتا تھا کہ اب یہ دنیا رہنے کے لائق نہیں بچی ہے لیکن اس دور میں بھی خواجہ احمد عباس نے ان ادیبوں سے مختلف لکھ کر یہ باور کرایا کہ یہ وقتی جھوٹکا ہے، جس سے کچھ شامیانے اڑ گئے ہیں، قاتل اور تنبوا کھڑے گئے ہیں، اس کا زور بس ٹوٹنے والا ہی ہے اور پھر ہر طرف اخوت و محبت دکھائی دے گی کیونکہ انہوں نے اپنی کہانی ”سردار جی“ میں اس کا اشارہ دے دیا تھا کہ انسانیت مری نہیں ہے، ابھی زندہ ہے۔ حالانکہ بعد میں خشونت سنگھ نے انگلش میں A Train To Pakistan لکھی۔ جس کا بعد میں اردو ترجمہ بھی شائع ہوا۔ اس ناول میں بھی ہر طرف انسانیت کے دشمن ہی دکھائی دیتے ہیں مگر آخر میں ناول کا سب سے برا کردار ”جگا“ ایسے انداز میں قاری کے سامنے آتا ہے کہ وہ خود اپنی جان دے کر ہزاروں ایسے افراد کی جان بچاتا ہے جس کا اس کے مذہب سے کوئی تعلق نہیں ہوتا ہے۔ لیکن اس سے قبل خواجہ احمد عباس ”سردار جی“ لکھ چکے تھے۔

ڈاکٹر عباس رضانیر قمر طراز ہیں:

”فسادات کے موقع پر یہ احساس عام ہو گیا تھا کہ انسانی اقدار و انسانیت کا خاتمہ ہو گیا ہے لیکن خواجہ صاحب نے اس کہانی کے ذریعہ یہ تاثر دینے کی کوشش کی ہے کہ ابھی انسانیت باقی ہے اور انسانیت کا خاتمہ نہیں ہوا ہے۔ انہوں نے ساری صورت حال کا تجزیہ کر کے اخلاقی اور تہذیبی تعطل کے وقت انسانی کردار کی معنویت کو متعین کرنے کی کوشش کی ہے۔ اس کے لیے انہوں نے متحارب فرقوں یعنی مسلم اور سکھوں کے ایسے واقعات پیش کئے ہیں جن میں ایک سکھ اپنے مسلمان پڑوسی کی حفاظت میں اپنی جان تک قربان کر دیتا ہے۔ جب وہ متعصب مسلمان مرتے ہوئے سردار جی سے پوچھتا ہے کہ اس نے ایک مسلمان کی جان بچانے کے لیے خود کو کیوں قربان کر دیا تو سردار جی جواب دیتے ہیں کہ لاہور میں ایک مسلمان نے بھی اس کی جان بچائی تھی۔ اس لئے اس نے قرض اتار دیا۔“

..... آگے چل کر ڈاکٹر عباس رضانیر لکھتے ہیں کہ:

”کہانی کے اس راوی کے دل میں سکھوں کے خلاف نفرت بھردی گئی تھی۔ یہ راوی مسلم یونیورسٹی میں جب تعلیم حاصل کر رہا تھا تو اسے پنجابیوں سے سابقہ پڑتا ہے۔ اس مقام پر افسانے میں حقیقت کا رنگ بھرنے کے لیے خواجہ صاحب نے بڑی فنکاری کے ساتھ سکھوں کے بارے میں چند لطیفے شامل کر دیئے ہیں۔“

(خواجہ احمد عباس: ص ۷۸)

ڈاکٹر عباس رضانیر کا کہنا ہے کہ:

”دلچسپ بات یہ ہے کہ مسلمانوں نے اس کہانی کو اپنے

خلاف سمجھا اور کراچی سے شائع ہونے والے روزنامے 'انجام' نے اسے مسلم دشمنی کا مظہر قرار دے کر خواجہ احمد عباس کو خوب لعن طعن کیا۔ سکھوں نے اسے اپنے خلاف سمجھا اور اس کہانی کے خلاف باقاعدہ گرد و داروں میں قرار دادیں پاس کی گئیں اور اس کے خلاف ارباب حل و عقد کے پاس تاریخچے اور اس پر مقدمہ بھی قائم کر دیا۔“

(خواجہ احمد عباس: ص ۷۷)

کہانیوں پر جب بھی مقدمہ کا ذکر آتا ہے تو منٹو اور عصمت کے علاوہ کس کا ذکر ہوتا ہے؟ لیکن ڈاکٹر عباس رضانیر نے ماوارائے متن جا کر اس کہانی کی تفہیم کی کوشش کی اور اس کے انسلالات کو قاری کے سامنے رکھا کہ یہ کہانی کیوں اہم ہے؟ ایسا نہیں کہ کسی کہانی کی وجہ سے تخلیق کار پر مقدمہ چل جائے تو وہ اہم ہو جاتی ہے بلکہ مسئلہ اس بات کا ہے کہ اس دور میں تخلیق کا دھارا ایک رخا تھا اس وقت احمد عباس نے ایسی کہانی لکھی جس سے آپسی محبت اور رواداری کو فروغ ملے۔ اس کے باوجود اس کہانی کا ذکر اس شد و مد کے ساتھ افسانوی ادب میں نہیں ہوتا ہے جس طرح ہونا چاہئے اسی لیے ڈاکٹر عباس رضانیر نے بطور خاص اس کہانی کی تفہیم کی کوشش کی اور بتایا کہ یہ کہانی کس قدر اہم ہے۔ ایک بات اور ملحوظ خاطر رہے کہ کوئی بھی تخلیق اس وقت اور ماحول میں دیکھی جانی چاہئے جس وقت وہ تخلیق ہوئی، اس کا تعین قدر بھی اسی کے ضمن میں ہونا چاہئے، اس پس منظر میں اگر خواجہ احمد عباس کی کہانی 'سردار جی' کو دیکھا جائے تو واقعی بہت اہم کہانی ہے مگر اس پر بحث نہیں ہوئی تھی، جس پر اب ڈاکٹر عباس رضانیر نے گفتگو کر کے بحث کا دروازہ کھولا ہے۔

اسی طرح ڈاکٹر عباس رضانیر نے خواجہ احمد عباس کی ناول نگاری اور ڈرامہ نگاری پر بحث کر کے اس کے امتیازات بیان کئے ہیں۔ انہوں نے یک رخ بحث کے بجائے منطقی استدلال کے ذریعہ خواجہ احمد عباس کی تخلیقات کا تعین قدر کیا ہے۔ ایسا نہیں

ہے کہ انہوں نے صرف ایک ہی فنکار کو اپنے مطالعہ کا محور بنایا ہو بلکہ ان کے مطالعہ میں تنوع ہے۔ وہ دوسرے فکشن نگاروں کی تخلیقات کا بھی جائزہ لیتے ہیں۔ ان کی ایک دوسری کتاب ”تنقیدی بحثیں“ ہے۔ جس میں یوں تو ۱۳ مضامین شامل ہیں لیکن فکشن تنقید پر اس کتاب میں ان کے چار مضامین ہیں جن میں پریم چند، مرزا ہادی رسوا، قرۃ العین حیدر اور انتظار حسین کی تخلیقات کو مرکز نگاہ بنایا ہے۔ اس میں بھی دو ایسے موضوعات ہیں جن پر کم تنقید لکھی گئی۔ پریم چند کا افسانہ ”پوس کی رات“ اور رسوا کا ناول ”آخری بیگم“ ہے۔ یوں تو پریم چند کے افسانے ’پوس کی رات‘ کو بھی نے اچھا کہا لیکن جب تعین قدر کی بات آئی تو سب کے سامنے صرف ان کا افسانہ ”کفن“ ہی رہا مگر ڈاکٹر عباس رضانیر نے پریم چند کی تخلیقات میں سے اس افسانے کو منتخب کیا تاکہ یہ واضح کر سکیں کہ ان کے کشکول میں صرف ”کفن“ ہی نہیں ہے بلکہ ’پوس کی رات‘ بھی ہے۔

اس کہانی کا تجزیہ کرتے ہوئے ڈاکٹر عباس رضانیر نے پریم چند کی کردار نگاری کو ابھارا ہے اور کس طرح انہوں نے ہلکو اور منی کے ساتھ ہی جبراً کو ایک ایسے کردار کے طور پر پیش کیا ہے، جو اگر نہ ہوتا تو کہانی تکمیل تک نہ پہنچتی۔ اردو ادب میں نسائیت اور فیمینزم بطور ایک تحریک بعد کی چیزیں ہیں مگر نسائی لہجے میں تندہی اسی وقت شروع ہو گئی جب ظلم حد سے بڑھ رہا تھا۔ ڈاکٹر عباس رضانیر نے ’پوس کی رات‘ میں منی کے کردار کی شناخت اسی ضمن میں کی ہے۔ وہ لکھتے ہیں کہ ہلکو کی بیوی منی کا مکالمہ کہانی کی اثر انگیزی کو دو آتشہ بنا دیتا ہے۔ غلامی کے بچے میں جکڑے ہوئے اس ہندستانی سماج کی ترجمانی کرتے ہوئے پریم چند نے اپنی کہانیوں میں بیشتر مقامات پر عورتوں کے یہاں احتجاج کی لے کو مردوں کے مقابلے میں زیادہ تیز اور شدید ہوتے ہوئے دکھایا ہے۔ چنانچہ یہاں بھی جن حالات میں ہلکو کو شہنا سے بات کرنے کی بھی ہمت نہیں ہوتی ان ہی حالات میں منی کے مکالموں کا یہ لہجہ بھی دیکھئے:

”میں اس کھیت کا لگان نہ دوں گی۔ کہے دیتی ہوں۔ جینے کے لیے کھیتی کرتے ہیں، مرنے کے لیے نہیں کرتے۔“

(تنقیدی بحثیں ص ۱۲۶-۱۲۷)

اس طرح ڈاکٹر عباس رضانیہ پریم چند کی کہانی میں نیا زاویہ تلاش کرتے ہیں اور اس کو قاری کے سامنے پیش کرتے ہیں۔ ڈاکٹر عباس رضانیہ نے فکشن کی تفہیم اور تنقید ذرا دوسروں سے مختلف انداز میں کرنے کی کوشش کی ہے۔ وہ کہانی کی بار بار قرأت کرتے ہیں، متن اور ماورائے متن غور کرتے ہیں۔ جس دور میں کہانی تخلیق ہوئی اور اس کے بعد کی تحریکات پر نظر دوڑاتے ہیں اس کے بعد اس کا تجزیہ شروع کرتے ہیں۔ اس طرح وہ ایک طرف جہاں کہانی کے سربستہ رازوں کو کھولنے کی سعی کرتے ہیں وہیں تخلیق کار کی اپنے زمانے سے ہم آہنگی اور اس کی دوراندیشی کا بھی پتہ چلا لیتے ہیں۔ دراصل کسی بھی تخلیق کی تفہیم اور اس کی تنقید کا حق اس وقت تک ادا نہیں کیا جاسکتا ہے جب تک کہ متن کو ماورائے متن یعنی تخلیق کار، ماحول اور حالات وغیرہ کے ضمن میں نہ دیکھا جائے۔ ڈاکٹر عباس رضانیہ کے پیش نظر متن کے ساتھ ہی یہ ساری باتیں رہتی ہیں۔

کہانی کا تجزیہ کرنے کے بعد وہ لکھتے ہیں:

”کہانی ’پوس کی رات‘ نے سرمایہ دارانہ طبقے کے جبر، سردمہری اور خود غرضی کو کم بیان کیا ہے لیکن اس کے باوجود اس کے سمجھنے میں قاری کو ذرا بھی دقت پیش نہیں آتی۔ اسی طرح ایک جبر مسلسل سے کراہتے ہوئے محکوم طبقے کی امید و تشویش کی نفسیات اور حوصلے و کم ہمتی کی کیفیات کے لامتناہی سلسلہ کو مختصر لفظوں میں کافی وضاحت سے بیان کر دیا ہے۔ طبقاتی کشمکش کی ان جزئیات کا بیان ہی پریم چند کا طرہ امتیاز ہے۔“

(تنقیدی بحثیں ص ۱۲۷)

اختری بیگم مرزا ہادی رسوا کا ایک ناول ہے جس پر بحث کم ہوئی ہے کیوں کہ ’امراؤ جان ادا‘ کے مقابل اس کی کم ادبی حیثیت ہے۔ رسوا کو جس نے بھی دیکھا اسی ایک ناول کی روشنی میں دیکھا لیکن اگر اس ناول کے علاوہ دوسرے ناولوں پر بھی لوگوں کی نظر جاتی تو رسوا کے فن کی مزید پختگی قاری کے سامنے آتی۔ کسی بھی ادیب اور تخلیق کار کا شاہکار ایک ہی ہوتا ہے لیکن اس شاہکار کا مطلب یہ تو نہیں ہے کہ اس کی دوسری تخلیقات کو درخور اعتنا سمجھا ہی نہ جائے! اسی لئے ڈاکٹر عباس رضانیہ نے اس ناول کو اپنے مطالعے کا موضوع بنایا تاکہ یہ دیکھا جاسکے کہ وہ اسباب و وجوہ کیا ہیں جن کی بنا پر امراؤ جان کو شاہکار کا درجہ ملا۔ مطالعہ تو انہوں نے اختری بیگم کا کیا ہے لیکن اس سے امراؤ جان ادا کے امتیازات زیادہ واضح ہوئے ہیں۔ ڈاکٹر عباس رضانیہ نے ”اختری بیگم: ایک تہذیبی دستاویز“ کے عنوان سے یہ مقالہ تحریر کیا ہے۔ اس مقالے کے ذریعہ انہوں نے جہاں ناول اختری بیگم کی تفہیم اور اس کی تنقید کی ہے وہیں انہوں نے رسوا کے فن پر بڑی کارآمد باتیں کی ہیں۔ مقالے کی ابتدا میں انہوں نے رسوا کے فن کو ان کی تحریروں کے آئینہ میں ہی سمجھنے کی کوشش کی ہے جو اس مقالے کا ماحصل ہے۔

ناول کے پلاٹ، کردار اور منظر نگاری پر بحث کرتے ہوئے انہوں نے لکھا ہے کہ:

”ہم نے اس مقالے میں اختری بیگم کے تقریباً سبھی کرداروں کو سمجھنے کی کوشش کی ہے کیونکہ کرداروں کے ذریعہ ہی ہم ان تہذیبی عناصر تک پہنچ سکتے ہیں جو اس ناول کی خوبی قرار دی جاسکتی ہے لیکن سارے کرداروں کے تجزیے کے بعد ہم اس نتیجے تک پہنچتے ہیں کہ رسوا کے اس ناول میں کرداروں کا ارتقا اس طرح نہیں ہو سکا جیسے رسوا کے کامیاب ناولوں میں ہوا ہے۔ اس لئے اس کے کچھ کردار ٹائپ کردار بن کر رہ گئے ہیں۔“

(تنقیدی بحثیں ص ۱۲۶)

کسی بھی تنقید نگار کے لیے ضروری ہے کہ وہ پہلے کسی کی بھی ذات کی عظمت کا سکھ اپنے اوپر نقش نہ کر لے، اگر اس میں یہ جاگزیں ہو گیا کہ فلاں تخلیق کار ایک بڑا فنکار ہے اس لئے اس کے یہاں کجی ہو ہی نہیں سکتی تو پھر وہ تخلیق کے ساتھ انصاف نہیں کر سکتا ہے اور نہ ہی غیر جانبداری کے ساتھ تخلیق کا تعین قدر کر سکتا ہے۔ ڈاکٹر عباس رضانی مرزا ہادی رسوا کی عظمت کا تو اعتراف کرتے ہیں مگر ان کا سکھ اپنے اوپر جمنے نہیں دیتے، اسی لئے غیر جانبداری کے ساتھ اپنا فیصلہ بھی صادر کرتے ہیں۔ وہ رسوا کی شخصیت اور ان کی عظمت کے سامنے جھکنے کے بجائے متن کے ذریعہ جو حقیقت کھل کر سامنے آتی ہے وہ قاری کے سامنے بیان کرتے ہوئے ناول کا تعین قدر کرتے ہیں۔ اسی لئے وہ ببا نگ دہل اعلان کرتے ہیں کہ ”سارے کرداروں کے تجزیے کے بعد ہم اس نتیجے تک پہنچتے ہیں کہ رسوا کے اس ناول میں کرداروں کا ارتقا اس طرح نہیں ہو سکا جیسے رسوا کے کامیاب ناولوں میں ہوا ہے۔ اس لئے اس کے کچھ کردار ٹاپ کردار بن کر رہ گئے ہیں۔“

اپنے تیسرے مضمون ”قرۃ العین حیدر کا تخلیقی سفر: ایک مجموعی جائزہ“ میں ڈاکٹر عباس رضانی مرزا عینی کے ناولوں اور ناولٹوں کا جائزہ لیتے ہیں۔ حالانکہ یہ مضمون ان کا سرسری ہے اور بس عینی کے ناولوں کے تعارف تک ہی محدود ہے اس کے باوجود اس معنی میں یہ مضمون اہم ہے کہ قاری صرف اس ایک مضمون کو پڑھ کر عینی کی تخلیقات کے بارے میں نہ صرف موٹی موٹی باتیں جان سکتا ہے بلکہ اس کے ذریعہ وہ عینی کے ان امتیازات کے بارے میں معلومات حاصل کر سکتا ہے جن کے جانے بغیر عینی کی تفہیم ناممکن ہے۔ اس لئے عمومی مضمون ہونے کے باوجود خاص ہو جاتا ہے۔

ڈاکٹر عباس رضانی مرزا نے انتظار حسین کے افسانہ ”کشتی“ کا تجزیہ کرتے ہوئے ان کے مجموعی فن پر بھی گفتگو کی ہے۔ انہوں نے کشتی کو انتظار حسین کا وہ افسانہ قرار دیا ہے جس کے ذریعہ انتظار حسین کی تفہیم ہوتی ہے۔ انتظار حسین کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ

اسطوری واقعات سے وہ کہانی کا تانا بانا بنتے ہیں۔ ماضی کو حال سے جوڑنے کا ہنر ان سے بہتر کوئی نہیں جانتا ہے اور کم سے کم فکشن نگاروں میں کوئی بھی ایسا شخص نہیں ہے جو ان کے قریب پھٹکے۔ ہاں قرۃ العین حیدر واحد ایسی فنکارہ ہیں جنہوں نے ”آگ کا دریا“ کے ذریعہ ماضی، حال اور مستقبل کو ایک کیا لیکن جو کیفیت انتظار حسین کے یہاں ہے وہ ان کے یہاں بھی مفقود ہے۔ ڈاکٹر عباس رضانی لکھتے ہیں:

”ماضی کی روایتوں اور تاریخوں کو کس طرح آج کی کہانی بنایا جائے۔ یہی انتظار حسین کا مابہ الامتیاز ہے۔ زیر نظر افسانہ ”کشتی“ جس کی منہ بولتی مثال ہے۔“

(تنقیدی بحثیں: ص ۶۷)

ڈاکٹر عباس رضانی نے انتظار حسین کے افسانہ ”کشتی“ کے کرداروں اور اس کی جزئیات کا تجزیہ کیا ہے۔ انہوں نے کرداروں کا مطالعہ کر کے ان کی نفسیات جاننے کے لیے تحلیل نفسی سے کام لیا ہے اور یہ دیکھنے کی کوشش کی ہے کہ آخر ان کرداروں کی نفسیات اس طرح تشکیل کیوں پائی کہ ہر طرف پانی ہی پانی ہونے کے باوجود نوٹ کے بیٹے نے کشتی میں سوار ہونے سے انکار کر دیا۔ اسی طرح کشتی میں سوار جانور جو عمل کرتے ہیں اس کے اسباب و عوامل کیا تھے۔ وہ کہانی کا تجزیہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

”کہانی کی ساری کی ساری جزئیات اس بات کا اشارہ ہیں کہ انسانی تہذیب ہر زمانے میں اسی طرح کی صورت حال سے دوچار ہوتی رہی ہے اور ہر دور میں بنی نوع انسانی کی ارتقا کے اسباب بھی اسی طرح پیدا ہوتے رہے۔ فنا اور ارتقا کا یہ سلسلہ ازل سے جاری ہے اور ابد تک جاری رہے گا۔ دیگر افسانوں کی طرح افسانہ ”کشتی“ میں بھی انتظار حسین تاریخ کے دیو مالائی سفر کو اپنے عہد سے منطبق کرنے میں

کامیاب نظر آتے ہیں اور یہی ان کے افسانہ نگاری کی امتیازی خصوصیت ہے۔“

(تنقیدی بحثیں: ص ۱۶۴)

اس طرح ڈاکٹر عباس رضانیر کرداروں کی نفسیات اور جانوروں کے عمل کو انسانی بقا اور فنا سے جوڑتے ہیں۔ ان کا کہنا ہے کہ یہ سب عمل اس لئے ہوتا ہے تاکہ انسانی وجود کو اس کی آلائشوں سے پاک کیا جاسکے جس کے لیے یہ عمل بطور جواز ہوتا ہے۔

☆☆☆

آفریں باد بریں ہمت مردانہ تو ”ڈاکٹر عباس رضانیر“

ڈاکٹر ساجد غفران ندوی

مقدس کتاب قرآن، حدیث اور بزرگوں کی زبانی اکثر یہ بات پردہ سماعت سے ٹکراتی رہی ہے کہ اللہ رب العزت رات کے تہائی پہر میں (تہجد کے وقت) آسمان سے ارض سماوی کی طرف آتا ہے اور یہ بھی سچ ہے کہ اس پاکیزہ گھڑی میں جو کچھ بھی قاضی الحاجات کے دربار سے منت و سماجت کے ساتھ مانگا جائے تو کریم رب بندے کی جائز تمناؤں کو پوری کرتا ہے، شاید یہ وہی لمحہ تھا یہ وہی گھڑی تھی جب ڈاکٹر عباس رضانیر جلال پوری اٹھے اور دست سوال کو یوں دراز کیا کہ اے پروردگار مجھے فروغ اردو کے لیے مزید اور جدید راہوں کی تلاش ہے اور مجھے محبان اردو کے لیے پیرہن کی تلاش ہے، ان دعائیہ کلمات کو رب رحیم و کریم نے ”خولجہ احمد عباس“، ”رثائی تنقیدیں“ اور ”تنقیدی بحثیں“ کی شکل میں آب کوثر سے دھلی ہوئی زبان میں سوغات کو قبول فرمایا۔

ڈاکٹر عباس رضانیر کی ابتدائی تعلیم لکھنؤ ہی کے ممتاز دینی و علمی درس گاہوں میں ہوئی، فراغت کے بعد معلّیٰ کا پیشہ اختیار کیا اس طرح انھوں نے مختلف مقامات اور کالجوں میں اپنے فرائض کو بخوبی انجام دینے کے بعد تہذیب کے شہر لکھنؤ کی طرف رخ کیا اور رہی بات شہر لکھنؤ کی تو زبان اور بول چال کے معاملہ میں پوری دنیا میں شہر ارکو جو

مقام حاصل ہے وہی مقام ہندوستان میں شہر لکھنؤ کو حاصل ہے یہاں پر یہ لکھنا اور کہنا غلط نہ ہوگا کہ وہ سارے طلباء بہت ہی خوش نصیب اور قابل مبارکباد ہیں جو مذکور کی زیر نگرانی درس و تدریس کے اعلیٰ معیار سے بہرہ مند ہو رہے ہیں، وہ بیک وقت ناظم، شاعر و ادیب، ناقد و محقق، مترجم و مبصر کی حیثیت سے ادب کے دلدادگان میں ہشت پہلو در زبان نہاد کی اہمیت رکھتے ہیں اور میں خصوصاً بارگاہ ایزدی میں دعا گو ہوں کہ:

”اللہ کرے زور قلم اور زیادہ“

زیر نظر کتاب ”خواجہ احمد عباس“ میں عباس رضا نیر صاحب خواجہ احمد عباس کی مختلف سمتوں، جہتوں کو چیدہ چیدہ الفاظ کے ذریعہ قارئین کو روشناس و روبرو کراتے ہیں جو کہ ایک مشکل ترین امر ہے جیسے افسانہ، ناول، ڈرامہ، سفر نامہ، صحافت (انگریزی اور ہندی) اور خصوصاً فلمی کارناموں کو بہت ہی باریک بینی اور جستجو کے ساتھ پیش کیا ہے۔ یہ کتاب آٹھ ابواب میں منقسم ہے:

باب اول حیات و شخصیت پر مشتمل ہے جو کہ قدرے تفصیل سے ہے جس میں کچھ ایسے نکات سے آپ کا سامنا ہوگا جس سے شاید اردو ادب ہی نہیں بلکہ فلمی ادب کی شخصیات بھی ناواقف ہیں یہاں پر انگریزی کی مشہور کہاوت بادل ناخواستہ یاد آتی ہے کہ: First Impression is Last Impression۔

مصنف کے یہی اوصاف انہیں عموماً اور ادیبوں کے مقابل مختلف بناتی ہے جس میں انہوں نے ایک چہار سو شخصیت کی مرور ایام کو خاندان، افراد، رشتہ دار، گھریلو ماحول، تہذیبی، ثقافتی و معاشرتی حالات کو یوں سمیٹ دیا جیسے کہ گاہر میں ساگر اور یہی خوبی انہیں ہم عصر ادیبوں میں ممتاز و فائق بنادیتی ہے۔

افسانوں کا معاملہ تو یہ ہے کہ دیگر نامور ناقدین کے خیالات کو مد مقابل رکھ کر مدلل بحث کے ساتھ افسانوں کی اہمیت کو اجاگر کیا گیا ہے اور جب آگے چل کر ناول کے

میدان میں آتے ہیں تو ناول نگاری کے ساتھ ساتھ ناول کے تمام تر لوازمات پر سیر حاصل بحث کرتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ صنف ناول میں ”انقلاب“ سے آغاز کیا۔ جو ناول کے میدان میں ان کی پہچان کا باعث ہے اور ایک لمبی گفتگو کے ساتھ ان کی فلمی جولانیوں کو ان کے رجحانات و خیالات کو واضح کرنے کی کوشش کی ہے۔ یہاں یہ لکھنا بھی ضروری جانتا ہوں کہ خواجہ احمد عباس ایک نامور و قدآور شخصیت ہے جس نے نہ صرف زبان اردو کو لہجہ عطا کیا بلکہ اپنی قابلیت و لیاقت کی بدولت پردہ سیمیں کے ہر گوشے کو بھی نمایاں کیا ہے یہاں تک کہ ان کی قبولیت اور رجحان کا فروغ برصغیر کے کئی شہروں سے ہوتے ہوئے دہقانی زندگی کو بھی اپنی چپیٹ میں لے لیتا ہے۔ ایسے جاذب و مختلف پیرائے کی شخصیت والے انسان کو چند اوراق میں سمیٹنا واقعاً بہت ہی دقیق امر تھا کہ جس کے بارے میں لکھنے کے لیے سیکڑوں اوراق کی ضرورت تھی لیکن کمال تو جناب عباس رضا نیر کا ہے کہ انہوں نے اپنی لیاقت، قابلیت، استعداد کی بدولت ان طویل صفحات کو سمیٹ کر صرف چند اوراق پر محدود کر دیا اور اس طرح کر دکھایا کہ زندگی کا ہر ایک گوشہ بہت ہی واضح ہو گیا اور یوں راہ نما ہوا کہ اگلے محققین کے لیے مکمل چراغ رہ گزرتا ہونے کے قابل بنادیا۔

کتاب کا ماحصل اپنی انفرادیت اور ذاتی خصوصیات کی بناء پر قابل توجہ ہے جو کہ افسانہ سے ابتدا ہو کر آپ بیتی تک پہنچتا ہے اور اسی ماحصل کے تحت پوری کتاب کا خلاصہ سلیسا و سادہ الفاظ کے ذریعہ بیان کیا گیا ہے ساتھ ہی خواجہ احمد عباس کی شخصیت کو خوب سے خوب تر بنانے، سنوارنے اور نکھارنے میں انصاف اور اعتدال کا راستہ اپنایا ہے۔ کتاب کے آخری پیرا گراف کا وہ جملہ کہ ”کسی بھی فن پارے، شخصیت پر کوئی تحریر حرف آخر نہیں ہوتی لیکن ہر تحریر میں فن پارے کے لیے نکات اور شخصیتوں کے لیے پہلوؤں کو اجاگر کرنے کی کوشش ضرور کی جاتی ہے، محققین کو نئی سمت ضرور دکھاتی ہے۔“ بہت ہی قابل غور ہے اس طرح کے رجائی الفاظ نئے تحقیق کاروں کے لیے درکشائی اور

میل کا پتھر ثابت ہونے کے حقدار ہیں۔

مقالے کے آخر میں ایک جھلک اس کتاب کی رسم اجراء کی تقریب پر بھی ڈالنا لازمی سمجھتا ہوں حالانکہ اس طرح کی محفلیں یا تقریبیں راقم الحروف کے لیے نئی نہیں تھیں لیکن حیرانی اور تعجب کی بات یہ تھی کہ ادب کے چہیتوں کے علاوہ مختلف زبان کے لوگوں کا ایک جم غفیر تھا جسے آنکھوں نے پہلی بار دیکھا تھا جو کہ ایک طرف مصنف کے حسن اخلاق اور خوش فکری کا کھلا ثبوت ہے تو دوسری جانب ذہن اور عقل میں خیالات کی بوچھاڑ تھی کہ شعبہ کے صدر کی مصروفیت، درس و تدریس، خانگی ذمہ داریوں کے باوجود اخبارات کی طرح ایک نہیں بلکہ تین کتابیں ایک ساتھ منظر عام پر آنا یقیناً مدد خدا کے شامل حال ہونے کی دلالت کرتا ہے۔ اس طرح کی پذیرائی اور آب و تاب کو دیکھ کر فطری طور پر خوشی و مسرت کا احساس تو ہوتا ہی ہے لیکن خیال یہ بھی آتا ہوگا کہ:

کیوں کھل گئے لوگوں پر مری ذات کے اسرار
اے کاش کہ ہوتی مری گہرائی ذرا اور

☆☆☆

”خواجہ احمد عباس“ عباس رضانیر کی ایک تجزیاتی تصنیف

وصیل خان

خواجہ احمد عباس کی شخصیت محتاج تعارف نہیں۔ ان کا شمار ایک ہمہ گیر اور مختلف الجہات طبقات رکھنے والی غیر معمولی ہستیوں میں ہوتا ہے۔ افسانہ، ناول، صحافت، سفرنامہ، فلم غرضکہ ادب سے تعلق رکھنے والی کوئی صنف ایسی نہیں ہے جس پر ان کا قلم روانی اور بشارت سے نہ چلا ہو اور وہ یہیں ختم نہیں ہوتی بلکہ ادب کی اصناف میں انہوں نے قائدانہ رول نبھائے ہیں۔ خواجہ صاحب کا تعلق ایک ایسے علمی خاندان سے ہے جسے بیک وقت ادب، مذہب، سیاست اور عصری علوم سے از حد دلچسپی و رغبت تھی۔ اور جنگ آزادی میں بھی وہ مجاہدانہ کردار کا حامل رہا ہے۔ اس خاندان کے سربراہ اور وہ افراد میں دیوان میر حسین و خواجہ غلام الحسین، خواجہ غلام الثقلین، خواجہ غلام السیدین، خواجہ غلام السبطین اور مولانا الطاف حسین حالی اور صالحہ عابد حسین وغیرہم شامل ہیں۔ خواجہ صاحب کا ادبی و ثقافتی سفر بہت طویل ہے۔ ان کے خاندان نے مدینہ سے افغانستان کے راستے ہندوستان کے پانی پت میں آکر سکونت اختیار کی۔ خواجہ صاحب نے بھی دہلی اور لاہور کے کئی سفر کیے۔ آخر میں ممبئی میں مستقل قیام پذیر ہوئے۔ اور یہی شہر ان کی کئی معرکہ آرائیوں کا مرکز رہا ہے۔ جس کی ساری تفصیل ان کی خودنوشت سوانح حیات میں موجود

ہے۔ ان کی مختلف الجہات ادبی خدمات پر بڑی حد تک کام ضرور ہوا ہے لیکن اتنا نہیں جتنا کہ ان کا حق تھا۔

زیر نظر کتاب ”خواجہ احمد عباس“ کے عنوان سے ابھی حال ہی میں شائع ہوئی ہے جس کے مصنف عباس رضا نیر ہیں جنہوں نے بڑی محنت سے کچھ ایسی تفصیل جمع کی ہیں جن سے خواجہ احمد عباس کی حیات و خدمات پر بڑی گہرائی کے ساتھ روشنی پڑتی ہے اور کچھ ایسے انکشافات کیے گئے ہیں جن سے صاحب تذکرہ کی زندگی کے پہلو ابھر جاتے ہیں۔ اشتراکیت اور کمیونزم سے ان کی والہانہ وابستگی کا احوال بیان کرتے ہوئے مصنف رقم طراز ہیں:

”خواجہ احمد عباس ترقی پسند خیالات کے حامل اس وقت سے ہی تھے جبکہ ترقی پسند تحریک وجود میں نہیں آئی تھی۔ خواجہ صاحب علی گڑھ میں زیر تعلیم تھے اس وقت سے ہی ترقی پسندی میں دلچسپی رکھنے والے طلباء ان کے ارد گرد جمع ہو گئے تھے۔ سجاد ظہیر، کرشن چندر، بیدی، محمود الظفر، احمد علی، ملک راج آنند اور علی سردار جعفری ان کے ترقی پسند دوست تھے۔“

خواجہ صاحب تحریک میں شامل ضرور تھے لیکن ان کی کچھ پالیسیوں سے نہ صرف منحرف رہتے تھے بلکہ کبھی کبھی بالکل کھل کر اختلاف رائے کا بھی اظہار کیا کرتے تھے جس سے ان کی آزادانہ طبیعت کا پتہ چلتا ہے۔ مصنف نے ان خصوصیات پر روشنی ڈالتے ہوئے لکھا ہے:

”خواجہ صاحب کافی پڑھے لکھے انسان تھے۔ ان کا کوئی فیصلہ جلد بازی پر مبنی نہیں ہوتا تھا بلکہ عقل کی میزان پر تول ہوا ہوتا تھا۔ خواجہ صاحب مارکسزم کو تسلیم کرتے تھے لیکن اس پر اندھا یقین نہیں رکھتے

تھے۔ وہ تنقیدی ذہن رکھتے تھے اور جس بات کو غلط سمجھتے تھے اس کا برملا اظہار کرتے تھے۔ وہ پارٹی کی پالیسی کے مطابق ہاں میں ہاں ملانے والے نہیں تھے یہی سبب ہے کہ ترقی پسند تحریک کی پالیسیوں سے جب انہوں نے اختلاف کیا تو وہ تحریک سے نکال دیئے گئے۔ صحافی ہونے کے ساتھ ساتھ ناول نگار، افسانہ نگار، ڈرامہ نگار اور فلم ساز بھی تھے۔ پڑھنے لکھنے کا انہیں بچپن سے شوق تھا اور کیوں نہ ہو ان کے گھر میں جو پڑھنے لکھنے کا ماحول تھا۔ ان کے گھر میں گھر کی عورتیں ناول باواز بلند پڑھتی تھیں۔ خواجہ صاحب ان کی زبانی ناول سنا کرتے تھے۔ اس کے بعد انہیں ناول پڑھنے کا شوق ہوا۔ ”گودڑ کا لعل“ اور ”فسانہ آزاد“ تو وہ آٹھ برس کی عمر ہی میں پڑھ چکے تھے۔“

مصنف عباس رضا نیر نے خواجہ صاحب کی مختلف الجہات خدمات کا جو احاطہ کیا ہے وہ جامع ہونے کے باوجود تشنگی کا احساس دلاتا ہے ممکن ہے کہ ضخامت کے خوف سے انہوں نے ایسا کیا ہو۔ ان کے ایک مشہور ناول ”اندھیرا اجالا“ جس میں خواجہ صاحب نے فلم صنعت کی سرمایہ دارانہ ذہنیت اور استحصالی مزاج کو موضوع بنایا ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

”اندھیرا اجالا“ میں فلم صنعت کی سرمایہ دارانہ ذہنیت اور فلمی سرمایہ داروں کے ہاتھوں ہونے والے ہر سطح پر استحصالی موضوع بنایا گیا ہے۔ ناول میں خواجہ صاحب نے دکھایا ہے کہ اس استحصالی کے بدترین شکار وہ چھوٹے چھوٹے ملازمین ہیں جن کی بے انتہا محنت سے فلمیں بنتی ہیں۔ ان کی محنت سے بنی ہوئی فلموں سے ایک طرف فلم سازوں، ہدایت کاروں اور اداکاروں کی تجوریاں بھرتی ہیں تو دوسری طرف چھوٹے اداکاروں اور ملازموں کو اتنا بھی نہیں ملتا کہ وہ صحیح

ڈھنگ سے دو وقت کی روٹی کھائیں۔ یہاں کا کوئی مذہب، دھرم اور ضابطہ اخلاق نہیں ہے۔ فلموں میں اکسٹرا کا رول کرنے والی لڑکیوں کا جنسی استحصال اوپر سے نیچے تک کے لوگ کرتے ہیں۔ یہاں اچھائی برائی، اونچ نیچ کا معیار مذہب یا دھرم نہیں بلکہ روپیہ اور صرف روپیہ۔“

مجموعی طور پر اس کتاب کے ذریعہ خواجہ احمد عباس کی زندگی کے مختلف پہلوؤں کو جس طرح سے واضح کیا گیا ہے اس سے بلاشبہ خواجہ صاحب کی تفہیم بہت آسان ہوگئی ہے اور مصنف اپنے مقصد میں کامیاب نظر آتے ہیں۔ مادیت پرستی کے اس دور میں جس نے عوام الناس کو ادب اور اخلاقی اقدار سے بے حد دور کر دیا ہے جس کے نتیجے میں نئی نسل کو ان شعرا و ادبا اور محققین سے کوئی دلچسپی نہیں رہ گئی ہے۔ آسان اور سہل اسلوب میں تحریر کی گئی یہ کتاب اپنی جانب ان کی توجہ مبذول کرنے میں ضرور کامیاب ہو سکتی ہے۔ ایوان ادب میں اس کتاب کا خیر مقدم ہونا چاہئے، ہم مصنف کی اس تحقیقی کاوش کی ستائش کرتے ہیں۔

☆☆☆

عباس شناس: عباس

سیدہ فاطمہ عریضی

رات کی بھیا نک تاریکی، ہوا کی سنسناہٹ اور ہولناک سکوت میں یکا یک ایک خوشگوار تبدیلی ہونے لگی۔ افق عنقریب ہی خورشید کے نمودار ہونے کی اطلاع دے رہا تھا۔ امید کی ایک روشن کرن پھوٹی نظر آئی۔ وہ جواتنے سالوں سے تاریکی، گھٹن اور خاموشی کے دبیز پردوں میں لپٹا سویا ہوا تھا، ایک خوشگوار اور بامقصد زندگی کے احساس سے اپنے ہونٹوں پہ ایک دلفریب مسکراہٹ سجا کر ایک بھرپور انگریزائی لیتا ہوا اپنی جگہ سے اٹھ بیٹھا۔ وہ اپنے ارد گرد کے ماحول کو سمجھنے کی کوشش کر رہا تھا۔ وہ اس حیرت انگیز مگر دلچسپ تبدیلی سے لطف اندوز ہو رہا تھا۔ یکا یک اسے اپنا آپ بہت ہی معتبر اور اہم لگنے لگا۔ اسے یہ محسوس ہو رہا تھا کہ اس کے جذبات و احساسات کو سمجھنے والا، اس کے ذہن و دماغ تک رسائی حاصل کرنے والا، اس کے اصل مقصد تک پہنچنے والا اور اس کی باتوں کی اصل افہام و تفہیم کرنے والا کوئی دانا شخص اس کے وقت کے ساتھ کمزور پڑے وجود کو سنبھالنے کے لیے آگیا ہے۔ ایک ایسا شخص جس نے اس کے آگے کی زندگی کو زندہ جاوید رہ جانے کی کافی حد تک کوشش کی، اس کی موت کے آگے سینہ تان کے کھڑا ہو گیا ہے۔ وہ اپنے اس محسن شخص کو جاننا چاہتا ہے کہ آخر وہ کون نرم دل معزز، مہربان ہے جو اس کے لیے یہ جنگ لڑ رہا ہے۔

ادھر ادھر مختلف جگہوں پر کافی تلاش کرنے کے بعد بھی اسے ایسا کچھ بھی نظر

نہیں آیا جس کی بنا پر وہ اس تبدیلی کا راز معلوم کر سکے۔ تبھی اس کی نظر ایک ایسے کتابی نسخہ کی طرف جاتی ہے جس کا ہر ورق اس سے جدا ہو چکا تھا۔ وہ کتاب اٹھالیتا ہے اور اس کا پہلا ورق ”حیات و شخصیت“ اپنے سامنے کھول کر بیٹھ جاتا ہے۔ اس کی آنکھوں کے سامنے آج سے تقریباً سو سال پہلے (۱۹۱۴ء) کی دنیا ایک فلم کی طرح چلنے لگتی ہے۔ جس میں اسے اپنا حسین بچپن اور زندگی کی حسین ترین یادیں نظر آتی ہیں۔ اس کے والد، نانا، دادا، مخلص ماں، محبوب بیوی اور اس کی اکلوتی چہیتی بیٹی ”روشی“ جسے اس نے دنیا سے چھپا کر رکھا تھا۔ غرض کہ اسے اپنا پورا خاندان موجود نظر آتا ہے۔

اس کی پڑھائی کا زمانہ اسکرین پر مختلف خوبصورت رنگ بکھیرتا جلوہ افروز ہوتا ہے۔ جہاں اس کے نانا اور والد اس کی تعلیم و تربیت میں مصروف و مگن ہیں۔ علی گڑھ یونیورسٹی کا ماحول بھی نمودار ہوتا ہے جہاں وہ اردو اور انگریزی کے ایک زبردست مقرر کے روپ میں نظر آتا ہے۔ اس کے ادبی و تعلیمی ساتھی اور ہم عصر بھی اپنے اپنے کاموں میں سرگرم عمل نظر آتے ہیں۔ اس کے عزیز ہیر و جواہر لال نہرو اور گاندھی جی بھی آزادی کے لیے جدوجہد کرتے لوگوں کو بیدار کرتے نظر آتے ہیں۔ اور پھر خود اس کی زندگی جو مسلسل مصروف رہنے والی تھی بڑی خوبصورتی کے ساتھ صفحات پر بکھری افشاں کی مانند خوشگوار حیرت میں ڈال دیتی ہے۔

کبھی وہ ”علی گڑھ میل“ لکھ رہا ہے۔ کبھی ممبئی میں ”ممبئی کرانیکل“ کا آخری صفحہ، کبھی ”بلٹرز“ میں آزاد قلم لکھ کر لوگوں کو اپنا گرویدہ بنا رہا ہے، کبھی ”نیشنل کال“ کے ایڈیٹر کا عہدہ سنبھال کر بلا معاوضہ کام کر رہا ہے۔ کبھی اپنے ساتھیوں کے ساتھ مل کر ”دی علی گڑھ اپینین“ جاری کرنے کی کوشش کرتا نظر آ رہا ہے۔ تو کبھی لڑکیوں کی تعلیم کے سلسلہ میں مختلف اخبارات کو ”جہاں آراء“ کے فرضی نام سے خط بھیج کر روشن خیال دانشوروں کی حمایت حاصل کر رہا ہے۔ اور ساتھ ہی جواہر لال نہرو سے متاثر ہو کر دنیا کے دیگر ممالک کے ادباء اور دانشورانِ ادب سے تبادلہ خیال کرنے کی غرض سے سفر کر رہا ہے۔

اس جادوئی نسخہ میں اس کی وہ زندگی صحافی، سیاسی اور فلمی دنیا سے وابستہ بڑی واضح اور قریب سے دکھائی دے رہی تھی۔ ”ممبئی ٹاکیز“ کی فلموں کی پبلسٹی کا کام، اشوک کمار اور دیوکارانی سے ملاقات، فلمی رسالہ ”فلم انڈیا“ میں فلم نقاد کی دعوت کو قبول کر کے ”فلم جرنلسٹ ایسوسی ایشن“ کا قیام، اس کے بینر ”نیاسنار“ کے زیر سایہ بننے والی کامیاب فلمیں وغیرہ۔ اس کی مختلف فلموں کو مختلف ممالک سے ملنے والے مختلف ایوارڈس، فلمی دنیا کے مختلف ادارے جن سے وہ وابستہ تھا۔

مصنف اس کی شخصیت، اس کے فن اور اس کی تمام خوبیوں اور خامیوں کو اس کے ہم عصروں اور بڑے بڑے دانشوروں کے قلم کے حوالے سے متعارف کروا رہا تھا۔ خود اس کا محسن اس کی شخصیت کو کتنے دلکش اور پراثر الفاظ میں بیان کر رہا ہے اس کا کرم فرما اس کے بارے میں بتاتا ہے کہ:

”خواجہ صاحب میں چند کمزوریاں بھی تھیں۔ ان میں خود سری تھی، ضد اور ہٹ دھرمی تھی۔ ان بشری کمزوریوں سے قطع نظر وہ بے حد پر خلوص، نفیس اور ایماندار آدمی تھے۔ وہ ایک بہت ہی اچھے شوہر اور محبت کرنے والے سرپرست تھے انھوں نے کبھی کسی کے ساتھ جھل کپٹ نہیں کیا۔ ذاتی پر خاش کو دشمنی میں نہیں بدلہ اور اچھے ہتھیاروں سے بدلا نہیں لیا۔ اپنوں اور غیروں کے ہاتھوں ان پر جیسی سنگ باری ہوئی۔ اس کی مثال ملنا مشکل ہے لیکن انہوں نے سب کچھ خوش طبعی سے برداشت کیا کیونکہ انہیں اپنی ذات پر اعتماد تھا۔ انہوں نے کسی کے خلاف مضامین نہیں لکھے اور نہ کسی مخالف کو اپنے اعصاب پر سوار کیا۔ ادبی چشمکوں کے لیے ان کے پاس وقت ہی نہیں تھا۔“

(خواجہ احمد عباس: عباس رضائیرص ۳۵۰)

اس کے لیے ایسی سچی گواہی تو ابھی تک کسی نے نہ دی تھی۔ اس مہربان شخص کی گواہی نے اسے بے انتہا خوشی عطا کی تھی۔ ذرا پھر اس کی زندگی کے آخری ایام اور بیماریوں کا ذکر کر کے اس کی زندگی کے خاتمہ کا ذکر ترقی پسند ادب کے شدید مخالف رسالہ ”شب خون“ کا خراج عقیدت پیش کرتے ہوئے گویا اس کی عظمت کا اعتراف کر دیا ہے۔

وہ جو کوئی بھی ہے اس نے اس کی زندگی کے تقریباً تمام چڑھاؤ اتار کو اسی زریں کتاب میں کمال مصوری کے ساتھ رنگ دیا ہے۔ اس محسن نے اس کے سینہ پہ رکھے ایک بھاری بوجھ کو اتار دیا ہے جسے وہ پچھلی ایک صدی سے خود پر محسوس کر رہا تھا۔ واقعی یہ پہلا ایسا بندہ ہے جس نے مجھے میرے مقصد کو میرے پیغام کو فن کے دائرے سے نکل کر بھی دیکھا ہے۔ مجھے میرے طریقہ سے سمجھنے اور دکھانے کی کوشش کی۔ میری مجبوریوں کو سمجھ کر میری زندگی کی تلخ حقیقتوں اور رازوں کو بڑی آہستگی اور سلیقہ سے منکشف کیا ہے۔ سچ میں اپنے اس محسن کا احسان کبھی نہیں اتار سکتا۔ اور اتاروں گا بھی کیسے۔ کیونکہ میرا وجود تو موت کی نیند سوچکا ہے، میں تو دنیا کے لیے مرچکا ہوں۔ لیکن ہاں آج میں اپنی تخلیقات کو اپنے ادبی سرمایے کو اس موت سے دور بہت دور دیکھ رہا ہوں کیونکہ میرے اس مہربان دوست نے میرے خزانہ کو دفن ہونے سے بچالیا ہے۔ یہی سب سوچتے ہوئے وہ اس کتاب کا دوسرا ورق جس کی پیشانی پر ”افسانہ نگاری“ کا عنوان جگمگا رہا تھا، کھولتا ہے اور یہ دیکھ کر فرط مسرت سے دیوانہ ہو جاتا ہے کہ کتاب کے خالق نے اس کے افسانوی سرمائے کے ۵۴ افسانوں کو اپنی نظر کرم سے نوازا ہے۔ ان افسانوں کو ہر پہلو اور ہر ہر زاویہ سے جانچا اور پرکھا ہے۔ ان پر صحت مند تنقید کر کے ان تمام افسانوں کو ایک نئی زندگی بخش دی ہے۔ مختلف افسانوں میں اس کے ذریعہ استعمال کی گئیں مختلف تکنیکوں کی نشاندہی کی ہے۔ اس کے مکالموں اور تحریروں سے نئے نئے مطالب و معانی نکالنے کی کوشش کی ہے۔ اس کتاب کا مصور اس کے افسانوں پر تنقیدی نظر ڈالتے ہوئے کہتا ہے:

”وہ سماجی حقیقت نگار ہیں اور ادب کے ذریعے محنت کشوں کی زندگی، ان کے مسائل، ان کی نفسیات، ان کے دکھوں اور جذبات و احساسات دکھا کر ان کی اصلاح کرنا چاہتے ہیں۔ بدلتے ہوئے ہندوستان میں محنت کشوں اور دبے کچلے لوگوں کی بدلتی ہوئی نفسیات اور سرے گئے اور فرسودہ نظام اقدار اور سماج سے نکلنے کی ان کی کوشش کو خواجہ صاحب دکھانا چاہتے ہیں۔“

(خواجہ احمد عباس: عباس رضانی ص ۱۰۶-۱۰۱)

یہ بھی نہیں بلکہ اس راوی نے اس کے ادب کے تعین قدر کے لیے معروف و مشہور ادیبوں، نقادوں اور دانشوران ادب کی تحریروں اور تنقیدوں کو بطور دلیل یکجا کر کے پیش بھی کیا ہے جو ان حضرات نے اس کے افسانوں اور ناولوں کے لیے تحریر کی ہیں۔ اس کی ”افسانہ نگاری“ کو مصنف کی خاص توجہ حاصل رہی ہے۔ وہ خود اس کے افسانوں کے لیے کی گئی محنت و کوشش اور اس کے افسانوں کی اہمیت و معنویت کو اجاگر کرتے ہوئے صفحہ بھر طاس پر کچھ اس قسم کی مصوری کرتا ہے۔

”کرشن چندر کے بعد انہوں نے اردو کے افسانوی ادب میں بے شمار تجربے کئے اور اس صنف کے امکانات کی تلاش و جستجو میں لگے رہے ان کے افسانوں میں موضوع اور تکنیک دونوں سطحوں پر تنوع کا احساس ہوتا ہے۔ ان کے افسانوں میں اس عہد کی سیاسی و سماجی زندگی کی عکاسی ملتی ہے۔ خواجہ صاحب کے افسانے ”ابابیل“، ”سردار جی“، ”اجنتا“، ”سلمہ اور سمندر“، ”ہولی“، ”چڑھاؤ اتار“، ”رادھا“، ”اختیار“، ”بارہ گھنٹے“ اور ”فین“ شدت تاثر کے اعتبار سے ایسے افسانے ہیں جن کے وسیلے سے خواجہ صاحب کا نام ترقی پسند افسانہ

نگاروں میں ہمیشہ احترام سے لیا جائے گا۔ افسانے کی کوئی بھی تاریخ اور کوئی بھی انتخاب خواجہ صاحب کے بغیر مکمل نہیں ہو سکتا۔“

(خواجہ احمد عباس: عباس رضانیہ ص ۱۵۸)

اسے فضا کچھ اور خوشگوار محسوس ہونے لگتی ہے۔ ہوا کہ خنکی اسے لطف اندوز کر رہی تھی۔ کہیں سے اٹھنے والی سوتیا کی بھینی بھینی خوشبو اس کے نتھنوں کو چھیڑ رہی تھی۔ صبح کا ذب کا سحر انگیز جلوہ فضا کو اور مسحور کن بنا رہا تھا۔ اور یہ سب شاید اس کی روح کی سرشاری اور پرسکون ہوتے ذہن و دماغ کا اثر بھی تھا جو وہ ہر شے میں ایک عجیب خوش کن تبدیلی محسوس کر رہا تھا۔ وہ ایک نئے تجسس کے ساتھ اپنے سامنے رکھی عزیز کتاب کا اگلا باب ”ناول نگاری“ کھولتا ہے۔

وہ کتاب کی اسکرین پر دیکھتا ہے کہ ادب شناس مصنف اس کے ساتھ ناولوں کو تنقیدی نظر سے دیکھ رہا ہے۔ وہ اس کے ناولوں کا بغور مطالعہ کر کے ان کی گہرائی تک اترنے کی کوشش کر رہا ہے اور کافی تفصیل سے گفتگو کر رہا ہے۔ اس کے ناولوں پر کام کرنے والوں کی تحریروں، تنقیدوں اور نظریوں میں سے کچھ کی مخالفت اور کچھ کی حمایت بھی کر رہا ہے۔ جہاں اس کے کرم فرمانے اس کے ناولوں کو ان کی دلچسپ پیشکش، پراثر انداز بیان کی بنا پر قابل ذکر بتایا ہے تو وہیں اس کے ناولوں کی فنی اعتبار سے ناکامیابی کے کئی وجوہات بھی بیان کیے ہیں جو کافی حد تک صحیح ثابت ہوتے ہیں۔ وہ اظہار خیال کرتا ہے کہ:

”اس قدر ناول لکھنے کے بعد انہیں پختہ، مشاق ناول نگار قرار

دینے میں تامل نہیں ہونا چاہئے۔ خواجہ صاحب ایک ممتاز فلم ساز بھی تھے اور انہوں نے اپنے زیادہ تر ناول فلم سازی کے لیے لکھے جس میں تھوڑی بہت تبدیلی کے بعد ناول کی شکل میں بھی شائع کر دیا۔ ان کے ناولوں کو پڑھتے وقت یہ محسوس ہوتا ہے کہ قلم تو فنکار کے ہاتھ میں ہے

لیکن اس کا دماغ اسکرین پر ہے۔ اس کے علاوہ صحافتی رنگ ان کے ناولوں پر غالب آ گیا ہے جس کے سبب ان کے ناول فنی بلندیوں تک پہنچنے سے قاصر نظر آتے ہیں۔“

(خواجہ احمد عباس: عباس رضانیہ ص ۲۷۶)

اور سب سے عظیم قول تو اس کا وہ ہے جو وہ اس کے پہلے ناول ”انقلاب“ کے بارے میں دانشوران ادب کی تحریروں اور تنقیدوں پر جو اس ناول سے تعلق رکھتی ہیں، پر خامہ فرسائی کرتے ہوئے کہتا ہے کہ:

”انقلاب خواجہ احمد عباس کا ایک کامیاب ناول ہے۔“

(خواجہ احمد عباس: عباس رضانیہ ص ۲۷۷)

وہ اب ناول کی دنیا میں سراٹھا کر جی سکے گا۔ اس کی خوشی اور انبساط کی کیفیت خود اس کو محفوظ ہونے پر مجبور کر رہی تھی۔ اپنی دوسری ادبی خدمات کا نتیجہ جو اس شخص نے اخذ کیا تھا۔ جلد از جلد دیکھنے کے تجسس نے اس کے ہاتھوں کو ایک اور ورق الٹنے پر مجبور کر دیا۔ اگلے صفحے پر جب وہ اپنی نگاہ مرکوز کرتا ہے تو وہ دیکھتا ہے کہ مصنف نے اس کی ”ڈرامہ نگاری“ سے متعلق اس کے چھ عدد ڈراموں کی تکنیک، تجربات اور ڈرامہ کے لیے کی گئی اس کی مختلف کوششوں کو مد نظر رکھتے ہوئے اس کے فن کو پرکھا ہے اور ممتاز نقاد ”عطیہ نشاط“ کی متوازن تنقیدی تحریروں کے ذریعہ اس کے ڈراموں کی فنی قدر و قیمت کا تعین کرتے ہوئے کہتا ہے:

”خواجہ صاحب نے زیادہ تر یک بابی ڈرامے لکھے ہیں۔

فنکارانہ صلاحیت اور نئے تجربات کی اساس پر اس میدان میں بھی ان کو خاطر خواہ کامیابی ملی ہے“

(خواجہ احمد عباس: عباس رضانیہ ص ۲۷۷)

پانچواں باب اس کی ”صحافت نگاری“ کے پیچھے کارفرما اس کی حب الوطنی، قوم پرستی، امن پرستی اور اخوت و محبت کے جذبے کی گواہی پر منحصر نظر آیا۔ مصنف اس کی صحافت اور شخصیت کی ترجمانی کرتے ہوئے اس کے ادب کو اور خاص طور سے اس کی صحافت سے وابستہ تصانیف قاری کو ازسرنو پڑھنے اور اس کے ادب کو اس کی زندگی کے آئینہ میں دیکھنے کی دعوت دیتا ہے۔ وہ اس کی شخصیت اور ادب کی متعدد گرہیں کھولتا ہوا قاری کو مخاطب کرتا ہے۔

”خواجہ احمد عباس جبر و استبداد اور ظلم و استحصال کے بہت بڑے مخالف تھے۔ انہوں نے ہمیشہ مظلوموں کی حمایت کی۔ وہ سرمایہ داروں، استحصال کرنے والوں اور ظلم و جبر کرنے والوں کے خلاف پر زور احتجاج کرتے تھے۔ انہوں نے جس قلم کو آزادی سے پہلے سامراج کے خلاف استعمال کیا تھا آزادی کے بعد اس کو فکری و سماجی انقلاب کے لیے استعمال کیا۔ وہ قومی یکجہتی، سیکولرزم اور سوشلزم کا درس دینا چاہتے تھے۔ دراصل وہ انسانیت کے علمبردار تھے۔ وہ یہ سمجھتے تھے کہ عالمی امن و مساوات اور اخوت و محبت کے بغیر حقیقی ترقی ممکن نہیں ہے۔ لہذا انہوں نے دنیا کے ہر کونے میں ہونے والے ظلم و جبر اور استحصال کے خلاف احتجاج کیا اور ہمیشہ ایک فکری جنگ میں مصروف رہے۔

خواجہ احمد عباس چاہے صاحب طرز افسانہ نگار یا ناول نگار رہے ہوں یا نہ رہے ہوں لیکن وہ صاحب طرز صحافی ضرور تھے۔ صحافت ہی کے وسیلے سے ان کی شہرت و مقبولیت ملک کی سرحدوں سے آگے بڑھ گئی تھی۔ آزاد قلم کے مضامین میں خواجہ صاحب کی رائے سے تو اختلاف کیا جاسکتا ہے لیکن ان کے خلوص سے انکار ممکن نہیں ہے۔“

(خواجہ احمد عباس: عباس رضانیہ ص ۱۲۵-۱۲۷)

دل کے بدلتے موسم نے قدرت کے خوبصورت مناظر کو کچھ اور حسین بنا دیا تھا۔ آسمان کے سرگیں آٹھل سے سورج کی ہلکی، نازک اور نرم کرنیں زمین پر اترنے کے لیے چل رہی تھیں۔ ہوائیں سمندر سے ٹھنڈا مستعار لے کر اس کے ارد گرد خنکی بکھیرتی پھر رہی تھیں۔ آسمان مختلف خوبصورت رنگوں سے سجا ہوا تھا۔ ہر طرف ایک مسکون کن سکوت اور سکون تھا۔ وہ پھر اپنے سامنے رکھی کتاب پر جھک گیا جواب اسے بے حد عزیز ہو گئی تھی۔

کتاب کے چھٹے باب نے اس کی آنکھیں شکر کے آنسوؤں سے بھر دیں کیونکہ خواب کی دنیا میں اس کا محسن اس کی محبوب تصنیف اس کی ”خودنوشت“ lam not an island کے بارے میں رقم طرازی کر رہا ہے۔ اس نے اس کی خودنوشت کا مکمل غور سے جائزہ لے کر اس کی خوش کن تعبیر و تفہیم کرتے ہوئے اس کی محبوب تصنیف کے بارے میں لوگوں کو بتایا ہے۔

”مختصر یہ کہ یہ خودنوشت نہ صرف خواجہ صاحب کی ذاتی اور نجی زندگی اور ان کے سیاسی، سماجی، تہذیبی اور معاشی نظریات کو پیش کرتی ہے بلکہ تحریک آزادی کی مختلف بڑی شخصیتوں، عوامی تحریکات اور واقعات کو بھی اپنے دامن میں سمیٹے ہوئے ہے۔ آزادی سے ۲۵ برس پہلے کا ہندوستان اور آزادی کے ۲۵ برس بعد کا ہندوستان اپنی پوری آب و تاب کے ساتھ اس خودنوشت میں موجود ہے۔ اس اعتبار سے اسے ایک دستاویزی حیثیت بھی حاصل ہو گئی ہے۔“

(خواجہ احمد عباس: عباس رضانیہ ص ۲۵۷)

اگلے باب میں لفظوں کے مصور نے اس کے ”سفرنامہ“ ”مسافر کی ڈائری“ کو مد نظر رکھتے ہوئے اس کتاب کو کینوس بنا کر صفحہ قرطاس پر مختلف لفظوں کی آمیزش سے خوبصورت نتیجہ نکال کر لوگوں کے روبرو کیا۔ اس کا خاکہ کچھ یوں ہے:

”اس سفر نامے کی زبان و بیان دلکش اور جاذب نظر ہے۔ اس میں بے جا طوالت سے گریز کیا گیا ہے۔ چھوٹے چھوٹے جملوں میں بڑی بڑی باتیں کہہ دی گئی ہیں۔ کہیں کہیں مناظر قدرت کی عکاسی کے وقت خواجہ صاحب کے اندر کا ادیب جاگ اٹھا ہے۔ خاص طور پر صبح و شام کے مناظر کے بیان میں۔ واقعات کے بیان میں خواجہ صاحب نے کہیں کہیں لطیف طنز و مزاح سے کام لیا ہے جس سے یہ سفر نامہ پر لطف اور دلچسپ بن گیا ہے۔ ایک خاص بات یہ ہے کہ ہر واقعے میں خواجہ صاحب نے اپنی فطری خاکساری سے کام لیا ہے اور اپنی ذات کو کم سے کم نمایاں کیا ہے۔ اس طرح وہ سفر نامے کا حصہ ضرور ہیں لیکن اس کا مرکز نہیں۔“

(خواجہ احمد عباس: عباس رضانیہ ص ۲۷۱-۲۷۲)

اس مہربان ادب شناس نے اس کے سفر نامہ کو اردو کے اچھے سفر ناموں میں سے ایک قرار دیا ہے۔ اس میں شامل دلچسپ و اہم واقعات سے متعلق مختلف تحریروں کے ذریعہ اس کے سفر نامہ کو ایک کامیاب، اہم اور دلچسپ سفر نامہ قرار دیا۔ سورج نے رات کا لمبا سا گھونگھٹ الٹ دیا تھا اور بڑی شرکیں نگاہوں سے دنیا کا نظارہ کرنے میں مصروف تھا۔ چڑیاں اس کی حالت سے لطف اندوز ہو کر آپس میں سرگوشیاں کر رہی تھیں، پھول اور کلیاں محظوظ ہو کر ایک دوسرے کی طرف دیکھ کر مسکرا رہی تھیں۔ اور ہوا بھی سرشار ہو کر سبزے کے ساتھ اٹھیلیاں کھیل رہی تھی، اسے دنیا بہت خوبصورت لگ رہی تھی۔ ہر طرف خوشی ہی خوشی اور پیار ہی پیار۔ ہوا کے دوش سے عزیز کتاب کا آخری حصہ ”ماحصل“ بھی کھل گیا۔ اس باب میں مصنف نے اس کی شخصیت، سوانح اور فن کا مجموعی جائزہ لے کر قارئین کو اپنی رائے سے مستفید کیا۔ اس نے اس کے افسانوں کے لیے ایک خوبصورت تحریری تحفہ پیش کیا۔

”اگر غلام عباس صرف ”آندی“ کی شہرت اور مقبولیت کے سبب افسانوی ادب میں زندہ رہ سکتے ہیں تو خواجہ صاحب اپنے آدھے درجن سے زیادہ افسانوں کے سبب ہمیشہ یاد رکھے جائیں گے۔“

(خواجہ احمد عباس: عباس رضانیہ ص ۲۷۱)

اس کے ناولوں کو اہمیت و معنویت کا حامل قرار دیتے ہوئے دلیل دے رہا ہے کہ: ”بہر کیف تحریک آزادی کے ناولوں میں خواجہ صاحب کا“ انقلاب“ ایک منفرد مقام ضرور رکھتا ہے اور اس حوالے سے خواجہ صاحب کا شمار نمائندہ ترقی پسند ناول نگاروں میں ضرور کیا جائے گا۔“

(خواجہ احمد عباس: عباس رضانیہ ص ۲۸۰)

اور پھر اس کی ادبی زندگی کا خوبصورت حصہ اس کی صحافت نگاری کے بارے میں رطب اللسان ہے۔

”خواجہ صاحب کی ایک حیثیت ممتاز صحافی کی ہے۔ ان کی رگوں میں صحافت خون کے ساتھ ساتھ دوڑتی تھی۔ صحافت ان کا شوق تھا جو آخری سانس تک قائم رہا۔ صحافت ان کا سرمایہ حیات تھا اور راز حیات بھی۔ ان کی زندگی کی ساری تگ و دو صحافت کے ڈگر سے ہو کر گزرتی تھی۔“

(ص ۲۸۰)

”خواجہ صاحب نے اپنے آزاد قلم کے ذریعے اردو صحافت کے معیار اور وقار کو بلند کیا۔ انہوں نے اردو صحافت کو ایک نیالب و لہجہ اور ایک نئی سمت و رفتار عطا کی۔ اردو صحافت میں آزاد قلم کی اپنی الگ شناخت ہے۔“

(خواجہ احمد عباس: عباس رضانیہ ص ۲۸۱)

اس کے لیے اتنا کچھ کر دینے کے بعد بھی وہ کتنی خاکساری، انکساری اور عاجزی کے ساتھ اپنی تخلیق کے آخری اقتباس میں کہہ رہا ہے:

”کسی بھی فن پارے یا شخصیت پر کوئی تحریر حرف آخر نہیں ہوتی لیکن ہر تحریر میں فن پارے کے نئے نکات اور شخصیتوں کے نئے پہلوؤں کو اجاگر کرنے کی کوشش ضرور کی جاتی ہے۔ اس تحریر میں بھی خولجہ احمد عباس کے فکر و فن کی تعبیر و تفہیم کی کوشش کی گئی ہے۔ اب اس تحریر کی خوبیوں اور خامیوں کو اجاگر کرنا قارئین کی صوابدید پر منحصر ہے۔“

(خولجہ احمد عباس: عباس رضانیہ ص ۲۸۶)

اس نے آسمان کی طرف دیکھا۔ سورج مکمل طور پر آسمان کی دبیز چادر کی اوٹ سے نکل چکا تھا۔ ہر طرف چہل پہل اور زندگی کی رقص محسوس ہو رہی تھی۔ وہ اس خوبصورت کتاب کو اپنے سینے سے لگائے شہر خموشاں سے زندگی سے بھرپور افسانوں کے شہر کی طرف چل پڑا، وہ اپنے محسن کو ڈھونڈنے کا مصمم ارادہ کر چکا تھا۔ وہ اس محترم، معزز لیکن انجان شخص کا شکریہ ادا کرنا چاہتا تھا۔ شہر پہنچتے پہنچتے سورج سر پر چڑھ آیا تھا۔ سورج کی تمازت اسے جھلسا رہی تھی۔ وہ لوگوں کو کتاب دکھا کر اس کے مصنف کے بارے میں پوچھتا پھر رہا تھا۔ لیکن کتاب کا سرورق نہ ہونے کی بناء پر اسے کافی دشواریوں کا سامنا کرنا پڑ رہا تھا۔ کوئی بھی اسے واضح جواب نہیں دے رہا تھا۔ وہ کافی جدوجہد کرتا رہا لیکن اسے کوئی سراغ نہیں ملا۔ سورج اب ڈھلنے لگا تھا۔ وہ بہت تھک گیا تھا۔ مایوسی اس کے ذہن و دماغ پر ضربیں لگا رہی تھی۔ تب ہی ایک مہربان شخص نے اس کی حالت زار پر ترس کھا کر اس کی پریشانی کا سبب پوچھا۔ اس نے اول سے آخر تک اپنی تمام روداد بیان کر دی۔ تب اس مہربان شخص نے اسے بتایا کہ یہ تصنیف جسے تم نے اپنے ہاتھوں میں تھا ماہوا ہے، عصر حاضر کے معروف و مشہور ادیب و شاعر اور لکھنؤ یونیورسٹی کے

شعبہ اردو کے صدر ڈاکٹر عباس رضانیہ صاحب کی ہے۔

اس کی خوشی کی کوئی انتہا نہ رہی۔ وہ دیوانہ وار لکھنؤ یونیورسٹی کی طرف چل پڑا۔ سورج آسمان سے الوداعی کلمات ادا کر رہا تھا۔ پرندے اپنے گھروں کا رخ کر رہے تھے۔ یونیورسٹی پہنچ کر اسے معلوم ہوا کہ وہ بند ہو چکی ہے۔ اب اسے اپنے محسن کا گھر تلاش کر کے اس سے ملنا تھا۔ اب وہ عباس رضانیہ نامی شخص کا پتہ پوچھتا پھر رہا تھا۔ سورج اپنی ڈیوٹی ختم کر کے اپنے مسکن کا رخ کر چکا تھا۔ اور چاند اپنی خدمات انجام دینے کی غرض سے آسمان کی ستاروں بھری محفل میں قدم رنجہ فرما چکا تھا۔ لیکن اس نے اپنی تلاش کا دامن نہیں چھوڑا۔ کافی جدوجہد کے بعد وہ عباس رضانیہ نامی شخص کے گھر کا پتہ معلوم کرنے میں کامیاب ہو گیا۔ وہ اپنے ادب شناس مصنف سے ملنے کے لیے بہت جذباتی ہو رہا تھا۔ رات کا گہرا سناٹا اپنے عروج پر تھا اور وہ اپنے مصنف کی رہائش گاہ کے سامنے کھڑا اندر جانے کی ہمت جٹا رہا تھا۔

ہمت کر کے وہ اس کے گھر میں داخل ہوا۔ ہر طرف سناٹے کا راج تھا۔ شاید گھر کے تمام باشندے بخواب مصروف تھے۔ دھیرے دھیرے وہ تمام کمروں کا چکر لگاتا ہوا اپنے مصنف کے گوشہ عافیت میں داخل ہوا۔ سامنے ہی بیڈ پر اس کا مصنف نیند کی آغوش میں لیٹا ہوا تھا۔ کتنی سادہ، معصوم اور نرم دل انسان تھا وہ۔ اتنے بڑے بڑے کام کرنے والا شخص کتنی سادگی اور خاکساری کے ساتھ رہ رہا تھا۔ اس کے چہرے پر تکبر و نخوت کا شائبہ تک نہ تھا۔ بیڈ کے سر ہانے ٹیبل پر ایک اور کھلی کتاب رکھی ہوئی تھی۔ شاید اس کا مصنف سونے سے پہلے تک اس کا مطالعہ کر رہا تھا۔ وہ کمرے میں رکھی کتابوں کی الماری کی طرف گیا جس میں بے شمار قیمتی اور اہم کتابیں بڑے سلیقہ سے رکھی اس کے ذوق مطالعہ کی عکاسی کر رہی تھیں۔ وہ دبے قدموں سے چلتا ہوا خواب گاہ کی طرف آیا اور اپنے سینے سے لگی عزیز کتاب اسی میز پر رکھ دی۔ کیونکہ اب اس کتاب کی اسے

ضرورت نہیں تھی۔ اس نے میز پر سے قلم اٹھایا اور کتاب کے آخری صفحہ پر اپنے مصنف کے نام خط لکھنا شروع کر دیا۔

عزیزم عباس رضانیر

سدا خوش رہو۔

میں تمہارا بہت احسان مند ہوں۔ تمہاری اسی خدمت نے مجھے اردو ادب کی دنیا میں ایک پختہ مقام عطا کیا ہے۔ تمہاری تصنیف نے میرے ادب کو از سر نو پڑھنے اور سمجھنے کا جواز عطا کیا۔ میرے فن کی صحیح افہام و تفہیم اور تنقید و تعبیر کے لیے یہ تصنیف بے حد معاون و مددگار ثابت ہوگی۔ کیونکہ جس سطح پر تم نے مجھے سمجھنے اور جاننے کی کوشش کی ہے۔ میرے ادب کو ہر پہلو اور ہر زاویے سے جانچنے اور پرکھنے کی کوشش کی ہے۔ وہ صرف تم سے منسوب ہے۔ تم نے میرے ادب کو بے مقصد اور پیغام کو بغیر کسی تعصب اور طرف داری کے فن کے دائرے میں بھی اور اس سے نکل کر انسانیت کے دائرے میں بھی دیکھا۔ مجھے یقین ہے کہ تمہاری اس کاوش سے میرا ادبی سرمایہ ادب کی دنیا میں ایک خاص مقام حاصل کرنے میں کامیاب ہو سکے گا۔ اس کاوش نے مجھ پر کام کرنے والوں کے لیے مختلف نکات و جہات اور خیالات و افکار کے نئے دروازے و اکٹھے ہیں۔

تمہاری یہ تصنیف آگے کی نسلوں کے لیے مشعل راہ ثابت ہوگی اور عنقریب ہی میرے ادب کی تفہیم کے لیے یہ کتاب سنگ میل کی حیثیت اختیار کرے گی۔ جس کو عبور کیے بغیر کوئی بھی مجھ تک نہیں پہنچ سکے گا۔

خدا تمہیں زندگی کے ہر موڑ پر کامیابیوں کے خوبصورت تحائف سے نوازے اور تمہارے ادبی سرمایہ کو تاقیامت محفوظ رکھے۔

خدا حافظ

تمہارا

خواجہ احمد عباس

قلم میز پر رکھ کر اس نے ایک آخری، حسرت بھری نظر قریب سوئے ہوئے مصنف پر ڈالی اور سر جھکا کر اس کے آشیانے سے نکل گیا۔ اس کے قدم بڑی تیزی سے شہر خموشاں کی طرف بڑھ رہے تھے کیونکہ سورج آسمان سے ملاقات کے لیے بے قرار ہو رہا تھا۔ اور وہ سورج کے نکلنے سے پہلے اپنے مسکن میں ہمیشہ کے لیے ابدی نیند سونے کے لیے پہنچ جانا چاہتا تھا۔ کیونکہ اب اس کی ادبی زندگی کا سفر عباس رضانیر کے ہاتھوں شروع ہو چکا تھا۔

☆☆☆

سوانحی ناول کے امتیازات اور ”آزاد قیدی“

حبیب احمد صدیقی

ناول اردو ادب کی ایک ایسی صنف ہے جو حیات انسانی کو محیط ہے، فنی اعتبار سے اس صنف میں بڑی وسعت ہے، اور یہی وسعت اس صنف کا امتیاز بھی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ آج کے اس برق رفتار دور میں بھی یہ صنف اپنی آب و تاب کے ساتھ نہ صرف موجود ہے بلکہ روز افزوں نت نئے تجربے ہو رہے ہیں۔ سوانحی ناول اس صنف میں کوئی نئی چیز نہیں ہے، ایک اعتبار سے دیکھا جائے تو اکثر و بیشتر ناول کسی ایک ہی کردار کے ارد گرد گھومتے ہیں اور وہی اس کا اصل ہیرو ہوتا ہے اگر وہ کردار حقیقی دنیا سے تعلق رکھتا ہے تو اسے سوانحی ناول قرار دیا جاتا ہے۔ ایک ناول نگار کے لیے سوانحی ناول لکھنا آسان بھی ہے اور مشکل بھی، آسان اس طور سے کہ اس کو مواد کی فراہمی میں دشواری نہیں ہوتی بلکہ وہ حقیقت کو ایک خاص انداز میں فنکاری کے ساتھ قاری کے سامنے پیش کر دیتا ہے مشکل اس طور سے کہ وہ حقائق سے انحراف نہیں کر سکتا ہے، ایسے میں اس کو پلاٹ سنبھالنے میں بڑی دشواریاں ہوتی ہیں، دوسری بات یہ کہ اگر اس کا تعلق ماضی بعید سے ہو تو ایسی صورت میں پہلے اس کو ریسرچ کرنی پڑتی ہے اور حقائق کو جمع کرنا پڑتا ہے، یہ ریسرچ بھی بڑی دشوار کن ہوتی ہے، آرکائیو تک پہنچ

سب سے بڑا مسئلہ ہوتا ہے، دراصل وہ خود آرکائیو تک نہیں پہنچتا ہے بلکہ وہ قاری کو پہنچاتا ہے اور فنی اعتبار سے ایک خشک موضوع کو قابل اعتنا بناتا ہے۔ فنی اعتبار سے اس کو مشکل اس طور پر بھی ہوتی ہے کہ سوانحی ناول اپنے کردار کے زمان و مکان میں محدود رہتا ہے جس کی وجہ سے سوانحی ناول نگار اپنے تخیل کی پرواز کوشاہین کی پرواز کی بلندی تک نہیں لے جاسکتا ہے اس لئے وہ حسب ضرورت اس میں ترمیم سے قاصر رہتا ہے وہ تراش و خراش میں اپنی پوری فنکاری کا مظاہرہ نہیں کر سکتا ہے ہاں یہ ضرور ہوتا ہے کہ اسے جزئیات پر زیادہ سوچنا نہیں پڑتا بلکہ یہ مواد اس کے پاس وافر مقدار میں موجود رہتا ہے۔ سوانحی ناول کی ایک خوبی یہ بھی ہوتی ہے کہ وہ کرداری ناول ہوتا ہے، پورا ناول ایک کردار کے ارد گرد گھومتا ہے ایسے میں قصے میں اسی ایک خاص کردار کو استحکام بخشا جاتا ہے، اس کی بہترین مثال ڈپٹی نذیر احمد کا ناول ’ابن الوقت‘، مرزا سوا کا ناول ’امراؤ جان ادا‘ عصمت کا ناول ’ٹپڑھی لکیر‘ قرۃ العین حیدر کا ناول ’کار جہاں دراز ہے‘ اور قاضی عبدالستار کا ناول ’صلاح الدین ایوبی‘ وغیرہ ہیں۔ یہ وہ ناول ہیں جن میں قصے کے بجائے ایک کردار کو استحکام بخشا گیا، اب اسی کڑی میں ڈاکٹر عباس رضا نیر کا ناول ’آزاد قیدی‘ شامل ہو گیا ہے جو آزادی کے متوالے بھگت سنگھ کی زندگی پر مبنی ہے۔ اس ناول میں انہوں نے سب سے زیادہ سہارا آرکائیو کا لیا ہے تاکہ حقائق مسخ نہ ہونے پائیں۔

سوانحی ناول کو نہ تو مکمل سوانح قرار دیا جاسکتا ہے اور نہ ہی مکمل ناول کہا جاسکتا ہے، یہ ان دونوں کے مابین ایک کڑی ہوتی ہے۔ اس صنف کی مکمل تعریف ابھی تک علماء نہیں کر سکے ہیں۔ آکسفورڈ ڈکشنری میں سوانح کی تعریف یوں کی گئی ہے:

”سوانح حیات بطور ایک ادبی صنف کے کسی واحد کی زندگی کا تاریخی مطالعہ ہے۔“

اس تعریف پر اگر غور کریں تو یہ واضح ہوتا ہے کہ سوانح نگاری کسی کی زندگی کا مطالعہ ہے لیکن سوانحی ناول میں ادبی چاشنی ضروری ہے، ایک بات اور کہ یہ صرف زندگی کا ہی نہیں بلکہ اس کا تاریخی مطالعہ ہے تاریخی لفظ ہی اس تعریف کی شاہ کلید ہے۔ اس ضمن میں اگر آپ ڈاکٹر عباس رضانیر کے ناول 'آزاد قیدی' کا مطالعہ کریں گے تو دونوں حقائق بدرجہ اتم موجود ملیں گے ایک طرف جہاں انہوں نے بھگت سنگھ کی زندگی کا تاریخی مطالعہ کیا ہے اور زمان و مکان کے دائرہ میں رہ کر پیش کیا ہے وہیں انہوں نے اپنی بیانیہ نثر کے ذریعہ ادبی چاشنی بھر دی ہے، اس طرح ان کا یہ ناول سوانح اور ناول ہر دو اصناف پر مکمل طور سے کھرا اترتا ہے۔

کسی ناول کو سوانحی ناول بنانے میں کردار کی مرکزیت، حقیقی مراجع کی نشاندہی کے ساتھ ساتھ ناول میں حقیقی سنین کا استعمال ہوتا ہے، سوانحی ناول میں کردار کی پیدائش، اہم واقعات و حادثات کی پیش کش اگر یہ ناول کردار کی وفات کے بعد لکھا گیا ہو تو وفات کی تاریخ سوانح کے طریقے کے مطابق دی جاتی ہے، شاید ان ہی حقائق کی بنا پر اس کو سوانحی ناول کا نام بھی دیا جاتا ہے۔ ڈاکٹر عباس رضانیر نے اپنے اس ناول میں حقیقی سنین درج کیے ہیں لیکن فرسودہ انداز میں نہیں بلکہ ناول جو تخلیقی اچھ کا اعلامیہ ہوتا ہے اس کی پوری آب و تاب کے ساتھ۔ وہ لکھتے ہیں:

۱۹۰۷ء کے ماہ ستمبر کی ۲۷ ویں تاریخ تھی، کشن سنگھ، اجیت سنگھ اور سورج سنگھ تینوں بھائی الگ الگ جیلوں میں حب الوطنی کی سزا کاٹ رہے تھے۔ پنجاب کے چھوٹے بڑے، عورت و مرد گلی گلی بانکے دیال جی کا گیت گارہے تھے:

پگڑی سنبھال جٹا پگڑی سنبھال اوئے

ظالموں نے، جابروں نے لوٹ لیا مال اوئے

جبھی اپنی ماں و دیاوتی جی کے آنچل میں بھگت سنگھ نے آنکھیں کھولیں، آج

کتنی جلدی صبح ہوئی، دھند کی چادر کتنی جلدی سمٹ گئی، سورج کتنی جلدی نکل آیا، دادا ارجن سنگھ کو پالنے میں اس پوت کے پاؤں نظر آئے، دادی جے کور نے واہے گرو کی وندنا کی، پڑوس کی عورتوں نے تھالی بجائی۔ (آزاد قیدی)

اس طرح ڈاکٹر عباس رضانیر نے ایک خشک موضوع کو دلچسپ انداز میں پیش کیا کہ قاری اگر ایک جملہ پڑھے تو بس پڑھتا ہی چلا جائے۔

ناول بنیادی طور سے اپنے عہد کا رزمیہ ہے، قدیم کہانیوں اور داستانوں میں ہیر و کوئی امیر، وزیر اور شہزادہ ہوا کرتا تھا جو اپنے سے نہایت طاقتور دیو سے ٹکراتا اور فتح و کامرانی اس کی قسمت ہوتی تھی مگر زمانہ بدلا، نظام بدلا تو انسان کا مزاج بھی بدل گیا اس کو اب ایسے قصے اور کہانیاں اپنی طرف متوجہ نہیں کرتیں بلکہ اس کو وہ چاہیے جن کا تعلق حقائق سے ہو۔ ڈاکٹر عباس رضانیر کے ناول 'آزاد قیدی' کی ایک خوبی یہ بھی ہے کہ یہ اپنے عہد کا رزمیہ ہے، اس ناول کا ہیر و کوئی امیر و وزیر اور شہزادہ نہیں ہے لیکن جو اس ناول کا مرکزی کردار ہے وہ ان میں سے کسی سے کم بھی نہیں ہے، بلکہ سماجی لگاؤ اور محبت میں ان سے آگے ہے، اتنا ہی نہیں عہد قدیم میں جہاں تخیل سے ایسے جابر و ظالم دیو کا کردار خلق کیا جاتا تھا جن سے اصل کردار کی معرکہ آرائی ہوتی تھی جسے پڑھتے ہوئے قاری کے ذہن میں یہ حقیقت بھی ہوتی تھی کہ یہ صرف ذہن کی اچھ ہے جو قاری اور کہانی کے مابین رشتے کو کمزور کر دیتا تھا مگر یہاں ایسے دیو قامت اور جابر و ظالم حکومت سے بھگت سنگھ معرکہ آرائی کر رہے ہیں جو ایک حقیقت ہے ایسے میں قاری کا متن سے رشتہ مزید مضبوط ہوتا ہے۔ ڈاکٹر عباس رضانیر بنیادی طور سے تو شاعر ہیں لیکن حقیقی تخلیق کار صرف ایک صنف کا ہو کر نہیں رہ سکتا بلکہ اس کا تخلیقی و فوہر صنف کو اپنے دائرہ کار میں لینا چاہتا ہے اسی لئے انہوں نے افسانے بھی لکھے اور ناول بھی، یہ ان کا پہلا سوانحی ناول ہے جو فنی لوازم کے ساتھ قاری کے سامنے پیش کیا گیا ہے۔

سوانحی ناول کے باب میں سب سے پہلا سوال ابھر کر یہ آتا ہے کہ آخر سوانحی ناول لکھے کیوں جاتے ہیں؟ تو اس کے کئی وجوہ و اسباب ہیں۔ اول کردار کا تاریخی ہونا، دوم ناول کے فارم میں بیانیہ نثر کے استعمال کی گنجائش، سوم سوانح نگاری کی قید سے آزادی، چہارم ناول نگار سوانحی ناول میں تخیل کے استعمال میں آزاد ہوتا ہے، پنجم ایک ادیب حقیقت کو فنکارانہ انداز میں پیش کرنے میں جو خوشی محسوس کرتا ہے وہ سادہ واقعہ نگاری سے میسر نہیں ہو سکتی، ششم قاری ایک خشک موضوع کو دلچسپ انداز میں زیادہ دلچسپی سے پڑھتا ہے۔

ڈاکٹر عباس رضانیر کے ناول 'آزاد قیدی' کا جب ہم مطالعہ کرتے ہیں تو دیکھتے ہیں یہ سبھی مقصد پورے ہوتے ہوئے نظر آتے ہیں ان کے ناول کا کردار جہاں حقیقی اور تاریخی ہے وہیں انہوں نے پراثر انداز میں بیانیہ تحریر کیا ہے، جہاں جہاں ضرورت پڑی ہے انہوں نے مکالمات کا بھی سہارا لیا ہے لیکن یہ مکالمے اس بیانیہ نثر میں مزید دلچسپی پیدا کرتے ہیں۔ ڈاکٹر عباس رضانیر کی نثر کے یوں تو سبھی قائل ہیں مگر انہوں نے جس انداز میں اس ناول میں نثر کو برتا ہے وہ خاصے کی چیز ہے۔ اہم بات یہ کہ قاری جب متن کی قرأت کر رہا ہوتا ہے تو حالات اور سچویشن کے اعتبار سے اس کی ذہنی کیفیت مختلف ہوتی جاتی ہے اس کیفیت کو ابھارنے میں ڈاکٹر عباس رضانیر کی نثر اور ان کے بیانے کا بڑا کمال ہے۔ انہوں نے ایک حقیقی کردار ہوتے ہوئے بھی تخیل کا اس قدر استعمال کیا ہے کہ قاری داد دیئے بغیر نہیں رہ سکتا۔ مثلاً جس وقت بھگت سنگھ کی پیدائش ہوئی اس وقت ”پنجاب کے چھوٹے بڑے، مرد و عورت گلی گلی بانکے دیال جی کا گیت گارہے تھے اور انہوں نے وہ گیت بھی لکھ دیا۔ یہ ہے تخیل کی پرواز اور کردار سے قاری کو جوڑنے اور اس میں دلچسپی پیدا کرنے کی کامیاب کوشش۔ ڈاکٹر عباس رضانیر نے آرکائیو سے حقائق لئے اور ان حقائق پر اس ناول کی بنیاد کھڑی کی لیکن انہوں نے صرف سوانح نہیں لکھی بلکہ عمارت کے ستون حقائق

سے بنائے اور پھر اس کی دیواریں اور اس کا اندرون سب اپنے تخیل سے خلق کیا اور ایک فنکار کا یہی سب سے بڑا کمال ہوتا ہے کہ وہ حقائق سے چھیڑ چھاڑ نہ کرے اس کے باوجود سوانحی ناول تخلیقی ادب میں درجہ کمال حاصل کر لے۔ ابتدا میں میں نے چند کرداری ناولوں کا ذکر کیا تھا اس باب میں شمس الرحمن فاروقی کا ناول 'کئی چاند تھے سر آسمان' بھی شامل ہے انہوں نے بھی آرکائیو کا سہارا لیا اور حقائق کو پیش کرنے کی کوشش کی لیکن ان کے یہاں تخیل اس قدر زیادہ ہے کہ قاری یہ محسوس ہی نہیں کر پاتا کہ وہ آرکائیو ناول پڑھ رہا ہے یا پھر کوئی عام سا ناول ہے۔ اس ناول کے اچھا ہونے میں کوئی شبہ نہیں لیکن کسی بھی چیز کی زیادتی اس کو بدرنگ بھی کر دیتی ہے اور یہی اس ناول کے ساتھ ہوا ہے جبکہ 'آزاد قیدی' میں قاری کو نہ صرف اس بات کا احساس ہوتا ہے کہ وہ ایک حقیقی کردار پر مبنی ناول پڑھ رہا ہے بلکہ ناول نگار نے ایسی تکنیک استعمال کی ہے کہ ہر صفحہ پر وہ قاری کے سامنے ایسے حقائق پیش کر دیتا ہے جو قاری کو آرکائیو تک پہنچا کر باور کر دیتا ہے کہ وہ ایک ایسا ناول پڑھ رہا ہے جو صرف حظ کے لیے ہیں بلکہ اس میں علم بھی ہے۔ اس ناول میں سوانح کا سادہ انداز بھی نہیں ہے بلکہ واقعہ نگاری کے ساتھ ساتھ ان فنی لوازم کا التزام بھی ہے جو قاری کا رشتہ متن سے استوار رکھتے ہیں۔ انہوں نے اپنے اس ناول میں حقائق کے ساتھ ہی امکانی حقائق بھی پیش کئے ہیں جو سوانحی ناولوں کا اصل مقصد ہے۔

تاریخ ہمیشہ توڑ مروڑ کر پیش کی جاتی ہے اور تاریخ کی پیش کش میں خاص طور سے مورخ حکومت وقت کا بھی لحاظ رکھتے ہیں، آرکائیو میں بھی وہی چیزیں محفوظ ہوتی ہیں، ایسی صورت میں اس زمانے کے لوگ تو حقائق سے واقف ہوتے ہیں مگر جیسے جیسے وقت گزرتا جاتا ہے سینوں میں محفوظ حقائق ختم ہو جاتے ہیں اور ایک وقت ایسا آ جاتا ہے جب آرکائیو کو ہی سب کچھ تسلیم کر لیا جاتا ہے، اس میں کوئی شبہ نہیں کہ آرکائیو سچائی جاننے کا ایک بڑا ذریعہ ہے لیکن اس میں حکومت وقت ترمیم و تسیخ بھی کراتی ہے تاکہ ایک عرصہ

کے بعد اس پر انگلیاں اٹھنا بند ہو جائیں۔ لیکن جب ایک فنکار اپنا قلم اٹھاتا ہے تو وہ حقائق کے ساتھ امکانات کو پیش کر دیتا ہے، جس کو میں نے امکانات سے موسوم کیا ہے سوانحی ناولوں کا یہی ماحصل بھی ہے ورنہ اگر حصول علم ہی اس کا مقصد تھا تو ناول کی ضرورت ہی کیا تھی اس کے لیے آرکائیو کافی تھا لیکن امکانات کے ذریعہ ایک فنکار حقائق کی بازیافت کر کے ان کو محفوظ کر دیتا ہے اور اس فارمیٹ کی وجہ سے وہ ظالم و جابر حکومت کے ساتھ ان سے تعلق خاطر رکھنے والوں کے شر سے بھی محفوظ ہو جاتا ہے۔ ڈاکٹر عباس رضانیر نے بھی اپنے اس ناول ”آزاد قیدی“ میں جہاں آرکائیو سے حقائق جمع کئے ہیں وہیں انہوں نے امکانات کی شکل میں ان حقائق سے قاری کو رو برو کر دیا ہے جو آرکائیو میں نہیں ملیں گے۔

ڈاکٹر عباس رضانیر کے اس ناول میں صرف بھگت سنگھ کی ہی شخصیت نہیں ہے بلکہ ان کے ساتھیوں، راج گرو، سکھ دیوار، بٹو کیشو ردت کی بھی داستان موجود ہے۔ ان کا جوش و ولولہ اور ان کی حب الوطنی بھی کسی طرح بھگت سنگھ سے کم نہیں ہے لیکن چونکہ بھگت سنگھ اس دستے کے سرخیل تھے اس لئے یہ افراد ان کے متعلقات میں ہیں۔ جب ہم اس ناول کی قرأت کرتے ہیں تو جہاں ایک طرف سرفروشی کی تمنا لیے بھگت سنگھ ہر گام مقتل سے قریب تر ہو رہے ہیں اور وہ جان رہے ہیں کہ ان کا ہر قدم ان کو پھانسی کے پھندے کی طرف لے کے جا رہا ہے اس کے باوجود قدم روکنے کے بجائے وہ بڑھاتے چلے جاتے ہیں، وہیں دوسری طرف قاری کا سابقہ ایسے ایمان فروشوں سے بھی پڑتا ہے جو اپنی مادر وطن کے ساتھ غداری کر رہے ہیں، ان کی نظر میں عزت و دولت کی قدر وطن سے زیادہ ہے۔ ایسے لوگوں میں ہنس راج دوہرا سرفہرست ہے۔ ناول میں جسٹس آغا حیدر جیسا کردار بھی ہے جو ملزمان کے ساتھ نا انصافی کو جب نہیں برداشت کر پاتا ہے تو الگ سے کاغذ مگ کراس سماعت سے ہی خود کو بری کر لیتا ہے۔ یہ وہ کردار ہے جو انگریزوں کے ساتھ رہ کر ان کی ملازمت کر کے بھی ان کا غلام نہیں بنا، ایسے ہی کرداروں نے ظلم و جبر کے خلاف سسٹم میں رہتے ہوئے آواز بلند کی۔ ایک

طرف اگر بھگت سنگھ اپنے باغیانہ تیور کے ساتھ تھے تو دوسری طرف آغا حیدر جیسے لوگ سسٹم میں رہ کر ہونے والے مظالم کا حاکموں کو احساس دلارہے تھے۔

جدوجہد آزادی کے لیے قربان ہونے والے یوں تو سبھی جیالوں نے مسکرا کر پھانسی کا پھندا چوما لیکن بھگت سنگھ نے جو کیا وہ شاید کوئی نہیں کر سکا، دوسرے افراد نے حکمت عملی سے کام لیا لیکن بھگت سنگھ نے اس کو ہمیشہ غلط تسلیم کرتے ہوئے یہی بات کہی کہ میں جو بھی قدم اٹھا رہا ہوں اس کا مقصد صرف اتنا ہے کہ مجھ پر مظالم ہوں اور دنیا دیکھے، ہماری آرزوئے آزادی سے دنیا آگاہ ہو، عوام میں جوش و جذبہ پیدا ہو۔ بھگت سنگھ کبھی پڑمرہ نہیں ہوئے، وہ کبھی احساس کمتری کا شکار نہیں ہوئے، ان کی اصل تصویر کو ڈاکٹر عباس رضانیر نے ناول کے فارمیٹ میں بڑی خوبصورتی کے ساتھ پیش کیا ہے۔ شروع سے آخر تک ان کے تیور باغیانہ اور آزادانہ رہے، ڈاکٹر عباس رضانیر کا قلم بھی ان کے بغاوتی تیور کے ساتھ ہی چلا ہے۔ ناول کی قرأت کے وقت ایسا نہیں لگتا ہے کہ ہم کوئی ناول پڑھ رہے ہیں بلکہ ایسا لگتا ہے کہ ایک فنکار قلم سے اسکیچ بنا رہا ہے اور اس کے موئے قلم کے ساتھ ہماری نظریں چل رہی ہیں، جس طرح قاری سطروں پر نظریں بڑھاتے ہوئے آگے بڑھتا ہے اسی طرح اسکیچ مزید واضح ہوتا جاتا ہے۔

سوانحی ناولوں کا ایک مقصد اور ہوتا ہے کہ متعلقہ کردار سے سماج میں کوئی پیغام جائے، یہ پیغام اسی انداز میں جائے گا جس انداز میں ناول تحریر کیا گیا ہوگا، اگر ناول میں کوئی کمی ہے تو ترسیل مشکل ہو جائے گی، ایسی صورت میں مقصد فوت ہو جائے گا۔ ڈاکٹر عباس رضانیر نے اپنے سوانحی ناول کے لیے ایک ایسی شخصیت کا انتخاب کیا جس کی حب الوطنی مثالی ہے، ایسے میں اس ناول کا مقصد بھی جذبہ حب الوطنی کا فروغ ہی قرار پاتا ہے۔ انہوں نے فنی لوازم کے ساتھ ناول کو قاری تک پہنچایا ہے اس لئے وہ اپنے مقصد میں کامیاب ہیں۔

بہ طور ہیرو میں لکھا ہے:

”حقوق نسواں کی روشن خیال تحریک اور جدیدیت کے درمیان گہرا تعلق ہے دونوں عالمی جنگوں کے بعد جب سیمون دی بواڑ نے اس بارے میں لکھا تھا کہ اس کے نزدیک حقیقت میں عورت ہونے کا کیا مطلب ہے تو دراصل اس نے سارتر کی وجودیت کے تناظر میں ہی ایک نہایت سنجیدہ کام کا آغاز کیا تھا۔ سیمون نے جب دعویٰ کیا کہ اس کی جنس اس کی عملی زندگی میں کبھی رکاوٹ نہیں بنی تو سارتر نے کہا تھا کہ پھر بھی تمہاری پرورش لڑکے کی طرح نہیں ہوئی تمہیں اس مسئلے کا بھی بغور جائزہ لینا چاہئے، سیمون کی کتاب ”دوسری جنس“ اصل میں عورت کے موضوع پر سارتر کے فلسفہ وجودیت کے اطلاق کا ہی نتیجہ ہے یعنی کسی کتاب میں پہلی بار عورت کو نسبتاً واضح طور پر سامنے رکھا گیا ہے کم از کم اتنا ضرور ہوا کہ پہلی بار یہ تصور پیش کیا گیا کہ ہر فرد ایک مکمل خود مختار انسان کی حیثیت سے اپنی تکمیل کا آرزو مند ہوتا ہے اور وہ فکر و عمل کی پوری آزادی چاہتا ہے اس کا مطلب یہ ہوا کہ اگر کبھی یا کہیں کوئی کوتاہی ہو جائے تو فرد اس کا اخلاقی طور پر ذمہ دار ہوتا ہے اور بے عملی یا کسی غلط کام پر اس کا مجبور ہو جانا غلط اور بری بات ہے سیمون دی بواڑ کا خیال ہے کہ عورت مرد کے جبر و استبداد کی شکار ہے اور مرد نے عورت کا جو تصور قائم کر رکھا ہے عورت خود اس تصور کو قبول کر کے سنگین غلطی کی مرتکب ہوئی ہے صنف نازک کا پورا تصور یہی ہے جو صدیوں سے جاری ہماری تعلیم، ہماری تہذیب نے ہمارے اوپر مسلط کیا ہے عورت کے صنف نازک ہونے اور اس کی نسائیت کی جو مٹھ صدیوں سے چلی آرہی

آسمان میں سات قدم

عشرت ظفر

تانیثی ادب کی طرح طرح سے تشرکس و تعبیریں کی جاتی رہی ہیں اور یہ سلسلہ ہنوز جاری ہے لیکن سچ تو یہ ہے کہ اردو میں اب تک کوئی ایسی تشریح نہیں کر سکا جسے ذہن فی الفور قبول کر لے بیسویں صدی میں بہت سی قلم کار خواتین ہوئی ہیں انہوں نے لکھا بھی بہت کچھ ہے لیکن ہر قسم کی تحریر کو تانیثی ادب کے زمرے میں نہیں رکھا جاسکتا یعنی کسی خاتون قلم کار کی کوئی بھی تحریر تانیثی ادب کے زمرے میں نہیں آتی نہ ان مرد ادیبوں کی تحریروں کو تانیثی ادب کہا جاسکتا ہے جن میں خواتین یا ان کی خصوصیات کا ذکر ہوا ہو خواہ وہ شاعری ہو یا فکشن وہ تانیثی ادب نہیں ہے یہ خیال بھی فضول ہے کہ دانشوروں کے ڈرائنگ روموں میں بیٹھ کر تانیثی ادب کی تحریک پیدا ہوئی اور فیمینزم کے نام سے معروف ہوئی اس کے اثرات کو جن قلم کاروں نے قبول کیا خواہ وہ عورت ہوں یا مرد تانیثی ادب کے پیش رو کہلائے خاص طور پر اردو میں فیمینزم کی تحریک کا تعارف فرانس میں فلسفہ ہم وجودیت کے مبلغ ژان پال سارتر کی خاتون دوست اور قلم کار سیمون دی بواڑ کی تحریروں سے ہوا یہ وہ زمانہ تھا جب فرانس کے معاشرہ میں عورت کی حیثیت ایک دسترخوان جیسی تھی جس کے بارے میں فکشن نگار الیگز کا میو نے کہا تھا کہ اگر کوئی مجھ سے پوچھے کہ بیسویں صدی کے انسان نے کیا کیا ہے تو میں کہوں گا اس نے سب سے زیادہ زنا کیا اور اخبار پڑھے بہر حال اس تحریک سے متعلق سکریتا پال نے اپنے مضمون عورت

ہے اس عورت کو پوری طرح آزادی کے ساتھ زندگی گزارنے کی اجازت ہی نہیں دی۔ کہا جاتا ہے کہ عورت کی اس کم تر حیثیت کو ہمارے روایتی اور مسلمہ تنقیدی تناظر نے دوام بخشا ہے البتہ گزشتہ چند عشروں میں حقوق نسواں کے قائل دانشوروں نے اس بات پر احتجاج کیا ہے کہ ادب میں عورتوں کے نہایت اہم کام اور تجربے کو مسلسل نظر انداز کیا جا رہا ہے اس کے علاوہ چند خواتین مصنفوں کو غلط انداز میں سمجھنے کی کوشش کی جا رہی ہے، ادب میں عورت کو ماں، پرورش کرنے والی، تخلیقی عمل پر اکسانے والی اور پیار کرنے والی کے روپ میں ہی پیش کیا جاتا رہا ہے اسے شکلی مانا گیا جوازی قوت ہے وہ پاکباز اور مرد کے لیے تکلیفیں برداشت کرنے والی بیوی ہے یا پھر جادوگرئی ہے عام زندگی کی طرح ادب میں بھی اسے مرد کے مقابلے میں ثانوی حیثیت ہی دی جاتی رہی ہے حتیٰ کہ مرد کی زندگی میں بھی اس کا رول ثانوی ہی ہوتا ہے، سیتا، اشتار، موہنی یا سری کی منہ میں بھی عورت کو ایک مکمل لیکن جامد عورت کے طور پر ہی پیش کیا جاتا ہے ایک ایسی عورت جو اپنے اس آدرشی قید خانے میں بند ہے یہاں عورت کے لیے اپنی شخصیت کی نشو و نما اور اپنی ذات کا شعور حاصل کرنے کی گنجائش ہی نہیں رکھی جاتی، عورت کا یہ مسلمہ روپ صرف اسی صورت میں نابود ہو سکتا ہے کہ مردوں کے قائم کیے ہوئے اس تصور کو پارہ پارہ کر دیا جائے۔“

اس زاویے سے اگر دیکھا جائے تو واضح ہو جاتا ہے کہ تانیشی ادب کیا ہے دراصل تانیشی ادب وہ ہے جو خواتین کی سماجی آزادی کی بات کرے وہ عورت جو صدیوں سے مرداساسی نظام کی اسیر ہو کر ٹپ رہی ہے اس کے حقوق بحال کیے جائیں، سماج

میں مساوی درجہ فراہم کرایا جائے، اس کے ساتھ جانوروں جیسا سلوک کرنے والے تعزیر کے مستحق ہوں، ایسے تانیشی ادب میں تخصیص نہیں ہے کہ مرد لکھیں یا خود خواتین قلم کار آواز بلند کریں۔ لیکن اصل میں یہ کام مرد قلم کاروں کو کرنا چاہیے کہ وہ عورت کی سماجی آزادی کے حصول کے لیے سینہ سپر ہوں اس طرح خواتین پر جو مظاہر مرداساسی معاشرے نے کیے ہیں ان کا کچھ تو کفارہ ادا کیا جاسکے۔ عورت صدیوں سے مظلوم ہے چیخ رہی ہے قلم کی آنکھوں میں خون کے آنسو ہیں لفظوں میں کرب ہے۔ لیکن اپنا حق کس سے مانگ رہی ہے انہیں سے جن کے بنائے ہوئے شکنجوں میں وہ پھڑپھڑا رہی ہے۔ اس صورت میں اگر مردوں کے قبیلے سے قلم عورت کی حمایت میں اٹھتا ہے آواز بلند ہوتی ہے تو انصاف کے پہلو زیادہ نمایاں ہوں گے اور حقیقی تانیشی ادب سامنے آئے گا اور معاشرہ عورت کے حقوق اور اس کی آزادی کو قبول کرے گا لیکن یہاں یہ پہلو ملحوظ خاطر رکھنا ہوگا کہ اخلاقی اقدار لہولہاں نہ ہوں اور یہ فرض ہر قلم کار پر ہے۔ خواہ وہ مرد ہو یا عورت۔ کیونکہ عورت کی نسوانیت ہی دراصل اس کا جوہر ہے اسے اس کی کمزوری نہیں سمجھنا چاہیے۔ تحفظ خواہی اس کے مزاج کا ایک حصہ ہے اس کی نفسیات کو سمجھنا ضروری ہے۔ مرد سماج اگر عورت کو مساوی اختیارات دیتا ہے تو عورت مرد کے حق میں مزید مفید ثابت ہوگی۔ جذبہ خود سپردگی کچھ زیادہ ہی فزوں تر ہو سکتا ہے اس لیے عورت کو آزادی دی جائے اس کی نسوانیت کا تحفظ کیا جائے، معروف افسانہ نگار جیلانی بانو نے زبردست احتجاج کیا ہے وہ کہتی ہیں کہ مرد نقاد خود انہیں لکھنے والیوں کے ساتھ سر پرستانہ رویہ اختیار کرتے ہیں یا پھر انہیں بالکل نظر انداز کر دیتے ہیں۔ خواتین لکھنے والیاں ان کی نظر کرم کی محتاج ہوتی ہیں کیونکہ ادب کی دنیا پر بھی مردوں کا قبضہ ہے اسی وجہ سے مغرب میں حقوق نسواں کی تنقید نے جنم لیا ہے حقوق نسواں سے متعلق نقادوں اور نظریہ سازوں کا کام یہ ہے کہ ادبی وثقافتی میدان میں عورتوں پر مردوں کی بالادستی کا پردہ چاک کریں اور

وضاحت کے ساتھ بتائیں کہ ہمارے کلچر کا جو سب سے نمایاں پہلو ہے اس کا تعلق بنیادی طور پر مردوں کی بالادستی سے ہے تاہم یہ ضروری ہے کہ نسائی تجربہ اور حقوق نسواں کی سیاست کے تعلق کو واضح طور پر سامنے رکھا جائے تاکہ نسائی تجربہ مجموعی انسانی تجربے کے اظہار میں اپنے جائز حق پر اصرار کرے۔ سکریٹا پال کمار نے اردو ہندی کے افسانہ نگاروں نرمل ورما، موہن راکیش، کرشنا سویتی، عصمت چغتائی، قرۃ العین حیدر، سعادت حسن منٹو کی کوششوں کو سراہا ہے کہ انہوں نے اپنے افسانوں میں عورت کو بہ طور ہیرو پیش کیا ہے ان کی کہانیوں میں عورت اپنے اوپر ہونے والے جبر کے خلاف آواز بلند کرتی ہے اس تناظر میں انہوں نے نرمل ورما کے ”پرندے“، موہن راکیش کا ”مس پال“، منٹو کا ”سوگندھی“ اور قرۃ العین حیدر کے ”پت جھڑ کی آواز“ کا حوالہ بھی دیا ہے اس سلسلے میں ان کے مضمون کا یہ آخری حصہ اہم ہے جس میں انہوں نے عورت کی راہ کی رکاوٹیں ختم کرنے اور اس مسئلہ کا کیا حل ہے یہ بھی بتانے کی کوشش کی ہے:

”اردو میں عصمت چغتائی اور ہندی میں کرشنا سویتی نے ادب میں عورت کو ایک خود مختار انسان کے طور پر پیش کرنے کا راستہ دکھایا ہے وہ عورت جو مردانہ معاشرہ کا شکار ہے اور وہ عورت جو اس جبر کے خلاف آواز کی جرأت رکھتی ہے اس کے بعد آنے والوں نے عورت کو پوری حقیقت پسندی کے ساتھ اس کے اصل روپ میں دیکھنے کی کوشش کی۔ اردو اور ہندی کے اکثر افسانہ نگار یہ ثابت کرنے میں کامیاب رہے ہیں کہ معاشرہ کا فرسودہ ڈھانچہ بکھر رہا ہے اور عورت کا جو ماڈل بنایا گیا تھا وہ ٹوٹ رہا ہے اور عورت جدید زندگی کے مسائل اور اس کی پیچیدگیوں کا ڈٹ کر مقابلہ کر رہی ہے وہ اپنے آپ کو پہچان رہی ہے اور پدری نظام کے جبر سے چھٹکارا حاصل کر رہی ہے ان افسانوں

نے معاشرہ کو بھی متاثر کیا ہے اور مردوں کی ذہنیت بھی بڑی حد تک تبدیل ہوئی ہے تاہم ابھی عورت کے راستے میں کافی رکاوٹیں موجود ہیں۔ شانتا کرشنا سوامی نے ہندوستان کے انگریزی فکشن میں عورت کا تجربہ کرتے ہوئے لکھا ہے کہ ناقابل عبور رکاوٹیں ہمارے سامنے اب بھی موجود ہیں بچوں کی پرورش کے ساتھ عورت اپنی خود مختاری کیسے برقرار رکھ سکتی ہے گھریلو زندگی، ماں بننے کا عمل، روزگار اور اپنی روحانی تکمیل کی کشمکش میں توازن کیسے برقرار رکھا جائے گا یہ ایسے سوال ہیں جن کے جواب تلاش کرنا ضروری ہیں اس کا حل شاید یہی ہے کہ ذہنی اقدار پیدا کی جائیں یعنی مرد اور عورت کو الگ الگ مقابل خانوں میں باٹنے کے بجائے ان میں اتصال و امتزاج پیدا کیا جائے ایسا اتصال جس میں دونوں کی آزادی اور خود مختاری برقرار ہو اگر ایسا نہ ہو تو عورتوں میں ایک قسم کی راحت پسندانہ سیاست ابھر کر سامنے آجائے گی۔“

میرے پیش نگاہ اس وقت گجراتی ادب کی نامور مصنفہ کنیکا کا پڑیا کا شہرہ آفاق ناول ”ست پگلاں آکاش ماں“ ہے یہ گجراتی ہی نہیں بلکہ عالمی ادب کا ایک تانیشی فن پارہ ہے اس ناول کا اردو ترجمہ جناب عباس رضا نیر (صدر شعبہ اردو لکھنؤ یونیورسٹی لکھنؤ) نے انتہائی شگفتہ، ملیح، سلیس، بامحاورہ، دلکش و دل نشیں اسلوب میں کیا ہے اس طرح اردو کے ادبی سرمائے میں گرانقدر اضافہ ہوا ہے۔ گجراتی زبان ہندوستان کی صوبائی زبانوں میں بہت ثروت مند زبان ہے جس میں تاریخ ادب کے لازوال فن پارے موجود ہیں ان فن پاروں سے ہندوستانی تہذیب و ثقافت کے ایوان میں غیر فانی روشنی کے جھماکوں کا منظر نظر آتا ہے۔

”ست پگلاں آکاش ماں“ ست یعنی سات، پگلاں یعنی قدم، آکاش یعنی

آسمان، ماں یعنی میں، ہے اس طرح اس ناول کا اردو نام ہے ”سات قدم آسمان میں“ یہ نام ہر نقطہ نظر سے با معنی اور خوبصورت ہے چونکہ یہ انسانی سماج (خصوصاً ہندوستان) میں عورت پر ہونے والے ظلم و تشدد کی باہم مربوط کہانیوں پر مشتمل ہے اس لیے آسمان میں قدم رکھنا گویا تمام سماجی بندھنوں کو جو بے جا طور پر عورت کے گرد ہیں انہیں توڑ کر عروج پرواز کی طرف ایک اشارہ ہے سات کا ہندسہ بھی اہمیت کا حامل ہے آسمان سات ہیں اور ہر قدم میں ایک آسمان ہے گویا دشت امکان نقش پا کے سوا کچھ نہیں اس طرح آسمان کو پامال کرنے اور وہاں مملکت قائم کرنے کا پہلو بھی برآمد ہوتا ہے۔ دن بھی سات ہیں راتیں بھی سات ہیں انہیں دونوں سے مل کر ماہ و سال و صدیاں بھی نمود کرتی ہیں گویا سات کے ہندسے کو مفتوح بنالینا صدیوں کو فتح کرنے کے مترادف ہے، دو ہزار دس میں شائع شدہ چار سو چوبیس صفحات کا یہ ناول اعلان بغاوت بھی ہے اور ترغیب بغاوت بھی، ساہتیہ اکاڈمی سے انعام یافتہ یہ فن پارہ گجراتی زبان میں مقبولیت تو حاصل کر ہی چکا ہے اب عباس رضا نیر کے خوبصورت ترجمے کے بعد اردو میں بھی مقبول ہو رہا ہے ناول نگار کند نیکا کا پڑیانی نے دل کا زہر جس انداز سے کاغذ پر انڈیلا ہے اس سے طرح طرح کی تصویریں ابھر آئی ہیں جن میں طنز کی کاٹ بھی ہے درد و کرب کی لہر بھی۔ مصنفہ اور ناول سے متعلق تعارف جو اس کتاب میں درج ہے کچھ اس طرح ہے:

”کسی زبان کی ایک ہی کتاب کو چھ چھ ایوارڈ ملنا ایک منفرد واقعہ ضرور ہے لیکن ست پگلاں آکاش ماں کی مقبولیت ان بڑے انعاموں سے نہیں ہے اس ناول نے گجرات کے نسائی معاشرے کو جھنجھوڑ کر رکھ دیا ہے یہی اس کی پذیرائی کا اصل سبب ہے چنانچہ یہ کتاب معاشرتی انقلاب کی کامیاب نقیب بن گئی۔ گجرات میں شاید ہی کوئی ایسا تعلیم یافتہ گھرانہ ہو جہاں یہ کتاب نہ پڑھی گئی ہو اور مرد اس

معاشرے میں عورت کے ساتھ صدیوں سے دیکھی اور ان دیکھی جو نا انصافیاں ہوتی رہی ہیں اس کی متعدد شکلیں اس ناول میں نظر آتی ہیں۔ اس ناول کے مقبول ہونے کا ایک سبب یہ بھی ہے کہ اس میں ہزاروں عورتوں نے اپنی زندگی اور اپنے درد کو محسوس کیا ہے۔ چنانچہ ناول مصنفہ کی اپنی کہانی نہ ہو کر پورے عورت سماج کی کہانی بن گئی ہے۔

ناول نگار کند نیکا کا پڑیا کا نام گجراتی ادب میں محتاج تعارف نہیں فیمنین مومنٹ (نسائی تحریک) شروع ہونے سے بہت پہلے انہوں نے آزادی نسواں کے مسائل پر بڑی ہمت سے کہانیاں لکھنا شروع کیں کئی ناول اور کئی کہانیاں تخلیق کی ہیں مصنفہ انتہائی درد مند اور سنجیدہ تخلیق کار ہیں آج کل نندی گرام نامی تنظیم سے وابستہ ہیں اور سماجی خدمات انجام دے رہی ہیں۔“

جہاں تک عورت کے استحصال کا تعلق ہے یہ عالمی سطح پر بھی ہوتا رہا ہے اور آج بھی ہو رہا ہے اس میں کسی ملک یا معاشرے کی تخصیص نہیں ہے ہر جگہ یہی ہوتا ہے مرد حاکم معاشرہ عورت پر مظالم کیوں توڑتا ہے اس کی بہت سی نفسیاتی گریہیں ہیں جنہیں اس ناول میں اجاگر کیا گیا ہے یہ گریہیں پہلے بھی تشریح طلب تھیں اور آج بھی ہیں عورت کا سفر غار سے چوٹی تک اس عنوان کے تحت مصنفہ نے چالیس صفحات پر مشتمل ایک دیباچہ قلم بند کیا ہے، جو اس ناول میں بے حد اہمیت کا حامل ہے ان صفحات میں عورت کی عمر، تمام مدارج میں اس کی پابند سوچ، نفسیاتی گریہوں، عقیدوں، استحصالی شکلوں اور اس کے ساتھ ہونے والے سلوک پر تفصیلی گفتگو کی گئی ہے۔ ایک اقتباس پیش ہے جس میں اسلام اور عیسائیت میں عورتوں سے متعلق کچھ باتیں کہی گئی ہیں لیکن اس سے پہلے اس دیباچہ

میں ہندو سماج پر گہرا طنز بھی کیا گیا ہے:

”اب تک ہم نے بھارت کا خاص طور پر ہندو سماج کا ذکر کیا ہے لیکن دوسرے مذہبوں اور دوسرے ملکوں میں بھی عورتیں کسی نہ کسی طرح اوسط درجے کی مانی گئی ہیں۔ اسلام میں قرآن میں کہا گیا ہے کہ خدا نے مرد کو عورت سے قوی بنایا ہے اور لائق عورت وہ ہے جو مرد کی فرمانبرداری کرے اور اگر عورت نافرمانی کرے تو اس کا بستر الگ کر دیں اور ضرب پہنچائیں بلاشبہ مذہب کی راہ میں اسلام نے عورت اور مرد کو برابر کا ہم سفر مانا ہے لیکن مسلم معاشرے میں عورت پر بہت سی بندشیں ہیں نکاح اور طلاق کے ذیل میں بھی مرد اپنے اختیارات استعمال کرتے ہیں مسلمان عورت کو وراثت کا حق دیا گیا ہے مگر اس کے عملی نمونے نہیں ملتے۔ ہندو کورٹ بل کے بعد ہندو عورت کو باپ کی پراپرٹی میں برابر کا حصہ ملنا چاہیے لیکن بھائی اس پر عمل نہیں کرتے اور عورتیں مانگے سے رشتہ برقرار رکھنے کے لیے اس پر اصرار بھی نہیں کرتیں یا کورٹ نہیں جاتیں مسلم عورتوں کی بھی یہی صورت حال ہے تعلیم بھی ان میں بہت کم ہے۔ اسلامی قانون کے نفاذ کی کوشش جن جن ملکوں میں ہو رہی ہے وہاں عورتوں کی صورت حال زیادہ مشکل نظر آرہی ہے پاکستان میں ایک مرد کے برابر دو عورتوں کو شمار کرنے کے قانون کی مخالفت میں جب عورتوں نے مظاہرے کیے تو پولیس نے بے رحمی کے ساتھ ان کی پٹائی کی ۱۹۸۲ء میں ایشیا ڈھیلوں کے دوران ایران کی ٹیم نے اس بات کی مخالفت کی کہ ان کے آگے کوئی عورت جھنڈا لے کر چلے۔ عیسائی مذہب نے بائبل میں عورت کی تصویر لہانے والی اور مہینز

کرنے والی کی شکل میں پیش کی گئی ہے جس کے باعث عورت اور ملکیت پر مرد کا تسلط قائم ہوا ہے پھر بھی دونوں میں مشترکہ ذمہ داریوں اور احترام کو اہمیت دینے کے باعث وہاں گھریلو نظام کی صورت مختلف ہے وہاں بہو پر سسرال والوں کا کوئی خاص اختیار نہیں رہتا۔ شوہر کے ساتھ وہ آزادی کے ساتھ گھوم پھر سکتی ہے زوجیت کے ایک تسلیم شدہ آئین کی وجہ سے بھی وہاں عورت کا درجہ اونچا ہے وہاں ایسا نہیں مانا جاتا کہ عورت کی زندگی شادی کے بعد ہی مکمل ہوتی ہے۔ ہندو عورت کے مطابق اس کا سماجی درجہ بلند ہونے کے باوجود مرد کے برابر تو پھر بھی نہیں ہے پارسیوں میں مرد اگر غیر پارسی سے شادی کر لے تو اس کے بچے پارسی مانے جاتے ہیں لیکن عورت اگر غیر پارسی سے شادی کر لے تو اس کے بچے پارسی نہیں مانے جاتے ہیں اور ایسا کرنے پر اس سے دھوپ دکھانے کا مذہبی اختیار چھن جاتا ہے۔“

کند نیکا کا پڑیا کا یہ عظیم الشان ناول گہرے سماجی شعور کا آئینہ دار ہے گہرے مطالعہ اور مشاہدے کے بعد اسے لکھا گیا ہے۔ دنیا کی قدیم و جدید تمام تر تہذیبوں اور مذاہب کی پرچھائیاں اس ناول میں موجود ہیں حالانکہ کہانی ہندوستانی سماج کی ہے اور ہونی بھی چاہئے کیونکہ مصنفہ کا جو زمانہ ہے اس کے خدوخال پر اس کی نگاہیں مرکوز ہیں لیکن ہندوستان جہاں مذہب بھی ہے، عقیدوں میں ایک خاص تنوع ہے، رنگارنگی ہے وہاں ایک حساس ذہن جس طرح کام کر سکتا ہے اس کی مثال اس ناول میں موجود ہے ہزاروں سال پر مشتمل ہندوستان کی قدیمی تاریخ سے مذہب کے رنگوں کی آمیزش سے ہی ہندوستانی تہذیب نے جنم لیا ہے آریائی نسلیں جو یہاں کی زمین سے اگی تھیں پھر باہر سے آنے والے لوگ جو مختلف زبانیں لائے، تہذیبیں لائے، مذاہب لائے، عقیدے

لائے وہ اسی میں ضم ہوتے چلے گئے اس طرح ایک مخلوط تہذیب نے جنم لیا لیکن اتنا سب کچھ ہونے کے بعد عورت وہی رہی جو تھی یعنی پابند اور محکوم، مرد کی شہوانیت اور حیوانیت کے بلاخیز سمندر کو آن کی آن میں شانت کر دینے والی یہ مخلوق مرد کے ظلم کا ہمیشہ شکار رہی، مرد نے کبھی بھی یہ نہیں سوچا کہ جس خوبصورت مخلوق سے وہ لازوال فرحت حاصل کرتا ہے اسے تشدد کا شکار بنا کر اسے کیا حاصل ہوتا ہے لیکن مرد کی جبلت میں چونکہ اذیت رسانی ہے خاص طور پر اپنے کمزور و نرم و نازک چیزوں کے تئیں اس لیے وہ خود کو روک نہیں پاتا ہاں وہ خوبصورت اشیاء جو اس کی دسترس سے باہر ہیں یا اس سے زیادہ طاقتور ہیں وہ ان کا کچھ نہیں بگاڑ پاتا حالانکہ اس کی طبیعت اس طرف مائل تو ہوتی ہے۔ دلچسپ پہلو یہ ہے کہ آج کی دنیا جو خود کو مہذب کہتی ہے قدیم اقوام کو غیر مہذب اور وحشی گردانتی ہے بڑی حد تک عورت کے معاملے میں انہیں قوموں کی طرح غیر مہذب ہے جنہیں وہ غیر مہذب کا نام دیتی ہے خاص طور پر اپنے مقابلے میں۔ حالانکہ سچائی یہ ہے کہ اس سطح پر مہذب وہ معاشرہ تھا جو بہت قدیم تھا اور نامہذب یہ معاشرہ ہے جو بہت جدید ہے۔ تقریباً سو اچار و صفحات میں احساسات کی ایک بے کراں دنیا اس ناول میں آباد ہے یہ قطعی نہیں کہا جاسکتا ہے کہ ناول نگار نے صرف عورتوں کی تعریف کی ہے اور مردوں کو برا بھلا کہا ہے لیکن یہ سوال ضرور قائم کیا گیا ہے کہ جب عورت مرد کے لیے بے حد ضروری ہے اس کے بغیر مرد کی زندگی ادھوری ہے اس کی موجودگی فرحت اور خوش رونقی کی دلیل ہے تو پھر سماج کا یہ سلوک عورت کے ساتھ کیوں ہے؟ اور یہ نکتہ ناول کے مرکزی خیال میں بار بار ابھر کر سامنے آتا ہے۔ ناول میں عورتیں بھی ہیں مرد کردار بھی ہیں عورتوں کو کمزور سمجھنے والے مرد بھی ہیں لیکن عورت کے بغیر رہ نہیں سکتے، عورت کو اس کی مرضی و رضا کے بغیر استعمال کرنے والے بھی ہیں ظاہر ہے کہ وہ محکوم ہے ہر طرح سے استعمال کی جاسکتی ہے لیکن عورت کو فقط جسم سمجھ لینا انتہائی گھٹیا سوچ ہے اور سچائی بھی یہی ہے کہ

عورت ایثار کا پیکر ہوتی ہے جسم سے لے کر روح تک ایثار ہی ایثار، اوتار اور پیہمیر جتنی رہتی ہے پھر بھی شیطان کی بیٹی کہی جاتی ہے۔

کند نیکا کا پڑیا کا یہ ناول زبردست احتجاج ہے مرد اساس معاشرے کے خلاف یہ ایک لمحہ فکریہ ہے انہوں نے اس ناول میں جو مبسوط دیباچہ لکھا ہے ان کے نظریات کی عکاسی کرتا ہے عام حالات میں ہمارے یہاں ناولوں میں دیباچے لکھنے کا کوئی چلن نہیں ہے۔ اگر لکھے بھی جاتے ہیں تو مختصر اور رسمی طور پر مگر اس ضخیم ناول کا دیباچہ اہم ہے اور اس کی کلید تفہیم و ترسیل کا کام کرتا ہے یہ نا انصافی ہوگی کہ ناول شروع کرنے سے پہلے دیباچے کو نہ پڑھا جائے ویسے بھی اس ناول کے لفظ لفظ میں یہ خوبی ہے کہ وہ اپنے قاری کو ایک سحر زدہ پرندے کی طرح جکڑے رہتا ہے اور خود کو پڑھوانے پر اصرار کرتا ہے، یہ کمال ناول نگار کا تو ہے ہی ترجمہ نگار کا بھی ہے۔

ڈاکٹر عباس رضانیر نے بہت شگفتہ و خوبصورت زبان میں اسے ڈھالا ہے ظاہر ہے کہ اصل زبان کتنی خوبصورت رہی ہوگی میرے خیال میں ست پگلاں آکاش ماں یعنی ”آسمان میں سات قدم“ گجراتی اور اردو دونوں زبانوں کا ایک لافانی شاہکار ہے۔



اردو فکشن کی تحقیق و تنقید میں عباس رضانیر کی رہنمائی

علی ظفر

میسویں صدی کی آخری دہائی سے لے کر اکیسویں صدی کے موجودہ دور تک اردو ادب میں جو مقبول نام گردش کر رہے ہیں ان میں ایک نام ڈاکٹر عباس رضانیر کا بھی ہے۔ ان کا شمار موجودہ اردو ادب کے جلیل القدر قلم کاروں میں ہوتا ہے۔ وہ گذشتہ تین دہائیوں سے ادب کی گراں قدر خدمات میں منہمک ہیں۔ ادب کے سیاسی و سماجی محرکات پر گہری نظر رکھنے کے ساتھ ساتھ وہ فن پارے کے فنی و جمالیاتی پہلو کی بھی تحسین کرتے ہیں۔ وہ ادب کو ایک وسیع تناظر میں دیکھنے والے ادیب ہیں۔ انہوں نے ادب کی جس صنف پر قلم اٹھایا اس پر اپنی شخصیت کی گہری چھاپ چھوڑ دی۔

نیر صاحب کو فکشن نگار کہا جائے یا تنقید نگار، انہیں غزل گو کا نام دیا جائے یا نثر نگار کا، انہیں ادیب سمجھا جائے یا دانش ور وہ اپنے ہر رنگ روپ میں ایک پختہ کار اور مشاق فن کار کی حیثیت سے اپنا مخصوص امتیاز برقرار رکھتے ہیں۔ اس لیے انہیں کسی مخصوص صنف ادب کے ساتھ وابستہ کر کے ان کی قدر و قیمت کو متعین کرنا ان کی عظمت کو محدود کرنے کے مترادف معلوم ہوتا ہے۔ نیر صاحب نے جس صنف اور جس اسلوب میں بھی اپنا اظہار کیا اس صنف اور اس اسلوب کے ضوابط کی پابندی سے زیادہ انہوں نے صنفی اور اسلوبیاتی ضابطوں کو اپنے پیرایہ اظہار کا پابند رکھا۔ یہی سبب ہے کہ ان کی

تنقیدی بحثیں ہوں یا رثائی تنقیدیں، اپنے ہم عصر ادیبوں پر لکھے ہوئے ان کے تبصرے ہوں یا خواجہ احمد عباس کی شخصیت اور فن کے جائزے یا چریویتی چریویتی کا ترجمہ ہر جگہ نیر صاحب اپنی مخصوص شناخت کے ساتھ نمودار ہوتے ہیں اور ہر موضوع میں اپنے رچے ہوئے مذاق کی چھاپ چھوڑ جاتے ہیں۔

عباس رضانیر کو لکھنؤ کے دبستان، تہذیب و ادب سے کافی دلچسپی ہے اگر انہیں لکھنوی تہذیب کے عاشق اور ترجمان کے نام سے بھی موسوم کیا جائے تو بے جا نہ ہوگا۔ انہوں نے حال ہی میں اودھ کی تہذیب پر دو بین الاقوامی سیمینار کا انعقاد کیا پہلے سیمینار کے مقالوں کی کتاب ”اردو ناول اور اودھ“ کے نام سے منظر عام پر آچکی ہے اور دوسری ”اودھ اور ادب“ کے نام سے شائع ہو چکی ہے۔ اردو ناول اور اودھ میں جو مقالے شامل ہیں ان کے مطالعے سے ہمیں اودھ کی تہذیب و ثقافت اور آداب زندگی کا پتہ چلتا ہے۔ ساتھ ہی نیر صاحب کی اودھ کی تہذیب و اقدار اور شعر و ادب کی دلچسپی کی ترجمانی بھی کرتی ہے۔ تہذیبی قدروں اور شعر و ادب کے ذوق کو اگر کوتاہ نظری سے دیکھا جائے تو یہ تمام چیزیں ایک شخص کی ذاتی پسند یا ناپسند میں سمٹ کر محدود بھی ہو سکتی ہیں۔ مگر نیر صاحب جب اسی رویے کو اپنی وسعت نگاہ سے آشنا کرتے ہیں تو ان ہی کے اقدار کے وسیلے سے اس کتاب کو پڑھنے والا تہذیبوں کے عروج و زوال کی پوری داستان پڑھ لیتا ہے۔

ڈاکٹر عباس رضانیر کی رہنمائی میں اب تک ادب کی ہر صنف میں فکشن اور غیر فکشن کے حوالے سے بہت سارے پی ایچ۔ ڈی مقالے پایہ تکمیل کو پہنچے ہیں۔ مگر فکشن کے حوالے سے چار مقالے بہت اہم ہیں جو نیر صاحب کو ایک باکمال نگراں کی صف میں کھڑا کرنے کے لیے کافی ہیں۔ اردو ادب میں ایک منفرد لب و لہجہ کے مالک، کام کے لیے خود کو وقف کیے رہنے کا ان کا رویہ، ریسرچ اسکالروں کے ہر کام کے ایک ایک پہلو کو بڑی گہرائی سے دیکھنے والی ان کی نظر اور ان کا طریقہ کار یہ وہ خصوصیات ہیں

جن کی بنا پر عباس رضا نیر ایک ہمہ جہت شخصیت کے مالک قرار دیے جاسکتے ہیں۔ ریسرچ اسکا لریکچے ذہن کے مالک ہوتے ہیں اس لیے ان کو رہنمائی کی ضرورت ہوتی ہے، ایک نگران ان سے گفتگو کر کے اندازہ لگالیتا ہے کہ کس صنف میں وہ کام کر سکتا ہے پھر اس کے بعد موضوع طے کیا جاتا ہے، ڈاکٹر عباس رضا نیر پہلے ریسرچ اسکا لریکچر دیکھتے ہیں پر کھتے ہیں اور اس کی دلچسپیوں کا اندازہ لگاتے ہیں اس کے بعد اس کے لیے موضوع کا انتخاب کرتے ہیں پھر ریسرچ میں اس کی رہنمائی کرتے ہیں۔ انہوں نے نظم کے ساتھ نثر خصوصاً فلشن تحقیق و تنقید میں بھی مثالی رہنمائی کی ہے۔ انہوں نے طالب علم کی دلچسپیوں کے مطابق موضوع کا انتخاب کیا، خاکہ تیار کرایا اور پھر ریسرچ کا کام مکمل کرایا۔ مقالوں کو دیکھ کر ہی اندازہ ہو جاتا ہے کہ ریسرچ اسکا لریکچر کی رہنمائی بڑی دقت نظر کے ساتھ کی گئی ہے۔

نیر صاحب کی رہنمائی میں اردو فلشن میں پہلا مقالہ ”بشیش پر دیپ حیات اور کارنامے“ ۲۰۱۱ میں پایہ تکمیل کو پہنچا۔ مقالہ نگار ڈاکٹر نوری فاطمہ ہیں۔ مقالے کو آٹھ ابواب میں منقسم کیا گیا ہے۔ اور تحقیق کے سائنٹفک اصولوں کی روشنی میں فلشن کے فن کو بڑے سلیس اور رواں انداز میں پیش کیا گیا ہے۔ مقالے کا پہلا باب ”بیسویں صدی کے سیاسی اور سماجی رجحانات“ ہے جس کو تین ذیلی عنوانات میں تقسیم کیا گیا ہے۔ ان ابواب میں ہندوستان کے سیاسی و سماجی حالات پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ ۱۹۴۷ء میں گاندھی جی کی قیادت میں ہندوستان چھوڑ و تحریک کا آغاز ہوا اور ہندوستان کی آزادی کا مطالبہ شروع ہوا۔ ۱۹۴۷ء میں ہندوستان آزاد ہوتا ہے اور قیام پاکستان اور ہجرت کا معاملہ سب سے بڑے مسئلے کی صورت میں نمودار ہوتا ہے۔ ان سارے حالات کو پہلے باب میں بیان کرنے کی اچھی کوشش کی گئی ہے۔

باب دوم میں دوم مرکزی عنوان ”اردو افسانے کا فنی اور ادبی مطالعہ“ اور ”اردو

افسانہ نگاری ۱۹۴۷ء کے بعد“ ہے۔ اس باب میں اردو افسانہ نگاری کا فنی اور ادبی اصولوں کی روشنی میں جائزہ لیا گیا ہے۔ اور ساتھ ہی ۱۹۴۷ء کے بعد اردو افسانہ نگاری کی روایت کو منظر عام پر لانے کی جو کوشش کی گئی ہے وہ قابل داد ہے۔

تیسرے باب میں بیشیش پر دیپ کے حالات زندگی اور شخصیت پر ایک تنقیدی نظر ڈالی گئی ہے۔ افسانہ نگاری بیشیش پر دیپ کی ادبی زندگی کا سب سے اہم اور نمایاں عنصر ہے۔ جب ہم ان کے افسانوں کا بغور مطالعہ کرتے ہیں تو ان کی شخصیت خود بخود نکھر کر سامنے آ جاتی ہے۔

مقالے کا چوتھا باب بحیثیت افسانہ نگاران کے مختلف ادوار کے افسانوں کا تنقیدی مطالعہ کے اعتبار سے کافی اہم ہے۔ بیشیش پر دیپ نے دوسو سے زائد کہانیاں لکھی ہیں۔ ان کی کہانیاں نفسیاتی افسانہ نگاری کا بے مثال نمونہ ہیں۔ ان کے افسانوں میں موضوعات کا بڑا تنوع ہے۔ عام زندگی اور عام انسانی محسوسات کی حقیقی عکاسی ان کے یہاں ملتی ہے۔ ان کے مشہور افسانوں میں ”گھسیٹن“، ”شادی سے پہلے“، ”جب ہم نہ ہوں گے“، ”ترک محبت“ وغیرہ قابل ذکر ہیں۔

مقالے کے پانچویں باب میں بیشیش پر دیپ کی افسانہ نگاری کے امتیازی پہلو اور افسانہ نگاری میں سائنسی انداز فکر پر مفصل بحث کی گئی ہے۔ سائنسی انداز فکر ان کی افسانہ نگاری کی ایک اہم خوبی ہے۔ وہ اپنے افسانوں میں جگہ جگہ سائنسی الفاظ، جملوں اور سائنسی نظریات کو حقیقی زندگی سے جوڑ کر پیش کرتے ہیں۔

مقالے کا چھٹا باب ”بشیش پر دیپ کی ترجمہ نگاری اور ان کی زبان و بیان کی خصوصیات پر مبنی ہے۔ انہوں نے لاتعداد انگریزی مضامین اور نظموں کو اردو زبان میں ترجمہ کر کے ادب کی بڑی خدمت کی ہے۔ ان میں سب سے زیادہ اہمیت کا حامل ”آٹو بایو گرافی آف اے یوگی“ کا ترجمہ ہے۔ جو بیشیش پر دیپ کو ترجمہ نگاروں کی صف میں

کھڑا کرنے میں اہم رول ادا کرتا ہے۔

باب ہفتم میں مقالہ نگار نے ان کی دیگر تصانیف مثلاً روحانی تصانیف، مختلف موضوعات پر مضامین، جنگ آزادی میں پنجاب کا حصہ اور سائنسی و ادبی مضامین پر ایک تجزیاتی مطالعے کے ساتھ ساتھ سیر حاصل بحث کی ہے جس سے ان کے متفرقات پر روشنی پڑتی ہے۔

آٹھواں باب مقالے کا سب سے اہم باب ہے۔ ہم اسے اختتامیہ، ماحصل اور محاکمہ بھی کہہ سکتے ہیں۔ اس باب میں اردو افسانہ نگاری میں بشیش پر دیپ کے مقام و مرتبت کو متعین کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ ان کے افسانوں کے مطالعے سے ہمیں پتہ چلتا ہے کہ یہ کسی بھی دبستان سے منسلک نہیں تھے بلکہ ادیب کی آزادی فکر کے قائل تھے۔ ان کے افسانوں میں ترقی پسندی کے ساتھ ساتھ جدیدیت کی بھی جھلک دکھائی دیتی ہے۔ ان کے افسانوں میں غور و فکر، سائنسی، نفسیاتی، فکری اور فنی رویوں کا جو رجحان ملتا ہے انہیں جدید افسانہ نگاروں کی صف میں بھی کھڑا کرنے کے لیے کافی ہے۔

زیر نظر مقالہ خاص طور سے اردو دنیا کے لیے ایک اضافہ ہے۔ مقالے کے تفصیلی مطالعہ سے ہمیں نگراں کے اوصاف کی جھلک صاف طور پر دکھائی دیتی ہے۔ تحقیق میں رہنمائی کے لیے ضروری ہے کہ رہنما اس فن اور اس کے فنی اصولوں سے کما حقہ واقفیت رکھتا ہو جس کے مصداق نیر صاحب بذات خود ہیں۔ مقالے کی طرز تحریر سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ نیر صاحب نے تحقیق کے ساتھ ساتھ تنقید کا دامن بھی تھامے رکھا جہاں انہیں ضرورت محسوس ہوئی مقالہ نگار کو ہمیز کیا کہ وہ اپنی رائے کا برملا اظہار کرے جو مقالے کے لیے نہایت ضروری تھا۔

عباس رضا نیر کی رہنمائی میں فلشن کی تحقیق و تنقید میں دوسرا مقالہ ”آزادی کے بعد اردو افسانہ نگاری میں خواتین کا حصہ“ نکہت کمال صاحبہ نے ۲۰۱۳ء میں مکمل کیا۔

مقالہ نگار نے نیر صاحب کی رہنمائی میں مقالے کو پانچ ابواب میں منقسم کیا۔ جس کا پہلا باب ”اردو میں افسانہ نگاری کا آغاز و ارتقاء“ ہے۔ افسانے کو دراصل زندگی میں ایک خاص مقام حاصل ہے جب سے انسانوں کی یہ زندگی شروع ہوئی ہے اس وقت سے ہی افسانہ منظر عام پر آیا اور ظاہر ہے جب تک زندگی باقی رہے گی افسانے کو اس سے الگ نہیں کیا جاسکتا۔ افسانہ دنیا کی ساری قوموں کے درمیان موجود ہوتا ہے اور قومیں انہیں سن کر ان میں موجود طلسمات، سحر اور اساطیری عناصر دوسروں کو سناتے ہیں۔ اردو میں افسانے کی روایت کے پیش روشنی پریم چند ہیں۔ انہوں نے اردو زبان و ادب اور اس کے سرمایے کو ایک نئی جہت سے آشنا کیا۔ وہ پہلے ادیب ہیں جنہوں نے ہندوستانی گاؤں کے کسانوں، کھیت، مزدوروں اور پسماندہ طبقے کی عظمت اور انسانی وقار کو سمجھا ان کے لیے ادب کے کشادہ دروازے کھولے، اور انہیں ہیر و بنا کر ان کے دکھ سکھ کی کہانی سنا کر اردو کے افسانوی ادب کو نئی وسعتوں اور نئے احساس جمال سے آشنا کیا۔

باب دوم کا عنوان ”اردو کی ابتدائی خواتین افسانہ نگار“ کے عنوان سے ہے۔ اس باب میں اردو کی ابتدائی عہد کی خواتین افسانہ نگاروں مثلاً نذر سجاد حیدر، حجاب امتیاز علی وغیرہ کے افسانوں کا تجزیاتی مطالعہ کیا گیا ہے۔ اور ان افسانہ نگاروں کی ادبی خدمات کا مفصل جائزہ لیا گیا ہے۔ جو اردو افسانہ نگاری میں خاص اہمیت کا حامل ہے۔ تیسرا باب ”ترقی پسند تحریک اور خواتین افسانہ نگار“ ہے۔ اس باب میں تحریک سے متاثر ہونے والی خواتین افسانہ نگاروں رشید جہاں، عصمت چغتائی، رضیہ سجاد ظہیر، ہاجرہ مسرور کے افسانوں کی خصوصیات پر روشنی ڈالی گئی ہے۔

مقالے کا چوتھا باب خصوصی اہمیت کا حامل ہے اس باب میں قرۃ العین حیدر، جیلانی بانو، واجدہ تبسم، ذکیہ مشہدی اور ترنم ریاض کے افسانوں کا محاکمہ کرتے ہوئے دیگر خواتین افسانہ نگاروں کے افسانوں کا تجزیہ کیا گیا ہے۔

باب پنجم میں مقالے کا اختتامیہ پیش کیا گیا ہے۔ اس باب میں آزادی کے بعد خواتین افسانہ نگاروں کی افسانہ نگاری پر مفصل بحث کرتے ہوئے ان کی اہمیت و معنویت اور افادیت پر روشنی ڈالی گئی ہے ساتھ ہی کتابیات کو حروف تہجی کے اعتبار سے مرتب کیا گیا ہے۔

تیسرا مقالہ نیر صاحب کی نگرانی میں ”انتظار حسین کی افسانہ نگاری“ کے عنوان سے مقالہ نگار ارشد عباس صاحب نے ۲۰۱۵ء میں مکمل کیا۔ مقالہ پانچ ابواب پر مشتمل ہے۔ جس کا پہلا باب ”اردو میں افسانے کا آغاز و ارتقاء“ کے عنوان سے ہے۔ اردو افسانے نے اپنی ابتدا سے اپنے دور عروج تک بہت سے مراحل طے کیے ہیں۔ قصہ گوئی ہمیشہ سے انسان کا پسندیدہ مشغلہ رہا ہے۔ روز اول ہی سے قصے کا تعلق سماج سے کسی نہ کسی صورت جڑا رہا ہے۔ جب سے اردو افسانے نے جنم لیا افسانہ نگاروں کی دلچسپی اور توجہ کا مرکز ان کے گرد موجود سماجی و معاشی مسائل ہی رہے۔ ان ساری چیزوں کو مد نظر رکھتے ہوئے اس باب میں تفصیلی طور پر اردو افسانے کے آغاز و ارتقاء پر روشنی ڈالی گئی ہے جو قابل ذکر ہے۔

دوسرا باب بعنوان ”اردو افسانے کے مختلف اسالیب کا جائزہ“ اس بات پر مشتمل ہے کہ اردو افسانے نے ابتدائی دور میں بہت سے اسالیب کو اختیار کیا جو موجودہ دور میں افسانہ نگاروں کے اسالیب سے میل نہیں کھاتا ہے۔ ہر افسانہ نگار کی اپنی روش ہوتی ہے جو اوروں سے منفرد ہوتی ہے۔ لہذا اس باب میں افسانے کے اسالیب پر گفتگو کی گئی ہے جو اس مقالے کی تحقیقی ضرورت کو پورا کرتا ہے۔

باب سوم میں انتظار حسین کے افسانوی امتیازات کی اہمیت و افادیت پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ انتظار حسین کی کہانیوں میں چار طرح کے رنگ نظر آتے ہیں۔ معاشرتی یادوں کی کہانیاں، انسانی اخلاق اور روحانی زوال اور وجودی مسائل کی کہانیاں، سیاسی و

سماجی مسائل کی کہانیاں، نفسیاتی افسانے اور ساتھ ہی دیومالائی اساطیری کہانیاں ہیں جو ان کے فنی ارتقاء اور ذہنی و فکری نشوونما کی درجہ بندی کرتی ہیں۔ انتظار حسین کا یہ کام بھی قابل قدر ہے انہوں نے اپنی کہانیوں میں یورپ کے کلچر کو من و عن قبول نہیں کیا بلکہ مشرقیت کی مصوری ان کے افسانوں میں ہر جگہ نظر آتی ہے۔ اس باب میں ان ساری چیزوں کو مد نظر رکھتے ہوئے ان کے افسانوں کی تفہیم و تعبیر کی کوشش کی گئی ہے۔

مقالے کے چوتھے باب میں انتظار حسین کے معاصر افسانہ نگاروں، قرۃ العین حیدر، بلراج منیر، سریندر پرکاش، انور سجاد، انور عظیم، اقبال مجید، غیاث احمد گدی، جوگیندر پال اور نیر مسعود وغیرہ کے افسانوں کا جائزہ لیا گیا ہے۔ اور ساتھ ہی انتظار حسین کے افسانوں کی خصوصیات کو معاصر افسانہ نگاروں کے افسانوں سے موازنہ کر کے واضح کیا گیا ہے۔

پانچویں باب میں انتظار حسین کی افسانہ نگاری کا مجموعی محاکمہ پیش کیا گیا ہے۔ انتظار حسین اردو افسانہ نگاری میں ایک اہم مقام رکھتے ہیں۔ ان کی کہانیوں میں واقعاً ایک جادو ہے جو پڑھنے والوں کو سحر زدہ ہونے پر مجبور کر دیتا ہے۔ ان کی کہانیاں تصنع اور بناوٹ سے پاک ہیں۔ مقصدی و مجمع عبارت ان کے افسانوں میں نہیں پائی جاتی اور نہ ہی وہ خطیب و مقرر نظر آتے ہیں۔ اس باب میں ان ساری چیزوں پر تفصیلی گفتگو کی گئی ہے جس سے مقالہ نگار اور نگران دونوں کی محنت صاف نظر آرہی ہے۔ مقالے کی ترتیب و تدوین میں نیر صاحب نے جس طرح سے رہنمائی کی ہے وہ ساری چیزیں ان کی محنت، ان کا طریقہ کار، ان کی زبان اور ان کا اسلوب مقالے میں نمایاں نظر آتے ہیں۔

اردو فکشن کی تحقیق و تنقید میں عباس رضا نیر کی رہنمائی میں چوتھا مقالہ ”اردو کی خواتین ناول نگاروں میں کردار نگاری کے امتیازی پہلو“ محترمہ فردوس تقی صاحبہ نے ۲۰۱۵ء میں مکمل کیا۔ یہ مقالہ اپنے موضوع کے اعتبار سے اچھوتا اور منفرد ہے۔ مقالہ چھ

ابواب پر مشتمل ہے۔ جس کے پہلے باب میں اردو ناول کے آغاز و ارتقاء اس کے پس منظر اور اردو کے سارے اہم ناول نگاروں کا جائزہ لیا گیا ہے۔

اردو ناول نگاری کی عمر بہت کم ہے لیکن اس فن نے ترقی کے منازل بہت جلد طے کیے ہیں۔ اس کی ایک وجہ انسانی طبع بھی ہے۔ بلاشبہ ماضی کا انسان داستانوں کے سحر میں جکڑا نظر آتا ہے۔ کہانیوں سے دلچسپی ابتدا ہی سے انسانی فطرت میں داخل ہے۔ اردو کے اولین ناول نگار ڈپٹی نذیر احمد اور رتن ناتھ سرشار نے پہلی مرتبہ اس صنف سے متعارف کرایا اور ابتدائی دور کے ناول نگاروں نے اسے پروان چڑھایا۔

مقالے کا دوسرا باب کردار نگاری کی اہمیت و معنویت پر مبنی ہے۔ ناول میں کردار نگاری کی بڑی اہمیت ہے۔ کردار کے بغیر نہ تو کہانی بیان کی جاسکتی اور نہ ہی پلاٹ کی تعمیر ہو سکتی ہے۔ ناول کی کامیابی کا انحصار سچی اور حقیقی کردار نگاری میں ہے۔ اس باب میں اردو ناول میں کردار نگاری کی اہمیت و معنویت پر ایک طویل گفتگو کی گئی ہے جو قابل داد ہے۔ تیسرے باب میں اردو کی خواتین ناول نگاروں کی کردار نگاری کی فنی خوبیوں اور خامیوں سے بحث کی گئی ہے۔ اردو کی پہلی خواتین ناول نگار رشیدۃ النساء سے لے کر محمدی بیگم، عباسی بیگم، طیبہ بیگم، نذر سجاد حیدر، فاطمہ بیگم کی کردار نگاری کا فنی جائزہ لیا گیا ہے۔ ان خواتین ناول نگاروں نے ادب کی عظیم خدمات انجام دی ہیں جنہیں فراموش نہیں کیا جاسکتا ہے۔

چوتھے باب میں ترقی پسند تحریک سے وابستہ خواتین ناول نگاروں کی کردار نگاری کا جائزہ لیا گیا ہے۔ ترقی پسند تحریک کا آغاز ۱۹۳۵ء میں ہوا۔ یہ ایک ایسی تحریک تھی جس سے صرف مرد ہی متاثر نہیں ہوئے بلکہ اس تحریک کا اثر خواتین فکشن نگاروں پر بھی ہوا۔ ترقی پسند خواتین قلم کاروں میں عصمت چغتائی، رضیہ سجاد ظہیر، خدیجہ مستور اور رشید جہاں خصوصی اہمیت کی حامل ہیں۔ مقالہ نگار نے اس باب میں ان خواتین ناول

نگاروں کی کردار نگاری کے امتیازات پر بھرپور روشنی ڈالی ہے۔ جو قابل تعریف ہے۔ مقالے کا پانچواں باب آزادی کے بعد خواتین ناول نگاروں کی کردار نگاری پر روشنی ڈالتا ہے۔ اس باب میں حجاب امتیاز علی، قرۃ العین حیدر، جمیلہ ہاشمی، بانو قدسیہ، جیلانی بانو، الطاف فاطمہ، وغیرہ کی کردار نگاری کی خوبیوں اور خامیوں پر مفصل بحث کی گئی ہے۔ ان کے علاوہ بھی بہت سی خواتین ناول نگار ہیں جن کے ناولوں میں کردار نگاری کی خوبیاں موجود ہیں ان میں واجدہ تبسم، بشری رحمن، رضیہ بٹ، ترنم ریاض وغیرہ ہیں۔ مگر مقالہ نگار نے مقالے کی طوالت کی بنا پر انہیں مقالے میں جگہ نہیں دی ہے۔ ان ناول نگاروں کے یہاں بہت سے ایسے کردار ہیں جو فنی محاسن کے حامل ہیں اگر ان کا بھی انتخاب کر لیا جاتا تو اردو ادب کے لیے گراں قدر بات ہوتی۔

چھٹا باب مقالے کا اختتامیہ ہے۔ اس باب میں مقالہ نگار نے اپنے موضوع کا مجموعی محاکمہ پیش کرتے ہوئے اردو کی خواتین ناول نگاروں کی ادبی حیثیت پر مجموعی رائے پیش کرتے ہوئے اس بات پر زیادہ زور دیا ہے کہ اردو ناول کی تعمیر و تشکیل میں جتنا حصہ مرد ناول نگاروں کا ہے اتنا ہی خواتین ناول نگاروں کا بھی ہے۔ خواتین نے بھی اپنے ناولوں سے اردو ناول نگاری کی بنیادوں کو مضبوط کرنے میں بہت محنت کی ہے۔

گذشتہ صفحات میں ہم نے ان چار مقالوں کو اپنے مطالعہ کا موضوع بنایا جو افسانوی نثر کے حوالے سے عباس رضانیر کی رہنمائی میں پایہ تکمیل کو پہنچے ہیں۔ یہ تحقیقی مقالے عباس رضانیر کی رہنمائی میں اردو فکشن کی تحقیق و تنقید کے حوالے سے اس بنیادی مسئلے کا محققانہ اور ناقدانہ تجزیہ ہیں کہ نیر صاحب کی رہنمائی میں اردو فکشن کی تحقیق و تنقید بھی اتنی ہی اہمیت کی حامل ہے جتنی کہ ان کی افسانوی نثر۔

مذکورہ چاروں مقالات کے عناوین، ابواب، ذیلی ابواب اور ان کے منسلکات و متعلقات سے اندازہ ہوتا ہے کہ مقالہ نگار کی رہنمائی رائج طریقہ پر نہ ہو کر

بڑی دقت نظر کے ساتھ کی گئی ہے۔ آج کل جامعات میں ریسرچ اسکالروں اور نگرانوں دونوں میں عدم توافق کی وجہ سے ہی ادب کی دنیا میں ان مقالات کو زیادہ اہمیت نہیں دی جاتی ہے البتہ یہ چاروں مقالات ایسے ہیں جو فکشن تنقید اور تحقیق کے حوالے سے نہایت اہم ہیں جس کی اہم وجہ نگران کی رہنمائی ہے کیونکہ جو مسائل اٹھائے گئے، بیباک رائے دی گئی وہ تنہا ایک ریسرچ اسکالر کے بس کی بات نہیں بلکہ اس میں نگران کی رہنمائی اور اس کی دقت نظر صاف طور سے جھلکتی ہے۔

اگرچہ نیر صاحب کی بنیادی حیثیت تو ایک منفرد شاعر کی ہے مگر نثر کے شعبے میں بھی انہوں نے مختلف افسانوی اصناف میں بھی اپنی تخلیقی اچھ کو اس طرح استعمال کیا ہے کہ ان کا امتیاز اپنی انفرادیت کے ساتھ ادبی اہمیت کا حامل ہو گیا ہے۔

☆☆☆

تنقید

عباس رضا نیر بحیثیت ناقد اور ”تنقیدی بحثیں“ ایک جائزہ

اسعد اللہ

اردو زبان و ادب میں تنقیدی نظریات کی معنویت اس بات سے لگائی جاسکتی ہے کہ ہر ادیب کا آج اپنا ایک الگ نظریہ اور فلسفہ ہے کسی بھی حقیقت کی مابینیت تک پہنچنے کے کئی راستے ہوتے ہیں انہیں میں سے ایک راستہ تنقید کا بھی ہے۔ اور یہ کسی بھی ادب کے زندہ رہنے کی بہترین مثال ہے کہ اس زبان کے اپنے ناقد ہوں اور اس کے اپنے اصول و ضوابط۔ یوں تو تنقید لکھنا اور اسے اہل فن سے منوالینا نہایت ہی جاں سوز کام ہے۔ اور اگر کام معیاری ہو تو منوانے کی چنداں حاجت نہیں۔ جیسے خوشبو کو یہ کہنے کی ضرورت نہیں کہ ”میں خوشبو ہوں“۔ اور اگر کسی قلم کار نے اصولوں سے سمجھوتہ کر لیا ہے تو بس زبان و ادب کا اللہ حافظ!

اردو ادب میں تنقید کی روایت کوئی بہت پرانی نہیں دیگر اصناف کی طرح اس صنف کو بھی یورپین تصور کیا جاتا ہے۔ نئی زبان اور نئے علوم و فنون کے مطالعہ نے اردو تنقید کو ایک صحت مند معاشرہ فراہم کیا ہے اور تنقید کو بین العلومیت (Interdisciplinary) حاصل ہوئی۔ پھر اس زبان میں جمالیاتی تنقید (Aesthetics Criticism) تاثراتی تنقید، (Criticism)

impressionistic) رومانوی تنقید (Romantic criticism) کے ساتھ ساتھ عمرانی تنقید، نفسیاتی تنقید، اور فلسفیانہ تنقید بھی عروج پاتی گئی۔ وقت گزرنے کے ساتھ عملی تنقید، تجزیاتی تنقید، ساختیاتی تنقید، پس ساختیاتی تنقید اور سائنٹیفک تنقید کے دروازے کھلے اور اصطلاحیں عام ہوئیں۔ آج کسی کے بھی خیالات کے جانچنے پر کھنے کے کئی میزان اور پیمانے ہیں۔ اس لیے کوئی بھی فن پارہ جانچنے یا پرکھنے سے پہلے ہمیں تنقیدی جہات کا صحیح علم رکھنا ہوگا۔ تب کہیں جا کر ہم اس فن پارے کا حق ادا کر سکتے ہیں ورنہ کہنے کو تو آج کی اس گلوبل دنیا میں نقادوں کی کمی نہیں۔ لیکن ان میں سے کتنے ایسے ہیں جنہیں ادب کی دنیا نے بحیثیت نقاد تسلیم کیا ہے۔ یقیناً ایسے ناقدین کی تعداد آٹے میں نمک کے برابر ہے۔ اردو دنیا میں کچھ ایسے بھی نقاد گذرے جو آندھی اور طوفان کی طرح آئے لیکن زیادہ دنوں تک نہیں رہ سکے۔ کیوں کہ ان کا مقصد سوائے اس زبان و ادب کی بے حرمتی کے کچھ نہیں تھا۔ اس لئے برساتی مینڈھک کی طرح دو ایک موسم میں اپنی راگنی سنا کر پانی کے بلبلے کی طرح غائب ہو گئے۔

اردو ادب میں جن شخصیتوں نے اپنی فنی مہارت، تخلیقی صلاحیتوں، تبحر علمی اور تنقیدی بصیرتوں کا لوہا منوایا ہے خاص کر دبستان لکھنؤ کے حوالہ سے۔ ان میں ایک بڑا اور معتبر نام عباس رضا نیر صاحب کا ہے۔ ان کے انداز تحریر، قوت استدلال اور بیانیہ کی قطعیت و وضاحت کو پڑھتے ہوئے محسوس ہوتا ہے کہ ایک کثیر الجہات اہل قلم کا مطالعہ کیا جا رہا ہے۔ عباس رضا نیر صاحب اپنی ان گونا گوں صلاحیتوں کی بنا پر قلم کار ہی نہیں بلکہ قلم ساز بھی ہیں۔ تنقید نگار ہی نہیں بلکہ ایک عہد ہیں۔ صرف معلم ہی نہیں بلکہ مربی بھی ہیں۔ مشرقی علوم پر کافی دسترس رکھنے کے ساتھ مغربی ماہرین کے نظریات کے بھی گواہ ہیں۔

آپ بیک وقت شاعر، ناظم مشاعرہ، افسانہ نگار، تنقید نگار اور منجھے ہوئے قلم کار

کی حیثیت سے اردو دنیا میں متعارف ہیں۔ گویا کہ وہ ایک اکیڈمی یا علم کے بحر بے کنار ہیں جہاں سے مختلف اور گونا گوں سوتے پھوٹتے ہیں۔ اب یہ علم کے متلاشی کا کام ہے کہ وہ ان کی شخصیت اور ان کے سیال قلم سے کتنا فائدہ اٹھاتا ہے۔ سردست ہم یہاں انہیں بحیثیت ناقد کے ان کے تنقیدی مقالوں کی کتاب ”تنقیدی بحثیں“ کا ایک سرسری جائزہ پیش کرنا چاہیں گے۔

اس کتاب میں انہوں نے اپنی وہ تمام تحریریں یکجا کر دی ہیں جو مقالات یا مضامین کی شکل میں مختلف موقعوں پر لکھے گئے تھے۔ تاکہ آنے والی نسلوں کے لیے ایک دستاویز رہے اس کتاب کے اندر کل تیرہ مضامین شامل ہیں اور ہر مضمون کی اپنی ایک انفرادیت ہے۔ کچھ مضامین تو ایسے ہیں جو برسوں سے کسی رسم و رواج کی طرح نسل در نسل چلے آ رہے مفروضوں کی نشان دہی کرتے ہیں اور قلم کاروں کی عدم توجہی پر نوحہ کننا ہیں۔ مثلاً ”بہادر شاہ ظفر اپنے نصیب کی تماشا گاہ میں“ اس مقالہ کے تنقیدی مطالعہ سے جہاں ایک طرف بہادر شاہ ظفر کے حالات زندگی پر روشنی پڑتی ہے وہیں دوسری طرف ان تمام الزامات کی تردید و تاویل مدلل انداز سے کی گئی ہے کہ کس طرح سے اس عظیم شاعر پر تہمتیں لگائی گئی ہیں اور حد تو یہ ہے کہ لوگوں نے ان فرضی اور سنی سنائی باتوں کو عام کر دیا ہے جن کا حقیقت کی دنیا سے کوئی تعلق نہیں اور بہادر شاہ ظفر کو ادب میں وہ مقام نہیں دیا گیا جس کے وہ حق دار تھے۔ لکھتے ہیں:

”بہادر شاہ ظفر ہماری سیاسی اور ادبی تاریخ کا ایک ایسا مظلوم شہنشاہ ہے جس کے ساتھ ارباب سیاست نے بھی زیادتی کی اور اہل ادب نے بھی۔ زمانے نے بھی اس کے ساتھ بے وفائی کی اور نصیب نے بھی۔ قدرت نے بہادر شاہ ظفر کو ستاسی برس کی طویل عمر دی لیکن وہ آرزو اور انتظار میں کٹ گئی باسٹھ برس کے انتظار کے بعد تخت نشینی کی

آرزو پوری ہوئی تو عہد جوانی رخصت ہو چکا تھا۔ خزانہ دولت سے اور زمانہ محبت سے خالی ہو چکا تھا..... یہ تو وہ ستم ہے جو بہادر شاہ ظفر پر غیروں نے کیا تھا اپنوں کے ستم کا یہ عالم ہے کہ ”آب حیات“ میں محمد حسین آزاد نے لکھ دیا کہ ”بہادر شاہ ظفر کا آدھا دیوان شاہ نصیر کا ہے اور باقی ایک تہائی دیوان استاذ ذوق کا عطا کردہ ہے۔“ یادگار غالب میں خواجہ الطاف حسین حالی نے لکھ دیا کہ ”ظفر کا آدھا دیوان غالب کا تھا“۔ انتہا یہ ہے کہ رنگون کے زمانہ قید و بند میں کہی گئی بہادر شاہ ظفر کی غزل مضطر خیر آبادی کی بتائی گئی اور کوئی غزل سیماب اکبر آبادی کے نام سے منسوب کی گئی جب کہ یہ غزلیں مذکورہ شعرا کی ولادت سے بہت پہلے دہلی کے عوام کی زبانوں پر بہادر شاہ ظفر کے نام سے چڑھی ہوئی تھیں۔“

(ص ۱۲/۱۱)

اس اقتباس کو یہاں ہم نے اس لئے درج کیا ہے کہ ایک کثیر اردو داں طبقہ آج بھی اس کو مانتا ہے اور اندرون خانہ یا پس پردہ تسلیم کرتا چلا آ رہا ہے کہ بہادر شاہ ظفر کا دیوان مذکورہ بالا شاعروں کی مرہون منت ہے ورنہ بہادر شاہ ظفر کو فرصت ہی کہاں تھی۔ حالانکہ ہم سب جانتے ہیں کہ غالب و ذوق دونوں ظفر کے استاذ تھے۔ اور اپنے استاذ سے اصلاح لینے میں کوئی مضائقہ نہیں۔ البتہ یہ کہہ دینا کا پورا یا آدھا دیوان انہیں کا ہے یہ بات نہ صرف بعید از قرین قیاس بلکہ الزام ہے۔

بہادر شاہ ظفر نے اپنے دل کی باتوں اور آئے دن پیش آنے والے حادثات و واقعات کو غزلیہ رنگ و آہنگ میں پیش کرنے کی کامیاب کوشش کی ہے۔ جس طرح سے ان سے پہلے اور بعد کے شعرا نے اپنی اپنی بساط بھر دہلی اور اس کے آس پاس کے حالات کی ترجمانی کرتے ہوئے بے بسی اور بے بضاعتی کا رونا رویا ہے۔ پھر اسے شعر

یانٹر کے پیراہن میں سجا کر عوام کو معنون کر دیا ہے۔ تاکہ مستقبل کے لیے ایک لمحہ فکریہ اور ماضی کی بازیافت ہو سکے۔ یہاں یہ بات بھی بتانا چلوں کہ اگر غالب نے خطوط نہ لکھے ہوتے تو شاید ہماری آزادی کی تاریخ اور غدر کی کہانی ادھوری رہ جاتی۔ کیوں کہ یہ اس دور کا سب سے بڑا ماخذ ہے۔ اور شاعر ہو یا ادیب وہ اپنے وقت کے حالات اور پاس پڑوس کے ماحول کا اثر ضرور قبول کرتا ہے۔ ایک شاعر جب گل و بلبل کو نغمہ سنجی کرتے ہوئے دیکھتا ہے تو اسے اپنے ملک کے جنگلات میں اس کی تلاش رہتی ہے تاکہ وہ بالواسطہ مشاہدہ کر سکے۔

اس ضمن میں بہت ساری نثری اور شعری کتابوں کا محاکمہ کیا جاسکتا ہے۔ مثلاً دہلی کی تباہیوں کہنے کہ ہندوستان کی تباہی ۱۸۵۷ء سے پہلے ہی شروع ہو چکی تھی۔ لیکن عموماً ہمارے اکثر مؤرخ یا شعرا حضرات اس کی تاریخ یا اس کے اجڑنے کی داستان ”۱۸۵۷ء“ کے بعد ہی شروع کرتے ہیں۔ اس پر کیا کہا جائے حالانکہ دھیرے دھیرے یہ عقدہ اب کھلتا جا رہا ہے۔ بہر حال اس وقت کے حالات کی عکاسی کے لیے جو کتابیں دستیاب ہیں اگر ان کا بغور مطالعہ کیا جائے تو یہ حقیقت سامنے آتی ہے کہ کس طرح سے انہوں اس کا مشاہدہ کیا تھا۔ اس سلسلہ میں شاہ ظہور الدین حاتم کا مخمس ”شہر آشوب“ مرزا رفیع سودا کا قصیدہ ”تضحیک روزگار“ اور میر تقی میر کی مثنویاں ”در بیان کذب“ وغیرہ سے حالات کا جائزہ لیا جاسکتا ہے۔ ان مثنویوں میں درد و غم، یاس و حزن کی جھلک دکھائی دیتی ہے۔

لیکن بہادر شاہ ظفر کا میدان مثنوی نہیں بلکہ غزل تھا۔ انہوں نے اپنے درد و غم اور زندگی کے اندر آنے والے مصائب و مشکلات بیان کرنے کے لیے غزلیہ رنگ و آہنگ کا سہارا لیا۔ ایسے میں یہ الزام کہ ان کا کلام مشکوک ہے دیانت داری کے تقاضہ کے خلاف ہے اور عباس رضا نیر صاحب کے قلم کی جرأت ہی کہے جس نے ان تمام الزامات کو دلائل کی روشنی میں یکسر کھوکھلا کر دکھایا۔

ظفر کے شعری ذوق کی تربیت لال قلعے کے صاف ستھرے ماحول میں ہوئی۔ اور یہ قلعہ ہی اس وقت شعر و شاعری کا مرکز ہوا کرتا تھا۔ بہادر شاہ ظفر کے نصیب میں اوپر والے نے جہاں بانی کے ساتھ ساتھ دولتِ درد سے بھی نوازا رکھا تھا۔ لہذا انہوں نے درد و الم، مصائب و مشکلات اور حکومت کے زوال کے آثار، اغیار کی سازشوں اور اپنوں کی ستم ظریفی کو بھی غزلوں میں آشکار کرنے کی کوشش کی ہے۔ ساتھ ہی انہوں نے دنیا کی بے ثباتی، ناپائیداری، پند و نصیحت، اور عاشقانہ معاملہ بندی کے ساتھ تصوف کو بھی اپنی غزلوں کی جولان گاہ بنایا ہے۔ اس لئے ان کے اوپر لگائے گئے الزامات کا مدلل جواب دیتے ہوئے عباس رضا نیر صاحب نے جو سوالات قائم کیے ہیں ان کی اہمیت دو چند ہو جاتی ہے۔ یہ اقتباس ملاحظہ فرمائیں:

”اگر یہ سب تخلیقات و آثار بہادر شاہ ظفر کے اساتذہ، تابعین اور تبع تابعین کی دین ہیں تو رنگوں کے زمانہ جلا وطنی کی غزلیں آخر کون ان کے دامن میں ڈال گیا....؟ یہ غزلیں اپنی بے تکلفی، برجستگی اور سادگی کے اعتبار سے ایک خاص نوع کی کیفیت کی حامل ہیں۔

(تنقیدی بحثیں ص ۱۲)

ایسے تمام مفروضوں کا پردہ چاک کرتے ہوئے عباس رضا نیر صاحب نے صحت مند تنقید کا بہترین نقشہ پیش کیا ہے۔ لیکن چون کہ ہمارے ادبا کی اکثریت کا سارا انحصار بس ”آب حیات“ کے اس جملے پر ہے جس میں بہادر شاہ ظفر کے کلام کو ذوق سے منسوب کرنے کی غلطی کی گئی ہے۔ حالانکہ ہم ”آب حیات“ کا تاریخی نہ سہی، سرسری جائزہ لیں تو ہمیں اس کتاب میں عصبيت کی بو آتی ہے جس کو چاہا آسمان بنا دیا اور طبعیت موزوں نہ ہوئی تو پاتال میں ڈھکیل دیا گیا۔ کبھی اپنے استاذ ذوق کو ثریا پر بٹھایا گیا تو کبھی غالب کے متعلق ایسے اقوال پیش کئے گئے جو کہ آج تحقیق کی روشنی میں غلط ثابت ہو چکے

ہیں۔ یہ ممکن ہے کہ لوگ ذوق کو بھول جائیں لیکن غالب کو.....؟ ہاں! میں یہ کہنے میں حق بجانب ہوں کہ ”تنقیدی بحثیں“ کے مطالعہ سے اتنی بات تو ذہن میں در آتی ہے کہ آج بھی کچھ لوگ ایسے ہیں جنہیں قلم سے سمجھوتہ کرنا نہیں آیا بلکہ وہی لکھا جسے حق سمجھا گیا، اور تنقید کی صحت مندی کی مثال اس سے بہتر کیا ہو سکتی ہے جو جس پیمانے کے لائق ہو اس کو اسی کے مطابق ”جام“ دیا جائے جس سے ”سبُو“ کی سبکی نہ ہو۔

اور یہی کام اس تنقیدی مقالہ میں عباس رضا نیر صاحب نے بڑے ہی مدلل انداز میں پیش کیا ہے جس سے کہ دودھ کا دودھ اور پانی کا پانی قاری کے سامنے آ جاتا ہے۔ ایک اور تنقیدی مقالہ کا ذکر ہم کرنا چاہیں گے جسے انہوں نے اپنے قلم کی جولان گاہ بنایا ہے اور وہ ہے ”جہد آزادی اور مسدس افق“ کے عنوان سے۔ اس مقالہ کے ذریعہ منشی دوار کا پرشاد کوارد داں طبقہ سے نہ صرف نئے سرے سے متعارف کروایا گیا ہے بلکہ ان کے مسدس کو مسدس حالی کے بعد سب سے اہم گردانا ہے۔ وہ رقمطراز ہیں:

”افق ہندو دھرم کو جگانے کے لیے اپنے مسدس سے وہی کام لیتے ہیں جو کام مسلمانوں کو جگانے کے لیے مولانا الطاف حسین حالی نے اپنے ”مسدس مد جزا اسلام“ سے لیا تھا۔“

(تنقیدی بحثیں: ص ۴۵)

مذکورہ بالا جملوں سے ممکن ہے کہ آپ کو اختلاف ہو اور ہونا بھی چاہئے۔ یہ آپ کا تنقیدی حق ہے۔ لیکن اس کے ساتھ ساتھ یہ بات بھی ہمارے ذہن کے درپچوں کو اکر جاتی ہے کہ حالی کی مسدس کے علاوہ بھی دیگر مسدس کا مطالعہ ادب کے قارئین کے لیے مفید ثابت ہو سکتا ہے اگر ہم ان پر گہرائی اور گیرائی کے ساتھ سوچیں۔ اور ایسا اس لیے بھی ہوا کہ دیگر مسدس پر قلم کاروں کی نظر التفات نہیں ہوئی۔ یا ہوئی ہوگی لیکن اہل قلم نے اس پر کچھ لکھنا مناسب نہیں سمجھا۔ لیکن مصنف نے منشی دوار کا پرشاد افق کو اس مقالہ

کے ذریعہ سچا خراج عقیدت پیش کرنے کی کوشش کی ہے۔ اور افق کے بیانیہ کی قوت، مہا بھارت اور روحانیت کی سیر کے حوالہ سے لمبی بحث کی ہے اور اس طرح سے گفتگو کی گئی ہے کہ اس کے شیریں جملوں کی ترتیب و ساخت میں قاری مسحور ہو جاتا ہے اور افق کی تابانی کی داد دینی پڑتی ہے جس طرح سے انہوں نے اس مسدس کے ذریعہ اپنی قوم کو یاد ماضی کی طرف دعوت دیتے ہوئے اس کی تاریخی حیثیت کو واضح کرنے کی سعی کی ہے۔ اس مضمون سے جہاں ایک طرف افق کو نئے سرے سے زندہ کرنے کی کوشش کی گئی ہے وہیں دوسری طرف اس بات کا اشارہ دیا گیا ہے ہمارے ادبا ان شاعروں یا ادیبوں پر کام کیوں نہیں کرتے جن پر اب تک کام نہیں ہو سکا ہے۔ یا ہوا ہے تو نہیں کے برابر۔ کیوں ہم انہیں موضوعات کو اٹھاتے ہیں جن پر کچھ نہ کچھ کام ہو چکا ہے یا جاری ہے۔

ادب کا رشتہ غیروں سے استوار کرنے کے لیے ہمیں ان ہستیوں کو دیکھنا پڑے گا جنہوں نے اس کے ابتدائی دور میں اس زبان و ادب کا ساتھ دیا ہے۔ خواہ وہ جس طرح سے بھی ممکن ہو سکا کیوں کہ ادب کا یا ادبی ہستیوں کا رشتہ سرحدوں، ذات پات، چھوڑا چھوٹ اور دھرم مذہب کی زنجیروں میں قید نہیں ہوتا بلکہ بہت ہی بلند ہوتا ہے۔ اور یہ بلندی ایسی ہے کہ ”ثریا“ بھی شرما جائے۔ یہ ادب اور زبان ہی ہے جو ہر ایک کو اپنے رنگ میں رنگ دینے کا خواہاں ہوتا ہے۔ زبانیں کسی کی میراث نہیں ہوتیں بلکہ یہ اس کی ہوتی ہے جو اسے اپنانا چاہے اور اس کی چھاؤں میں اپنی زندگی کے حسین لمحات کو گزارتے ہوئے سرور و انبساط حاصل کرے۔

اس سے پہلے کہ میں اپنا یہ جائزہ مکمل کروں ایک اور مقالہ کا تجزیہ مناسب ہوگا ”بیسویں صدی میں لکھنؤ کا اردو ادب“ اس میں دراصل عباس رضا نیر صاحب کا منشا ہے کہ لکھنؤ ادبی اعتبار سے مرکز ہے لہذا موجودہ حالات میں اس کی مرکزیت کے مقام کی تعیین کی جانی چاہئے کہ آیا گذشتہ لکھنؤ سے موجودہ لکھنؤ مختلف ہے یا پھر آج بھی اس

تہذیب وثقافت کے شہر میں زبان و ادب کے تئیں لوگ حساس ہیں یا نہیں اور مصنف اس میں کامیاب دکھائی دیتے ہیں انہوں نے قدیم ماخذوں سے لے کر جدید شعراء اور ادباء کا اس خوب صورتی کے ساتھ احاطہ کیا ہے جیسے وہ ہمارے سامنے ہوں۔ وہ لکھتے ہیں:

”لکھنؤ بیسویں صدی میں ادبی تخلیقی روایت کے اعتبار سے مرکزی حیثیت کا حامل رہا ہے۔ اس صدی کے اوائل ہی سے تمام اصناف ادب کے مظاہر سامنے آتے ہیں۔ شاعری، افسانہ، ناول اور تنقید کے میدا نوں میں اس شہر کے ادیبوں نے کارہائے نمایاں انجام دیئے ہیں۔ زمانہ شرر کے تاریخی ناولوں اور رسوا کی ”امراؤ جان ادا“ سے انکار نہیں کر سکتا۔ علی عباس حسینی، چکیت، عزیز، صفی، محشر اور ثاقب ہماری شاعری کا گراں مایہ خزانہ ہیں۔ توجوش اور یگانہ ہماری شعری روایت کے آفاق کو روشن کرتے ہیں۔ مسعود حسن رضوی ادیب کی علمی اور تحقیقی کاوشیں نئے جہان معنی سے روشناس کراتی ہیں تو حیات اللہ انصاری کا ناول ”لہو کے پھول“ برصغیر کے نمائندہ ناول کی حیثیت سے ایک نیا اور بیش بہا عطیہ ہے۔“

(تنقیدی بحثیں: ص ۲۲۲-۲۲۳)

چونکہ عباس رضانیر صاحب خود بھی اسی شہر تہذیب سے وابستہ ہیں اس لئے ان

کا یہ کہنا بجا ہے کہ:

”لکھنؤ کی جدید تر نسل بھی انہیں ادبی سرگرمیوں میں پورے انہماک اور دلجمعی کے ساتھ مصروف ہے اور سابقین کی طرح یہ نسل بھی لکھنؤ کو ادبی روایت کے ساتھ زندہ اور تابندہ رکھے گی۔“

(ایضاً: ص ۲۲۳)

اس کے علاوہ اس کتاب میں جو دیگر مقالے ہیں یہاں میں ان کا عنوان لکھنے پر

اکتفا کروں گا کیوں کہ ”بات نکلے گی تو بہت دور تلک جائے گی“ جن تنقیدی مقالوں کو اس کتاب میں جگہ ملی ہے وہ کچھ اس طرح سے ہیں ”بہادر شاہ ظفر اپنے نصیب کی تماشہ گاہ میں“۔ ”جہد آزادی اور مسدس افق“۔ ”اپنی زمین اور اپنی تہذیب کا شاعر فراق“۔ ”ہند فارس اور ن۔ م راشد“۔ ”دیہی زندگی کی کشاکش اور پریم چند“۔ ”اختری بیگم: ایک تہذیبی دستاویز“۔ ”قرۃ العین کا تخلیقی سفر ایک مجموعی جائزہ“۔ ”انتظار حسین اور ہجرت“۔ ”اردو صحافت کا مجاہد اول‘ مولانا باقر دہلوی“۔ ”اردو صحافت اور مولانا ابوالکلام آزاد“۔ ”منشی نول کشور، مرزا غالب اور ہم“۔ ”بیسویں صدی میں لکھنؤ کا ادب“۔ یہ کل تیرہ مقالات اس کتاب کی زینت ہیں لیکن سب ایک سے بڑھ کر ایک۔ کسی مقالے کو کسی پرفوقیت نہیں دی جاسکتی ہے۔ ظاہر ہے چاند اور سورج دونوں مختلف ہیں بلکہ متضاد بھی۔ لیکن فائدہ ہر ایک سے اٹھایا جاسکتا ہے۔ اور دونوں کی اپنی اپنی کچھ خاصیتیں بھی ہیں اسی طرح کا معاملہ ان تمام مقالات کا بھی ہے جو اس کتاب کی زینت ہیں۔

آخری بات یہ ہے کہ عباس رضانیر صاحب نے اس کتاب کے اندر عملی تنقید اور خا رچی تنقید کا بہترین نمونہ پیش کیا ہے اور ایک حد تک جمالیاتی تنقید کی بھی مثالیں پیش کیں ہیں۔ خاص کر ”قرۃ العین کا تخلیقی سفر ایک مجموعی جائزہ“ میں۔ اور انہیں اس پر گرفت حاصل ہے۔ اور اس سے اس بات کی بھی تصدیق ہوتی ہے کہ ”ایک شاعر ایک بہتر نقاد ہو سکتا ہے“۔ اس کی مثالیں ہمارے سامنے ہیں مثلاً شمس الرحمن فاروقی، ٹی ایس ایلٹ، پروفیسر مغنی تبسم، پروفیسر آل احمد سرور وغیرہ۔ جن کی ناقدانہ صلاحیتیں جگہ ظاہر ہیں۔ امید ہے ادبی حلقوں میں اس کتاب کی خاطر خواہ پذیرائی ہوگی جس کی یہ حقدار ہے۔ اور مزید اس پر بحث و مباحثہ اور تحقیق و جستجو کے راستے واہوں گے۔ جس سے تنقیدی بصیرت کی مزید گرہیں کھل سکیں گی۔ اور مذکورہ مقالات کی روشنی میں ایک نئے سرے سے کام کیا جاسکے گا۔

عباس رضانیر کی ”تنقیدی بحثیں“ ایک جائزہ

حیدر علوی

کچھ کتابیں محترم وقار رضوی صاحب کے ذریعہ لیں۔ گھر آ کر دیکھا تو محترم عباس رضانیر صاحب کی کتابیں تھیں۔ تو ایک کتاب ”تنقیدی بحثیں“ پڑھنی شروع کی۔ ایک ایک ذہنی رو بھٹکی اور دوسری سمت اڑنے لگی۔ کچھ دن پہلے علم دست شناسی پر ایک کتاب دیکھی۔ یوں ہی ورق گردانی شروع کر دی۔ پہلے ہی صفحہ پر کچھ ہدایتیں لکھی تھیں۔ جن میں ایک یہ تھی کہ اگر کسی سے آپ کے تعلقات ٹھیک نہ ہوں تو اس کا ہاتھ مت دیکھئے۔ ایک ذہن میں خیال آیا کہ تنقید کا معاملہ بھی کچھ ایسا ہی ہے کسی سے دشمنی مول لینی ہے تو اس کے شعر پر تنقید کر دیجئے۔ سمجھ لیجئے آپ کی خیر نہیں ہے کیونکہ ہر شاعر غالب اور میر سے دو ہاتھ بڑا ہے۔ لیکن محترم عباس رضانیر نے بڑی خوب صورتی سے خود کو محفوظ کر لیا، کیونکہ ان کے تنقیدی مضامین کے تمام کردار دنیا سے رخصت ہو چکے ہیں۔ ورنہ ان کے دولت کدے پر نعروں اور لاٹھی ڈنڈوں سے۔ بس لوگوں کا ہجوم ہوتا، جب اسٹیج کے ایک شاعر ناقد، جس کو ہندی میں آلوچک کہتے ہیں۔ سرعام اس کو آلوچنا کہتے ہیں، تو چھٹ بھیوں کا کیا حال ہوگا؟

محترم عباس رضانیر نے اس کتاب کو لکھنے میں کتنی محنت کی ہوگی، کتنا خون

جلایا ہوگا، یہ ان کا دل جانتا ہوگا۔ کس طرح ایک ایک شعر، ایک ایک جملہ کھنگالا ہوگا، کتنی عرق ریزی کی ہوگی، کتنی راتیں جاگ کر گزاری ہوں گی، کتنی پیشانی کی شکنوں میں اضافہ کیا ہوگا۔ یہ وہی جانتے ہوں گے۔ لوگ سمجھتے ہیں کہ لفظوں کا استعمال کرنا بہت آسان ہے۔ تحقیق و تنقید ایک عام سا کام ہے۔ شاید وہ یہ نہیں جانتے کہ ہمالیہ فتح کرنے کے لیے تین سنگھ کا حوصلہ چاہئے۔ محترم عباس رضانیر نے بارہ شخصیات کے بارے میں لکھا ہے اور تیرہویں مضمون میں قدیم لکھنؤ کو سمیٹا ہے۔ ایک ایک شعر کو ثابت کرنا حوالوں سے کہ شعر کس کا ہے، لوگوں کے ذہنوں سے گرد و غبار صاف کرنا، اتنا آسان نہیں ہوتا کیونکہ جب شعر کسی کے نام سے منسوب ہو جائے تو یہ ثابت کرنا کہ شعر کس کا ہے، اس کا اصل خالق کون ہے۔ ایک دشوار ترین کام ہوتا ہے اور انہوں نے یہ کام بحسن و خوبی انجام دیا ہے۔

بہادر شاہ ظفر کے بارے میں میر صاحب نے اپنے مضمون، اپنے نصیب کی تماشہ گاہ میں لکھا ہے کہ بہادر شاہ ظفر کے ساتھ جو نا انصافیاں ہوئیں ہیں، وہ سب کے سامنے ہیں، مگر ستم تو یہ ہے کہ محمد حسین آزاد نے ستم کے جوڑ ہریلے تیر چلائے اور یہاں تک لکھ ڈالا کہ ان کا آدھا دیوان شاہ نصیر کا اور آدھا استاد ذوق کا ہے۔ یہاں پر میر صاحب نے عمیق مطالعہ کے بعد بھرپور طور پر ثابت کیا ہے کہ یہ اشعار اور غزلیں بہادر شاہ ظفر کی ہی ہیں اور اس کی وجہ یہ بتائی ہے کہ ان غزلوں کے تجربات اور احساسات استعارے کی شکل میں اپنی زندگی سے تراشے ہوئے ہیں۔ مسدس افق بھی ایک تراشہ ہوا اور مدلل مضمون ہے۔ ان کی شاعری اور پیغام جو افق صاحب نے دیا ہے، گویا کہ کوزے میں دریا کو سمیٹا ہے۔

فراق صاحب کے بارے میں ایک دنیا جانتی ہے کہ وہ ایک نا آسودہ زندگی کے مالک تھے اور شاید اس نا آسودگی اور اعلیٰ تعلیم نے مل کر ان کو ایک عظیم شاعر کے

سانچے میں تبدیل کر دیا تھا۔ اس میں نیر صاحب نے یہ اعتراف بھی کیا ہے کہ مضمون میں صرف فراق کے شاعری میں جمالیاتی احساس کو مرکزی حیثیت دی گئی ہے۔

ن، م راشد پر مضمون میں نیر صاحب نے یہ بتانے کی بھرپور سعی کی ہے کہ ان کی شاعری پر ایرانی کرداروں اور علامتوں کا بہت گہرا اثر رہا ہے اور وہ وہاں کے منظر ناموں سے جڑے رہے ہیں۔ اور یہی ن، م راشد کا کارنامہ ہے۔

پریم چند پر مضمون میں کہتے ہیں کہ انہوں نے اس وقت قلم اٹھایا جب ہندوستان غلامی کی زنجیروں میں جکڑا ہوا تھا اور غلام ہندوستان میں اس لکھاری نے انصاف پیدا کر دیا اور جہتوں کا نقیب کہلایا۔

مرزا رسوا کے ناول ”اختری بیگم“ کے بارے میں فرماتے ہیں کہ اس ناول کے کردار ٹائپ کردار ہو کر رہ گئے ہیں، لیکن بہر حال یہ ایک تہذیبی ورثہ ہے۔

قرۃ العین حیدر کے ناولٹ اور افسانوں کے بارے میں ان کی رائے یہ ہے کہ رزمیہ کی کڑیاں ہیں۔ مگر جدید افسانے کا آغاز بھی ہیں۔ اس لیے ان کے کردار کہانی کے کرداروں سے کم حیثیت نہیں رکھتے ہیں۔

انتظار حسین کے افسانہ ”کشتی“ کے بارے میں ان کی رائے ہے کہ تاریخ کے دیومالائی تسلسل کو اپنے عہد سے ملانے میں کامیاب ہیں۔

اردو ادب کے مجاہد مولوی باقر کو آج بھی وہ مقام نہیں ملا، جس کے وہ حقدار تھے، جیسا کہ ان کو شہید اول کا خطاب ملنا چاہئے تھا، نہ ان کے نام کوئی سڑک، نہ تعلیمی ادارہ ہے، اللہ تعالیٰ کچھ شہیدوں کے درجات یوں بھی بلند کرتا ہے۔

اردو صحافت اور مولانا ابوالکلام آزاد پر ملک زادہ منظور احمد نے جو تحقیق کی ہے وہ سوچنے پر مجبور کرتی ہے کہ ”الہلال“ اور ”البلاغ“ کے لیے مضامین کس نے لکھے اور کس کس کی کاوشیں تھیں۔ یہ کسی ایک کی کاوش نہیں ہو سکتی اور اس پر ابھی بہت تحقیق کی

ضرورت ہے، تا کہ گرد صاف ہو اور آسمان دکھے۔ ”منشی نول کشور اور غالب“ اس مضمون میں انہوں نے بتایا کہ منشی جی نے غالب کی تمام تصانیف شائع کی ہیں کہ کس طرح اردو ادب کی خوشبو پھیلی اور لکھنؤ کی تہذیبی روایت مضبوط ہوئی۔ اور حرف آخر میں بیسویں صدی کا لکھنؤ جواب ریگ رہا ہے۔ اللہ کرے کہ نیر صاحب نے سچ لکھا ہو کہ لکھنؤ کی روایت زندہ رہے گی اور نئی نسل اس کی حفاظت کرے گی۔ نیر صاحب کی ”تنقیدی بحثیں“ کے لیے بہت مبارکباد۔ ایک لائق و فائق استاد ہی ایسے موضوعات پر اس شان سے قلم اٹھا سکتا ہے۔



تنقیدی بحثیں ایک نظر میں

عبدالرحمن جمال

تنقیدی بحثیں ڈاکٹر عباس رضا نیر صدر شعبہ اردو لکھنؤ یونیورسٹی کی تصنیف ہے۔ اس کتاب میں الگ الگ موضوع پر لکھے گئے تیرہ مضامین شامل ہیں جو بقول مصنف مختلف اوقات میں اور مختلف موضوعات پر لکھے گئے ان مضامین میں کسی تحریک یا ازم سے متاثر ہوئے بغیر متن اور اس کے سیاق و سباق کے ذریعہ نتیجے تک پہنچنے کی کوشش کی گئی ہے۔ یہ مقالے قومی اور بین الاقوامی سمیناروں میں پڑھے بھی گئے ہیں اور مؤقر ادبی جریڈوں میں شائع بھی ہوئے ہیں۔

ان مضامین کے ذریعہ موصوف نے اردو ادب کی عمق کی شخصیات اور ان کے کارناموں پر سیر حاصل گفتگو کی ہے۔ جن میں ”بہادر شاہ ظفر اپنے نصیب کی تماشہ گاہ میں“ ”جہد آزادی اور مسدس افق“ ”اپنی زمین اور اپنی تہذیب کا شاعر فراق“ ”ہند فارس اور ن۔م راشد“ ”مجروح کی شعری جمالیات“ ”دیہی زندگی کی کشاکش اور پریم چند“ ”اختری بیگم: ایک تہذیبی دستاویز“ ”قرۃ العین حیدر کا تخلیقی سفر ایک مجموعی جائزہ“ ”انتظار حسین اور ہجرت“ ”اردو صحافت کا مجاہد اول مولانا باقر دہلوی“ ”اردو صحافت اور مولانا ابوالکلام آزاد“ ”منشی نول کشور، مرزا غالب اور ہم“ اور ”بیسویں صدی میں لکھنؤ کا اردو ادب“ شامل ہیں۔

اختری بیگم: ایک تہذیبی دستاویز کے تحت مصنف نے مرزا ہادی رسوا کے ناول

اختری بیگم سے متعارف کراتے ہوئے اسے ایک تہذیبی دستاویز کے طور پر پیش کیا ہے۔ اس سلسلے میں وہ خود لکھتے ہیں کہ: ”رسوا کے بیشتر نقادوں نے رسوا کے دونوں اطراف جان ادا اور شریف زادہ کو ہی اپنے مطالعے کا حصہ بنایا ہے، لیکن ہم نے اس مضمون میں رسوا کے نسبتاً کم مشہور ناول اختری بیگم میں اودھ کے تہذیبی عناصر تلاش کرنے کی جستجو کی ہے۔“

قرۃ العین حیدر کا تخلیقی سفر: ایک مجموعی جائزہ۔ میں مصنف نے قرۃ العین حیدر کے ناولوں ”میرے بھی صنم خانے“ ”سفینہ غم دل“ ”آگ کا دریا“ ”آخر شب کے ہمسفر“ ”کار جہاں دراز ہے“ ”گردش رنگ چمن“ ”چاندنی بیگم“ اور ناولٹ ”سیتا ہرن“ کا مختصر تعارف و تجزیہ پیش کرتے ہوئے اپنے موقف کا اظہار کیا ہے۔ ان کے نزدیک قرۃ العین حیدر کے ناول اور ناولٹ زندگی اور اس کے معنی کی تلاش کا ایک کامیاب رزمیہ ہیں اور ان کے افسانے اس رزمیہ کے تسلسل کی کڑیاں ہیں۔ وہ اپنے افسانوں میں محض تاریخی واقعات کی بازخوانی نہیں کرتیں بلکہ تہذیبی اقدار کی باز آفرینی بھی کرتی ہیں۔ اس کے علاوہ اس کتاب میں اردو صحافت سے متعلق دو اہم مضمون ”اردو صحافت کا مجاہد اول مولانا محمد باقر دہلوی“ اور ”اردو صحافت اور مولانا ابوالکلام آزاد“ اور ان دونوں کی اردو صحافتی خدمات اور کارناموں پر مشتمل ہیں جو اپنے متعلقات پر مبنی مواد کا اہم ذریعہ ہیں۔

”منشی نول کشور، مرزا غالب اور ہم“ میں مصنف نے منشی نول کشور اور مرزا غالب کے مختصر حالات زندگی اور باہمی روابط کو دلائل و شواہد کی روشنی میں پیش کرنے کی کوشش کی ہے اور منشی جی کے بارے میں لکھتے ہیں کہ: ”وہ اپنے پریس میں مصنفین کی کتابیں اپنی شرطوں پر چھاپتے تھے۔ کہیں کہیں تو مصنف سے یہ طے کرتے تھے کہ کتاب چھپنے کے بعد ایک بڑی تعداد میں کاپیاں مصنف کو خریدنی ہوں گی۔ اس طرح کتابوں کی اقلیم میں منشی نول کشور کی شہنشاہیت چلنے لگی تھی۔ یہ مضمون اپنے مشمولات کے اعتبار سے

اردو ادب کی ان دو ممتاز شخصیتوں کو سمجھنے اور معلومات حاصل کرنے کے لیے اہم ہے۔
 ”بیسویں صدی میں لکھنؤ کا اردو ادب“ موضوع مواد کے اعتبار سے اچھا ہے،
 موصوف نے نوصفحات میں پوری بیسویں صدی کے اردو ادب کا خلاصہ پیش کر دیا ہے،
 جس کی مدد سے اردو ادب کا کوئی بھی قاری دبستان لکھنؤ کی ادبی خدمات کا سرسری طور پر
 جائزہ لے سکتا ہے۔

”تنقیدی بحثیں“ اپنے مواد کے اعتبار سے ایک اہم کتاب ہے اور تنقید و
 تجزیے کے جو تقاضے ہیں ان کو بھی پورا کیا گیا ہے اور زبان و بیان میں بھی ثولیدگی نہیں
 ہے بلکہ تنقید میں جس زبان و بیان کی ضرورت ہوتی ہے ڈاکٹر نیر نے زبان و بیان کے
 اسی انداز کو اپنایا ہے۔

مختصر یہ کہ مختلف مضامین پر مشتمل ہونے کے باوجود یہ کتاب اپنے موضوع اور
 مواد کے اعتبار سے اردو زبان و ادب میں ایک اضافہ ہے۔ امید ہے کہ اردو قارئین اس
 کتاب سے استفادہ کریں گے۔

☆☆☆

ڈاکٹر عباس رضانیر کی تنقیدی بصیرت

غلام نبی کمار

لکھنؤ اردو زبان و ادب کا قدیم گہوارہ ہے۔ نیز اسے مشرقی تہذیب و تمدن کی
 آماجگاہ بھی کہا جاتا ہے۔ لکھنؤ اتر پردیش کے اس خطے میں واقع ہے جسے ماضی میں اودھ
 کہا جاتا تھا۔ لکھنؤ کو کثیر الثقافتی شہر بنانے میں یہاں کے نوابوں اور حکمرانوں کا بہت بڑا
 رول رہا ہے۔ ان نوابوں اور حکمرانوں نے نہ صرف تواریخی عمارتیں، خوبصورت محلات
 اور دلکش باغات تعمیر کیے بلکہ تہذیب و ثقافت، فنون لطیفہ، موسیقی، زبان و ادب اور خصوصاً
 شاعری کرنے والوں کی خوب پذیرائی کی۔ یہاں کے امراء اور نوابین نہ صرف شاعری
 کے دلدادہ تھے بلکہ خود بھی شعر و شاعری کا ذوق رکھتے تھے۔ اردو زبان کے بڑے بڑے
 شعرا کو انہوں نے اپنا استاد بنایا اور انہی کی سرپرستی میں اپنے شعری ذوق و شوق کو پروان
 چڑھاتے رہے۔ چونکہ انہیں ہر قسم کی آسائش میسر تھی اور ہر اعتبار سے ان کی زندگی رنگین
 طبع تھی۔ مصیبت اور غم و اندوہ سے ان کا دور کا بھی واسطہ نہیں تھا اس لئے ان کی شاعری
 میں سطحیت اور خارجیت کے عناصر نمایاں ہوئے۔ ان کے سرپرست اور درباروں سے
 تعلق رکھنے والے شعرا بھی اس رنگین طبع زندگی کے عادی ہو گئے تھے اور صلہ و اکرام
 پانے کی غرض سے اور ساتھ ہی اُس وقت کے ماحول کے زیر اثر بھی ان کی شاعری میں
 سطحی اور خارجی عناصر کا پیدا ہونا فطری عمل تھا۔ یہاں کے ادباء و شعراء نے ایک مخصوص
 اسکول کے تحت اپنے نظریات کی ترویج کی اور ان کو اپنی تخلیق کے توسط سے فروغ

دیا۔ اس اسکول کو دبستان لکھنؤ کا نام دیا گیا۔ اس کے برعکس دہلی میں اس کے بالکل مختلف انداز کی شاعری ہو رہی تھی جسے دبستان دہلی کا نام دیا گیا۔ ان دونوں دبستانوں میں دوا لگ الگ قسم کے نظریات وجود میں آنے کی وجوہات اس وقت کے ماحول کی کارفرمائی تھی۔ مذکورہ دبستانوں نے اردو ادب کو کافی متاثر کیا تھا۔ لیکن وقت گزرتا گیا، حالات بدلتے گئے، نئے تقاضے پیدا ہوئے، نئے ادباء و شعرا اور ناقدین کی آمد ہوئی۔ اس طرح اب ہم محسوس کرتے ہیں کہ آج کے لکھنؤی شعرا اور ناقدین حضرات کی طرزِ تحریر کا ایک اپنا مخصوص رویہ ہے۔ جو کسی مخصوص نظریاتی رجحان کے دائرے میں مقید نہیں ہے۔ لکھنؤ نے اردو کے شہرت یافتہ شاعروں اور ناقدین کو جنم دیا ہے۔ انہی شاعروں اور نقادوں میں ایک نام ڈاکٹر عباس رضا نیر کا ہے۔ ڈاکٹر عباس رضا نیر ایک ایسی شخصیت کا نام ہے جو برسوں سے ادب کے ایک اہم خدمت گزار کی حیثیت سے بے لوث ہو کر اپنی خدمات انجام دے رہے ہیں۔ نیر صاحب ایک اچھے انسان اور مدرس تو ہیں ہی لیکن ساتھ ہی ساتھ ایک بہترین ناظم، شاعر، مترجم اور مرتب بھی ہیں۔ ان کے مختلف تنقیدی و تجزیاتی مضامین ملکی اور غیر ملکی رسائل میں چھپتے رہتے ہیں اور میرا بنیادی مقصد یہاں پر صرف ان کی تنقید نگاری بیان کرنے سے ہے۔ عباس رضا نیر کی حال ہی میں تین تنقیدی و تجزیاتی مضامین کی کتابیں شائع ہوئیں ہیں جن میں ”تنقیدی بحثیں“، ”رثائی تنقیدیں“ اور ”خواجه احمد عباس“ شامل ہیں۔ ان کتابوں کے تناظر میں اور اس کے علاوہ ان کی مرتب کردہ کتابوں کے مقدموں سے بھی ان کی تنقیدی بصیرت کی پہچان بہ آسانی کی جاسکتی ہے۔

”تنقیدی بحثیں“ (۲۰۱۶ء) میں عباس رضا نیر صاحب کے تیرہ (۱۳) تنقیدی و تجزیاتی مضامین شامل ہیں۔ یہ مضامین مختلف اوقات میں مختلف موضوعات پر بین الاقوامی اور قومی سطح کے سمیناروں میں پڑھنے کی غرض و غایت سے لکھے گئے تھے۔ جو بعد

میں مؤثر ادبی جراند میں شائع ہو کر قارئین حضرات سے دادِ تحسین بھی وصول کر چکے ہیں۔ چونکہ عباس رضا نیر کافی عرصے سے درس و تدریس کے شعبے سے منسلک ہیں۔ اس دوران انہوں نے ادب کو اپنے قلم سے گرمایا بھی ہے اور اس کی لذت و چاشنی سے تسکین یاب بھی ہوئے ہیں۔ اس کتاب کے انتساب کو انہوں نے اردو زبان کے مایہ ناز ادیب اور ناقد پروفیسر شارب ردولوی کے نام معنون کیا ہے۔ ابتدائیہ میں شامل کتاب مضامین کے حوالے سے مختصر لیکن کارآمد گفتگو کی ہے۔

”تنقیدی بحثیں“ میں عباس رضا نیر نے بعض کلاسیکی اور جدید شاعروں، افسانہ نگاروں اور صحافیوں پر مضامین کے ساتھ ان کی غزلوں، نظموں، افسانوں، ناولوں اور دوسرے تخلیقی سرمایوں کا تجزیہ اپنے فنی و فکری اور بلیغ و عمیق نقطہ نظر کی بنیاد پر کیا ہے۔ موصوف کے مطابق ”پیش نظر تنقیدی مضامین میں فن پاروں کو قاری کے تاثرات اور تخلیق کار کی ذاتی زندگی یا سماجی اور تاریخی پس منظر کی بجائے براہ راست متن سے رشتہ استوار کیا گیا ہے اور متن کے سیاق و سباق کے حوالے سے فن پاروں کو سمجھنے کی کوشش کی گئی ہے۔“ یہ بات واضح رہے کہ عباس رضا نیر ایک معتبر پارکھ بھی ہیں اور حقیقت پسند تنقید نگار بھی۔ اس کتاب میں شامل مضامین سے اس بات کا اندازہ لگانا قطعی مشکل نہیں ہے۔

”بہادر شاہ ظفر اپنے نصیب کی تماشہ گاہ میں“ اس کتاب کا اولین مضمون ہے۔ جس میں عباس رضا نیر نے آخری مغل بادشاہ بہادر شاہ ظفر کے دورِ اقتدار اور ان کے ادبی کوائف کا تجزیہ اور محاکمہ اثر انگیز انداز میں رقم کیا ہے۔ عہدِ ظفر کے خارجی خلفشار اور داخلی انتشار کی جو تصویریں ہمیں میر و غالب اور ذوق و سودا کے یہاں نظر آتی ہیں اس سے کہیں زیادہ یہ پہلو ظفر کی شاعری میں نمایاں ہوا ہے۔ اس کے علاوہ سماجی انتشار اور سیاسی خلفشار جیسے عناصر سے قطع نظر ظفر کے نہ ان کے ماقبل اور نہ مابعد کے

شعراء کے یہاں ملتے ہیں۔ یہاں تک کہ ان کے معاصرین کی حیثیت بھی ان پہلوؤں کو اجاگر کرنے میں تماشائی سے زیادہ کی نہیں ہے۔ اس مضمون کے ابتدائی صفحات میں جہاں ظفر کے عہد، ان کے دورِ اقتدار، ان کی زندگی، ان کی حالتِ زار، ساتھیوں اور ہم عصروں کی بے اعتنائی، مسائل و مصائب سے دوچار ہونے کے علاوہ اور ان کی درد بھری زندگی کے احوال آشکار ہو جاتے ہیں۔ وہیں باقی صفحات میں ان کی ادبی زندگی کا تفصیلی تجزیہ ان کی غزلیات کے حوالے سے کیا گیا ہے۔ یہ بات عیاں ہے کہ کلامِ ظفر اُس عہد کی آئینہ سامانی کرتا ہے۔ ان کا شعری اسلوب اپنے عہد کے شعرا سے بہر نوع مختلف ہے اور ان کا لہجہ بہر حال اپنا ہے۔ لیکن زمانے کی ستم ظریفی دیکھئے کہ غیروں نے ان پر ستم ڈھائے تھے ہی مگر ان کے تو اپنے بھی بیاہ نہ کر سکے۔ کسی نے کہا ان کا آدھا دیوان شاہ نصیر کا ہے، کسی نے کہا کہ ان کا آدھا کلام غالب کا ہے۔ یہاں تک کہ ان کی معروف غزلوں کو بھی دوسرے شعراء سے منسوب کیا گیا۔ ان سب باتوں کا تذکرہ مصنف نے نہایت غیر جانبداری کے ساتھ کیا ہے۔ مصنف نے ظفر کی جن تین غزلوں کا تجزیہ کیا ہے اور گہرائی میں جا کر ان کی تفہیم و تعبیر پیش کی ہے ان کے مطالعے یوں ہیں:

نہ کسی کی آنکھ کا نور ہوں نہ کسی کے دل کا قرار ہوں

رات بھر مجھ کو غم یار نے سونے نہ دیا

لگتا نہیں ہے جی مرا اجڑے دیار میں

یہ غزلیں ان کی بے مائیگی و بے بضاعتی، شکست و ریخت، مایوسی و ناامیدی، محرومی و محرومی، بے چینی و دل آزاری، یاس و غم اور رنج و تعب کی عکاس ہیں۔ ظفر کی لاچاری اور شکستگی سے ان کی شاعری میں متصوفانہ رنگ آمیزی نے جنم لیا۔ ان کی شاعری حزنِ عینہ ناصر سے مزین ہے۔ عباس رضا نیر کے بقول بہادر شاہ ظفر کی شاعری نہ کہیں سے درآمد ہے نہ کسی سے استفادہ۔ بلکہ بہادر شاہ ظفر کی شاعری اور پینٹل شاعری ہے۔ اس

پورے مضمون میں مصنف کا عالمانہ اور مفکرانہ انداز نمایاں ہوتا ہے اور ان کی فکری و فنی بصیرت کا احساس ہوتا ہے۔ دوسرا مضمون ”جہدِ آزادی اور مسدسِ افتق“ پر لکھا گیا ہے۔ جس میں مصنف نے انیسویں صدی کے ایک اہم مفکر شاعر منشی دوار کا پرشاد افتق کے ۸۴ بند پر مشتمل ”مسدسِ افتق“ کا تجزیہ پیش کیا ہے۔ یہ مسدس شری دین دیال جی کی تحریک ”دھرم مہا منڈل“ سے متاثر ہو کر ان کے موومنٹ کی ستائش میں لکھا گیا تھا۔ افتق جس دور میں ادبی افتق پر نمودار ہوئے وہ دور ہندوستان پر انگریزوں کے تسلط کا زمانہ کہلاتا ہے۔ چونکہ افتق بیدار ذہن اور حساس شاعر تھے۔ اس لئے قوموں کی بیداری اور غفلت کی نیند سو رہے سماج کو متحرک کرنے کے لیے انہوں نے اپنی شاعری کو وسیلہ بنایا۔ ”مسدسِ افتق“ اس کی بہترین مثال ہے۔ اس مسدس کی تجزیہ نگاری میں مصنف نے اُس زمانے میں ملک و ملت کی بے حسّی، بدگمانی، ظلم و جبر، زبانوں کی اہمیت سے ناشناسی اور تہذیب و ثقافت کی اہمیت سے ناآشنائی وغیرہ کو بڑی ہنرمندی سے واضح کر دیا ہے۔ انہوں نے یہاں کی تہذیب و تمدن، جغرافیائی خدوخال، علوم و فنون، موسموں اور تہواروں، مذاہب اور مقدس کتابوں وغیرہ کی اہمیت سے بھی قاری کو آشنا کرایا ہے۔ ساتھ ہی ساتھ زبان و بیان پر افتق کی قوت اس تجزیاتی مضمون سے نمایاں ہو جاتی ہے۔ مضمون ”اپنی زمین اور اپنی تہذیب کا شاعر: فراق“ میں ابتداً ہندوستان کی مشترکہ تہذیبی روایت، ملک کی سالمیت اور ہندو مسلم اتحاد کی علمبردار زبان کے فروغ میں مختلف ادبا کا سرسری تذکرہ کیا گیا ہے۔ اس کے علاوہ مصنف نے فراق کی آسیب زدہ اور مصائب و آلام میں گھری گھریلو اور ازدواجی زندگی کی داستان بھی رقم کی ہے۔ علاوہ ازیں فراق کے مختلف اشعار کا تجزیہ کر کے انہوں نے فراق کی شاعری میں غم دوراں اور غمِ جانان، غم سے اُبھرنے کا حوصلہ، نئی تعمیر کا خواب، گنگا جمنی تہذیب کی پاسداری، ہند کی مٹی سے لگاؤ، تاریخ اور دیومالائی عناصر کا ذکر، جمالیاتی فضا، سوز و گداز، موسیقیت اور

غنائیت وغیرہ کی نشاندہی کی ہے۔ ”ہند، فارس اور ن۔م۔ راشد: ایران میں اجنبی“ کا تجزیہ اس کتاب کا ایک اور معلوماتی مضمون ہے۔ جس کی تمہیدی گفتگو میں موصوف نے ایران کی تہذیب و تمدن، کلچر، صنعت و حرفت، شعبہ ہائے فنون، فارسی شعر و ادب، اردو کی فارسی زبان سے مستعار لی گئی فارسی لفظیات اور تراکیب کے ذکر کے علاوہ ایرانی تہذیبی و ثقافتی اور سیاسی و سماجی انقلابات، فارسی زبان کا مشرقی ممالک پر اثر و نفوذ وغیرہ کا ذکر کیا ہے۔ اس مضمون میں راشد کے نظموں کے مجموعے ”ایران میں اجنبی“ میں شامل تیرہ نظموں کا تجزیہ بڑی عمدگی سے کیا گیا ہے۔ ان نظموں کے تناظر میں مصنف نے ایران پر برطانوی استعمار کے بہیمانہ سلوک، سماجی و معاشرتی حالات، سیاسی و سماجی صورت حال، اشتراکی مظالم، جبر و آمریت، برطانوی سپاہیوں کی ہولناکیوں وغیرہ کو مؤثر انداز میں مرقوم کیا ہے۔ ”مجروح کی شعری جمالیات“ بھی ایک قابل مطالعہ مضمون ہے۔ مجروح سلطان پوری بیسویں صدی کے شعراء میں ایک ممتاز مقام رکھتے ہیں۔ جن کی شاعری میں جمالیاتی عنصر کی تلاش بالکل منفرد کام ہے۔ مجروح کی شاعری جمالیاتی عنصر سے لبریز ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ”ہم ہیں متاع کوچہ و بازار کی طرح“ کے شاعر کو صدیوں تک بھلائے نہ بھلایا جائے گا۔ اردو افسانوں میں پریم چند نے جس قدر دیہی زندگی کے مناظر اور کشاکش کو اپنے افسانوں میں برتا اور حقیقی طور پر اس کو زندگی بخشی، شاید ہی کوئی ان کے اس وصف میں ان کی ہمسری کر سکے۔ حالانکہ ان کے بعد کئی افسانہ نگاروں نے ان کا تتبع کیا لیکن پریم چند کا فن فنِ جاوداں ہے۔ مصنف نے ”دیہی زندگی کی کشاکش اور پریم چند کے افسانے پوس کی رات کا تجزیہ“ میں ایک دیہی کسان ’ہلکو‘ کے پس منظر میں دیہات کی افلاس زدہ زندگی اور حادثات اور حالات کے جبر سے جو جھٹے ایک بے کس انسان کی درد انگیز کہانی کا بہترین تجزیہ کیا ہے۔ عباس رضا نیر کی مذکورہ کتاب کا تنقیدی مضمون ”اختری بیگم: ایک تہذیبی دستاویز“ بالکل منفرد حیثیت کا حامل ہے۔ اس

میں موصوف نے مرزا ہادی رسوا کی ادبی اہمیت بھی اجاگر کی ہے اور بنیادی موضوع کے حوالے سے مصنف لکھتے ہیں کہ درحقیقت اس ناول کا موضوع مٹتے ہوئے تہذیبی اثرات ہیں اور اگر اس بنیادی نقطہ نظر کو نظر انداز کیا جائے تو اختر بیگم کا شمار دوسرے درجے کے ناولوں میں بھی نہ ہو سکے گا۔ انھوں نے ”اختری بیگم“ کے کرداروں کے ذریعے ادا کیے گئے مکالموں اور ان کی خوبیوں اور خامیوں کے توسط سے ناول کے تہذیبی عناصر کو نمایاں کرنے کی بہترین کوشش کی ہے۔ جس سے اس ناول کی اہم خوبیوں میں گنا جاسکتا ہے۔ اس کتاب کے دیگر تنقیدی مضامین میں ”قرۃ العین حیدر کا تخلیقی سفر ایک مجموعی جائزہ“، ”انتظار حسین اور ہجرت“، ”اردو صحافت کا مجاہد اول: مولانا باقر دہلوی“، ”اردو صحافت اور مولانا ابوالکلام آزاد“، ”منشی نول کشور، مرزا غالب اور ہم“ اور ”بیسویں صدی میں لکھنؤ کا اردو ادب“ شامل ہیں۔ قرۃ العین حیدر پر تصنیف کیے گئے مضمون میں عباس رضا نیر نے ان کے سات ناولوں اور ایک ناولٹ ”سیتا ہرن“ کے پس منظر، کرداروں، بیان کی گئی تہذیب و تاریخ کا نچوڑ، برقی گئی تکنیک، وسیع تر کینوس، ان کی وحدت اور ابعاد وغیرہ سے واقف کرایا ہے۔ ہندوستان کی تقسیم کے بعد ہی غالباً اردو افسانوں میں ہجرت کے موضوع کا وجود ہوا اور اس موضوع کی ابتدا اور انتہا انتظار حسین کے افسانوں میں جس قدر نظر آتی ہے، شاید ہی کسی دوسرے افسانہ نگار کے افسانوں میں یہ کیفیت اتنی عروج کو پہنچی ہو۔ انتظار حسین کے افسانہ ”کشتی“ کا تجزیہ ہجرت کے پہلو کو ہی مد نظر رکھ کر کیا گیا ہے۔ اس کتاب کے بقیہ تین مضامین میں اردو صحافت کے معماروں مولانا باقر دہلوی، مولانا ابوالکلام آزاد اور منشی نول کشور کی صحافتی خدمات کا اجمالی جائزہ پیش کیا گیا ہے اور ایک مضمون میں بیسویں صدی میں لکھنؤ کے اردو ادب کے نامور تخلیق کاروں کی تخلیقی صفات کی معلومات بہم پہنچائی گئی ہے۔

”تنقیدی بحثیں“، نیر صاحب کے تنقیدی مضامین کا ایک اعلیٰ وارفع مرقع کہا جا

سکتا ہے۔ جس میں انہوں نے متقدمین کی تحریروں کا وسیع و وسیع تر تناظر میں مطالعہ کر کے ان کے مختلف ابعاد کا احاطہ اور پرت در پرت معلومات سے قاری کو نوازا ہے۔ یہ مضامین انہوں نے پوری سوجھ بوجھ، فنی و فکری ندرت اور تکنیکی اعتماد کی بنیاد پر تصنیف کیے ہیں۔

ڈاکٹر عباس رضا نیر کا شمار دورِ حاضر کے اہم اور معتمد قلم کاروں میں کیا جاتا ہے۔ ان کی تنقیدی تصانیف سے ان کی سنجیدہ بیانی، عمیق انتقادی شعور اور استعدادی صلاحیت کا احساس بخوبی ہوتا ہے۔ انہوں نے جہاں متقدمین ادبا و شعراء کو اپنا موضوع بنایا وہیں اپنے محبوب مرثیہ نگاروں کے شاہکار مرثیوں میں منفرد خصوصیت کو بھی اجاگر کیا ہے۔ ”رثائی تنقیدیں“ میں انہوں نے اردو کے نامور ادبا و شعراء کی شاعری میں واقعاتِ کربلا سے متعلق مرقعِ عناصر نمایاں کیے ہیں۔ انہوں نے کلاسیکی وجدید اردو شاعری میں ان تلازمات اور عناصر کو تلاش کرنے کی کامیاب سعیِ بلیغ کی ہے۔

”رثائی تنقیدیں“ ڈاکٹر عباس رضا نیر کے ۱۴ مضامین کا مجموعہ ہے۔ اس کتاب کے ابتدائیہ میں انہوں نے مرثیہ کی اہمیت، صنفِ مرثیہ کے شمس و قمر کہلائے جانے والے انیس و دیر کی شاعرانہ تعلیٰ کا اقرار، واقعاتِ کربلا کا صنفِ مرثیہ کے علاوہ دیگر اصنافِ ادب میں علامتوں اور استعاروں کا اظہار اور کتاب سے متعلق اپنے تاثرات مرقوم کیے ہیں۔ ابتدائیہ کے بعد ڈاکٹر منتظر مہدی نے کتاب سے متعلق اپنے تاثراتی مضمون ”رثائی تنقیدیں: ایک جائزہ“ میں کتاب کے متعلق اپنے وسیع و عمیق تر مطالعے کی بنیاد پر ہر ایک مضمون پر انفرادی طور پر روشنی ڈالی ہے اور مصنف کی تنقیدی و تشریحی صلاحیت کا قابلِ فخر اعتراف کیا ہے۔

”رثائی تنقیدیں“ کے اول الذکر مضمون ”پیکر تراشی اور انیس“ میں مصنف نے میر انیس کے مرثیہ ”جب کربلا میں داخلہ شاہ دیں ہوا“ کے حوالے سے انیس کے پیکر

تراشی کے ملکہ پر گفتگو کی ہے۔ چونکہ یہ مرثیہ ۲۴۳ بندوں پر مشتمل ہے اس لئے بقول مصنف ”اگر پورے مرثیہ پر گفتگو کی جاتی تو مضمون طوالت اختیار کرتا“۔ اس بات کو مدِ نظر رکھتے ہوئے انہوں نے اس مرثیہ کے بہت سارے کرداروں میں صرف اس مرثیہ کے مرکزی کردار حضرت عباسؑ کی روشنی میں انیس کی پیکر تراشی کی خصوصیت بیان کی ہے۔ انہوں نے ثابت کیا ہے کہ انیس نے اس مخصوص کردار کو اپنی لفظیات، استعارات اور تشبیہات کے ذریعے کس طرح کے پیکروں میں ڈھالا ہے۔ اس مرثیہ میں جہاں جہاں پر حضرت عباسؑ کا ذکر آیا ہے، چاہے وہ بالواسطہ طور پر آیا ہو یا بلا واسطہ طور پر اس کو زیرِ غور رکھتے ہوئے مصنف نے مرثیہ کی ہر پرت کھول کر حضرت عباسؑ کی اُن جملہ خصوصیات اور مزاجی کیفیات کو اجاگر کیا ہے جس سے انیس نے مرثیہ میں حضرت عباسؑ اور ان کے ساتھ دوسرے شہداء کے ذریعے ادا کیے گئے مکالموں، ان پر پیدا کیے گئے منظر نامے، ان کے عادات و اطوار، اعمال و خصائص اور حرکات و سکنات وغیرہ کو مخصوص انداز میں برت کر پیکر تراشی کی ایک کامیاب صورت قارئین کے سامنے پیش کر دی ہے۔ فاضل مصنف نے انیس کے اس پیکر تراشی کے عمل کو زیادہ تر قوت اور حرکت حضرت عباسؑ اور ان کے تعلق سے ادا کیے گئے مکالموں سے بخشی ہے اور جہاں منظر نگاری اور واقعہ نگاری کے سہارے ایسا عمل انجام پایا ہے وہاں اختصار سے کام لیا ہے۔ پیکر تراشی کے متعلق موصوف لکھتے ہیں:

”پیکر کی تشکیل میں سب سے اہم رول ماحول کے فطری پن، کردار کی وضع قطع اور مکالموں کے لب و لہجہ کے عین مطابق مزاج ہونے پر منحصر ہے اور انیس اس فن سے بخوبی واقف ہیں وہ اپنے کرداروں کی نشست و برخاست، حرکات و سکنات اقوال و افعال کی پیش کش میں ہمیشہ لحاظ رکھتے ہیں۔“

دوسرے مضمون میں میر انیس کے مرثیہ ”اے مومنو کیا صادق الاقرار تھے شبیر“ کی روشنی میں انیس کے کہانی پن پر دسترس اور بیانیہ پران کی فطری قدرت کو مرقوم کیا ہے۔ انیس کو شہنشاہ مرثیہ یونہی نہیں کہا جاتا۔ موصوف کے مطابق انیس نے کہانی کے فن کو اعتبار و عظمت کی جن اونچائیوں تک پہنچا دیا ہے وہ فقید المثل ہے۔ انیس اپنی فکری و فنی صلاحیتوں کی بنا پر تمام مرثیہ نگاروں میں منفرد اور ممتاز نظر آتے ہیں۔ اس مضمون کی ابتدا میں انہوں نے کہانی سے متعلق بہت ہی دلچسپ اور معلوماتی باتیں لکھی ہیں۔ انہوں نے لکھا ہے کہ کہانی اچھی ہو یا بری کہانی، کہانی ہوتی ہے اور دونوں صورتوں میں انسانی فکر کو متاثر کرنے کی صلاحیت موجود ہوتی ہے۔ اردو مرثیے میں کہانی نے کیسے جنم لیا؟۔ کچھ لوگ سوچتے ہوئے کہ کر بلا میں پیش آئے تاریخ ساز واقعات تو صداقت اور سچائی پر مبنی ہیں تو ان میں کہانی کہاں سے آئی۔ درحقیقت اس مضمون میں اس موضوع پر سے پردہ اٹھتا ہے۔ مرثیہ کے اس تجزیاتی مضمون میں شیرین کی داستان تحریر کی گئی ہے۔ جو زوجہ حضرت امام حسینؑ حضرت شہر بانو کی کنیز تھیں۔ انیس نے اس مرثیے میں اپنے جواہر قلم سے فن بیانیہ کے انتہائی حدود کو چھوا ہے۔ مصنف نے انیس کے اس مرثیہ میں پیدا کیے گئے کہانی پن اور بیانیہ پران کی قدرت کو بڑی فنکاری سے روشن کیا ہے۔ ”اسٹیج مکالمہ اور دبیر“ میں دبیر کے معرکہ آرائی اور مقبول مرثیہ ”قید خانے میں تلاطم ہے کہ ہند آتی ہے“ کا تجزیہ پیش کیا گیا ہے اور مذکورہ مرثیہ کی رو سے اسٹیج اور مکالمہ کا تقابلی مطالعہ اور دبیر کے ان دونوں تکنیکوں کے برتنے کے ہنر کو اجاگر کیا گیا ہے۔ ایک کامیاب ڈرامے میں جتنا رول اس کی کہانی، کرداروں اور ان سے ادا ہونے والے مکالموں کا ہوتا ہے اتنا ہی رول اس میں اسٹیج کا بھی ہوتا ہے۔ اردو مرثیہ میں کہانی، اسٹیج اور مکالمے کے ساتھ جنھوں نے انصاف کیا بلکہ یوں کہیے کہ اس فن کو حد کمال تک پہنچایا ان کے نام انیس و دبیر ہیں جو اس افق کے آفتاب و مہتاب کہلائے۔ عباس رضانیر نے دبیر کے شہر آفاق مرثیے کا جو تجزیہ

زیر نظر مضمون کے عنوان کی خوبیوں کو مد نظر رکھ کر کیا ہے وہ واقعی قابل تحسین ہے۔ ایک مضمون ”جمیل مظہری کا مرثیہ شام غریباں“ ہے۔ جس میں حضرت زینبؑ کے کردار کا بصیرت افروز تجزیہ ملتا ہے۔ ابتدائی سواتین صفحات میں انہوں نے صفات زینبؑ بیان کیے ہیں اور بقیہ صفحات پر اسلامی تاریخ کی ایک عظیم الشان اور پاکیزہ سیرت خاتون جناب زینبؑ کے مثالی اور لازوال کردار کا معلومات سے پُر تنقیدی تجزیہ کیا ہے۔ عباس رضانیر نے بیسویں صدی کی تیسری دہائی میں جسے شہزاد معصومی کے ایک معروف مرثیہ ”معراج“ کا تذکرہ بھی اپنے ایک مضمون میں کیا ہے۔ یہ مرثیہ ۴۷ بندوں پر مشتمل ہے اور شہزاد معصومی اسے بیسویں صدی کی آٹھویں دہائی میں تخلیق کر کے اعلیٰ مرثیہ نگاروں کی صف میں اپنی جگہ بنانے میں کامیاب ہوئے۔ قابل ذکر بات یہ ہے کہ مرثیہ کا عنوان شہزاد معصومی نے مولانا محمد علی جوہر کا مشہور زمانہ مصرعہ ”قتل حسین اصل میں مرگ یزید ہے“ رکھا ہے۔ چونکہ معراج کا ذکر تو قرآن کریم میں بھی ہے اس لئے قرآن کی زبان میں بیان کی جانے والی محمدؐ کی اس معراج کو شہزاد معصومی نے کس طرح ملاحظہ کیا ہے اور اس عظیم واقعے کو کس طرح اپنے مرثیے کے قالب میں ڈھالا ہے جس کا اندازہ اس عالمانہ تجزیاتی مضمون سے بخوبی لگایا جاسکتا ہے۔ جس میں قرآن مجید کی آیتوں کا حوالہ بھی ملتا ہے۔ ابھی تک میر وغالب کی شاعری پر سینکڑوں مقالات لکھے جا چکے ہیں لیکن موصوف نے ان سے ہٹ کے بالکل ایک منفرد موضوع کی تلاش کر کے اس فہرست میں ایک اور قابل قدر اضافہ کر دیا ہے۔ ”میر کی غزلوں میں علاماتِ کربلا“، ”غالب کی غزلوں میں استعاراتِ کربلا“، ”علی سردار جعفری کی نظموں میں علاماتِ کربلا“ اور ”عرفان صدیقی کی شاعری میں استعاراتِ کربلا“ جیسے مضامین اس کے گواہ ہیں۔ ناقدین ادب نے میر کے بارے میں یہ تو کہا کہ میر درد و الم کے شاعر ہیں اور اسی سبب انہیں قنوطی شاعر کے نام سے بھی جانا گیا۔ لیکن اس کے ساتھ ناقدین میر نے یہ بھی لکھا

ہے کہ میر کی قنوطیت غم عشق، غم روزگار، غم زندگی وغیرہ سے مستعار ہے۔ لیکن شاید ہی کسی نے ابھی تک یہ لکھا ہو کہ میر نے درد و غم، درد و الم، حزن و یاس سے متعلق شاعری میں برتی گئی علامات کہاں سے اخذ کیں۔ اس مضمون سے پتہ چلتا ہے کہ شکست و ریخت، رنج و غم اور ہجر و الم کے مضامین اور منظر نامے میر نے بارہا کر بلا سے مستعار لئے ہیں اور واقعہ کر بلا کے احساس و ادراک کو اپنے وجود اور اپنے شعور کا حصہ بنانے سے میر کے یہاں یہ کیفیت شدید تر انداز میں در آئی۔ مثال کے طور پر موصوف نے میر کے وہ اشعار پیش کیے ہیں جن میں کر بلا کے واقعے سے کوئی استعارہ یا کوئی علامت بنانے کی کوشش کی گئی ہے۔ یہ اور اس نوعیت کے دیگر مضامین بھی معلومات سے لبا لب ہیں۔ ”مطالعہ مراثی کی خشتِ اوّل: موازنہ انیس و دبیر“ بھی ایک قابل رشک مضمون ہے۔ جس میں کئی نئے پہلو روشن کیے گئے ہیں۔ عباس رضا نے بہت ہی بے باک انداز میں لکھا ہے کہ ”موازنہ انیس و دبیر“ کا بنیادی موضوع انیس و دبیر کا موازنہ نہیں بلکہ میر انیس کے شعری امتیازات کو واضح کرنا ہے۔ موصوف نے تنقیدی رویہ اختیار کرتے ہوئے لکھا ہے کہ اس کتاب کے وجود سے شبلی نعمانی نے اردو میں تقابلی مطالعہ کی بنیاد تو رکھی لیکن دبیر کے ساتھ اس کتاب میں انہوں نے بڑی نا انصافی برتی ہے۔ شبلی نے میر انیس کے شعری امتیازات کو نمایاں کر کے مرزا دبیر کی شاعری کو ان کے پہلو میں رکھ کر صرف موازنے کا کام لیا ہے۔ انہوں نے دبیر کی خامیوں پر تو سخت تنقید کی لیکن خوبیوں کو اجاگر کرنے میں اپنے منصب کا حق ادا نہ کر سکے۔ جہاں انیس و دبیر کو زندگی میں ہی اپنے شعری محاسن کی بنیاد پر بے پناہ شہرت نصیب ہوئی۔ تو بعد میں صرف دبیر کی خامیوں کو اجاگر کرنے کا بھلا کیا جواز؟۔ یہی وجہ تو ہے کہ بعد میں کتاب کے شائع ہوتے ہی اعتراضات کا سلسلہ شروع ہو گیا۔ موصوف نے اس مضمون میں شبلی نعمانی کے متوازن تقابل نہ کرنے پر جہاں اختلافات کیے وہیں ان کی زیر نظر کتاب کو مرثیے کی تنقید اور

انیس و دبیر کی تعبیر و تفہیم کی راہ میں خشتِ اوّل قرار دیا ہے۔ اس کتاب میں شامل دیگر اہم مضامین ”آنسو، تلوار اور کر بلا“، ”پروفیسر فضل امام بحیثیت انیس شناس“ اور عصمت چغتائی کے ناول پر لکھا گیا مضمون ”ایک قطرہ خون: ایک جائزہ“ مصنف کی تنقیدی بصیرت کے غماز ہیں۔

”رثائی تنقیدیں“ میں شامل مضامین میں رثائی عناصر نمایاں کرنے کی جاندار کوشش کی گئی ہے۔ ساتھ ہی ان مضامین میں مصنف کے سلیس و فصیح اسلوب، اظہار خیال کی قوت و وسعت، زبان و بیان کی ندرت، موضوعات کے تنوع اور بالغ نظر تنقید کا پہلو بھی صاف نظر آتا ہے۔

۲۰۱۶ء میں ہی عباس رضا نے ایک اور تحقیقی و تنقیدی کتاب ”خواجه احمد عباس“ شائع ہوئی۔ اس کتاب میں انہوں نے خواجه احمد عباس کی شخصیت اور فن کے متنوع پہلوؤں پر بہت ہی عمیق انداز میں لکھا ہے۔ اس کتاب میں ان کا سلوب تحریر گٹھا اور سلجھا ہوا ہے اور تحریر میں اتنی روانی، سلاست، فصاحت، شکستگی اور چاشنی ملتی ہے کہ پڑھتے پڑھتے ایسا محسوس ہوتا ہے کہ موصوف خود اپنی زبانی خواجه صاحب کی رودادِ زندگی بیان کر رہے ہوں۔ کتاب میں ایمان داری کے ساتھ فٹ نوٹس کا اہتمام بھی برتا گیا ہے۔ مصنف نے قارئین کو خواجه احمد عباس کی زندگی اور کارناموں سے متعلق ہر گوشے کو منور کرنے کی بے حد کامیاب کوشش کی ہے۔

عباس رضا نے بیسویں صدی کی دوسری دہائی میں جنمے اردو کے معروف اور ایک اہم فکشن نگار، ڈراما نگار، ہندوستان گیر شہرت رکھنے والے صحافی، مشہور فلم ساز، اردو زبان و ادب میں ایک رنگارنگ حیثیت رکھنے والے اعلیٰ فنکار خواجه احمد عباس کی شخصیت اور کارناموں کو مذکورہ کتاب میں منظر عام پر لا کر ایک اہم اور مدلل کارنامہ انجام دیا ہے۔ ابھی تک خواجه صاحب پر صرف دو چار رسائل میں ہی خصوصی شمارے شائع ہوئے

ہیں اور اس کے علاوہ ان پر محض ایک دو کتابیں تصنیف کی جا چکی ہیں۔ گو کہ حال تک ان پر کوئی تحقیقی و تنقیدی کاوش منظر عام پر نہیں آسکی ہے۔ ہو سکتا ہے کسی جامعہ میں ان پر ایم۔ فل یا پی۔ ایچ۔ ڈی کا تحقیقی کام ہوا ہو لیکن کتاب منظر عام پر نہ آنے اور پوری معلومات حاصل نہ ہونے کی وجہ سے وثوق کے ساتھ کچھ نہیں کہا جاسکتا۔ جن رسالوں میں خواجہ احمد عباس پر خصوصی شمارے شائع ہوئے ہیں ان میں ایوانِ اردو (دسمبر 1987)، دریافت (1989)، اردو دنیا (جون 2014) اور آجکل قابل ذکر ہیں۔ کتابوں میں راج نرائن راز کی مرتبہ ”خواجہ احمد عباس: افکار، گفتار، کردار“، ”خواجہ احمد عباس: ایک مطالعہ“ از ڈاکٹر غلام حسین اور اس کے علاوہ ڈاکٹر ضیاء الدین نے کسی نام سے کتاب لکھی ہے، مزید کچھ افسانوی انتخاب کی کتابیں ہیں اور کچھ بکھرے ہوئے مضامین ہوں گے۔ بس اتنا سا کام ابھی تک خواجہ احمد عباس کی ذات اور فکر و فن کے حوالے سے ملتا ہے اور کچھ نہیں۔ آج تک اتنے بڑے قلم کار کو اردو دنیا نے فراموش کیا جس پر صرف حیرت اور افسوس ہوتا ہے۔ اب عباس رضانی کی کتاب ”خواجہ احمد عباس“ کے شائع ہونے سے یہ خلش کسی حد تک دور ہوئی ہے۔ یہاں پر یہ بات باور کرانا ضروری ہو جاتا ہے کہ خواجہ احمد عباس کے کارنامے اتنے وسیع اور بے بہا ہیں کہ اتنی مختصر سی کتابوں سے اس کا ازالہ نہیں ہو سکتا۔ اس لیے ان پر جتنا کام ہوا ہے وہ تشفی بخش نہیں ہے۔ اسے ہماری بد نصیبی سمجھئے یا بے اعتنائی برتنے کی ایک وجہ بھی۔

خواجہ احمد عباس پر عباس رضانی کی اس تصنیف کردہ کتاب کے ابواب میں خواجہ صاحب کی ”حیات و شخصیت“، ”افسانہ نگاری“، ”ناول نگاری“، ”ڈرامہ نگاری“، ”صحافت نگاری“، ”خودنوشت“ اور ”سفرنامہ“ کا مکمل طور پر احاطہ کیا گیا ہے۔ اولین باب میں موصوف نے خواجہ صاحب کے خاندان، آباؤ اجداد، والدین، ان کی پیدائش، تعلیم، ازدواجی زندگی، تحریری و تقریری سرگرمیاں، معاصرین، میلانات،

ابتداء میں ترقی پسند نظریات کے خاص پیروکار، بعد میں ترقی پسند تحریک سے علیحدگی کے علاوہ خواجہ صاحب کی ادبی زندگی، فلمی زندگی، صحافتی زندگی، مختلف زبانوں پر ان کی دسترس، انگریزی زبان میں ان کے تخلیقی سرمایے، ترجموں اور اعزازات کو بھی اختصار کے ساتھ بیان کیا گیا ہے۔ خواجہ صاحب کی شخصیت اور سیرت کو جن خصائص نے مثالی اور بہترین بنانے میں کلیدی رول ادا کیا ہے۔ ان کا بھی کتاب میں ذکر ملتا ہے۔ اردو میں خواجہ احمد عباس کے افسانوی مجموعوں کی تعداد تقریباً دس ہیں۔ جن میں ”ایک لڑکی“، ”زعفران کے پھول“، ”میں کون ہوں“، ”دیا جلے ساری رات“، ”کہتے ہیں جس کو عشق“، ”پیرس کی ایک شام“، ”گیہوں اور گلاب“، ”نیلی ساری“، ”بیسویں صدی کے لیلیٰ مجنوں“ اور نئی دھرتی نئے انسان“ قابل ذکر ہیں۔ اس باب میں خواجہ صاحب کے سب افسانوی مجموعوں کے اہم اہم افسانوں کا تنقیدی و تجزیاتی مطالعہ پیش کیا گیا ہے۔ جن میں ابابیل، سردار جی، دیا جلے ساری رات، پاؤں میں پھول، لوان مسوری، ڈیڈ لیٹر، کہتے ہیں جس کو عشق، گیہوں اور گلاب، سردی گرمی، شکر اللہ کا، دو ہاتھ، سونے کی چار چوڑیاں، خزانہ، ٹیری لین کی پتلون، تین بھنگی، ہنومان جی کا ہاتھ، بنارس کا ٹھگ، خونی، نیلی ساری، واپسی کا ٹکٹ، آج کے لیلیٰ مجنوں، زعفران کے پھول، ایک لڑکی سات دیوانے، چڑیا چڑے کی کہانی، سیاہ سورج، سفید سائے، نئی جنگ، چراغ تلے اندھیرا وغیرہ خاص طور پر شامل ہیں۔ خواجہ احمد عباس کے جس افسانے کو عالمگیر شہرت حاصل ہوئی، اس کا نام ’ابابیل‘ ہے۔ اس کہانی کا دنیا کی مختلف زبانوں میں ترجمہ ہو چکا ہے۔ مصنف کتاب نے اس افسانے کا تنقیدی تجزیہ ماہرانہ اور فنکارانہ انداز میں کیا ہے اور اس افسانے کی مختلف جہتوں کی طرف ہماری توجہ مرکوز کی ہے۔ مذکورہ بالا افسانوں کے بھی دانشورانہ تنقیدی تجزیے کیے گئے ہیں۔

خواجہ احمد عباس کے افسانوں پر بات کرتے ہوئے عباس رضانی نے اس

زمانے کے ماحول، ہندوستانی معاشرے، رجحانات، نظریہ سازی اور طبقاتی کشمکش وغیرہ کو زیرِ غور رکھا ہے۔ علاوہ ازیں ان کے معاصرین کے افسانوی موضوعات کو بھی مدِ نظر رکھا ہے۔ جو کہ ان کے بصیرت آموزِ تنقیدی تجربے کی خوبی میں ایک اور اضافہ کرتے ہیں۔ انہوں نے خواجہ احمد عباس کے اُن افسانوں کو جو فسادات پر لکھے گئے ہیں ان کے معاصرین جیسے کرشن چندر، بیدی، حیات اللہ انصاری، قدرت اللہ شہاب، احمد ندیم قاسمی، منٹو وغیرہ کے مذکورہ موضوع کے ہمہ پہلو کو سامنے رکھ کر پرکھا ہے اور ان کے کامیاب کہانی کار ہونے کی دلیل پیش کی ہے۔ اس کے علاوہ انہوں نے خواجہ صاحب کے عشقیہ افسانوں، نفسیاتی کہانیوں، ترقی پسند نظریہ کی نمائندگی کرتی ہوئی کہانیوں، واقعات اور حقیقت پسندی پر مبنی کہانیوں، نچلے، متوسط اور اعلیٰ طبقے کی کہانیوں پر بھی اپنی طائرانہ نظر ڈالی ہے۔ عباس رضا نیر نے خواجہ احمد عباس کے موضوع، فن، تکنیک اور اسلوب پر روشنی ڈالتے ہوئے مختلف دلیلیں اور مثالیں دے کر ان کے فنی، فکری اور تخلیقی اعتبار کو ثابت کرنے کی کوشش کی ہے۔ عباس رضا نیر لکھتے ہیں:

”خواجہ احمد عباس کے افسانوں کے مطالعے سے قاری کو ان کے یہاں غیر معمولی تنوع کا احساس ہوتا ہے۔ اس طرح کا تنوع ان کے معاصرین میں صرف کرشن چندر کے یہاں دیکھنے کو ملتا ہے۔ کرشن چندر تجربہ پسند مزاج کے مالک تھے۔ انہوں نے مغرب کے افسانوی ادب کے تجربوں کو اتنی خوبصورتی سے اردو میں منتقل کیا ہے کہ اجنبیت کا احساس تک نہیں ہوتا۔ بہر حال خواجہ صاحب کے یہاں تنوع صرف موضوع کی سطح پر نہیں ہے۔ بلکہ تکنیک اور اسلوب کی سطح پر بھی ہے۔“

(خواجہ احمد عباس: عباس رضا نیر، ص ۶۵)

خواجہ احمد عباس ایک ہمہ جہت شخصیت کا نام ہے۔ ایک حساس فنکار کی سب

خوبیاں ان میں کوٹ کوٹ کر بھری تھی۔ انہوں نے سماجی مسائل، معاشرتی پسماندگی، تہذیبی اقدار اور خاص طور پر مسلم معاشرہ کو اپنے افسانوں کا موضوع بنایا۔ علامتی انداز میں لکھے گئے افسانوں میں بھی خواجہ صاحب اپنے حقیقت پسندانہ رویے کو قائم رکھتے ہیں۔ باقی مثالی کرداروں کی تخلیق اور مناظر کی تصویر کشی کرنے میں انہیں بھرپور مہارت حاصل ہے۔ ان سب خصوصیات کا اندازہ عباس رضا نیر کے خواجہ صاحب کے افسانوں کے تجزیوں سے بخوبی لگایا جاسکتا ہے۔

عباس رضا نیر نے اپنی کتاب ”خواجہ احمد عباس“ میں خواجہ صاحب کے ناولوں ’انقلاب‘، ’بہمنی رات کی بانہوں میں‘، ’سات ہندوستانی‘، ’چار دل چار راہیں‘، ’اندھیرا اجالا‘، ’دوبوند پانی‘ اور ’تین پیہے‘ کا بڑی عرق ریزی اور جانفشانی سے تجزیہ کیا ہے۔ ناول ’انقلاب‘ کا تجزیہ تیس صفحات پر کیا گیا ہے۔ گویا تحقیق کرنے والوں کے لیے انہوں نے راہ صاف کر دی ہے۔ دیگر ناولوں کے تجزیے میں بھی ان کی تنقیدی بصیرت نمایاں نظر آتی ہے۔ عباس رضا نیر نے خواجہ صاحب کے فن ڈرامہ نگاری کے بارے میں تفصیل سے لکھا ہے۔ ان ڈراموں میں زبیدہ، گاندھی اور غنڈہ، بارہ بج کر پانچ منٹ، رپورٹر، لال گلاب کی واپسی، یہ امرت ہے، اناس اور ایٹم بم وغیرہ شامل ہیں۔ مصنف نے موضوع، تکنیک اور پیشکش کے اعتبار سے ناولوں کا خوبصورت تعارف کرایا ہے۔ اسی طرح اس کتاب میں خواجہ صاحب کی صحافت نگاری، سفرنامہ نگاری اور فنِ خودنوشت نگاری پر عباس رضا نیر نے اپنی ناقدانہ نظر ڈالی ہے۔ بہر حال عباس رضا نیر کی خواجہ صاحب پر لکھی گئی یہ کتاب اردو ادب اور تحقیق و تنقید کے میدان سے دلچسپی رکھنے والوں کے لیے بے حد کارآمد ثابت ہو سکتی ہے۔

بارہ سال قبل ڈاکٹر عباس رضا نیر کی تنقیدی مضامین پر مشتمل کتاب ”ادبی میزان“ پہلے ہی قارئینِ اردو سے دادِ تحسین وصول کر چکی ہے۔ اس کتاب میں جہاں

کلاسیکی شعراء و مرثیہ نگاروں کے کلام کی تفہیم و تعبیر کی گئی تھی وہیں اس میں معروف تخلیق کاروں کے تخلیقی فن پاروں کا بہترین تجزیہ بھی ملتا ہے۔ عباس رضانیہ کے تنقیدی عناصر کے اولین نمونے ”ادبی میزان“ میں ملتے ہیں۔ اسے موصوف کا تنقیدی میدان میں نقشِ اول قرار دیا جاسکتا ہے۔

”حیثیت مرتب عباس رضانیہ پچھلے کچھ برسوں میں ادبی دنیا میں اپنی ایک منفرد شناخت بنانے میں کامیاب ہوئے ہیں۔ حالانکہ ایک شاعر، ناقد، مترجم، مبصر اور ناظم کی حیثیت سے لوگ ان کی صلاحیت کو پہلے ہی بھانپ چکے تھے۔ اچھے موضوعات پر کتابیں ترتیب دینا بھی ایک قلم کار کے فرائض منصبی میں شامل ہیں۔ جس سے عباس رضانیہ بخوبی واقف ہیں۔ ”مجموع: کچھ یادیں کچھ باتیں“، ”کربلا فہمی“، ”خطوط بنام ضمیر“، ”فہرست مخطوطات: کانگریس لائبریری امریکہ“، ”احساس (ڈاکٹر ضمیر اختر نقوی کے مضامین کا مجموعہ)“، ”اردو ناول اور اودھ“، ”ابھی میں سفر میں ہوں (سلیم کیفی کی غزلوں اور نظموں کا مجموعہ)“ وغیرہ ان کی اردو میں مرتب کردہ کتابوں کے نام ہیں۔ ”کربلا فہمی“ اور ”اردو ناول اور اودھ“ ڈاکٹر عباس رضانیہ کی کوششوں سے منعقد کیے سمیناروں میں پڑھے گئے مقالات کے مجموعے ہیں جنہیں نیر صاحب نے بے حد سلیقے سے ترتیب دے کر شائع کر دیا۔ دونوں کتابوں میں ان کا دیباچہ اور مضمون شامل ہیں۔ اس کے علاوہ دیگر مرتب کی گئی کتابیں ان کی تنقید فہمی کا دیرپا ثبوت پیش کرتے ہیں۔

عباس رضانیہ عصر حاضر کے ناقدین ادب میں اہم مقام پر براجمان ہیں۔ لیکن ان کا اندازِ نقد دیگر ناقدین سے بالکل منفرد ہے۔ موصوف ایسے گھسے پٹے اور فرسودہ موضوعات پر قلم چلانے سے انحراف کرتے ہیں۔ جن سے ادبی دامن کو کوئی کشادگی حاصل نہیں ہوتی اور جس سے قارئین ادب کے اذہان میں کوئی قابلِ قدر اضافہ نہیں ہوتا بلکہ صرف الجھن ہی الجھن پیدا ہوتی ہے۔ نیر صاحب دیانت دارانہ اور منصفانہ اندازِ نقد

کے پیروکار نظر آتے ہیں۔ نئی نئی چیزوں کی کھوج، تلاش اور اپنے مجتہد اور اختراعی و تخلیقی ذہنیت کی آمیزش سے ان کا تنقیدی شعور بلند و بالا نظر آتا ہے۔ نیر صاحب ایک باشعور تنقیدی صلاحیت رکھنے والے فنکار ہیں، جس کی بنیاد پر انہیں اعلیٰ تنقید نگاروں کی صف میں رکھنے میں مجھے کوئی باک نہیں۔ ان کا تنقیدی اسلوب دیگر ناقدین سے بالکل جداگانہ ہے۔ یہ دوسروں کی راہ پر نہیں چلتے بلکہ اپنی راہ خود متعین کرتے ہیں۔ لیکن ہٹ دھرم بھی نہیں ہیں۔ ادب کی ہر اہم روایت کے امین ہیں تبھی تو ان کی تنقیدی تحریروں میں کلاسیکی و عصری شعور کی بالیدگی پائی جاتی ہے۔ لفظیات کے بارے میں کیا بیان کروں، جس میں ان کا کوئی ثانی نہیں۔ ان کے یہاں عمدہ نثری بیانیہ ملتا ہے۔ جس میں کہیں پیچیدگی نہیں اور نہ کہیں الجھاؤ نظر آتا ہے۔ اپنی تحریروں میں حوالے اور فٹ نوٹس ان کی صاف بیانی کی دلیل ہیں۔ عباس رضانیہ اپنی کتابوں میں دوسرے ادبا سے اپنے حق میں تحریک کھوانے یا شائع کرنے میں یقین نہیں رکھتے ہیں بلکہ پورا قاری پر ہی چھوڑ دیتے ہیں۔ اس سے یہ فائدہ ہوتا ہے کہ قاری کتاب کے بارے میں اپنی آزادانہ رائے پیش کرتا ہے۔ نیر صاحب کی ایک خوبی جو بہت پسند آئی وہ یہ کہ کتاب کے مسودے کو جلد بازی میں اشاعت کے لیے نہیں بھیجتے یا یوں کہیں کہ عجلت پسندی کے شکار نہیں ہوئے ہیں اسی وجہ سے ان کی کتابوں میں کوئی غلطی پروف ریڈنگ کی یا کسی اور قسم کی ڈھونڈنے سے بھی نہیں ملی۔ ایک ادنیٰ سے طالب علم کی حیثیت سے میں نے بھی نیر صاحب کی تنقیدی بصیرت کو اپنے نظریہ سے پرکھنے کی کوشش ہے، پورا حق تو ادا نہیں ہوا، اب کس حد تک کامیاب ہوا ہوں، اس کا فیصلہ بھی قارئین پر ہی چھوڑ دیتے ہیں۔ بہر حال ایک اچھے ناقد کی تحریروں سے بہرہ مند ہوا، جس کی مجھے اطمینانیت حاصل ہے۔

”تنقیدی بحثیں“ ایک جائزہ

ڈاکٹر آفاق فاخری

ڈاکٹر عباس رضا نیر کو میں نے بہت قریب سے دیکھا ہے۔ وہ میرے آبائی وطن جلال پور (ضلع امبیڈکر نگر) کے ہیں۔ ان کا خمیر اسی شہر جلال پور کی خاک پاک سے اٹھا ہے۔ وہ اسی شہر دلنواز کی آب و ہوا میں پروان چڑھے اور یہیں رہ کر اعلیٰ تعلیم سے سرفراز ہوئے اور ان دنوں لکھنؤ یونیورسٹی میں صدر شعبہ اردو کے منصب جلیلہ پر فائز ہیں۔ اور آج بحیثیت ادیب، شاعر اور نقاد آسمان ادب پر ان کا نام نامی مہر نصف النہار کی طرح تاباں و درخشاں نظر آتا ہے۔

جب کسی انسان کے فطری میلانات و رجحانات اور فکری و علمی دونوں رویوں میں خاصی پختگی پیدا ہو جاتی ہے، تو یہ اس کی علامت ہوتی ہے کہ اس کا وجود ایک منفرد کردار میں ڈھل گیا ہے۔ یہی کردار جب صالح کردار کے ساتھ انسانی تہذیب اور تخلیقی عمل کے کسی میدان میں اپنے فکری جوہر کا سکھ جاتا ہے اور اپنے اور ضمیر کو آزماتا ہے اور اپنے حسن عمل سے انسانی تہذیب میں حصہ لیتا ہے تو وہ ایک اہم شخصیت بن جاتا ہے۔

ڈاکٹر عباس رضا نیر کی شخصیت ہمہ گیر ہے۔ وہ ایک کثیر الجہات قلم کار ہیں۔ ان کا علمی بصیرتوں کا دائرہ وسیع ہے۔ تنقیدی و تحقیقی اعتبار سے انہوں نے گراں قدر کارنامے انجام دیئے ہیں۔ تخلیقی زاویے سے اگر دیکھا جائے تو ڈاکٹر عباس رضا نیر اپنی افتاد طبع اور قلم کی جولانیوں سے علمی، تہذیبی، جذباتی زندگی کی گہرائیوں، گیرائیوں اور

رعنائیوں کو انتہائی سلیقے سے پیش کرنے کے ہنر سے واقف ہیں۔

ڈاکٹر عباس رضا نیر کی شخصیت میں سنجیدگی، متانت اور جاذبیت کا عکس نظر آتا ہے۔ وہ پیکر اخلاص و محبت اور شائستگی و تہذیب و ادب کے مظہر ہیں۔ ان کی خود اعتمادی، ان کی شخصیت میں ایک مخصوص انفرادیت کی شان پیدا کرتی ہے۔ اور یہی خود اعتمادی ان کے تخلیقی، تنقیدی اور تحقیقی فن کو کامل اور اسلوب و لہجہ اور طرز ادا و شیوہ گفتار کو حکیمانہ اور ساحرانہ بنادیتی ہے اور انہیں اپنی دنیا آپ پیدا کرنے کا عزم عطا کرتی ہے۔ ان کی تحریروں میں تہذیبی قدروں کا احترام، روایت کی پاسداری اور ماضی کی بازیافت سب کچھ موجود ہے۔ ان کی تنقیدی عبارتوں سے پتہ چلتا ہے کہ وہ انسانی اور تخلیقی زندگی کے رمز آشنا اور انسانی حقائق کے مزاج آشنا ہیں۔ وہ کثیر الجہات شخصیت کے حامل ہیں۔ اردو نثر و نظم و دنوں میدانوں میں انہوں نے اپنی ادبی فتوحات سے سنجیدہ اور تابندہ نقش ثبت کئے ہیں۔

۲۰۱۶ء ڈاکٹر عباس رضا نیر کے لیے اہمیت کا حامل ہے کیونکہ اسی سال ان کی تین گراں قدر تصانیف مثلاً ”خواجه احمد عباس“، ”رہائی تنقیدی“ اور ”تنقیدی بحثیں“ زیور طبع سے آراستہ ہو کر منظر عام پر آئی ہیں۔ موضوع و مواد کے لحاظ سے اور تنقیدی اصول و ضابطہ کے اعتبار سے یہ تصانیف یقیناً رباب علم و دانش کو متوجہ کریں گی۔

”تنقیدی بحثیں“ ڈاکٹر عباس رضا نیر کے تحریر کردہ علمی، ادبی اور تنقیدی کل تیرہ مضامین پر مشتمل نثری مجموعہ ہے۔ اس کتاب کے عنوانات میں تنوع ہے۔ اس کتاب میں ابتدائی کے تحت وہ لکھتے ہیں:

”کسی فن پارے کے سلسلے میں ادبی تنقید کا پورا پورا حق ادا کرنے کے لیے متن کی اہمیت و معنویت سے انکار نہیں کیا جاسکتا۔ کسی مخصوص نظام فکر میں کوئی متن کس طرح با معنی ہوتا ہے یا سیاق و سباق کی

تبدیلی کس طرح معنی پر اثر انداز ہوتی ہے۔ صحیح نتیجے تک پہنچانے میں متن کی تفہیم ہی صحیح راستہ ثابت ہو سکتی ہے۔ لہذا پیش نظر تنقیدی مضامین میں فن پاروں کو قاری کے تاثرات اور تخلیق کار کی ذاتی زندگی یا سماجی اور تاریخی پس منظر کی بجائے براہ راست متن سے رشتہ استوار کیا گیا ہے۔ اور متن کے سیاق و سباق کے حوالے سے فن پارے کو سمجھنے کی کوشش کی گئی ہے۔“

اس کتاب کا پہلا مضمون بعنوان ”بہادر شاہ ظفر اپنے نصیب کی تماشا گاہ میں“ ہے اس میں بہادر شاہ ظفر کی زندگی کے پس منظر میں ان کی تین نمائندہ غزلوں کے محاکے کی کامیاب کوشش کی گئی ہے۔

”جہاد آزادی اور مسدس افق“ اردو شاعری کے ملک الشعراء منشی دوار کا پرشاد افق کے معروف مسدس کا تجزیہ ہے۔ یہ مسدس افق ۸۴ بندوں پر مشتمل ہے۔ ڈاکٹر نیر کے خیال میں منشی دوار کا پرشاد افق ہندو دھرم کو جگانے کے لیے اپنے مسدس سے وہی کام لیتے ہیں جو کام مسلمانوں کو جگانے کے لیے مولانا الطاف حسین حالی نے اپنے مسدس ”مدوجز اسلام“ سے لیا تھا۔

فراق گورکھپوری ہماری اردو غزل کی روح سے آشنا ایک ایسے منفرد و ممتاز شاعر ہیں جن کی غزلوں میں رومانی فضا، نشاط و درد کی کیفیت اور جذباتوں کی لطافت اور عنائی خیال کی جھلک صاف طور پر نظر آتی ہے۔ میر کے لب و لہجہ کی بازیافت کے اس شاعر کو ڈاکٹر نیر نے اپنی زمین اور اپنی تہذیب کا شاعر“ قرار دیا ہے وہ لکھتے ہیں:

”فراق کی شاعری کی پہچان دھرتی کی سوندھی خوشبو سے ہی ہے اس میں دلکشی اور سرمستی ہے۔ گیان اور سکون ہے۔ فراق کہتے تھے کہ ہندوستان کی شاعری میں ہندوستانیت ہونا بہت ضروری ہے بلکہ

فراق کی نظر میں دھرتی کی شاعری ہی بڑی شاعری ہے۔“

”تنقیدی بحثیں“ میں ہند، فارس اور ن، م، راشد کے عنوان سے راشد کے مجموعہ ”منظومات“ ایران میں اجنبی“ کا سیر حاصل تجزیہ پیش کیا گیا ہے۔ جس سے قاری متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا۔ ن، م، راشد کی نظم نگاری کے اسلوب و لہجہ کے آہنگ اور شعری مزاج کی رنگارنگی اور تہذیبی قدروں سے اس کی وابستگی پر انہوں نے دلکش انداز میں اظہار خیال کیا ہے۔ یہ عبارت ملاحظہ کیجئے:

”بلاشبہ مشرق وسطیٰ کے کسی بھی علاقے میں ماضی، حال اور مستقبل کے تناظر میں گفتگو قائم کرنے کے لیے بے پناہ مواد حاصل ہو سکتا تھا لیکن ایران سے ہندوستانی اقوام سے تہذیبی و ثقافتی تعلق اور تاریخی قربت ان نظموں کے بیانیے کو موثر بنانے میں جس قدر اہم رول ادا کرتی ہے اتنا شاید کسی اور قوم یا کسی اور علاقے کو علامت بنائے جانے سے فیض نہیں اٹھایا جاسکتا تھا۔“

دوسرے یہ کہ تشبیہات، استعارے، علامات، تمثیل اور تلمیحات کے سلسلے میں اردو شاعری کو فارسی زبان و ادب اور روایات و حکایات سے جو فیض پہنچ سکتا ہے اتنا کسی اور ثقافت سے ممکن نہیں ہے۔ یوں بھی اردو شعر و ادب پر فارسی کے گہرے اثرات ہمیشہ سے اردو شاعری کا لہجہ اور اسلوب طے کرتے آئے ہیں۔ شاید اسی لیے ن، م، راشد نے ایرانی کرداروں، علامتوں، ثقافتوں اور منظر ناموں کے حوالوں سے اپنی نظموں کو موثر اور معتبر بنایا ہے۔ بلاشبہ ”ایران میں اجنبی“ راشد کا اہم کارنامہ ہے۔“

ڈاکٹر نیر کا ایک اہم مضمون ”مجروح کی شعری جمالیات“ ہے۔ مجروح نے یقیناً غزل کے دائرہ کو وسیع کیا ہے۔ واردات قلبی، عشقیہ جذبات کے ساتھ ساتھ انہوں نے غزل کو انسانی ذات کی وابستگی کے رجحان سے آشنا کیا۔ مجروح کی شعری جمالیات کے

تعلق سے ڈاکٹر نیئر کی یہ عبارت پیش ہے:

”مجروح کا سرمایہ کلام اس بات کے ثبوت کے لیے کافی ہے کہ سیاسی مقاصد کے حصول میں بھی اردو غزل پوری طرح زمانے کا ساتھ دے سکتی ہے۔ بس ضرورت اس بات کی ہے کہ غزل کے تغزل کو مجروح نہ ہونے دیا جائے۔ مجروح کے شعروں میں بے پناہ شعریت اور نغمگی موجود ہے۔ چنانچہ مجروح کی غزلیں اپنی تمام تر نزاکتوں اور لطافتوں کے ساتھ نئے امکانات کی نقیب نظر آتی ہے۔“

”تقیدی بحثیں“ میں ڈاکٹر عباس رضا نیئر نے پریم چند کے مشہور افسانے ”پوس کی رات“ کا سیر حاصل تجزیہ ”دیہی زندگی اور پریم چند“ کے عنوان سے کیا ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

”دیہی زندگی کو نہ صرف یہ کہ پریم چند نے خود بھی جیا ہے بلکہ اس زندگی کی معمولی سے معمولی دھڑکنوں اور آہٹوں کا تجزیہ بھی کیا ہے۔ دیہی زندگی کو لاحق تمام تر خدشات و خطرات اور دیہی سماج کو حاصل تمام تر سہولیات و حصولیات کا مشاہدہ پریم چند نے نہایت باریک بینی سے کیا ہے۔“

”اختری بیگم: ایک تہذیبی دستاویز“ اس مضمون کا آخری پیرا گراف اس کی

اہمیت اور افادیت پر بھرپور روشنی ڈالتا ہے۔ آپ بھی ملاحظہ کیجئے:

”ہم نے اس مقالے میں ”اختری بیگم“ کے تقریباً سبھی کرداروں کو سمجھنے کی کوشش کی ہے کیونکہ کرداروں کے ذریعہ ہی ہم ان تہذیبی عناصر تک پہنچ سکتے ہیں جو اس ناول کی خوبی قرار دی جاسکتی ہے۔ لیکن سارے کرداروں کے تجزیے کے بعد ہم اس نتیجے تک پہنچتے

ہیں کہ رسوا کے اس ناول میں کرداروں کا ارتقاء اس طرح نہیں ہو سکا جیسے رسوا کے کامیاب ناولوں میں ہوا ہے اس لیے اس کے کچھ کردار ٹائپ کردار بن کر رہ گئے ہیں اس خامی کے باوجود ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ ”اختری بیگم“ بہر حال ایک تہذیبی دستاویز ضرور ہے۔“

اسی طرح ”قرۃ العین حیدر کا تخلیقی سفر: ایک مجموعی جائزہ“ کا یہ آخری پیرا گراف بھی مضمون کی افادیت اور اہمیت کے تناظر میں پیش ہے:

”بلاشبہ قرۃ العین حیدر کے ناول اور ناولٹ زندگی اور اس کے معنی کی تلاش کا ایک کامیاب رزمیہ ہیں۔ اور ان کے افسانے اس رزمیہ کے تسلسل کی کڑیاں ہیں۔ وہ اپنے افسانوں میں بھی محض تاریخی واقعات کی بازخوانی نہیں کرتیں بلکہ تہذیبی اقدار کی باز آفرینی بھی کرتی ہیں۔ اس لحاظ سے قرۃ العین حیدر کے افسانے اردو میں جدید افسانے کا نقطہ آغاز ہیں۔ قرۃ العین حیدر کے افسانوں میں ماضی صرف اور صرف کسی ویران حویلی کے کھنڈرات کا لینڈ اسکیپ ہی نہیں بلکہ زندگی کی باطنی صداقتوں کی جستجو کا سرچشمہ بھی ہے۔ چنانچہ ان کی کہانی کے منظر نامے بھی کہانی کے کرداروں سے کسی طرح کم اہمیت نہیں رکھتے۔“

”انتظار حسین اور ہجرت“ اس عنوان سے ڈاکٹر نیئر نے ”افسانہ کشتی“ کا تجزیہ بھرپور انداز میں پیش کیا ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

”دیگر افسانوں کی طرح افسانہ ”کشتی“ میں بھی انتظار حسین تاریخ کے دیومالائی سفر کو اپنے عہد سے منطبق کرنے میں کامیاب نظر آتے ہیں اور یہی ان کی افسانہ نگاری کی امتیازی خصوصیت ہے۔“

تقیدی بحثیں میں ایک مضمون ”اردو صحافت کا مجاہد اول: مولانا باقر دہلوی“

کے عنوان سے ہے جس میں مولانا باقر دہلوی کی صحافتی خدمات اور ان کی قائدانہ حیثیت پر روشنی ڈالی گئی ہے اور ان کی خدمات اور شخصیت کے تناظر میں چند تجاویز کی طرف اشارہ بھی کیا گیا ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

”مولانا محمد باقر نے اردو صحافت کے ذریعہ مجاہدہ آزادی ہند میں جو کردار ادا کیا ہے اسے ہندوستان کی تاریخ کبھی فراموش نہیں کر سکتی۔ لیکن یہ کہنا بھی غلط نہ ہوگا کہ آزاد ہندوستان میں مولانا محمد باقر کو اردو صحافت کے شہید اول کی حیثیت سے جو مقام ملنا چاہئے تھا وہ ابھی تک انہیں نہیں دیا گیا۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ دہلی میں مولانا محمد باقر کے نام سے سڑکیں منسوب کی جائیں اور ہندوستان میں ان کے نام سے تعلیمی ادارے قائم کئے جائیں تاکہ مولانا محمد باقر کی قربانی کا کچھ تو حق ادا ہو سکے۔“

”اردو صحافت اور مولانا ابوالکلام آزاد“ یہ مضمون گرانقدر اور وسیع ہے۔ مولانا آزاد جیسی ہمہ گیر اور عبقری شخصیت کی اردو صحافت کے تناظر میں یہ مضمون کچھ اور پہلوؤں کا متقاضی ہے۔ ”منشی نول کشور، مرزا غالب اور ہم“ یہ مضمون منشی نول کشور کی زندگی اور کارناموں پر تفصیلی جائزہ کی حیثیت رکھتا ہے۔ ”تنقیدی بحثیں“ کا آخری مضمون ”بیسویں صدی میں لکھنؤ کا اردو ادب“ ہے اس میں بھی ڈاکٹر عباس رضا نیر لکھنؤ کی تہذیبی، علمی، اور تخلیقی سرگرمیوں کا جائزہ لیتے ہوئے عصر حاضر کے منظر نامے کو بخوبی پیش کرنے میں کامیاب نظر آتے ہیں۔

☆☆☆

ڈاکٹر عباس رضا نیر جلال پوری کی ”تنقیدی بحثیں“

ڈاکٹر مسیح الدین خاں، لکھنؤ

مت سہل ہمیں جانو پھرتا ہے فلک برسوں
تب خاک کے پردے سے انسان نکلتے ہیں

آسمان میں بہت سارے ستارے ہیں لیکن ان ستاروں میں کچھ ستارے زیادہ چمکدار ہیں ان چمک دار تاروں میں بھی ایک دو تارے سب سے زیادہ چمکتے ہیں۔ اسی طرح اردو زبان و ادب میں بھی بہت سارے ستارے ہیں، جو چمک دار ہیں۔ تاروں میں ایک تارہ جو کافی چمک دار ہے اس تارے کا نام ڈاکٹر عباس رضا نیر جلال پوری ہے۔ نیر جلال پوری اردو زبان و ادب کا وہ تابندہ ستارہ ہیں جنہوں نے اپنی بھرپور صلاحیت و کمال کے ذریعے سے ہر طرف روشنی بکھیر رکھی ہے۔

ڈاکٹر نیر کی شخصیت محتاج تعارف نہیں ہے، وہ ایک دانشور، ناظم، خطیب، شاعر، ادیب اور اہل قلم ہیں۔ ہمہ جہت شخصیت کے مالک ہیں ان کی برجستہ گوئی و حاضر دماغی کے سبھی قائل ہیں۔ ان کا مطالعہ کافی وسیع و مشاہدہ عمیق ہے ان کے حافظہ و ذہانت کا تو جواب نہیں۔ زبان و بیان پر دسترس ہے ان کی زبان بہت سادہ ہے، وہ خدا داد صلاحیتوں کے مالک ہیں۔ ان کے مزاج میں انکساری اور طبیعت میں شگفتگی ہے۔

ڈاکٹر نیر جلال پوری نے مختلف موضوعات پر قلم اٹھایا ہے، لیکن سب سے خاص بات ان مضامین کے اندر یہ ہے کہ جس موضوع پر بھی انہوں نے لکھا ہے ایمانداری کے ساتھ پورا پورا انصاف کیا ہے۔ مجھے یہ کہنے میں کوئی تکلف و تامل نہیں ہے کہ نیر صاحب کے اندر ایک بہت خاص بات جو میں نے محسوس کی ہے وہ یہ ہے کہ جس طرح میر انیس کے لیے یہ کہا جاتا تھا کہ ”الفاظ“ گویا ان کے سامنے ہاتھ باندھے کھڑے ہیں، اسی قول کے مصداق ڈاکٹر عباس رضا نیر جلال پوری ہیں کہ ان کے یہاں بھی ”الفاظ“ ان کی لب کشائی کے منتظر رہتے ہیں۔

ان کی نثر ہو یا نظم ہو یا پھر نظامت کے جوہر ہوں۔ ان کے کلام میں سلاست و روانی ہے، الفاظ کے ذخائر موجود ہیں۔ ان کے الفاظ کی ترتیب قارئین کے احساس کو بیدار کرتی ہے، اور جذبات کو بلندی عطا کرتی ہے۔ وہ لفظیات کے ماہر ہیں۔ وہ قارئین و سامعین کے مزاج کو سمجھنے کی پوری صلاحیت رکھتے ہیں۔ الفاظ منہ سے نکلتے ہی خود اپنی جگہ بناتے چلے جاتے ہیں، اور پیوست ہو جاتے ہیں۔ تبھی تو کئی بار پروگرام میں مجھے یاد ہے عالمی شہرت یافتہ مشہور ناظم مشاعرہ، ادیب و شاعر پروفیسر ملک زادہ منظور احمد ڈاکٹر عباس رضا نیر کے بارے میں یہ کہہ چکے ہیں کہ:

’ڈاکٹر نیر جلال پوری کی نظامت اور ان کے گفتگو و کلام میں ایک ایک لفظ منہ سے نکلتے ہیں اور دل میں جگہ بناتے اور پیوست ہوتے چلے جاتے ہیں۔ جملوں کے ربط کا جواب نہیں بات کہاں سے شروع کریں اور کہاں ختم کریں کچھ پتہ ہی نہیں چلتا اور سننے والوں کو مزہ آتا ہے اور ان کا ایک ایک لفظ کانوں کو اچھا لگتا ہے۔ یہ وہی الفاظ استعمال کرتے ہیں جو آسانی کے ساتھ لوگوں کو سمجھ میں آجائے غرض کہ جملوں و لفظوں کے انتخاب میں ان کو خداداد صلاحیت حاصل ہے۔ ان کی

برجستہ گوئی اور حاضر جوابی کا تو زمانہ قائل ہے۔“

ڈاکٹر نیر جلال پوری بسا اوقات موضوع اور موقع و محل کے اعتبار سے جو جملے استعمال کرتے ہیں وہ بہت مشکل سے دوسرا کوئی استعمال کر پائے گا۔ یعنی ان کا کوئی ثانی نہیں ہے۔

نیر صاحب کی کتاب میں جو مضامین ہیں ان کے اندر کافی اشعار بھی موجود ہیں۔ انہوں نے ایسے اشعار کا انتخاب کیا ہے جس کے معانی و مفاہیم سے قاری متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا ہے۔ مطالعے سے یہ بھی پتہ چلتا ہے کہ مصنف کی گرفت، ہندی زبان پر بھی خاصی ہے۔ کسی ایک موضوع پر لکھنا اتنا مشکل نہیں ہے جتنا مشکل ہے الگ الگ موضوعات، مضمون، خاکے اور کردار پر قلم اٹھانا، الفاظ کو سلیقے سے ان کی جگہ پر رکھنے کا ہر نیر صاحب کو آتا ہے۔

لفظوں کے انتخاب، نشست و برخاست اور ان میں جہان معانی پیدا کرنے کی صلاحیتوں کے پیش نظر میر انیس کا یہ بند ڈاکٹر عباس رضا نیر پر حرف بہ حرف صادق آتا ہے۔

تیرگی بد ہے مگر نیک ہے گیسو کے لیے
ہے کجی عیب ہے مگر حسن ہے ابرو کے لیے
سرمہ زیبا ہے فقط نرگسِ جادو کے لیے
زیب ہے خال سیہ عارض گل رو کے لیے

داند آں کس کہ فصاحت بہ کلامے دارد

ہر سخن موقع و ہر نکتہ مقامے دارد

کوئی فن نظامت کا ماہر ہے، تو کوئی خطابت کا، کوئی شاعری میں ماہر ہے، کوئی بحیثیت نثر نگار، کوئی قلم کا سپاہی ہے تو کوئی تقریر کا جادوگر۔ لیکن ڈاکٹر نیر کے اندر بیک وقت سارے جوہر موجود ہیں۔ جب وہ بولتے ہیں تو لگتا ہے کہ انہوں نے سامعین

پر جادو کر دیا ہے۔ موقع کا فائدہ اٹھاتے ہوئے میں اس مبارک ساعت میں ان کی تحریر کردہ ”الہام“ کا ذکر کرنا بھی مناسب سمجھتا ہوں کہ بہت ہی منفرد انداز میں نیر صاحب نے یہ مسدس تحریر کیا ہے۔ قاری پڑھنے کے بعد اسی ”الہام“ کی کیفیت میں ڈوب جاتا ہے۔ مسحور ہو جاتا ہے۔

یہ تو اپنا اپنا ہے حوصلہ، یہ تو اپنی اپنی اڑان ہے
کوئی اڑ کے رہ گیا بام تک، کوئی کہکشاں سے گذر گیا

☆☆☆

تنقیدی بحثیں: ایک جائزہ

افزا خاتون

ڈاکٹر عباس رضانی کی ”تنقیدی بحثیں“ کا مطالعہ جب میں نے شروع کیا تو اسے ختم کر کے ہی دم لی اور اس نتیجے پر پہنچی کہ یہ کتاب جیسے طالب علموں کے لیے بہت زیادہ افادیت کی حامل ہے۔

تنقیدی بحثیں کا پہلا مضمون ”بہادر شاہ ظفر اپنے نصیب کی تماشہ گاہ میں“ یہ مضمون بہادر شاہ ظفر کی شاعری کو سمجھنے میں بہت ہی معاون و مددگار ہے۔ انتشار زمانہ کے کچھ نہ کچھ نقوش میر و غالب، سودا اور ذوق کی شاعری میں بھی نظر آتے ہیں لیکن جس قدر بہادر شاہ کی شاعری میں نمایاں ہیں اس قدر ان شعرا کی شاعری میں نہیں ہے کیونکہ ظفر کے ہم عصر شعرا صرف تماشائی تھے اور بہادر شاہ ظفر تماشہ بھی تھا اور تماشائی بھی اور ایسا انسان جو تماشہ بھی ہے اور تماشائی بھی اس کی شاعری کو ایسے لوگوں کی شاعری بتادی جاتی ہے جو صرف تماشہ دیکھنے والے ہیں جیسے محمد حسین آزاد نے ”آب حیات“ میں آدھا دیوان شاہ نصیر کا بتایا ہے اور باقی ایک تہائی استاد ذوق کا۔ ”یادگار غالب“ میں حالی نے آدھا دیوان غالب کا بتایا ہے۔ انتہا تو یہ ہے کہ رنگوں کی قید میں لکھی جانے والی غزلوں کی کوئی غزل مضطر خیر آبادی کی بتائی جاتی ہے اور کوئی غزل سیماب اکبر آبادی کی ایسا لگتا ہے کہ یہ لوگ تسلیم کر بیٹھے تھے کہ بہادر شاہ ظفر نے کوئی غزل ہی نہیں کہی ہے لیکن اس کتاب میں شامل مضمون کو اور اس میں شامل کی گئی غزلوں کو پڑھ کر بلا جھجک قاری یہ کہنے

پر مجبور ہو جائے گا کہ یہ غزلیں بہادر شاہ ظفر کی غزلیں ہیں اور کسی سے استفادہ کی ہوئی نہیں ہیں بلکہ اور خیل ہیں۔

کتاب کا دوسرا مضمون مسدس افق کے تجزیے پر مشتمل ہے جس کا نام ”جہد آزادی اور مسدق افق“ ہے یہ مسدس اس وقت لکھا گیا تھا جب انگریزی تہذیب ہر طرف چھائی ہوئی تھی لیکن کچھ لوگ ایسے تھے جن کے اندر پرانی تہذیب ابھی بھی زندہ تھی اور وہ یہ چاہ رہے تھے کہ لوگ قدیم تہذیب کی طرف واپس آئیں۔ اس مضمون میں افق کے اسی مضمون کا تجزیہ پیش کیا گیا ہے جس مسدس کے ذریعہ افق اپنی قوم کو بیدار کرنا چاہ رہے ہیں اس مضمون کو پڑھ کر قاری اس بات سے بخوبی واقفیت حاصل کر لے گا کہ افق اپنے مسدس میں کیا کہنا چاہ رہے ہیں۔ مجھے نہیں لگتا ہے کہ اس مضمون کو پڑھنے کے بعد قاری کو اس مسدس کے تجزیے کے لیے دوسری کتاب کو اٹھانے کی ضرورت پڑے گی کیونکہ اس مضمون کو پڑھ کر قاری کو وہاں تک پہنچنے میں دیر نہیں لگے گی کہ افق اس مسدس میں کیا بتانا چاہ رہے ہیں۔

کتاب کا تیسرا مضمون اپنی زمین کے شاعر فراق پر مشتمل ہے۔ مضمون کا نام ”اپنی زمین اور اپنی تہذیب کا شاعر فراق“ ہے اس مضمون میں فراق کی مختلف غزلوں، نظموں اور رباعیوں کے ذریعہ فراق کی شاعری کو سمجھنے کی کوشش کی گئی ہے۔ اس کتاب کے مضمون میں شامل شاعری کو پڑھ کر بہت حد تک یہ محسوس ہوگا کہ فراق کی شاعری میں میر تقی میر کی شاعری کی جھلک دکھائی دیتی ہے اور کیوں نہ جھلک دکھائی دے کیونکہ میر تقی میر کی طرح فراق کو بھی سکون نہیں مل سکا تھا اسی لیے فراق کی شاعری پر تاثر قائم ہونا بھی تھا لیکن مضمون میں شامل شاعری کو غور سے پڑھنے کے بعد قاری بغیر کسی شک کے کہے گا کہ فراق کی شاعری میں میر کی شاعری کا اثر ملتا ہے اور یہ مضمون فراق کی شاعری کو سمجھنے میں بہت حد تک معاون و مددگار ثابت ہوگا۔

کتاب کا چوتھا مضمون اردو کے جدید شاعر، ن۔م۔راشد کی تخلیق ”ایران میں اجنبی کا تجزیہ“ ہے اس مضمون میں نذر محمد راشد کی تیرہ مسلسل نظموں کا تجزیہ کیا گیا ہے اس مضمون میں شامل نظموں کو پڑھنے کے بعد قاری پر ایک تاثر قائم ہوگا لیکن اس کتاب کے مصنف نے جس بہترین انداز سے ان نظموں کا تجزیہ کیا ہے تجزیہ کرنے کا وہ انداز قاری کو اندر سے جھجھوڑ دے گا اس مضمون کو پڑھتے پڑھتے قاری کے ذہن میں یہ سوال بھی آسکتا ہے کہ ان نظموں کو تراشنے کے لیے صرف ایران کو ہی کیوں منتخب کیا۔ اس سوال کا تشفی بخش جواب بھی قاری کو اسی مضمون میں مل جائے گا۔ بہر حال راشد کی نظموں کو سمجھنے کے لیے یہ مضمون بہت ہی مفید ثابت ہوگا۔

کتاب کا پانچواں مضمون مجروح کی شاعری پر مشتمل ہے۔ اس مضمون کا عنوان ”مجروح کی شعری جمالیات“ ہے اس مضمون میں مجروح کی شامل کی گئی غزلوں کے ذریعہ یہ بتانے کی کوشش کی گئی ہے کہ قدیم سے قدیم الفاظ بھی مجروح نے اپنی شاعری میں پیش کیے ہیں لیکن اس کو اس انداز سے پیش کیا ہے کہ وہ قدیم ہو کر بھی قدیم نہیں لگتے ہیں بلکہ تراشے ہوئے جواہرات کی مانند جگمگا رہے ہیں اس مضمون میں شامل غزلوں کو پڑھ کر یہ اندازہ ہو جائے گا کہ اپنی بات غزلوں کے ذریعہ سے بھی پہنچائی جاسکتی ہے۔ آج کے دور میں بھی بہت سے شعرا ہیں جو یہ سوچتے ہوں گے کہ اپنی بات صرف نظم کے ذریعہ سے بھی پہنچائی جاسکتی ہے غزل کے ذریعہ سے نہیں وہ اس مضمون کے پڑھنے کے بعد یہ کہہ اٹھیں گے کہ اپنی بات غزل کے ذریعہ بھی پہنچائی جاسکتی ہے۔

کتاب کا چھٹا مضمون ایک ایسے افسانہ نگار کے متعلق ہے جو دیہات کی زندگی کے مسائل کو اپنے افسانوں کا موضوع بناتے تھے۔ مضمون کا عنوان ہے ”دیہی زندگی کی کشاکش اور پریم چند“ پریم چند جب بھی اپنے ناولوں یا افسانوں میں مزدور طبقہ کی عکاسی کرتے ہیں تو جیتے جاگتے کردار سامنے آجاتے ہیں لیکن اس مضمون میں

پریم چند کے جس افسانہ ”پوس کی رات“ کا تجزیہ پیش کیا گیا ہے اس میں ایک مزدور طبقہ کی حالت مکمل طور پر واضح ہو جاتی ہے۔ میں یہ بات یقین کے ساتھ کہہ سکتی ہوں کہ غور سے پڑھنے کے بعد افسانہ کا جو تجزیہ پیش کیا گیا ہر ایک اقتباس قاری کے ذہن میں ایک تاثر چھوڑ جائے گا۔

کتاب کا ساتواں مضمون ایک ناول کے متعلق ہے اس مضمون کا عنوان ”اختری بیگم: ایک تہذیبی دستاویز“ ہے اس کتاب کے مصنف کی خاصیت یہ ہے کہ انہوں نے اپنے مضمون کے لیے رسوا کے ایک ایسے ناول کو منتخب کیا ہے جس پر بہت کم لوگ توجہ دیتے ہیں۔ اس نظر انداز کئے جانے والے ناول میں کتاب کے مصنف نے اس ناول میں تہذیبی عناصر تلاش کر کے اس کی اہمیت بتانے کی کوشش کی ہے۔ اس مضمون میں ناول ”اختری بیگم“ سے پیش کئے گئے اقتباس کو غور سے پڑھنے کے بعد قاری کو اس میں بنیادی نقطہ نظر مل جائے گا اور اس مضمون کے پڑھنے کے بعد لوگوں کے اندر جو اس ناول کے لیے الجھنیں ہیں وہ بہت حد تک دور ہو جائیں گی۔

کتاب کا آٹھواں مضمون قرۃ العین حیدر اور ان کے ناولوں کے متعلق ہے اس مضمون کا عنوان ہے ”قرۃ العین حیدر کا تخلیقی سفر: ایک مجموعی جائزہ“۔ اس مضمون میں قرۃ العین حیدر کے ناولوں اور ناولٹ کا تعارف پیش کیا گیا ہے۔ تعارف پیش کرنے کے ساتھ ساتھ ناولوں اور ناولٹ کے مرکزی کردار کی بھی وضاحت کی گئی ہے اور یہ بھی بتایا گیا ہے کہ ان ناولوں اور ناولٹ کی تخلیق میں قرۃ العین حیدر کو کتنی مشقتیں اٹھانی پڑیں۔

کتاب کا نواں مضمون جدید افسانہ نگار انتظار حسین اور ان کے افسانے کے متعلق ہے۔ مضمون کا عنوان ہے ”انتظار حسین اور ہجرت: افسانہ کشتی کا تجزیہ“ اس مضمون میں انتظار حسین کے افسانے کی خصوصیات بتانے کے ساتھ ساتھ افسانہ کشتی کا تجزیہ بھی پیش کیا گیا ہے۔ اس مضمون کو پڑھ کر ہجرت کرنے والوں کی نفسیات سے آگہی

بھی ہو جائے گی۔ اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ افسانہ کشتی کا تجزیہ کرنے کے لیے جن اقتباسات کو پیش کیا گیا ہے ان کو پڑھ کر قاری کے ذہن میں اس ہجرت اور اس وقت کا انتظار ذہن میں چھا جائے جب لوگ ہندوستان کو چھوڑ کر پاکستان جا رہے تھے اس مضمون میں یہ بات بھی ابھر کر سامنے آئی ہے کہ انتظار حسین سے پہلے جتنی بھی ہجرتیں ہوئی ان کا کوئی نہ کوئی مقصد تھا کوئی منزل تھی اور کوئی راہی اور رہبر تھا لیکن انتظار حسین اور ان کے بعد کی نسلوں نے جو ہجرت کی وہ ایک ایسا المیہ ہے جس کی نہ کوئی منزل ہے نہ کوئی مقصد ہے۔ اور نہ کوئی رہبر لیکن اس بات کو یقین کے ساتھ کہا جاسکتا ہے کہ اس مضمون کو پڑھ کر ان افراد کو ضرور تسلی مل جائے گی جو ایک جگہ سے دوسری جگہ منتقل ہوئے ہیں یہ سوچ کر تسلی ملے گی کہ ہم سے پہلے بھی بہت سے لوگوں نے ہجرت کی اور شاید ہجرت بھی انسان کا مقدر ہے۔

کتاب کا دسواں مضمون اردو کے پہلے معتبر اور مستند صحافی مولانا باقر دہلوی کی قومی اور صحافتی خدمات پر مشتمل ہے۔ مضمون کا عنوان ہے ”اردو صحافت کا مجاہد اول، مولانا باقر دہلوی“ اس مضمون میں مولانا کا تعارف پیش کرنے کے ساتھ ساتھ ان کی علمی و ادبی خدمات پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ اور ان کی تصانیف کا بھی ذکر کیا گیا ہے۔ اس مضمون میں اس دور کے شعرا کے آپسی اختلاف کو بتانے کے ساتھ ساتھ اس وقت کی گروہ بندیوں کو بھی ذکر کیا گیا ہے۔ بطور حوالہ بیچ بیچ میں ”دہلی اردو اخبار کی بھی عبارت کو پیش کیا گیا ہے۔ اس مضمون کو پڑھ کر اس وقت کی بد حال دہلی کا نقشہ کھینچ جائے گا ان سب کے ساتھ اس مضمون میں اس سوال کا بھی جواب ملے گا کہ مولانا باقر کو گولی کیوں ماری گئی۔ مولانا باقر کی علمی و ادبی خدمات اور دہلی کے اس وقت کے حالات کو جاننے کے لیے یہ مضمون بہت ہی معاون و مددگار ثابت ہوگا۔

کتاب کا گیارہواں مضمون بھی ایک صحافی پر مشتمل ہے۔ مضمون کا عنوان ہے

”اردو صحافت اور مولانا ابوالکلام آزاد“ اس مضمون میں ابوالکلام آزاد کا تعارف پیش کرنے کے ساتھ ان کے علمی وادبی کارناموں کا بھی ذکر کیا گیا ہے۔ اس مضمون کو پڑھتے وقت قاری کو یہ محسوس ہوگا کہ سرسید احمد کی طرح ابوالکلام آزاد کو بھی مسلمانوں کی بد حالی بے چین کر دیتی تھی اور یہ بات بھی ظاہر ہوگی کہ سرسید احمد کی طرح ابوالکلام آزاد کو بھی اعتراضات کا سامنا کرنا پڑا لیکن اس مضمون کا بغور مطالعہ کرنے کے بعد قاری یہ کہنے پر مجبور ہو جائے گا کہ اردو اور ہندوستانی صحافت کی دنیا میں ابوالکلام آزاد کا ہر نقش مشعل راہ ہے۔

کتاب کا بار ہواں مضمون نول کشور کے متعلق ہے مضمون کا عنوان ہے ”منشی نول کشور، مرزا غالب اور ہم“ اس مضمون میں نول کشور کی حالت زندگی بتانے کے ساتھ ساتھ ان کی علمی وادبی خدمات پر بھی روشنی ڈالی گئی ہے۔ اور اس بات کی بھی وضاحت کی گئی ہے کہ اگر اس انتشار کے دور میں منشی نول کشور ادبی خدمات کو انجام نہ دیتے تو اس ادبی ذخیرہ کا کیا ہوتا غالب اور نول کشور کے رشتہ کو سمجھنے کے لیے یہ مضمون بے حد مفید ہوگا کیونکہ اس مضمون میں اس وقت کی گفتگو خطوط کے ذریعہ سے وضاحت کر دی گئی ہے۔ اس مضمون میں نول کشور پریس میں جتنی بھی کتابیں چھاپی گئیں اس کی فہرست کے ساتھ ساتھ اس دور کی لنگا جمنی تہذیب کی بھی عکاسی ہوتی ہے اس دور کو سمجھنے کے لیے یہ بہت ہی کارآمد ثابت ہوگا۔

اس کتاب کا آخری مضمون اسی شہر لکھنؤ کے متعلق ہے مضمون کا عنوان ہے ”بیسویں صدی میں لکھنؤ کا اردو ادب“ اس مضمون میں انشاء سے لے کر عصر حاضر تک کے رویوں کا ذکر کرنے کے ساتھ اس بات کی بھی وضاحت کی گئی ہے کہ وہ کس صنف سے وابستہ رہے۔ مضمون میں یہ بات بھی سامنے آئے گی کہ شہر لکھنؤ ہمیشہ سے ہی علم وادب کا گہوارہ رہا ہے اور دوسری جگہوں سے بہت سے ایسے لوگ یہاں آئے ہیں جن کی

شاعری اسی جگہ پروان چڑھی۔ انشا کے دور میں جو نئی صنف وجود میں آئی اس کا بھی ذکر کیا گیا ہے۔ ترقی پسند تحریک کا بھی مختصر تعارف پیش کیا گیا ہے۔ بہر حال لکھنؤ میں علم وادب کے متعلق جتنے بھی امور انجام دیئے گئے ہیں اس مضمون کو پڑھ کر مکمل واقفیت حاصل کی جاسکتی ہے۔

”تنقیدی بحثیں“ جس کے مصنف ڈاکٹر عباس رضا نیر صاحب ہیں اس کتاب کے ہر مضمون کا میں نے بغور مطالعہ کیا ہے۔ بغور مطالعہ کرنے کے بعد میں نے ہر مضمون سے جو بھی نتیجہ اخذ کیا ہے اور ایک طالب علم کی حیثیت سے جو میں نے محسوس کیا اور اس کتاب کی اہمیت و افادیت کیا ہے اس کو مختصر طور پر اس مضمون میں بیان کر دیا ہے۔



رثائی تنقیدیں: ایک اجمالی جائزہ

سید علی احمد دانش

اردو کے شعری ادب میں دیگر اصناف کے علاوہ مرثیہ کو جو مقبولیت حاصل رہی ہے وہ کسی زمان و مکان کی پابند نظر نہیں آتی۔ اس صنف کے سلسلے عرب و عجم نیز ہندوستان کے تمام علاقوں میں پھیلے نظر آتے ہیں۔ اس طرح کی شاعری بغیر کسی دوئی کے ہر مذہب و مسلک کے انسانوں نے کی۔ یہ تمام افراد علاقائی طور پر بہت کامیاب بھی ہوئے۔ یہ اور بات ہے کہ ان کے اسلوب میں فرق نظر آتا ہے۔

گزشتہ صدی میں ہندوستان میں موجود شعراء میں کچھ قدیم کلاسیکل شاعری سے وابستہ رہے۔ تو بعض افراد نے قدما کی ڈگر سے ہٹ کر نئے تجربات کئے۔ ان شعرا میں شاد عظیم آبادی، جمیل مظہری، وحید اختر، شاہد حیدر آبادی، علی سردار جعفری، علی مہدی بلرام پوری، تجسس اعجازی، طیب کاظمی، عشرت لکھنوی، شہید صفی پوری، اثر بلوری، شہید لکھنوی، خورشید فتح پوری، مضطر جو پوری وغیرہ افادیت کے حامل ہیں۔

فی الوقت میرا موضوع لکھنؤ میں موجود ایک باصلاحیت شخصیت جناب عباس رضا نیر صاحب ہیں جنہوں نے اردو شاعری کی تمام اصناف میں طبع آزمائی کے جوہر دکھائے اور صاحب زبان شعرا نے انہیں سندا جتھا د عطا کی، ورنہ لکھنؤ کی تاریخ شاہد ہے کہ یہ آسانی سے کسی بیرونی شاعر کو تسلیم نہیں کرتے۔ اس کی مثال جناب یاس یگانہ چنگیزی جیسی عروض داں شخصیت کی ہے جنہیں یہاں کے شعراء نے قبول نہیں کیا۔

ڈاکٹر نیر جلال پوری صاحب جناب کیف جلال پوری صاحب کے نواسے ہیں۔ انہوں نے لکھنؤ یونیورسٹی سے پی ایچ ڈی کی ڈگری حاصل کی۔ ان کا موضوع ”اردو شاعری میں علامات کر بلا“ تھا۔ موصوف نے شعری تجربات کے بعد نثر کی طرف توجہ فرمائی۔ نتیجہ میں لاتعداد مضامین سپرد قلم کئے۔ وہ ایک بہت اچھے ناظم بھی ہیں۔ جہاں بھی جاتے ہیں، وہاں کے سامعین انہیں بے حد پسند کرتے ہیں۔ ایک کامیاب زندگی گزارنے کے لیے ضروری ہے کہ وہ جہاں اور جس ماحول میں رہے، درمیانہ روی اختیار کرے اور ایسے رہے جس سے ملنے کے لیے لوگ متنی ہوں۔ یہ صفت ان میں بدرجہ اتم موجود ہے۔ کتاب کا انتساب ”دبستان دبیر“ کے ممتاز محقق جناب ڈاکٹر محمد زماں آزرہ کشمیری کے نام ہے۔

جناب عباس رضا صاحب نیر جلال پوری نے جس سرعت کے ساتھ اپنے ادبی سفر کو طے کیا، وہ ان کے معاصرین کے لیے مشعل راہ ہے۔ ان کی متعدد تصانیف، جن میں شعری تخلیقات اور نثری فن پارے شامل ہیں۔ راقم کی نظر سے گزر چکے ہیں۔ اس وقت میرے پیش نظر ان کی تازہ تصنیف ”رثائی تنقیدیں“ ہے جسے ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس نئی دہلی نے شائع کیا ہے۔ اس کتاب میں جو دو سو چوبیس صفحات پر مشتمل ہے۔ اردو مرثیہ کے معتبر شعراء و ادباء مثلاً انیس، دبیر، جمیل، نسیم، غالب، عرفان، سردار، شہزاد اور میر تقی میر دہلوی جیسے عظیم المرتب شخصیتوں کی شاعری خصوصاً مرثیہ پر لاجواب نکات پیش کئے گئے ہیں۔ انہوں نے خدائے سخن میر انیس کے مرثیہ ”جب کر بلا میں داخلہ شاہ دیں ہوا“ کے سلسلے میں فرمایا ہے:

”میر انیس کی قدرت منظر نگاری اور ملکہ پیکر تراشی پر ناقدین ادب کی جانب سے ہزار ہا تبصرے اور اعترافات آچکے ہیں۔ بلکہ یوں کہا جائے کہ رزمیہ شاعری میں انیس نے آج جو

حیثیت حاصل کی ہے وہ دنیا کے عظیم سے عظیم شاعر کو میسر نہ ہو سکی ہے۔ اس کی وجہ ان کی یہی فطری اور حقیقی منظر نگاری اور تاریخ کے اوراق میں صدیوں کے اس پار کے کرداروں کو اپنے عہد کے جیتے جاگتے حقیقی ماحول کا ایک واقعی حصہ بنا کر پیش کرنے کا ہنر ہی ہے۔ انیس کے اس ہنر تک پہنچنے میں انسانی عقل و تصور ابھی تک حیران و عاجز ہے۔ تمام عالم ادب اس واقعہ کو بیان کرنے میں انیس کی قدرت کلام کا لوہا مانتا ہے۔“

(رثائی تنقیدیں، ص ۱۹)

موصوف نے مثال میں اسی مرثیہ سے موقع محل کے اعتبار سے انتخاب کر کے ایسے بندوں کو پیش کیا جن کا محل استعمال اس جگہ ضروری تھا۔ اسی طرح انہوں نے ”بیانیہ اور انیس“ میں جناب شیریں سے متعلق مرثیہ ”اے مومنو! کیا صادق الاقرار تھے شیریں“ میں فرمایا ہے:

”اردو ادب کے بہت سے مرثیہ نگاروں نے کربلا کی تاریخ کو اسی قدر خوب صورتی کے ساتھ کہانی بنا کر عوام تک پہنچایا ہے۔ حالانکہ مرثیہ نگاروں کی کہانی نے کہیں کہیں تاریخ سے تجاوز کیا ہے۔ لیکن کہانی کو محض تخیل یا مفروضات کے حوالے بھی نہیں کیا ہے۔“

(رثائی تنقیدیں، ص ۳۶)

شیریں کے حال میں کہا ہوا یہ مرثیہ اپنی انفرادیت کی بدولت مستورات میں بے حد مقبول ہے۔ میرا انیس نے صادق الاقرار ہونے کی جو دلیلیں نظم کی ہیں وہ قابل داد ہیں۔ امام حسینؑ نے طفلی میں ملاقات کا جو وعدہ کیا تھا۔ اسے سجدہ شکر کے ساتھ اپنا سر قلم کرا کے پورا کیا۔ انیس فرماتے ہیں:

اس طرح کے صادق کبھی دیکھے ہیں نہ کسی نے
مرکر کیا وعدے کو وفا سبب نبیؐ نے

کہا جاسکتا ہے کہ نیر جلال پوری نے اسے جس جدید انداز میں تحریر کرنے کی سعی فرمائی ہے اس میں لفظ کہانی، محل، منظر، غالباً انہیں اس بات کا خیال تھا کہ انیس کے معاصر دبیر کا حق ادا کرنے سے قاصر نہ رہ جاؤں۔ اس لیے انہوں نے میرا انیس کے شیریں والے مرثیہ کے مد مقابل اس بات کو ضروری سمجھا کہ اسی طرز کا کوئی مرثیہ دبیر کا بھی ہونا چاہئے۔ لہذا انہوں نے جس مرثیہ کو منتخب کیا وہ اپنی تمام تر خوبیوں کی بدولت اتنا زمانہ گزرنے کے بعد بھی نرم دل ذہنوں میں اپنا مقام بناتا ہے۔

قید خانے میں تلاطم ہے کہ ہند آتی ہے

ڈاکٹر صاحب نے اپنی جدت فکر سے الفاظ کے ذخیرے کو جس طرح سجا سنوار کر اس مقالے میں پیش کیا وہ پڑھنے سے تعلق رکھتا ہے۔ ان کا انداز تحریر خود ایک ڈرامہ سا لگتا ہے۔ میں سمجھتا ہوں قاری کو کہیں ذرا سی بھی اکتاہٹ نہیں ہوگی۔

اسی طرح ڈاکٹر صاحب نے جمیل مظہری، بسیم امروہوی کے جدید اسلوب کے مرثیوں سے جو اجزائے مرثیہ پیش فرمائے ہیں وہ بھی بہت عمدہ ہیں۔ شہزاد معصومی کے مرثیہ کا جو محاکمہ کیا ہے، وہ قابل رشک ہے۔ شہزاد معصومی مرحوم بھی ایک انفرادیت کے حامل تھے، جنہیں پتہ نہیں کیوں نظر انداز کیا جاتا رہا۔ جبکہ ان کا کلام کافی زمانے پہلے اشاعت کی منزل سے گزر چکا تھا۔

ڈاکٹر صاحب نے میر کی غزلوں میں علامات کربلا کے ذیل میں ان کی غزلوں سے جس طرح سے اس نوعیت کے اشعار تلاش کئے ہیں وہ ان کی بالغ نظری کا نتیجہ ہیں۔ میرا خیال ہے کہ میر کے اس طرز کے کلام کو بنیادی قرار دے کر گزشتہ صدی کے بعض شعراء نے بھی طبع آزمائی کی، جس میں جناب عرفان صدیقی نے بڑا نام روشن

کیا۔ تصور حسین زیدی، وقار عظیم نے بھی اس صنف میں اشعار نظم کئے۔ ملاحظہ فرمائیں:

قاتل نے کس صفائی سے دھوئی ہے آستیں

اس کو خبر نہیں کہ لہو بولتا بھی ہے

(وقار عظیم)

یوں بھی لہو نے صورتِ اظہار پائی ہے

مقتل سے دل دھڑکنے کی آواز آئی ہے

(امید فاضلی)

انہوں نے میر تقی میر کے اس شعر:

حاصل نہ پوچھ باغِ شہادت کا بوالہوس

یاں پھل ہر اک درخت کا حلق بریدہ ہے

کا جس طرح تجزیہ فرمایا وہ انفرادیت کا حامل ہے۔ انہوں نے گلشن، مشہد،

پھل، درخت، حلق اور بریدہ ظاہر ہے سب میں ایک طرح کی رعایت پائی جاتی ہے۔ گلشن

بھی سرخ ہوتا ہے اور شہادت گاہ بھی۔ گلشن پھولوں سے سرخ ہوتا ہے اور مشہد شہیدوں

کے خون سے۔ گلشن میں درخت پھیلے ہوتے ہیں اور مشہد میں حلق کاٹا جاتا ہے۔

بڑی احسان ناشناسی ہوگی اگر میں یہاں اس موضوع کا ذکر نہ کروں جو ڈاکٹر

صاحب نے عرفان صدیقی مرحوم پر قلم بند کیا ہے۔ عنوان ہے ”عرفان صدیقی کی

شاعری میں علامات کربلا“ یہ اپنی نوعیت کا بڑا معیاری مقالہ ہے جس میں انہوں نے ان

کی غزلوں سے ان شعروں کا انتخاب کیا ہے جن میں علامات کربلا کے عناصر موجود ہیں۔

چند شعر پیش کئے جاتے ہیں۔

سروں کو ربط رہا ہے سناں سے پہلے کبھی

گزر چکے ہیں یہ لشکر یہاں سے پہلے کبھی

حریف تنگ ستمگر تو کر دیا ہے تجھے

اب اور مجھ سے تو کیا چاہتا ہے سر میرے

یہ سرخ پھول سا کیا کھل رہا ہے نیزے پر

یہ کیا پرندہ ہے شاخِ شجر پہ وارا ہوا

تری تنگ تو میری ہی فتح مندی کا اعلان ہے

یہ بازو نہ کٹتے اگر میرا مشکیزہ بھرتا نہیں

سورج کا خون بہنے لگا پھر ترائی میں

پھر دشتِ شب میں تنگ جفا ہوگئی ہے شام

عرفان صدیقی صاحب مرحوم کے ذہنی دریچوں میں کربلا کے عظیم سانحے کے

سلسلے میں ایک خلوص موجود تھا۔ انہوں نے اس کیفیت کو مرثیہ نہ کہہ کر اپنی غزلوں میں سمو

کر پیش کر کے اپنے دلی جذبات کی ترجمانی کی اور بقول ڈاکٹر نیر صاحب:

”عرفان صدیقی کی شاعری میں علامات کربلا کا تخلیقی

استعمال نہ صرف یہ کہ ہمارے عہد کے درد و کرب کو پوری طرح

نمایاں کرتا ہے۔ بلکہ آئندہ زمانوں کی بشارت بھی دیتا ہے۔“

(رثائی تنقیدیں: ص ۱۹۱)

ڈاکٹر نیر جلال پوری کی اس نادر کتاب کا آخری مضمون ”ایک قطرہ خون“ ایک

جائزہ ہے۔ وہ بھی بڑی انفرادیت کا حامل ہے۔ موصوف نے انیس کے معرکہ آراء مرثیہ

کو کس خوبصورت انداز میں پیش کیا ہے۔ ”صاحبو! کہو کیا تمہیں میر انیس کے مرثیہ کا

مطالعہ نہیں یاد آیا:

جب قطع کی مساف شب آفتاب نے
جلوہ کیا سحر کا رخ بے حجاب نے
دیکھا سوائے فلک شہ گردوں رکاب نے
مڑ کر صد ارفیقوں کو دی اس جناب نے

آخر ہے رات حمد و ثنائے خدا کرم
اٹھو فریضہ سحری کو ادا کرو

اس تاریخی ناول کے بارے میں ان کا ارشاد ہے کہ ”ناول مکمل ہو گیا“ انہوں نے ناول کی شکل میں امام عالی مقام کی زندگی کے ستاون برس کو بیان کر دیا۔ نیز آگے رقم طراز ہیں کہ ”دیکھئے عصمت چغتائی کا ناول کس طرح انیس کے مصرعوں کی انگلیاں تھام کر آگے بڑھتا ہے۔ کیا اب پڑھا جائے انیس کے مرثیہ سے رخصت کا یہ بند؟

حسین جب کہ چلے بعد دو پہر رن کو
نہ تھا کوئی کہ جو تھامے رکاب تو سن کو
حسین چپکے کھڑے تھے جھکائے گردن کو
سکینہ جھاڑ رہی تھی عبا کے دامن کو

نہ آسرا تھا کوئی شاہ کربلائی کو
فقط بہن نے کیا تھا سوار بھائی کو

یہاں اس بات کا اعلان ضروری ہے کہ مذکورہ بند میر انیس کی تصنیف سے نہیں ہے۔ یہ پورا مرثیہ ان کے سب سے چھوٹے بھائی میر نواب مولس کا ہے اور مطبع نول کشور کی جلد میں موجود ہے۔ محترمہ سے تسامح ہوا۔ بہر حال عصمت چغتائی صاحبہ نے کربلا کو نظر انداز نہیں کیا۔ گویا اس انداز میں انہوں نے اس مظلومیت کی داستان کو بہ طور ناول پیش کر کے ان افراد کو ملتفت کرنے کی سعی کی جو اردو مرثیہ سے دور ہیں۔

میں ڈاکٹر نیر جلال پوری کو اس کتاب ”رثائی تنقیدیں“ پر دلی مبارک باد پیش کرتا ہوں۔ ان کی اس تصنیف کی جلد یا بدیر قدر و قیمت کا تعین ضرور ہوگا۔ بقول شاعر علامہ اقبال:

ہو ترے دم سے یونہی میرے وطن کی زینت
جس طرح پھول سے ہوتی ہے چمن کی زینت
☆☆☆

رثائی تنقیدیں: نئی تنقیدی جہت

احمد وصی، ممبئی

اردو میں تنقید کے خانوں میں رنگ بھرنے کا سلسلہ برابر جاری ہے اور بعض رنگ تو اتنے خوشنما اور جاذب نظر ہیں کہ یہ احساس ہی نہیں ہونے دیتے کہ ان کے بعد کوئی اور خانہ بھی رنگ بھرنے کے لیے ہوسکتا ہے مگر جستجو بھری نظریں نہ صرف اس کی متلاشی ہوتی ہیں بلکہ اسے ڈھونڈھ بھی لیتی ہیں۔

”رثائی تنقیدیں“ ڈاکٹر عباس رضانیر کی ایک ایسی ہی کاوش ہے۔ انہوں نے ایک نئی فکر اور سوچ کے سہارے ایک نئی تنقیدی جہت کو ”رثائی تنقیدیں“ میں سمیٹ کر تنقید کا ایک نیا خانہ، ایک نیا گوشہ نمایاں کیا ہے۔

رثائی ادب اردو کا وہ لازوال خزانہ ہے جس کے لیے یہ دعویٰ کیا جاسکتا ہے کہ دنیا کی کسی زبان کے ادب میں کسی ایک تاریخی واقعہ پر اتنا نہیں لکھا گیا جتنا واقعہ کر بلا پر لکھا گیا اور یہ سرمایہ اردو کے رثائی ادب کا حصہ ہے لیکن رثائی تنقید اردو میں رائج تو کیا، نا آشنا، ہی رہی ہے۔ ڈاکٹر عباس رضانیر نے نہ صرف اس کے اوپر جمی مٹی کی تہیں صاف کیں بلکہ خود قلم لے کر اس کی الف ب لکھ ڈالی۔ یہ کتاب دراصل اس طرح کے رثائی ادب کی ابتدائی کتاب ہے اس لیے میں نے الف ب لکھنا، کہا ہے۔

”رثائی تنقیدیں“ میں جس مضمون نے سب سے پہلے مجھے متوجہ کیا وہ ہے شبلی کے موازنہ انیس و دبیر کا جائزہ۔ اس موضوع کو انہوں نے اپنے زاویہ نظر سے دیکھا ہے

اور میں اسے اس موضوع کی تجدید ہی کہوں گا۔ انہوں نے انیس کے مرثیوں کے حوالوں سے انیس کے فن پر بات کی ہے۔ یہی نہیں انہوں نے جمیل مظہری، نسیم امروہوی اور شہزاد معصومی کے مرثیوں کا بھی تجزیہ پیش کیا ہے۔ اس کے علاوہ میر، غالب، علی سردار جعفری اور عرفان صدیقی کے شعروں میں کر بلا کی علامت کے استعمال پر بھی مضامین لکھے ہیں۔ اردو ادب کی یہ کم مائیگی، یا غربت الفاظ ہے کہ اس میں اپنے عہد کی زندگی کی کشمکش، جدوجہد، کرب اور درد کے اظہار کے لیے صرف اور صرف ایک ہی علامت ہے اور وہ ہے کر بلا۔ اس لیے ہر شاعر اس طرح کے موضوع کے لیے اس علامت کو استعمال کرنے پر مجبور ہے۔ ہاں اس سے شاعر کی کر بلا سے ذہنی وابستگی یا عقیدت کا اندازہ ضرور ہوتا ہے۔

کتاب کے دوسرے مضامین ”اسٹیج مکالمہ اور دبیر“ پروفیسر فضل امام بحیثیت انیس شناسی، اپنے موضوع کے لحاظ سے ذہن پر تاثر چھوڑتے ہیں۔

عصمت چغتائی کے ناول ”ایک قطرہ خون“ کا جائزہ لینا خود اس بات کا ثبوت ہے کہ یہ ناول اردو کے اچھے ناولوں میں سے ایک ہے اور نہ جانے کیوں ناول پر قلم اٹھانے والے یہ رونا تو روتے ہیں کہ اردو میں اچھے ناولوں کی کمی ہے مگر لکھتے وقت اس اچھے ناول کو بھول جاتے ہیں۔ کتاب کا یہ آخری مضمون ”ایک قطرہ خون: ایک جائزہ“ اس اہم ناول کو اردو کے رثائی ادب میں شامل کرنے کے لیے ایک ذہن بناتا ہے۔

”رثائی تنقیدیں“ کا مطالعہ کرنے کے بعد میرے ذہن میں ایک سوال ضرور ابھرتا ہے کہ عباس رضانیر نے اردو کے رثائی ادب کو خاص کر شاعری میں صرف مرثیوں تک ہی محدود کیوں کر دیا جبکہ نوحہ، ماتم، سوز، سلام بھی رثائی ادب کا ہی حصہ ہیں اور مرثیوں سے زیادہ عوامی، مشہور اور زبان زد ہیں کیونکہ مجلسوں اور جلوسوں میں بار بار پڑھے جاتے ہیں۔

سوال پوچھنے کا حق ہر قاری کو ہے اور ایک قاری کی حیثیت سے ہی میں نے

اس کا اظہار کیا مگر اس کا مطلب یہ قطعی نہیں کہ صرف اس سوال کی وجہ سے اس کتاب کی اہمیت پر اثر پڑے، بلکہ میں اسے ایک نئی تنقیدی جہت کے ساتھ اردو ادب میں ایک نئی تنقیدی شروعات سمجھتا ہوں اور امید ہے کہ ڈاکٹر عباس رضانیر کی اس نئی پہل کو دوسرے نقاد بھی اپنائیں گے اور اپنی کاوشوں سے مزید اضافہ کریں گے۔ لیکن قلم اٹھانے سے پہلے انہیں یہ بات ذہن نشین کرنی ہوگی کہ ایسی تحریریں صرف روشنائی سے نہیں آنسوؤں سے بھی لکھی جاتی ہیں اور ڈاکٹر عباس رضانیر نے یہی کیا ہے۔



ڈاکٹر عباس رضانیر کی تنقیدی نظر: ”رثائی تنقیدیں“ کی روشنی میں

ڈاکٹر نسیم نکہت

ڈاکٹر عباس رضانیر کی تخلیق ”رثائی تنقیدیں“ میں ان کی تمام صلاحیتیں یعنی ان کا وسیع مطالعہ اور ان کا گہرا مشاہدہ ان کی فکری پرواز، ان کی تجزیے کی صلاحیت و تنقیدی بصیرت بھرپور طریقے سے واضح ہے۔ ڈاکٹر نیر ایک بہترین مقرر، شاندار استاد، زبردست ناظم، معیاری شاعر، اعلیٰ درجے کے ادیب، بڑے دانشور اور زبردست خطیب ہیں۔ اور ظاہر ہے کہ خطیب کی حیثیت سے واقعہ کر بلا کی اثر انگیزی ان کے لیے ایک مستقل موضوع ہے اور اردو شعر و ادب میں علامات و استعارات کر بلا کی روایت سے انہوں نے فیض حاصل کیا ہے۔

اکثر ادبی کتابوں کی تحریریں اتنی ثقیل ہوتی ہیں کہ انہیں پڑھنے کے لیے متعدد مرتبہ غور کرنا پڑتا ہے کہ نثر نگاروں کا اپنا اپنا منفرد انداز ہوتا ہے کچھ لوگ ہلکا پھلکا انداز رکھتے ہیں کچھ بہت ادق زبان استعمال کرتے ہیں جس میں اپنے مزاج کے مطابق لفظوں کی ترتیب رکھتے ہیں۔

شاعری کے متعلق تو آتش نے فرما دیا کہ:

بندش الفاظ جڑنے سے نگوں کے کم نہیں

شاعری بھی کام ہے آتش مرصع ساز کا

لیکن نثر میں لفظوں کے موتی سجانے کے سلیقے کو لفظوں کی جادوگری یا تحریر کے ہنر کو اگر آپ تلاش کرنا چاہیں تو ڈاکٹر نیر کی ”رثائی تنقیدیں“ پڑھیں۔ اگر تحریر میں جادو ہے تو پڑھنے والے کو خشک مضمون میں بھی ایسا لطف آنے لگتا ہے کہ پوری کتاب پڑھ کر پھر اسے دہرانے کا دل چاہتا ہے۔

ڈاکٹر نیر کی تحریر میں اتنی سلاست اور روانی ہے کہ کہیں بھی ذہن اٹکتا نہیں ہے ایسی وضاحت جیسے گرہیں کھولنے کا کام دھیرے دھیرے کر رہے ہوں۔ اپنی کتاب کے پہلے مضمون ”پیکر تراشی اور انیس“ میں انہوں نے اس بات کا پورا خیال رکھا ہے کہ انیس کی پیکر تراشی کو اچھی طرح تفصیل اور وضاحت کے ساتھ پیش کریں۔ چنانچہ اس تعلق سے وہ لکھتے ہیں کہ:

”جہاں کہیں واقعہ اپنا حقیقی اور تاریخی وجود رکھتا ہو، کردار بھی

سچ مچ کے واقعی اور حقیقی کردار ہوں وہاں یہ احتیاط کچھ اور شدت کے ساتھ لازم ہو جاتی ہے کہ منظر یا کردار کہیں سے ذرا سا بھی غیر فطری اور غیر حقیقی نظر نہ آنے پائیں اور اگر ایسا نہ ہوا تو یہ ان کرداروں کے ساتھ بھی ظلم ہوگا اور تاریخ کے ساتھ بھی۔ چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ واقعہ کر بلا کو مرثیہ کی زبان سے بیان کرنے والے شعراء نے حتی الامکان یہ کوشش کی ہے کہ ان کی جنبش قلم سے نہ تو کہیں تاریخ کی واقعیت مجروح ہو اور نہ کرداروں کی حیثیت، مقام اور فطرت۔“

یہ حقیقت ہے کہ ادب کی دنیا واقعہ کو بیان کرنے میں انیس کے قدرت کلام کا لوہا مانتی ہے۔ ان کے اس ہنر سے عقل اور تصور حیران رہ جاتے ہیں انیس کے مرثیوں

میں جہاں پیکر تراشی کی گئی ہے وہاں کسی پیکر کی تشکیل میں سب سے اہم کردار ماحول میں فطری انداز وضع قطع اور مکالموں کے لب و لہجے کے عین مطابق مزاج ہونے پر منحصر ہے انیس اس فن کے ماہر ہیں۔

ڈاکٹر نیر نے مضمون میں حضرت عباسؓ، امام حسینؓ، حضرت زینبؓ، بی بی سکینہؓ، زوجہ عباس علمدار سب کے کرداروں اور مکالموں کو انیس نے کس طرح پیش کیا ہے اس کی بڑی خوبصورتی سے تشریح کی ہے اور انیس کی پیکر تراشی کا پورا عمل لفظوں میں بڑے سلیقے سے پروئے کا حق ادا کر دیا ہے۔ خصوصاً حضرت عباس کے کردار پر تمام تر توجہ صرف کر کے بڑی باریک بینی سے کردار کے مختلف پہلوؤں کا جائزہ لے کر انیس نے جیسے اس کردار کو ہو ہو پیش کر دیا ہے لفظوں کا یہ کرشمہ حیرت انگیز ہے لیکن انیس نے یہ کمال دکھایا ہے جسے نیر نے بہت واضح طور پر ایک ایک چیز پر غور کر کے اس کی خوب سے خوب تر تشریح کی ہے۔

”کہانی بیانہ اور انیس“ میں ڈاکٹر نیر نے انیس کے مرثیے ”اے مومنو! کیا صادق الاقرار تھے شیر“ کا تجزیہ پیش کیا ہے اس مرثیے میں حضرت امام حسینؓ ان کی زوجہ حضرت شہر بانو اور شہر بانو کی کنیز شیریں کے سلسلے ہیں جس میں امام حسینؓ شیریں کی آنکھوں کی تعریف کرتے ہیں شہر بانو کا شیریں کو آزاد کر کے امام کی کنیزی میں دینا اور امام کا شیریں کو آزاد کر دینا اور شیریں سے وعدہ کرنا کہ ایک دن ہم لوگ تم سے ملنے آئیں گے۔ اور واقعہ کر بلا گذر نے کے بعد جب حرم کا لٹا ہوا قافلہ شیریں کے قلعہ کے راستے سے گذرا تو نیزے پر سر حسین کا ٹھہر جانا اور اسی مشکل راستے سے شیریں کے قلعے کی طرف گذرنا پھر شیریں کو معلوم ہونا کہ امام حسینؓ کے اہل حرم ہیں اس کے بعد شیریں کا اہل کے بچوں کی دلجوئی کرنا یہ سارے واقعات بڑی ندرت، بڑے سلیقے سے انیس نے لفظوں کی کاریگری سے مرثیہ کے بندوں میں پیش کر دیا جس کی وضاحت ڈاکٹر نیر نے بہت قرینے سے کی

ہے۔ انیس نے بیان اور کہانی، روایت اور تاریخ کو اس طرح پیش کیا ہے کہ کہیں پر بھی روایت نے تاریخ کو مجروح نہیں کیا ہے نہ ہی تاریخ روایت میں گم ہوتی ہوئی نظر آتی ہے۔ انیس نے واقعہ کو کہیں بھی کمزور نہیں ہونے دیا ہے اس بات کو ثابت کرنے کے لیے نیر نے بہت محنت کی ہے اور تمام دلائل کے ساتھ پوری توانائی اور شدت سے انہوں نے انیس کے بیانیہ کہانی اور کرداروں کو سجا سنوار کر پیش کیا ہے یہ ثابت کرنے کے لیے ڈاکٹر نیر کہیں نثر اور کہیں مرثیے سے کام لیتے ہیں۔ مرثیے کی ایک بیت ہے:

”کیا کھانے کو ہم کھائیں کہ دل غم سے بھرا ہے

لاشہ تو ابھی بھائی کا جنگل میں پڑا ہے“

ایک کنبہ کی تباہی کے بعد جہاں بے کفن لاشے جنگل میں پڑے ہیں ان کے حرم کھانا کس طرح کھائیں اور پانی کیونکر پیئیں، منظر کشی لفظوں میں انیس اس طرح کرتے ہیں کہ آنکھوں میں پورا قصہ اترنے لگتا ہے۔

ڈاکٹر نیر نے ثابت کیا ہے کہ انیس کردار کو اس کے کام کی مناسبت سے مزاج اور نفسیات بخشتے ہیں۔

”اسٹیج مکالمہ اور دبیر“ مضمون میں مرزا دبیر کے بے پناہ مرثیے ”قید خانے میں تلاطم ہے کہ ہند آتی ہے۔“ کا تجزیہ کیا ہے یہ دبیر کا معرکہ آرا مرثیہ ہے۔ بلکہ اسے مرزا دبیر کا شاہکار کہا جاتا ہے۔ اس میں ڈاکٹر نیر نے کہانی مکالمہ اور اسٹیج کی اہمیت کو بیان کیا ہے اور ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ ان تینوں کی اہمیت مرثیہ کی کامیابی میں کتنی اہم ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ بلاشبہ اگر کہانی تاریخ کی کئی صدیوں کو ایک لمحے میں بیان کرنے کی صلاحیت رکھتی ہے تو اسٹیج بھی کئی صدیوں کو ایک لمحے میں بیان کر سکتا ہے اور مکالمہ کسی بھی کہانی یا اسٹیج کی روح ہوتا ہے مثال کے طور پر مرثیے کی ایک بیت پیش ہے:

”دیکھ اے ہند بہن بھائی کی تقدیر یہ ہے

سر شیر ہوں میں خواہر شبیر یہ ہے“

ڈاکٹر نیر بیان کرتے ہیں کہ:

”مرثیہ اپنے اختتام کو پہنچ رہا ہے ڈرامے کا اصل مقصد ایک

حزینہ فضا قائم کرنا ہے سو ڈرامہ کامیابی سے اپنی آخری حدود کو چھو رہا ہے

اور یہ کامیابی دبیر کے اسٹیج اور مکالمے کی بنیاد پر قائم ہوتی ہے۔“

جدید مرثیہ نگاری کی تاریخ میں جمیل مظہری ایک اہم ستون کی حیثیت رکھتے ہیں انہوں نے اپنے مرثیوں میں قوم کو رلانے سے زیادہ جگانے پر توجہ دی ہے نیر اپنے لفظوں میں کیا بیان کرتے ہیں دیکھئے:

”عالمی ادب نے ابھی تک کسی زبان کو لفظوں کا وہ سرمایہ عطا

ہی نہیں کیا جو دنیا کے سامنے حضرت زینب کے کردار کی مکمل تصویر پیش

کر سکے۔ صاحب ذوالفقار کی بیٹی زینب جس نے اپنے خطبوں سے

ذوالفقار کا کام لے لیا۔ ملکہ تطہیر کی لاڈلی زینب جس نے اپنی بے

ردائی سے آیہ تطہیر کی لاج رکھ لی۔“

مرثیہ شام غریباں میں جمیل مظہری نے حضرت زینب کے کردار کی مضبوطی اور عمل پیہم اور طوفانوں سے ٹکرانے والی ہمت کا ذکر کیا ہے اسے بیان کرنے میں ڈاکٹر نیر نے پوری طرح سے انصاف کیا ہے اور تفصیل کے ساتھ اس کا تجزیہ کیا ہے۔

”آنسو تلوار اور کر بلا“ اس عنوان سے ڈاکٹر نیر نے نسیم امروہوی کے مرثیہ ”عابد بیمار“ کا تجزیہ کرتے ہوئے لکھا ہے کہ کر بلا خون اور اشکوں کی لکھی ہوئی کہانی ہے یہ عظیم سانحہ آنسو اور تلوار دونوں کو اپنے دامن میں سمیٹے ہے اس میں پہلے تلوار کا معرکہ ہوا پھر اشکوں نے اپنا اثر پیش کیا۔ عابد بیمار نے اپنے پورے خاندان کی شہادت خیموں کی

تاراجی اور خود اپنی اسیری کے باوجود عزم و حوصلہ اور جرأت و استقامت کی روشن علامت بن کر دکھایا۔ مرثیہ کے دو مصرعے دیکھئے:

عمیاں تھے رخ سے وہ غنیض و جلال کے آثار
کہ جیسے قبر پیمر پہ حیدر کرار
ڈاکٹر نیر اسے اس طرح پیش کرتے ہیں:

”عابد بیمار کے اسی عزم و استقامت کی پیکر تراشی کرتے ہوئے نسیم امر و ہوی کا مرثیہ آگے بڑھتا ہے۔ کربلا اور شام کے بعد ایک بار پھر مدینہ نبوی میں یزید کے ظلم اور بربریت کی تصویریں واقعہ حرہ کی شکل میں ظاہر ہوتی ہیں۔ لیکن تاریخ کی آنکھوں کو یہاں بھی عابد بیمار کے پائے استقلال میں ذرا سی بھی جنبش نظر نہیں آئی۔“

ڈاکٹر نیر نے اس مرثیے کے بیان اور مقصد کی گرہیں دھیرے دھیرے کھولی ہیں اور بہت واضح طور پر ثابت کیا ہے کہ تلوار سے آنسوؤں کی طاقت کہیں کم نہیں ہے۔ شہادت امام حسین اور ان کے ساتھیوں کی شہادت میں تلوار کے جوہر تھے وہ تلوار جو ظلم کے خلاف اٹھائی گئی تھی یہ جنگ حق و باطل کی تھی جہاں حق نے باطل کے سامنے سر جھکانے کے بجائے سر کٹا دینے کو اہمیت دی تھی لیکن کربلا کے بعد شام اور حرم کی اسیری معصوموں کے صبر ان کے آنسو اور خاموش احتجاج نے ظلم کو ایسا جواب دیا کہ رہتی دنیا تک مقصد امام حسینؑ کو پھیلا دیا۔

ڈاکٹر نیر نے شہزاد معصومی کی اہمیت اور ان کے لہجے کی خصوصیت، زبان کی روانی، لفظوں کی تلاش اور کلام کی زندہ زبان کا خوب تجزیہ کیا ہے اور ان کے متعلق کافی تفصیل سے لکھا ہے ”سفر معراج اور شہزاد معصومی“ میں لہجے کی تازگی جدت اور انفرادیت کو شہزاد معصومی نے اس طرح پیش کیا ہے کہ حقاری حیرت سے ہر بند کو پڑھنے پر مجبور ہو جاتا

ہے اور ان کے اس پہلو پر ڈاکٹر نیر نے بڑی گہرائی سے نظر ڈالی ہے لفظوں کے انتخاب سلاست، اور روانی کو مرثیہ میں اس طرح پیش کیا ہے کہ غزل کے حسن اور مرثیہ کے حزن دونوں کی آمیزش کا ایسا امتزاج بہت کم کہیں دیکھنے میں آتا ہے۔ واقعہ معراج کی ابتدا سے لے کر کعبہ اور ابراہا کی فوج کشی ابا بیلوں کی منقاروں سے گرنے والی کنکریوں سے فوج کی پسپائی یہ سب مرثیے میں پیش کیا گیا ہے۔ معراج کی انتہا پر دست غیب کا ذکر کرنا پھر حسینؑ کا رسول اللہ کے کاندھے پر سجدے کی حالت میں سوار ہونا اور رسول اللہ کا سجدہ کو طول دینا پھر امام حسینؑ کی شہادت حرم کی بربادی۔ خیموں کا لٹنا، سکیں کو ظالموں کا طمانچہ مارنا، بیمار کو درے لگانا، صبر زینبؑ سب کچھ جیسے کوزے میں سمندر کو سمیٹ دیا گیا ہو۔ مرثیے کو ڈاکٹر نیر نے بہت تفصیل کے ساتھ اور باریک بینی سے بیان کیا ہے۔

اس کے بعد وہ میر کے کلام میں جو کربلا کی علامتیں نظر آتی ہیں ان پر غور کرتے ہوئے بہت سے اشعار کا انتخاب کرتے ہیں۔ انہوں نے بہت لکھا بھی ہے شعر بھی جمع کئے ہیں ہم ایک شعر یہاں پیش کرتے ہیں۔

”اس دشت میں اسے سیل سنبھل کر ہی قدم رکھ
ہر سمت کو یاں دفن میری تشنہ لبی ہے“

اسی طرح ڈاکٹر نیر غالب کے کلام میں جو استعارے کربلا سے متعلق انہیں تلاش کرتے ہیں ان میں یہاں صرف ایک شعر پیش ہے کہ:

”ہوتا ہے نہاں گرد میں صحرا مرے ہوتے
گھستا ہے جہیں خاک پہ دریا مرے آگے“

اسی طرح وہ علی سردار جعفری کے کلام میں کربلا کو تلاش کرتے ہیں اور بڑی تفصیل سے نظموں اور غزلوں کے اشعار میں کربلا کے استعارے و علامات پیش کرتے ہیں۔

علی سردار جعفری ترقی پسند شعرا میں بہت اہم شاعر تھے وہ اپنے عصری مسائل کو

بھی شعر میں پیش کرتے ہیں جنہیں ڈاکٹر نیر نے تلاش کر کے اپنی کتاب میں پیش کیا ہے اور بھرپور روشنی ڈالی ہے۔ بہت سا کلام ہے جسے ہم رثائی تنقید میں تفصیل سے پڑھ سکتے ہیں۔

اس کے بعد وہ عرفان صدیقی کی شاعری پر علامات کر بلا کے حوالے سے کام کرتے ہیں۔

ہم تہی دستوں کے ہاتھوں میں نہ چادر ہے نہ خاک
بیبیوں تم نے کس امید پر سر کھولا ہے
ڈاکٹر نیر کہتے ہیں کہ:

”نئی شاعری میں عرفان صدیقی کی شناخت علامات کر بلا کے تخلیقی رجحان سے قائم ہوتی ہے۔“

عرفان صدیقی کی شاعری میں علامات کر بلا کا استعمال ہمارے عہد کے کرب کو نمایاں کرتا ہے۔ ڈاکٹر نیر نے اس طرح ان شعرا کے کلام میں واضح یا کم واضح طور پر کر بلا کے استعارے علامتیں وغیرہ کی تلاش خوب کی ہے۔

موازنہ انیس و دیر ایسا موضوع ہے جس پر بہت کام ہو چکا ہے اور اتنا لکھا گیا ہے کہ کوئی نئی بات بہت مشکل سے کہی جاسکتی ہے تو اس سلسلے میں کام کرنا ایک کوشش ہے اس میں کچھ لکھنے کی لیکن شبلی نعمانی نے موازنہ نہیں کیا ہے بلکہ میر انیس کے شعری امتیازات کو واضح کیا ہے اور اس کوشش میں وہ کہاں تک کامیاب ہیں یہ پڑھنے والوں کو خود ہی معلوم ہو جائے گا۔

پروفیسر فضل امام نے بحیثیت انیس شناس بہت بڑے پیمانے پر کام کیا ہے اور اردو ادب کو سرمائے کے طور پر بہت کچھ سونپا ہے۔ انہوں نے انیس کے فن کو ادبی معیاروں پر جانچا پرکھا ہے اہل ادب ان کی انیس شناسی سے بخوبی واقف ہیں جو

سرمایہ انہوں نے ادب کو سونپا ہے اس کی افادیت کو ڈاکٹر نیر نے تفصیل سے تجزیہ کر کے تحریر کیا ہے۔

آخر میں عصمت چغتائی کے ”ایک قطرہ خون“ پر جو کہ عصمت چغتائی نے انیس کے مرثیوں سے متاثر ہو کر تخلیق کیا ہے اور جس میں صاف صاف انیس کے مرثیوں کی جھلک اور بازگشت سنائی دیتی ہے اس میں انیس کے مرثیوں کے استعارے اور علامتیں جا بجا نظر آتی ہیں۔ کہانی کر بلا کے پیش نظر ہے اس لئے اس میں کیفیت بھی ہے اور بیان بھی ہے انہوں نے ناول کی شکل میں انیس کے مرثیوں کو پیش کر دیا ہے۔

ڈاکٹر نیر نے ایک نئے طریقے سے اس مضمون میں یہ واضح کیا ہے کہ ”ایک قطرہ خون“ کو ایک نئے زاویہ نظر سے دیکھا جائے تو مختلف جہات سے اس پر سوچنے کی ضرورت نظر آتی ہے۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ عباس رضا نیر نے رثائی تنقید میں بڑی محنت سے باریک بینی سے تفصیل کے ساتھ تشریح کی ہے جس میں ڈاکٹر نیر کے گہرے مشاہدے کا بھی دخل ہے، ان کی گہری فکر اور ادراک کا بھی حصہ ہے اور تجزیہ کرنے کی ان کی صلاحیت اور تنقیدی نگاہ کا استعمال کر کے انہوں نے خوب سے خوب تر کی تلاش کرنے کی کوشش کی ہے اور ان مضامین میں ایسا لطف، ایسی پیکر تراشی کا تجزیہ منظر نگاری، کردار نگاری، مکالمات کا جادو پیش کیا ہے جو انیس کا خاصہ ہے اسی لیے یہ کتاب ”رثائی تنقیدیں“ ڈاکٹر نیر کی ایسی تخلیق بن گئی ہے جسے پڑھنے میں انسان ڈوب جاتا ہے اور متعدد مرتبہ پڑھنے پر مجبور ہو جاتا ہے۔

ڈاکٹر عباس رضانیر کی ”رثائی تنقیدیں“ ایک اہم کتاب

ایچ۔ ایم۔ یسین

مرثیہ نظم کی وہ قسم ہے جو کسی کی وفات کا غم اور مرنے والے کی خوبیاں یا اوصاف بیان کرے۔ مرثیہ ہمارے یہاں دراصل خاص طور پر شہدائے کربلا کی شہادت کے ذکر کو کہتے ہیں۔ ہر چند کہ مرثیے اس کے علاوہ بھی لکھے گئے ہیں جیسا کہ مرثیہ حالی، مرثیہ غالب وغیرہ۔ مرثیہ کی ہیئت کے لیے مسدس کو مخصوص کر دیا گیا ہے۔ اردو ادب میں انیس اور دبیر نے مرثیہ کے میدان میں بہت نام پیدا کیا ہے۔ انہوں نے اپنے مرثیوں میں محاورات، حسن بیان، مناظر قدرت بہت فصیح و بلیغ انداز میں پیش کئے ہیں، جو کربلا کے گرد گھومتے ہیں۔

واقعہ کربلا کا قوم مسلم سے ایک اٹوٹ رشتہ ہے۔ حضورؐ سے محبت اور عقیدت رکھنے والوں پر لازم ہے کہ وہ اہلبیت سے بھی وہی سلوک اور احترام روا رکھیں جو ان کا حق ہے اور ایسے میں وہ لوگ جو ان کے قریب تر ہیں، کسی بھی فروعی بیر سے ان کے غم کو اپنا غم اور ان کی خوشی کو اپنی خوشی نہ سمجھنا نادانی ہی تو ہے۔ اردو کی صنف سخن مرثیہ کربلا کے بہتر شہیدوں کے غم کے اظہار کا ہی طریقہ ہے اور یہ انسانی رشتوں سے وابستگی کی ایک مثال ہے۔ یہ صفت بھی دوسرے اصناف سخن کی طرح انسان اور انسان دوست نیز انسانیت

سے اپنا رشتہ کا عدم نہیں کر سکتی، اس لیے واقعہ کربلا براہ راست مرثیہ کا موضوع بنا ہوا ہے اور اس کی تعدیل فی زمانہ اردو نثر و نظم دونوں میں نظر آتی ہے۔ شعر کا اثر چونکہ نثر سے زیادہ ہوتا ہے اس کی غنائیت اور ”ردم“ انسانی احساسات و جذبات کو جلد متاثر کرتی ہے، اس لیے مرثیہ اور اس میں بیان کردہ واقعات انسانی آنکھ کو جلد اور زیادہ غم کرتے ہیں اور یہ آنسو جس قدر جلد اور زیادہ ہوں گے مرثیہ اتنا ہی اثر انگیز اور بہترین مانا جائے گا۔

عباس رضانیر صاحب اردو دنیا کے جانے مانے استاد ہیں۔ وہ لکھنؤ یونیورسٹی میں شعبہ اردو کے صدر ہیں۔ اردو کے موقر اخباروں میں شائع ہوتے ہیں اور قومی اور بین الاقوامی سمیناروں میں بطور استاد ان کی شرکت ہوتی ہے۔ جہاں وہ اپنے مضامین، اردو ادباء و شعرا کے سامنے پیش کرتے ہیں۔ اور اپنی صلاحیتوں اور قابلیت سے پسند بھی کئے جاتے ہیں۔ نیر صاحب جب کبھی نظامت کی ضمام اپنے ہاتھوں میں سنبھالتے ہیں، وہ شعری نشستیں ہوں یا دیگر جلسے، مجالس ہوں یا خالص ادبی یا ثقافتی فنکشن، ان کے الفاظ کا ربط و ضبط، برجستگی، خداداد یادداشت کا جلوہ اور موزوں و بر محل اشعار کی پیشکش حاضرین محفل کو سردھننے پر مجبور کر دیتی ہے اور اس طور پر نظامت کا حق پوری طرح ادا ہو جاتا ہے۔ تنقید کے میدان میں بھی ان کی استادی اور علمیت ایسے ہی گل کھلاتی ہے، جس کا لوہا بڑے بڑے استاد مانتے ہیں۔ خدا نے ان کو جو گویائی عطا کی ہے وہ نطق اعلیٰ پر محمول کی جاسکتی ہے۔ زیر نظر کتاب ”رثائی تنقیدیں“ میں انہوں نے ایسا ہی تجزیہ کیا ہے اور ان کے بقول ہماری نئی غزل کا بڑا حصہ آج مرثیہ کی لفظیات لے کر کھڑا ہوتا نظر آتا ہے۔ قاری کے لیے ان کی تحریروں سے لطف لینے کی جملہ وجوہات کے علاوہ یہ بات بھی پیش نظر رہتی ہے کہ وہ جس موضوع پر قلم اٹھاتے ہیں اس میں کوئی پہلو چھوٹا نظر نہیں آتا۔ وہ سارے نکات و جہات کا احاطہ کیے بغیر نہیں رہتے۔ ان کی تحریروں میں بھی ہوتی ہے، سلیس اور عام فہم بھی۔ نہ کہیں کوئی جھول ہوتا ہے نہ کوئی ابہام۔

دیگر اصناف کی طرح مرثیہ میں بھی عصری تقاضوں کے ساتھ تبدیل ہونے کی گنجائش ہے اور اسی لیے یہ بھی عصری معنویتوں کے ساتھ بدلا ہے۔ ڈاکٹر نیر کا تعلیمی ذوق اور طالب علمانہ جستجو ان کو کسی بھی مضمون کا سطحی مطالعہ نہیں کرنے دیتی بلکہ اس کی گہرائی میں اتر کر وہ کوئی نہ کوئی جہت تلاش کر کے آپ کے سامنے ایسے پیش کرتے ہیں کہ آپ اس سے بغیر چونکے اور بغیر لطف لیے نہیں رہ سکتے۔ سانحہ کربلا مختلف النوع پس منظر پر محیط ہے اور مختلف شعراء نے اس کو مختلف انداز میں بیان کیا ہے۔ کسی نے بہت پر اثر انداز میں بات کی تو کسی نے علامات و استعارات کی معنویت سے لبریز۔ غرض کہ ڈاکٹر عباس رضانیر نے ”رثائی تنقیدیں“ میں مرثیہ کیے دس امن سے ٹپکے آنسو سب کو بانٹے ہیں۔

”پیکر تراشی اور انیس“ میں نیر صاحب نے جو مواد پیش کیا ہے اس نے معلومات میں اضافہ کے علاوہ اپنی واقعات نگاری سے حقیقی ماحول کو انجان لوگوں تک پہنچانے کا کام کیا ہے۔ بلاشبہ ہر چیز کو اس کے فطری انداز میں پیش کرنا انیس ہی کا حصہ ہے۔ انیس کے مرثیوں میں ہر کردار کی گفتگو اس کے مزاج کے مطابق ہی ہوتی ہے۔ ڈاکٹر موصوف نے میر انیس کی پیکر تراشی کا نہایت مفصل اور مدلل بیان پیش کیا ہے جو پڑھنے سے تعلق رکھتا ہے۔ انیس کی منظر نگاری کی قدرت اور پیکر تراشی عظیم سے عظیم شاعر کومات کرتی نظر آتی ہے کیونکہ یہ فطری اور حقیقی منظر نگاری ہے۔

”کہانی، بیانیہ اور انیس“ کے ضمن میں بھی نیر صاحب نے کہانی کے فن پر جو روشنی ڈالی ہے اس میں فرضی کہانی اور تاریخی کہانی کے افتراق کو بیان کرتے ہوئے کہانی کار کے تخیل کے پروں پر جو قدغن تاریخی واقعات کے مجروح کرنے پر لگائی ہے وہ اس واقعہ کے مزاج، کیفیت اور محل کے خلاف نہ ہونے کے مترادف ہے۔ بلاشبہ کربلا کا تاریخی واقعہ کہانی کا ایک شاہکار ہے اور میر انیس کا کہانی کے فن کو عظمت و اعتبار کی اونچائیوں تک پہنچانا فقید المثال ہے۔ انہوں نے حسین کے صادق الاقرار

ہونے کا مرثیہ بغیر کسی مبالغے کے تاریخی واقفیت کو دلیل بنا کر حسین کے مزاج ایفاء عہد کو ظاہر کیا ہے۔

حضرت شہر بانو کی کنیز شیریں کا واقعہ آزادی اور اس کے رخصت ہوتے وقت کسی دن اس کے یہاں مہمان ہونے کا حضرت حسین کا وعدہ اور پھر کس انداز سے اس کے ایفاء میں آپ کے صادق الاقرار ہونے کا جو منظر انیس نے پیش کیا ہے اس کا تاثر مجھ جیسے رقیق القلب شخص پر نیر صاحب کی رثائی تنقیدیں میں پڑھ کر بہت ہوتا ہے۔ مجھے یہ بات قطعی سمجھ میں آ جاتی ہے کہ جب مجالس میں مرثیہ خواں اپنے سوز و بیان سے کسی شاعر کا بھی مرثیہ پڑھتا ہوگا تو آنسوؤں کا باندھ یقیناً ٹوٹا ہوگا۔ انیس کی زبانی شیریں کے تاثرات کا پورا بیان حزن و ملال کی کیفیت اور حسین کے وعدہ کے انتظار اور شوق، انتظار کی اضطرابی کیفیت کے ساتھ بند جو یہاں طوالت کے پیش نظر تحریر نہیں کئے جا رہے ہیں۔ پڑھنے سے تعلق رکھتے ہیں۔ اس طرح حسین کے سربریدہ سر سے ادا کرائے گئے مکالمے کے مصرعہ مرثیہ ”اے مومنو! کیا صادق الاقرار تھے شبیر“ ایک طرف انیس کے کمال فن کی غمازی کرتے ہیں تو دوسری طرف صاحب کتاب محترم نیر صاحب کا طرز بیان اور اس پورے مرثیہ پر اظہار خیال ان کے قلم پر دسترس کی بھرپور غمازی کرتے ہیں۔ اس پورے مرثیہ کا تجزیہ جس خوبی سے نیر صاحب نے کیا ہے وہ ان ہی کا حصہ ہے۔ وہ حضرت زینب سے بہت متاثر نظر آتے ہیں۔ ہمیں ان کی اس بات پر یقین کرنا پڑے گا کہ حضرت زینب کے مکمل کردار کی تصویر الفاظ میں بیان نہیں کی جاسکتی۔ وہ دیکھنے اور پرکھنے کی چیز ہے۔

نیر صاحب ہمیں یہاں حضرت زینب کے تین کردار سے روشناس کراتے ہیں۔ ”ایک بھائی کی حمیت میں لمحہ لہو اضطراب و اضطراب دوسرا ماں کا بیٹوں کو شہادت کے لیے آمادہ کرنا اور تیسرا بھتیجے کی بے کسی میں نصرت کا عصا بنتی ہوئی پھوپھی اور پھر عصر

یہ وہ صدا ہے جسے قتل کر نہیں سکتے

پروفیسر جمال نصرت

زیر نظر کتاب ”رثائی تنقیدیں“ کے مصنف ڈاکٹر عباس رضانیر ہیں۔ یہ کسی اور کے نہیں شعبہ اردو کے صدر ہیں اور کہیں اور کے نہیں بلکہ لکھنؤ یونیورسٹی کے ہیں۔ لکھنؤ جو تمام عالم میں اردو کی خوبیاں گنوانے کی دلیل بھی ہے اور وکیل بھی ہے۔ میں ایک سائنس اور انجینئرنگ کا طالب علم اور معمولی اردو جانتا ہوں میرا دخل بس اتنا ہے کہ سائنس کے اور کلام پاک کے تعلق سے چند مضامین لکھے ہیں وہ بھی ملازمت سے رٹائر ہونے کے بعد مرثیہ جیسے اہم موضوع پر میں بالکل ناموزوں ہوں۔

مرثیہ تو غم و الم کا باسلیقہ بیان ہے۔ اس میں نظم زیادہ موثر ہے۔ کوئی واقعہ یا بات بری ہوتی ہے، نامناسب ہوتی ہے کبھی دکھ بھری یا تکلیف دہ، کبھی اس میں افسردگی، کبھی غمی، کبھی دل شکن، کبھی اندوہناک، کبھی المناک، کبھی سانحہ ہے اور کبھی روح فرسایا اس سے بھی آگے۔ ہر ایک کی مثالیں دیگر ہوں گی لیکن پنسل کا ٹوٹنا یا کھونا ایک سانحہ کبھی نہیں ہوگا اور کسی عزیز کا گذرنا کبھی برائیا نامناسب نہ ہوگا۔ لفظ کا سلیقہ سے چننا ضروری ہے۔

کسی واقعہ کے بیان کے لیے قرینے سے، سلیقے سے، لے سے، قدرت کلامی سے، اپنائیت سے، خلوص سے ادا ہو تو یہ بات ہے ورنہ خبر۔ اسی کہنے میں بصیرت اور شعور بھی اگر ہوگا تو اس میں خوبیاں ضرور ہوں گی۔ بس شرط یہ ہے کہ کون کہہ رہا ہے اور کیا کہہ

عاشور کے بعد تاریخی خیام، بیمار اور لاغر بھتیجے کو جلتے ہوئے خیموں سے باہر لاتی ہیں، بخار میں مبتلا امام کو مشورہ دیتی اور شام غریباں کی ہولناکیوں میں تپیموں اور بیواؤں کی دل جوئی کرتی، بے ردا اور اسیر زینب کی ان صفات سے ہمارے دلوں کو آزرہ کرتا بیان محترم ڈاکٹر عباس رضانیر صاحب کے جادوئی رواں دواں اور تیز رولم کا ہنر نہیں تو پھر اور کیا ہے۔ زینب کی قوت اور حوصلہ کا اندازہ اس امر سے لگایا جاسکتا ہے کہ شام غریباں اور اسیری کے عالم میں یزید کے دربار میں ان کا تیز و تند احتجاج اور شام کے قید خانے میں بجائے احتجاج کے تبلیغی لہجہ ان کے موثر ترین تیور کی شاندار مثال ہے، انہوں نے دربار شام میں جو انقلاب آفریں خطبہ دیا وہ حق پسند اور احتجاج رہتی دنیا تک ناسازگار حالات سے نبرد آزما رہنے کا سبق دیتا رہے گا۔

اسی طرح اسٹیج مکالمہ اور دیر مرثیہ کا تجزیہ، جمیل مظہری کا مرثیہ شام غریباں، نسیم امروہوی کے مرثیہ عابد بیمار، سفر معراج اور شہزاد معصومی مخصوص مرثیہ کا تجزیہ، میر کی غزلوں میں علامات کربلا، غالب کی غزلوں میں استعارات کربلا یا علی سردار جعفری کی نظموں میں علامات کربلا، مطالعہ مرثیہ کی خشت اول، موازنہ انیس و دیر، پروفیسر فضل امام بحیثیت انیس شناس یا ایک قطرہ خون ایک جائزہ۔“ پر نیر صاحب کے سحر انگیز بیان کو جتنا میں وقت کی قلت اور ناسازی طبیعت کے باوجود پڑھ سکا، اس سے یہ نتیجہ اخذ کیا کہ ڈاکٹر موصوف کی رثائی تنقیدیں ان کے وسیع مطالعہ، عالمانہ صلاحیت، گیرائی اور گہرائی تک پہنچنے کی جستجو اور تنقید کی انصاف پسندی کا قابل قدر نمونہ ہے۔ اردو ادب میں ان کی کتابیں انشاء اللہ ان کو ضرور ایک الگ اور بلند مقام حاصل کرائیں گی۔

☆☆☆

رہا ہے یہاں کون۔ میں تو میرا نیس، مرزا دبیر، علامہ شبلی، جمیل مظہری، نسیم امروہوی، شہزاد معصومی، میر، غالب، سردار جعفری، عرفان صدیقی، عصمت چغتائی و فضل امام اور کیا میں۔ حضرت امام حسینؑ کا واقعہ اس پر تنقید جو اصولی بھی ہے اور عملی بھی ہے اپنے خاص انداز اور اسلوب میں نیر صاحب رقم کر رہے ہیں۔

اس کتاب کو ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس دہلی نے پیش کیا ہے، ۲۲۴ صفحات پر مشتمل ہے قیمت تین سو روپے ہے۔ کمپیوٹر پر بھی موجود ہے۔ کاغذ، کمپوزنگ اور جلد بہت اچھی ہے۔ لکھنؤ، دہلی، پٹنہ، حیدر آباد، ممبئی، کولکاتہ اور الہ آباد سب ہی جگہوں پر دستیاب ہے۔ ابتدائیہ میں مصنف نے دیگر مرثیہ نگاروں پر لکھنے کا کوئی وعدہ نہیں کیا ہے جو کہ ہونا تھا۔ کتاب پر ایک بہت جاذب جائزہ ڈاکٹر منتظر مہدی نے رقم کیا ہے اس سے اس کی افادیت اور بڑھ گئی ہے۔

ایک لفظ آج کل بہت زور پکڑ رہا ہے تقابلی مذہبی اور مذہبوں کا جائزہ۔ یہ کوئی چیز ہو سکتی ہے۔ مگر اسلام میں یہ ہے ہی نہیں۔ یہاں تو دعا مانگنا عبادت ہے، کعبہ کو بس خلوص اور محبت سے دیکھنا بھی عبادت ہے، رسول اللہ اور اہل بیتؑ کو یاد کرنا اور ان کی چھوٹی چھوٹی خوبیوں پر عمل کرنا، ذکر کرنا، دہرانا، ان کی قربانیوں کو یاد کرنا بھی عبادت ہے۔

ڈاکٹر نیر نے بڑی ہی خوبصورتی، لیاقت اور کامیابی کے ساتھ یہ ثابت کیا ہے کہ مرثیے میں بہت سی عبادتی خوبیاں ہیں اور چند اساتذہ مرثیہ نگاروں کی خوبیاں اور ان کے خصوصیت والے اسلوب کی مدد سے زمانے کے سامنے رکھ کر ایک قیمتی خدمت انجام دی گئی ہے۔ یہ بھی ہوا ہے کہ اساتذہ کے بیان میں کوئی درمیانی واقعہ ہونا یقینی سا معلوم ہوتا ہے اسے بیانیہ ہی خوبی بیان سے بالکل ایسا باور کرا دیتا ہے کہ یہ آنکھ کے سامنے گزرا ہوا معلوم دے اور یہ بھی ہوا ہے کہ کسی اہم واقعہ کو بار بار دہرانے کی جگہ صرف اشارہ

کر دیا جائے۔ یہ نیر مصنف کو خوب آتا ہے۔ اس نے بہت باریک بینی سے اپنے مقصد کو ادا کیا ہے۔ یہ اس کی وسیع النظری اور وسیع المطالعے کی کامیاب تصویر ہے۔

میرا نیس کے سلسلے سے دو تنقیدی مضامین ہیں، ایک پیکر تراشی پر اور دوسرا کہانی اور بیانیہ پر۔ جب صف اول کے مرثیہ نگار کا عطا کیا ہوا کام ہو تو ادب اور قرینے سے پڑھنے اور باریکی سمجھنے کی ضرورت بہت ہوتی ہے۔ بات تو اصول اور ضمیر پر ہاتھ نہ دے کر سردینے کی ہے وہ بھی رسول اللہ اور ملیکہ العرب کے ناتی اور شیر خدا و خاتون جنت کے بیٹے کی ہو۔ نیر صاحب نے کیا خوب تشریح فرمائی ہے کہ ”انیس نے جہاں روایت کو تاریخ پر حاوی نہیں ہونے دیا وہیں تاریخ کو تاریخ کی طرح خشک اور بے روح بھی نہیں بننے دیا ہے بلکہ اس میں اپنے بیانیے کی قوت سے کہانی کا حسن پیدا کر دیا ہے۔“ یہ جامہ تحریر دے کر بڑا کرم کیا گیا ہے۔

حضرت مرزا دبیر کے مرثیوں کا ایک خاص زاویہ اس تنقید کا حصہ ہے۔ یہاں تجسس اور پرتو خیال کی خصوصیات کو بڑے سلیقے سے پیش کر کے اس کی خوبیوں کو عام فہم کیا گیا ہے۔ یہاں وہ سب سمجھایا گیا ہے جہاں تک اہل قلم، اہل عقل اور اہل سخن ہی پہنچ پاتے ہیں۔

”قید خانے میں تلاطم ہے کہ ہند آتی ہے“ کو طرح طرح سے بتایا گیا ہے۔ اس کے اہم پہلو تنقید کا جز ہیں۔ زبان، تحریر اور اشارے پڑھ کر بس دعائیں نکلتی ہیں۔ جمیل مظہری کے مرثیہ شام غریباں کی کیا بات کی جائے یہ تو بیانیہ کا عروج ہے جو بی بی زینبؑ سے ادا کرایا گیا ہے۔ نیر صاحب یوں رقم طراز ہیں:-

”صاحب ذوالفقار کی بیٹی زینبؑ جس نے اپنے خطبوں سے ذوالفقار کا کام لے لیا ہے۔ اسلام کے پیغام حریت کی وارث زینبؑ جس نے اپنی بے روائی سے آیہ تطہیر کی لاج رکھ لی۔“

ان کے یہاں بھائی کی محبت میں لمحہ بہ لمحہ اضطراب، بیٹوں کی شہادت اور بھتیجے کی بیکیسی میں نصرت کا عصارہ کرتقید کو جاوداں کر دیا ہے۔ نسیم امر وہوی کے حضرت زین العابدینؑ کے صبر و تحمل کو لکھا ہے اس پر یہ تنقید ہے کہ جو آنسو ہیں وہ سوکھ ہی نہیں سکتے اور یہ روز قیامت تک یوں ہی جاری رہیں گے۔“

نبی سے خلد میں یہ غم تمام کہہ دینا

سکینہ بی بی سے میرا سلام کہہ دینا

اس کے ساتھ یہ اعلان بھی ہے کہ اہل بیت ہرگز مجبور، بے آسرا اور بے سہارا نہیں ہیں ان کے پاس وجاہت، شہادت، شجاعت، منصب و عظمت سب تو ہے جو نصرت کے لیے ضروری ہے۔ یہ بھی واضح ہے کہ امام حسینؑ اور ان سے قبل لکھنویا مجبوری پر تلوار اٹھائی گئی ہے لیکن ان کے بعد کسی بھی امام نے کبھی تلوار نہیں اٹھائی۔

شہزاد معصومی کے ذکر میں حضرت محمد مصطفیٰؐ کے سفر معراج سے لے کر واقعہ کربلا اور بی بی زینبؑ کے بین تک کے واقعہ کو تنقید میں شامل کیا گیا ہے۔ سفر معراج تو دل کی بات ہے دلیل کی مگر کم ہے۔ یہاں ایک خاص نکتے کا بھی ذکر ہے کہ جب باری تعالیٰ کو خود ملاقات کا اشتیاق ہے اور وہ کن فیکون کا مالک ہے تو پھر دلیل بے ضروری ہے۔ تحریر تو خوب ہے ہی لیکن نیر کی تنقید نے اس کے جوہروں سے اور بھی زیادہ آشنا کر دیا ہے۔

میر تقی میر کے سلسلے میں بتایا گیا ہے کہ ان کی تمام زندگی دکھ اور الم سے بھری ہے۔ ان کے یہاں جب کسی جگہ کا ذکر آتا ہے تو وہاں استعارے میں معنی کربلا کے ہوتے ہیں۔

بارِ سجدہ ادا کیا تہہ تیغ

کب سے یہ بوجھ میرے سر پہ تھا

میر کی بات ہی الگ ہے۔ ان کی زندگی اور بیان میں رنج و الم حاوی رہا اور ذکر کربلا تو ان کے شعور میں شامل ہے۔ مصنف کہتا ہے کہ جو گداز اور گداز خستگی ان کے حصے میں آئی وہ کسی دوسرے کو میسر نہ ہوئی۔ یہ بات بتا کر بات تمام کی گئی ہے کیونکہ تنقید اتنے میں ہی واضح اور مکمل ہے۔

مرزا غالب کے لیے پروفیسر نیر کہتے ہیں کہ غزلوں کا استعاراتی نظام اس قدر تہہ دار، معنی خیز اور مکمل ہے کہ وہ واقعہ کربلا شناسی میں اپنے عہد میں ممتاز ہیں جس کی مثال میں یہ شعر:

لکھتے رہے جنوں کی حکایات خونچکاں

ہر چند اس میں ہاتھ ہمارے قلم ہوئے

علی سردار جعفری کی نظموں میں کربلا کے واقعہ کو مصنف نے کتنی بار پڑھا ہے اس کا اندازہ تنقید سے ہوتا ہے اور یہ بھی احساس ہوتا ہے کہ سردار ان کے پسندیدہ شاعر ہیں۔ یہاں ترقی پسندی بھی ہے اور جڑوں سے جڑے رہنے کو بھی ترجیح دی گئی ہے۔ علامات بھی ہیں باریک خیالی اور علمیت کا حرف آخر بھی ہے۔ بس یہ شعر:

کلمہ حق کا اجالا یہ تجلی کا ظہور

یہ لہو میرا لہو تیرا لہو سب کا لہو

عرفان صدیقی کے کلام کے سلسلے میں درج کیا ہے کہ معانی اور مفاہیم کے نئے جہان تلاش کئے ہیں اور کربلا کی لفظیات کو معاصر معنویتوں سے روشناس کرایا گیا ہے۔

مگر اک صدا مسلسل

یہ کہاں سے آرہی ہے

ابھی رات درمیاں ہے

ابھی رات درمیاں ہے

انیس شناس پروفیسر فضل امام کے لیے بتایا گیا ہے کہ فضل امام کی کاوشیں انیس کے فن اور شخصیت پر جو لکھ دیا گیا ہے وہ لفظ آخر نہ ہوتے ہوئے بھی نقطہ آغاز ہمیشہ رہے گا اور اس کی ضرورت بھی ہمیشہ ہی رہے گی۔ یہ ایک ماہر استاد کی طرف سے کام کرنے کا اشارہ بھی ہے۔

عصمت چغتائی کے ناول ”ایک قطرہ خون“ پر تنقید میں لکھتے ہیں کہ ناول میں عصمت چغتائی نے میر انیس کے بتائے ہوئے کرداروں کو ناول میں بڑی خوبی سے پرویا ہے اور آگے ان کا یہ بھی خیال ہے کہ اگر خود میر انیس ان کرداروں کو نثر میں لکھتے تو دشواری ہوتی۔ ایک جگہ مرثیہ کا بیانیہ پروفیسر نیر اس طرح کرتے ہیں:

”کربلا کے صحرا میں نماز صبح ادا ہوتی ہے اور پھر حسین کی جماعت منتشر ہونے لگتی ہے۔ اصحاب و انصار کے بعد قاسم، عباس، علی اکبر حد یہ ہے کہ چھ مہینے کے علی اصغر ایک ایک کر کے شہید ہو جاتے ہیں۔ اب حسین تنہا رہ جاتے ہیں۔“

حضرت امام حسین کی رخصت کا بیان بہت سے مرثیوں میں میر انیس لکھتے ہیں لیکن اس جگہ عصمت چغتائی لکھتی ہیں:

”زینب نے ذوالجناح کی گردن میں بازو حائل کر کے اس کی پیشانی پر بوسہ دیا اور اس کے کان میں کہا: ”ذوالجناح میرے بھائی کا خیال رکھنا“ پھر دونوں ہاتھوں سے منہ چھپا کر دہری ہو گئیں۔ ”خدا تمہارا نگہبان امام نے زیر لب فرمایا اور گھوڑے کو ایڑ لگا دی۔“

اس سے بہتر لکھا ہی نہیں جاسکتا تھا۔ مجھے ایک اور واقعہ بھی یاد آ رہا ہے شاید وہ سب کے مطلب کا ہو۔ مجھے تاریخ تو یاد نہیں بات غالباً ۱۹۷۸ء یا ۱۹۷۹ء کی ہے۔ میری چھوٹی بہن (ڈاکٹر صبیحہ انور) کو یہ ناول بس دو دنوں کے لیے ملی تھی اور

چاہتی تھیں کہ والد صاحب (وجاہت علی سندیلوی صاحب مرحوم) بھی دیکھ لیں اور کچھ پڑھ بھی لیں اس لیے مجھے محکمہ آبپاشی کے دفتر میں فون کیا جہاں میں تعینات تھا۔ ”آج آپ یہ کتاب مجھ سے لے لیں اور کل ضرور واپس لے آئیں۔“ ان دنوں میں روز ہی لکھنؤ سے سندیلہ آتا جاتا تھا۔ میں شام کو بعد مغرب پہنچا اور کتاب دی۔ والد صاحب اسے اسی وقت سے پڑھتے رہے اور دوسرے دن صبح سے ہی پڑھتے رہے یہاں تک کہ مارنگ واک پر بھی نہیں گئے۔ میرے اسٹیشن جانے کے وقت واپس دی اور بتایا کہ میں نے پوری پڑھ لی یہ لا جواب ہے۔ میں اسے کل ہی ریل گاڑی میں شروع کر چکا تھا اور پھر آج کے سفر میں پڑھتا رہا۔ اس میں اتنا ڈوبا کہ دفتر جانے کے بجائے ریلوے اسٹیشن لکھنؤ پر ہی بیٹھ کر شام تک پوری ختم کر ڈالی اور صبح کو واپس دے آیا اور کہا کہ جو کام آج کیا ہے وہ کبھی نہیں کیا تھا۔ جلدی سے ایک جلد مجھے بھی منگوادو۔

نیر صاحب نے لکھا ہے کہ عصمت کا مقصد تھا کہ ظلم و جبر کے خلاف صدائے احتجاج بلند کر سکیں اس میں وہ پوری طرح کامیاب ہیں۔

نیر صاحب ایک تو خود اپنے آپ میں پوری طرح کتاب ہیں اور پھر ان کی کتاب ”رثائی تنقیدی“ بھی ہر طرح سے مکمل ہے یعنی اس میں بی بی زینب کی تقریر بھی ہے، واقعہ جنگ بھی، علم اور نہر بھی، عابد بیمار کا صبر بھی جناب شیریں کے یہاں قیام بھی۔ بڑی حد تک کتاب با تفصیل بھی ہے اور ذہنی نقوش کے اعتبار سے تصویر بھی ہے۔ بس میں اپنی رائے میں ڈاکٹر عباس رضانی اور کتاب ”رثائی تنقیدی“ پر یہ جملہ کہوں گا۔

جو کچھ بھی ہے خدا کی قسم کامیاب ہے!

☆☆☆

ادیب عصر نیر جلال پوری کی ادبی پرواز اور حب الوطنی

مہدی حسن واعظ جلال پوری

نقد و تبصرہ ہر ایک کے بس کی بات نہیں ہے۔ وہ بھی ”رثائی تنقیدیں“ پر۔ دراصل شاعری کی جملہ اصنافِ سخن میں مرثیہ سب سے جداگانہ حیثیت کی حامل صنف ہے مگر ڈاکٹر عباس رضا نیر جلال پوری کی ”رثائی تنقیدیں“ کا مطالعہ کرنے کے بعد یہ لکھنے میں کوئی باک محسوس نہیں کرتا کہ یہ کتاب ان کے وسیع تر مطالعہ کا ثبوت بھی ہے اور ادب پر مکمل عبور کی گواہ بھی ہے۔

عزیزم نیر کے یہاں خودی ہے مگر ایسی نہیں جو فریب ہو بلکہ ایسی خودی جو عزت نفس کی محافظ ہو۔ بقول جمیل مظہری:

بقدر پیمانہ تنخیل سرور ہر اک میں ہے خودی کا

اگر نہ ہو یہ فریب پیہم تو دم نکل جائے آدمی کا

نیر تارنِ ولادت کی مجبوری کے سبب مجھ سے بہت چھوٹے ہیں مگر یہ بھی سچائی ہے کہ:

زندگی کو دیکھ میزانِ عمل میں تول کر

ناپنے بیٹھا ہے کیا پیمانہ ایام سے

اس کم عمری میں مقبول خطابت، پرکشش نظامت، مقناطیسی تحریر، شہرت،

منصب، عزت غرض کہ ہمہ جہات ترقی ان کی قدم بوسی کر رہی ہے۔

بعض افراد دفعتاً ترقی اور کمال کے زینوں کو طے تو کر لیتے ہیں مگر بہت جلد تنزلی کے گڈھے میں گر جاتے ہیں کہ جہاں سے پھر ان کا ابھرنا بڑا مشکل ہوتا ہے۔

بلندیوں پہ پہنچنا کوئی کمال نہیں

بلندیوں پہ ٹھہرنا کمال ہوتا ہے

شاید یہ حسد و تکبر اور دیگر ذاتی کر توت کا نتیجہ ہوتا ہے۔ نیر بلندیوں پر صرف ٹھہرے ہی نہیں ہیں بلکہ مزید کمال کے مراحل و منازل کو طے کرتے جا رہے ہیں۔

البتہ نیر کی کچھ کمیاں ضرور ہیں یعنی حسد سے بہت دوری، غرور سے پرہیز، انانیت سے نفرت اور خود ستائی میں بالکل صفر ہیں۔ ان میں یہ کمیاں مجھے پسند ہیں۔

ڈاکٹر نیر جلال پوری کی حب الوطنی کی بات کی جائے تو لفظ وطن میں خود ایک کشش اور جاذبیت ہے۔ وطن سے محبت فطری ہے۔ آنحضرت نے ارشاد فرمایا:

”حب الوطن من الایمان“ وطن کی محبت جزو ایمان ہے۔

ایک فارسی شاعر نے کہا:

حب الوطن از ملک سلیمان خوشتر

خارِ وطن از سنبل وریحان خوشتر

یعنی وطن اور اس کی محبت سلیمان کے ملک سے فزوں تر ہے۔ اور وطن کا خار بھی سنبل وریحان سے بہتر ہے۔

ایک شاعر کی فکر ہے:

وہ پھول سرچڑھا جو چمن سے نکل گیا

عزت اسے ملی جو وطن سے نکل گیا

سرچڑھنے کے لیے پھول کی شرط ہے جو چمن میں خار ہے وہ چمن سے نکل کر خار ہی رہے گا۔ پھول نہیں بنے گا۔ بس اسی طرح عزت اسی کو ملتی ہے جس کی وطن میں بھی عزت و توقیر ہو۔
بقول وسیم بریلوی:

جہاں رہے گا وہیں روشنی لٹائے گا
کسی چراغ کا اپنا مکاں نہیں ہوتا

مولائے کائنات کا ارشاد ہے کہ فقد الاحبة غربۃ۔ وطن مسافرت ہے اس کے لیے جس کے وطن میں دوست نہ ہوں۔

کسی دشمن کا آبائی مکان جس جگہ ہوا سے وطن کہتے ہیں البتہ اگر کوئی چھ ماہ قیام کرے اور ملازمت کی وجہ سے بود و باش ہو تو اسے وطن ثانی کہتے ہیں۔ کسی شہر میں پیدا ہونے سے وہ شہر اس بچہ کا وطن بنتا ہے بلکہ اس کا وطن وہی ہے جو اس کے والدین کا ہے۔ رسول خدا کا وطن مکہ تھا اس لیے کہ مکہ ہی میں رسول کا آبائی مکان تھا اور اسی شہر مکہ میں رسول پیدا ہوئے لیکن جب رسول نے اپنے وطن سے مدینہ کی طرف ہجرت فرمائی اور مدینہ میں رہنے لگے تو وطن کو بے حد یاد کرتے تھے۔ چنانچہ جب کوئی مکہ کا رہنے والا مدینہ آتا تو نبی وطن کے موضوع پر خوب گفتگو فرماتے۔

نبی نے جب اپنا وطن چھوڑا اور مدینہ کی طرف روانہ ہوئے تو وطن کو چھوٹنے کا اس قدر کرب تھا کہ وطن کا رخ کر کے فرمایا اے زمین مکہ خدا جانتا ہے کہ میں تجھ سے بہت محبت کرتا ہوں اگر مجھے مجبور نہ کیا جاتا تو میں کبھی وطن نہ چھوڑتا۔

اے شہر مکہ میں تیری جدائی پر غمگین ہوں۔ چنانچہ وطن کی جدائی کے غم کو فرو کرنے کے لیے خدا نے آیت ناول فرمائی۔ ”إِنَّ الَّذِي فَرَضَ عَلَيْكَ الْقُرْآنَ لَرَأْدُكَ إِلَيَّ مَعَادٍ“ (سورہ قصص/۸۵) اے رسول جس خدا نے تم پر قرآن نازل کیا

تم کو ضرور تمہارے وطن کی طرف لوٹائے گا۔ یہ اشارہ ہے فتح مکہ کے موقع پر جب ۸ ہجری میں رسول مدینہ سے اپنے وطن مکہ تشریف لائے۔

وطن کے مفہوم عام کے اعتبار سے انسان کا اپنا ملک بھی وطن ہے چنانچہ ملکی باشندوں کو ہم وطن کہا جاتا ہے۔ علامہ اقبال نے کہا:

مذہب نہیں سکھاتا آپس میں بیر رکھنا
ہندی ہیں ہم وطن ہیں ہندوستان ہمارا

بجاء اللہ میرا اپنا عزیز وطن جلال پور جملہ خوبیوں اور کمالات سے آراستہ ہے۔ انجمنہائے ماتمی کی کارکردگی، علم و عمل، مجلس و ماتم، باہمی خیر خواہی، اتحاد، صوم و صلوة کی پابندی حج و زیارات کی ادائیگی غرض کہ ہر جہت سے خوبیاں ہی خوبیاں ہیں۔

البتہ شاید مستقل وطن میں رہنے والوں کو وطن کی اچھائیوں کا احساس زیادہ نہ ہوتا ہو بالکل ایسے ہی جیسے کوئی عطار عطر خانہ میں مستقل رہے تو خوشبو کا احساس کم ہو جاتا ہے۔
شکراً للہ کہ مرے وطن کا ماضی بھی نہایت تابناک ہے۔

شعر و شاعری کے حوالے سے مولانا حکیم انصار حسین کیف، ماسٹر انصار حسین انصار، ظفر حسین ظفر، اعجاز حسین معجز، منشی اکبر علی اکبر وغیرہ کے نام قابل ذکر ہیں۔

اسی طرح علماء کرام میں مولانا غلام حسنین نجفی، مولانا نجف علی، مولانا حسین علی، مولانا شبیر الحسن، مولانا حسن رضا، مولانا علی رضا طاب ثراہم کے خدمات ناقابل فراموش ہیں۔ اور اب فی زمانہ آبروئے وطن ڈاکٹر عباس رضا نیر جلاپوری صدر شعبہ اردو لکھنؤ یونیورسٹی اپنی گونا گوں خصوصیات و کارکردگی شہرت و عزت سے وطن کا نام روشن کر رہے ہیں۔

نیر کو اپنے وطن سے عقیدت و محبت میری طرح جنوں کی حد تک ہے جس کا میں گواہ ہوں۔ اہل وطن بھی نیر کو بہت چاہتے تھے اور چاہتے ہیں۔

میرے اور نیر کے درمیان سن و سال کا فاصلہ زیادہ ہونے کے سبب ان کا بچپن

میرے سامنے گذرا نیر نانا کے گھر ہی رہتے تھے جس کے جوار میں ہمارا پرانا مکان ہے یوں نیر سے ہمارا رابطہ و سابقہ بچپن سے تھا۔

بچپن ہی میں ان کی زیر کی ذہانت اور حاضر جوابی کے پیش نظر ارباب نظر پیشین گوئی کر چکے تھے کہ یہ بچہ مستقبل میں وطن کا نام روشن کرے گا۔

نیر کوئی ۶-۷ سال کے ہوں گے کہ کسی نے کہا بیٹا تم ہر وقت نانا کے پاس کیوں رہتے ہو تو فوراً کہا کہ کیا آپ کو یاد نہیں کہ نانا کا دین بچایا تھا۔

شاعری کا عنصر بھی بچپن سے تھا انہوں نے پہلا نوحہ اس وقت کہا تھا جب وہ مکتب جعفریہ کے طالب علم تھے:

”کیا ابھی دور ہے شام“

تو اس وقت کے بزرگ شعرا نے تعجب بھی کیا اور دعائیں بھی دیں۔ ان کا یہ نوحہ اس وقت انجمن معصومیہ نے بہت سلیقے سے پڑھا بھی تھا۔

ان کی مادر علمی مکتب جعفریہ ہے غالباً اسی سبب مکتب سے خصوصی انس اور لگاؤ ہے میری اور نیر کی وطن عزیز سے محبت ایک جیسی ہے ڈاکٹر نیر نے میرا سپاس نامہ لکھتے ہوئے کہا تھا:

یہی احساس ہے کافی مجھے سرشار رکھنے کو

ہے تیرا شہر نیر کا وطن مہدی حسن واعظ

نیر کے لیے ان کا وطن صرف وطن نہیں بلکہ وطن مالوف ہے۔ وطن مالوف اس جگہ کو کہتے ہیں جس جگہ سے لگاؤ اور انس ہو ورنہ ہم بعض لوگوں کو اپنے وطن سے شاکہ پاتے ہیں اور کہتے ہیں:

وطن سے دور ستاتی ہے ہم کو یاد وطن

وطن میں ہوں تو ستاتے ہیں یہ وطن والے

یہ شکوہ وہی کر سکتا ہے کہ جس کی وطن کے لیے کوئی قربانی نہ ہو ورنہ اہل وطن ہر اس شخص کے قدرداں ہوتے ہیں جو وطن کے لیے قربانی دے۔ میں خود جانتا ہوں کہ نیر نہ جانے کتنی بار محافل و مجالس کے لیے لکھنؤ سے وطن بذریعہ کار آئے مگر نذرانہ تو درکنار کرایہ کی رقم بھی قبول نہیں فرمائی۔ جب سے نیر کو لیش بھارتی ایوارڈ ملا ہے تب سے اہل وطن مزید نیر پر فخر کرتے ہوئے دعائیں دے رہے ہیں میری بھی دعائیں ان کے ساتھ ہیں۔ وطن عزیز میں نیر کی شان اور عزت قابل رشک ہے۔ کبھی کبھی تو خود مجھ کو نیر سے حسد کرنے کا جی چاہتا ہے۔ مگر میں یا کوئی یہ کیسے کر سکتا ہے کہ حسد جرم بھی ہے گناہ بھی ہے۔

وہ لوگ عجیب ہوتے ہیں جو کسی کی دینی و دنیاوی ترقی اور کمال پر حسد کرتے ہیں حسد کے بجائے رشک کرنا چاہئے۔

میری شریف قوم اور میرا عزیز وطن آج نیر کو اتنا چاہنے لگا ہے کہ کسی باہر کے خطیب سے زیادہ وطن میں ان کی مجالس میں مجمع ہوتا ہے وطن کی بعض انجمنیں ان کے نوحے سلام پڑھنا اپنے لیے باعث فخر سمجھتی ہیں۔ دعا ہے کہ پروردگار بحق اہلبیت علیہم السلام اس عالمی شہرت یافتہ خطیب، ذاکر، شاعر، دانشور، ادیب اور آبروئے وطن کو سلامت رکھے۔ بالخصوص حسد کے شر سے محفوظ رکھے تاکہ وطن کا نام روشن ہوتا رہے۔

☆☆☆

نیرتاباں

ڈاکٹر ذیشان حیدر

خارجی اعتبار سے یہی کوئی سوا پانچ یا ساڑھے پانچ فٹ کا قد مگر داخلی اعتبار سے آپ کی فکر رسا جہاں تک پیمائش کرے، کرتے رہیے۔ سرمئی رنگ، ذہن کی شریانوں کی حفاظت کرتے سخت اور پیوست بال، ادب کی شاہ راہ نظر آتی ماتھے کی لکیریں، خطابت اور نظامت کے پرتو لتی ابرویں، لمحوں میں منزلوں کو قید کرتی ہوئی مقفی و صبح نگاہیں، اپنی عمر سے سیکڑوں سال آگے دیکھتی ہوئیں مستقبل شناس آنکھیں، آنکھوں کے نیچے شب گزیدہ حلقے، جلال پور کی اکلوتی اور نمایاں ناک، صبح کا ذب سے صبح صادق کی طرف سفر کرتی ہوئی خش خش داڑھی۔ عمر کی بالائی چڑھی موچھیں، گلاب اور جامن کھائے ہوئے ہونٹ، جلال پور کا بار اٹھائے ہوئے مضبوط کندھے، الف کے قافیے پر دلفظی ردیف کی طرح جھکی گردن، نظم و نثر سے خلط ملط سینہ، غزل سے صنف مثنوی کی طرف آہستہ آہستہ پیش رفت کرتا ہوا شکم، خیالات کی آہٹ محسوس کرتے سبک رو قدم، منبر پر شیروانی، محفل میں کرتا پاجامہ اور ادبی نشستوں میں عام ہندوستانی لباس میں کسی ایسے شخص کو دیکھیں تو کسی سے کچھ پوچھنے یا تفتیش کرنے کی ضرورت نہیں۔ اور ویسے بھی آپ کو پوچھنے کی کیا غرض۔ آپ تو ڈاکٹر عباس رضا نیر کو پہلے ہی سے جانتے ہیں۔

عمر کا وہ افسانوی دور جس میں جلال پور کی نئی نسل پتنگ بازی، گیند بازی اور زندگی کی بازی داؤں پر لگائے ہوئے تھی، جلال پور کا ایک عام سادہ کھنے والا طالب، تنظیم

المکاتب کے مکتب امامیہ جعفریہ، جعفر آباد، جلال پور سے ابتدائی تعلیم حاصل کرنے کے بعد مرکز علم و ادب لکھنؤ کے مدرسہ سلطان المدارس میں داخل ہو گیا اور مدرسے کے غیر افسانوی ماحول میں افسانوی حیات کا زائچہ بنانے لگا۔ صدر الافاضل، ایل۔ ایل۔ بی، پی۔ ایچ۔ ڈی، لکچررشپ، پروفیسر اور صدر شعبہ اردو، شعری بصیرت اور دلآویز خطابت نے دیکھتے ہی دیکھتے عباس رضا کو نیر درخشاں بنا دیا۔

کہنا بہت آسان ہے مگر زندگی کا یہ سفر قیس کی صحرا نوردی سے بھی مشکل ہے۔۔۔ مدرسے کی دو وقت کی شرعی غذا..... جیب خاطر اپنی ہی خاطر داری کرنے سے قاصر.... سعدی شیرازی، صرف و نحو، میزان، ملا صدرا، شرح جامی، شرح تجرید، شرح لمعہ، رسائل، مکاسب اور کفایہ، جید علماء و معلمین کی فصیح و بلیغ تدریس، وطن سے ہجرت، ماں باپ کی نگاہوں سے دوری، کم عمری، تنہائی، ایک طرف مولوی، عالم، فاضل کا امتحان۔ دوسری طرف ہائی اسکول، انٹر۔ بی۔ اے۔ ایم۔ اے کے امتحانات، نٹ کی تیاری۔ سند الافاضل کا پرچہ... صدر الافاضل کی افضلیت۔ پی۔ ایچ۔ ڈی۔ کی تگ و دو، لکچررشپ کے لیے بھاگ دوڑ، لکھنؤ یونیورسٹی میں انتخاب، پروفیسررشپ، صدر شعبہ اردو... مجلس، محفل، سیمینار، لکچر، آرٹیکل، ریڈیو، ٹی. وی، طبع زاد تصنیفات، رات میں جگنا، سفر میں اونگھنا، خود پڑھنا، بچوں کو پڑھانا اور محض چالیس سال کی عمر... آپ خود فیصلہ کیجئے۔ اس فرہاد شیریں سخن و شیریں بیان کا جنون آمیز سفر کتنا مشکل رہا ہوگا۔

انسان جب کسی مقام پر پہنچ جاتا ہے تو عام طور سے یہ بات بڑی آسانی سے کہہ دی جاتی ہے کہ موصوف اوائل عمری سے ہی صاحب کمال تھے مگر میں تمام باتوں سے پرہیز کرتے ہوئے یہ بات پورے وثوق سے کہہ سکتا ہوں کہ مکتب امامیہ جعفریہ جعفر آباد جلال پور میں ابتدائی تعلیم کے دوران ہی عباس رضا نیر تقریری مقابلوں، بحث و مباحثہ اور دیگر کلچرل پروگرام میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیتے تھے۔ اور اسی دوران شعر موزوں کرنے کی

ریجنس بھی نکلنے لگی تھیں۔ ان تمام کمالات اور رجحانات کو سلطان المدارس اور لکھنؤ کی ہموار فضا نے جلا بخشی۔

آج آپ جس ڈاکٹر عباس رضا نیر جلال پوری کو دیکھنے، سننے اور ان سے ملنے کے متمنی ہیں، ان کی پیدائش جلال پور میں اس وقت ہوئی جب دور دراز کے علاقوں میں ڈاکیہ خط لے کر آتا تو محلے کے چند بڑھے لکھے لوگ یاد کئے جاتے تھے۔ شعرا اور علماء کی پہلی پسند جلال پور آج کے چالیس سال پہلے پیدل چل رہا تھا۔ زندگی کی رفتار کی ہوئی تھی۔ کیف جلال پوری، انور جلال پوری اور ظفر جلال پوری نے اس رکی ہوئی زندگی کو رفتار بخشی مگر اقلیتوں میں ایک طبقہ ابھی بھی جلال پور سے ناواقف تھا۔ نیر جلال پوری نے اس کمی کو اور اس خلا کو پُر کر دیا۔

ڈاکٹر عباس رضا نیر کی کئی طبع زاد کتابیں منظر عام پر آچکی ہیں جس میں تازہ ترین کتاب ”رثائی تنقیدیں“ پڑھنے کے بعد طبیعت خیالات کا اظہار کرنے پر آمادہ ہوگئی۔ ظاہری بات ہے کسی کتاب پر اظہار خیال کرنے یا تبصرہ کرنے کے اصول و ضوابط ہوتے ہیں۔ ہم نے تو ایسے تبصرہ نگار بھی دیکھے ہیں کہ فیس بک یا Whatsapp پر سر ورق کی تصویر بھیج دیجئے تو دوسرے دن مکمل تبصرہ آپ کی قدم بوسی کرنے کو تیار ملے گا۔ عام طور سے تبصرہ نگار کی شعوری کوشش تعریفی کلمات سے معمور ہوتی ہے۔ اگر تبصرہ کسی ماہانہ رسالے میں شائع ہونا ہو تو صرف کتابوں اور مصنف کے نام بدل دیئے جاتے ہیں باقی ردیف اور قافیہ وہی ہوتے ہیں۔ میں اس وقت تذبذب میں پڑا ہوں کہ تبصرہ نگاری کے جدید اصولوں پر آگے بڑھوں یا پھر اپنے چھوٹے بھائی نیر کے بنائے ہوئے اصولوں پر آگے بڑھوں۔

”رثائی تنقیدیں“ کی ایک خاص بات یہ ہے کہ شاعر، خطیب اور پروفیسر ہونے کے ساتھ ساتھ صاحب کتاب نے اسٹیج تقاریر اور درس و تدریس کی زبان سے

گریز کرتے ہوئے اپنے خیالات کو اس زبان میں پیش کیا ہے جو تحقیق یا تنقید کی زبان حلقہ ادب میں تسلیم کی جاتی ہے۔ کسی مقرر، ناظم یا شاعر کے لیے تحقیقی یا تنقیدی زبان کا استعمال کرنا اتنا ہی مشکل ہے جتنا کسی نثر نگار کے لیے کسی اسٹیج پر فی البدیہہ تقریر کرنا۔ عباس رضا نیر میر انیس اور دیگر مرثیہ گو وغزل گو شعراء کے اشعار کو نثری سانچے میں ڈھال کر پروفیسر عباس رضا نیر بنے ہیں اس لیے وہ نہ صرف رثائی ادب کے واقعات، کردار، حالات اور درد غم سے واقف ہیں بلکہ ان واقعات کی اصل روح بھی ان کی شخصیت میں سرایت نظر آتی ہے۔ یہی سبب ہے کہ وہ اپنی بات کہنے کے لیے بہت زیادہ دوسری کتابوں کے حوالوں کے متلاشی نظر نہیں آتے بلکہ مراثنی کی کیفیات کو برجستہ اور فطری زبان میں پیش کرتے نظر آتے ہیں۔

نثری اصناف میں کہانی، افسانہ اور ناول کو مرکزیت حاصل ہے۔ بحیثیت صنف کے کہانی کا دائرہ بہت وسیع ہے مگر بحیثیت لفظ کے کہانی کے ادبی دائرے محدود ہو جاتے ہیں۔ میر انیس کے مضامین کو برتنے میں لفظ کہانی کو جو وسعت اور معنویت دی گئی ہے وہ اسی کتاب کا خاصہ ہے اسی ایک لفظ کے ذریعہ ڈاکٹر نیر نے واقعات، کردار، پیکر تراشی اور دیگر رثائی عوامل کو بڑے سلیقے سے نبھایا ہے۔ عام طور سے مراثنی کے حقیقی اور روحانی واقعات میں لفظ کہانی کا گذر بیشتر ماہرین انیس و دبیر کے یہاں شاذ و نادر ہی نظر آئے گا۔ اس بے جان سے لفظ کو رثائی ادب کا حصہ بنا کر ایک نئے باب کا آغاز کیا گیا ہے۔ یہ عبارت ملاحظہ کریں:

”کمال یہ ہے کہ انیس کی کہانی پر تاریخ کی صداقتوں کی مہر اور

انیس کے بیان کردہ تاریخی واقعے پر کہانی کی دلکشی کا گمان گزرتا ہے۔

یہی انیس کی کہانی کا فن ہے۔ یہی انیس کے بیانیے کی عظمت ہے۔“

مندرجہ بالا اقتباس میں لفظ کہانی کو کئی بار دہرایا گیا ہے مگر کہیں بھی نثر جو بھل یا

غیر معنوی نظر نہیں آتی۔

اسی طرح دبیر کے مرثیے کا محاسبہ کرتے ہوئے اسٹیج کی اہمیت و معنویت، ڈرامائیت اور تجسس کے جن پہلوؤں کا احاطہ کیا گیا ہے، اتنی تفصیل کے ساتھ دیگر تنقید نگاروں نے اسٹیج کی معنویت کو بروئے کار لاتے ہوئے اس پر روشنی نہیں ڈالی ہے۔ یہاں بھی صاحب کتاب نے کہانی اور اسٹیج کے داخلی اور خارجی پہلوؤں کی ضرورتوں کو محسوس کرتے ہوئے اپنے خیالات کی تشریح و توضیح بڑے سلیقے سے کی ہے۔ دبیر کے مرثیوں میں ابھرنے والے ڈرامائی تصورات اور اس کے خدوخال کو مرثیے کی نزاکت اور وقار کا خیال کرتے ہوئے جس ہنرمندی کے ساتھ پیش کیا گیا ہے وہ لائق تقلید ہے۔ عام طور سے ماہرین نے اس پہلو کو منظر کشی یا منظر نگاری کے زمرے میں رکھ کر اپنے خیالات کو پیش کیا ہے۔ طلباء سے امتحانات میں بھی اسی طرح کے سوالات پوچھے جاتے ہیں مگر نیر نے لفظ بدل کر مرثی کی ادبی اور عقیدت مندانہ فضا برقرار رکھتے ہوئے بار بار لفظ اسٹیج کا استعمال کر کے نہ صرف جسارت کا کام کیا ہے بلکہ اسے نبھایا بھی ہے۔ اسٹیج کی اہم ضرورتوں مثلاً کردار، مکالمہ، تزئین کاری، تصوراتی فضا، کہانی یا پلاٹ، قاری، سامع یا پھر ناظر کی موجودگی کا پاس و لحاظ رکھتے ہوئے اپنے خیالات کو فنی خوبیوں سے آراستہ و پیراستہ کیا ہے۔

کتاب کے دیگر مضامین بھی قابل ستائش ہیں جن میں نیر نے واقعہ کر بلا اور اردو ادب کے رشتوں کو اپنے خیالات سے معراج بخشی ہے۔ ان تمام مضامین میں عقیدت مندانہ رجحان سے پرے خالص ادبی نقطہ نظر سے واقعہ کر بلا کو پیش کرنے کی شعوری کوشش کی گئی ہے۔ اس سے پہلے بھی ان شعراء پر قلم کاروں نے بہت کچھ لکھا ہے مگر چونکہ نیر کی واقعہ کر بلا پر گہری نظر ہے اس لیے ان کے خیالات جداگانہ نظر آتے ہیں۔ جمیل مظہری کا مرثیہ ”شام غریباں“، نسیم امروہوی کا مرثیہ ”عابد بیمار“، ”سفر معراج

اور شہزاد معصومی، میر کی غزلوں میں علامات کر بلا، غالب کی غزلوں میں استعارات کر بلا، سردار جعفری کی نظموں میں علامات کر بلا، عرفان صدیقی کی غزلوں میں علامات کر بلا، موازنہ انیس و دبیر، پروفیسر فضل امام بحیثیت انیس شناس اور ایک قطرہ خون ایک جائزہ میں واقعہ کر بلا کے نقوش کو ابھار کر جو دبلیں اور اشارے پیش کئے گئے ہیں وہ قابل تعریف ہیں۔

ظاہری بات ہے ڈاکٹر عباس رضا نیر کا تعلق اسلامی فکر و فلسفہ سے ہے جس کی وجہ سے واقعات کی عرق ریزی کر کے کسی نتیجے پر پہنچنا ان کے لیے دیگر تنقید نگاروں کے مقابلے قدرے فطری اور آسان عمل ہے جس کا مظاہرہ پوری کتاب میں نظر آتا ہے۔ یہی نیر جلال پوری کا خاصہ ہے جو مرثی کے حوالے سے ان کو دوسرے تنقید نگاروں سے جداگانہ مقام عطا کرتا ہے۔

☆☆☆

ڈاکٹر عباس رضائیر ”رثائی تنقیدیں“ کے آئینے میں

ڈاکٹر سید علی سلمان رضوی

ہندوستان میں مرثیے کی صنف اپنے موضوع اور ہیئت کے مقرر ہونے کے بعد مسلسل ترقی کی منزلیں طے کرتی رہی۔ دکن سے لے کر انیس سے قبل تک یہ صنف نئی وادیوں میں قدم رکھتی ہوئی آگے بڑھتی رہی اور اپنے امکانات کے سورج روشن کرتی رہی۔ انیس و دبیر کے زمانے میں یہ صنف اپنے عروج کو پہنچی اور مرثیے کو شاعری کی عظیم صنف میں شمار کیا جانے لگا۔ ان دونوں شاعروں کی غیر معمولی شاعرانہ بصیرت نے مرثیے کے میدانوں کو وسیع سے وسیع تر کر دیا۔ واقعہ کر بلا کا کوئی ایسا جز نہیں تھا جو ان مرثیہ نگاروں نے اپنے بہترین اسالیب کے ذریعے بیان نہ کیا ہو۔ یہی سبب ہے کہ مرثیے کو جو قار و اعتبار انیس و دبیر کے زمانے میں حاصل ہوا اس کی نظیر نہ پہلے تھی نہ اب ہے۔ اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ مرثیہ ایک مرکز پر ٹھہر گیا یا اس کا ارتقائی سفر ختم ہو گیا۔ اگر ایسا ہوتا تو انیس کے بعد اردو مرثیے کے جائزے پر محاکمہ کی ضرورت پیش نہ آتی۔ انیس کے بعد کی مرثیہ گوئی کا جائزہ مرثیے میں رونما ہونے والی نئی تبدیلیوں کو سامنے رکھتا ہے۔ یہ ضرور ہے کہ مرثیوں نے ہمیں رثائی شاعری کے نئے افق سے روشناس کرایا۔ نئے مرثیہ نگاروں نے مرثیے میں نئے موضوعات کی جستجو کی اور نئے

اسالیب کے ذریعے اس صنف سخن میں ایک نئی تازگی اور ندرت پیدا کر دی۔ علاوہ بریں اسے نئے عہد کے مسائل کا نمائندہ بنا دیا۔ اس طرح نئے مرثیہ نگاروں نے موضوع و اسلوب کی سطح پر جو تجربے کیے وہ واقعہ کر بلا کی اہمیت و معنویت میں ایک اہم اضافہ ہے۔ یہ محسوس کیا جانے لگا کہ واقعہ کر بلا ہر عہد کے مسائل کی ترجمانی کرنے پر قادر ہے۔ انیس کے بعد مرثیہ نگاروں کا سب سے بڑا کارنامہ یہی ہے کہ انھوں نے مرثیے کی روایت میں انحراف اور توسیع کے عمل کے ذریعے مرثیے کو ایک نیا معنوی قالب عطا کیا۔ واقعہ کر بلا کی معنویت سے متاثر ہو کر دیگر اصناف سخن بالخصوص نظم و غزل گو شعراء اور افسانہ نگاروں نے بھی علامات و استعارات کر بلا کے ذریعے ادب کے دامن کو وسعت عطا کی۔ یہی وجہ ہے کہ ظالم و مظلوم، قاتل و مقتول کے حوالے سے جفا جو، شمشیر، مقتل، دامن خون آلود، خنجر، سناں تیر و نیزے کے ہزاروں مضامین غزل میں ملتے ہیں۔

اگر انیس و دبیر وجود میں نہ آتے تو مرثیہ وہاں نہ پہنچتا جہاں اسے جوش، آل رضا، نجم آفندی، جمیل مظہری، نسیم امر و ہوی، باقر امانت خانی، ناشر نقوی، عظیم امر و ہوی، شمیم کرہانی، ڈاکٹر پیام اعظمی اور ڈاکٹر وحید اختر وغیرہ نے پہنچایا۔

ان موضوعات کا سرسری جائزہ بتاتا ہے کہ نیا مرثیہ روایتی مرثیے کے آداب کو ملحوظ رکھتے ہوئے نئے سماجی اقدار سے پوری طرح ہم آہنگ ہے۔ اور نئے مرثیہ نگار اور دیگر اصناف سے تعلق رکھنے والے شعراء اور ادباء دنیا میں رونما ہونے والے المناک واقعات کو واقعہ کر بلا کے پس منظر میں پیش کرنے کا ہنر جانتے ہیں۔

ڈاکٹر عباس رضائیر نے اسی قبیل سے متاثر ہو کر سخنوران ادب کے ادبی سرمایے کا تجزیہ کر کے اردو دنیا میں جرأت فکر کے چراغ جلانے۔ اور ہمارے لکھنے پڑھنے والوں کے ذہنوں کی تربیت کے لیے علوم و فنون کے ذخائر فراہم کر کے نئی نسل کی پرداخت اور نشوونما میں دست تعاون وا کیے۔ اور اسی روشنی میں ان کے چند

مضامین ”رثائی تنقیدیں“ کا عنوان کلی اختیار کرتے ہوئے مرثیے کی لفظیات کا سہارا لے کر منظر نامے میں داخلی کیفیتوں کے ساتھ علامات و استعارات کر بلا کی مستحکم روایات کے ذریعے کسب نور کرتے ہوئے قارئین کے ذہنوں میں ایک فکری ارتعاش پیدا کر رہے ہیں۔

۲۲۲ صفحات کو محیط مضامین میں وہ کر بلا کے پس منظر میں مختلف شعراء کی شاعری کو پرکھتے ہیں اور ان کے احساسات و خیالات تک پہنچنے میں سعی کرتے ہیں۔ اس لحاظ سے مرثیہ، غزل، نظم، انشائیہ، افسانہ کی ترتیب کے ذریعے میر انیس، مرزا دبیر، جمیل مظہری، نسیم امروہوی، شہزاد معصومی، میر، غالب، علی سردار جعفری، عرفان صدیقی، شبلی نعمانی، پروفیسر فضل امام اور عصمت چغتائی وغیرہ جیسے نامور سخنوران کے متعلق تنقیدی تبصرہ کیا ہے۔

عباس رضائے کے ادبی مضامین کو پڑھتے ہوئے ادبیت کا احساس ہوتا ہے اور حقیقت کا ادراک بھی۔ استدلال جاندار ہے۔ مثالی پیرائے سامنے کی چیز لگتے ہیں۔ دور از کار تشبیہیں نہیں ہیں اور نہ ہی مصنوعی پن ہے۔ روزمرہ استعمال میں آنے والے الفاظ ان کی علمی تحریروں میں ملتے ہیں۔ تحریر تشبیہ و استعارے سے خالی نہیں ہے۔ اس سلسلے میں چند اقتباسات قابل غور ہیں:

۱۔ ”ایک کہانی کے جو لازمی عناصر ہوتے ہیں وہ سب کر بلا کے تاریخی سانچے میں موجود ہیں جہاں ایک طرف عشق، عرفان و آگہی ہے تو دوسری طرف ظلم، وحشت اور بربریت، ادھر محبت، ایثار اور جانثاری ہے تو ادھر مکر و فریب اور عیاری۔ گویا ایک کامیاب کہانی کے سارے تلازمات کر بلا کے تاریخی واقعے سے بہ آسانی فراہم کیے جاسکتے ہیں۔“

(رثائی تنقیدیں: ص ۳۶-۳۷)

۲۔ ”کر بلا آنسو اور خون سے لکھی ہوئی ایک ایسی عبارت ہے جو رونما ہونے سے قبل اور رونما ہونے کے بعد آج تک حقیقت شعار ہی نہیں حقیقت ساز بھی ہے۔ جہاں تک بنی نوع انسانی کے مطالعے کا سوال ہے تو بلاشبہ تاریخ کے دامن میں ہزار ہا جاں گداز واقعات محفوظ ہیں۔ ہر واقعے کی اپنی واقعیت، اہمیت اور انفرادیت بھی ہے لیکن واقعہ کر بلا اپنی جاں گزینی اور اثر پذیری کی بدولت وہ تنہا اور منفرد واقعہ نظر آتا ہے جو چودہ سو سال سے ہر حساس دل اور ہر حقیقت کو اپنی جانب اتنی ہی شدت سے کھینچ رہا ہے جتنا اثر نفوذ اس واقعہ میں چودہ سو سال قبل تھا۔“

(رثائی تنقیدیں: ص ۹۶)

۳۔ ”عرفان صدیقی نے جہاں روایتی اور مروج علامتوں کو نئے مفہیم سے آشکار کیا وہیں نئی اور پُر قوت علامتیں بھی اختراع کیں۔ اس معاملے میں عرفان صدیقی افتخار عارف کے بالمقابل اس لیے قدرے دشوار پسند واقع ہوئے ہیں کہ وہ کسی بھی لفظ کے ایک سطحی، قطعی اور قابل شناخت مفہوم کے بجائے معنی در معنی کے قائل ہیں۔“

(رثائی تنقیدیں: ص ۱۷۸)

۴۔ ”شبلی کی پسند اور ترجیحات میں جو مقام میر انیس کا تھا وہ مقام مرزا دبیر کا نہیں تھا لہذا انہوں نے میر انیس کے مرثیوں سے اس قدر طویل اور شاندار مثالیں پیش کیں کہ قاری کو عطار کی گفتگو سے زیادہ مشک کی خوشبو اپنی جانب کھینچتی چلی جائے جب کہ مرزا دبیر کے کلام سے مثالوں کو تلاش کرنے میں شبلی نعمانی نے کوئی خاص توجہ نہیں دی۔“

(رثائی تنقیدیں: ص ۱۹۳)

محولہ اقتباسات سے یہ اندازہ ہوا کہ الفاظ کا یہ انتخاب، جملوں کی ساخت، لفظوں کی بندشیں یہ سب ذمہ دار ہیں ڈاکٹر نیر کے اسلوب کو شگفتہ بنانے میں۔ اس شگفتگی میں ایک متانت ہے۔ بلاشبہ ان کی نثر سنجیدہ، پُر تاثیر اور باوقار رہتی ہے۔ نثر میں سلاست کے ساتھ ساتھ ربط و تسلسل بھی ہے۔ وہ نثری آئینہ ہے کہ اس کے حسن میں نگاہیں الجھ کر رہ جاتی ہیں۔ اسی کے ساتھ ساتھ مضامین پُر درد ہیں کہ ان کے پڑھنے سے دل پر چوٹ لگتی ہے جو لطف سے خالی نہیں ہوتی۔ اکثر مضامین میں کوئی اخلاق یا حکیمانہ نکتہ نہایت خوش اسلوبی سے بیان کیا گیا ہے۔ ان کی زبان میں جو صناعی ہے اس کا تعلق حسن کاری سے ہے جو سادگی، صفائی، صحت اور سحرائی سے آتی ہے۔ ذہن کی یکسوئی اور فکر کی ہم آہنگی سے آتی ہے۔ اس صناعی کا تعلق پینترہ بازی، لفظی شعبہ گری اور سحر سامری سے نہیں ہے۔ یہ مضمون کی بھول بھلیوں سے آزاد ہے۔ غالب کی شاعری متانت آمیز مظرافت سے مزین ہے اس کے باوجود غالب کے کلام میں استعارات کر بلا کو نمایاں کرنا ڈاکٹر نیر کا کمال ہے۔ اس ضمن میں غالب کے شعر کے ساتھ یہ اقتباس ملاحظہ کریں:

کانٹوں کی زباں سوکھ گئی پیاس سے یارب
اک آبلہ پا وادی پُر خار میں آوے

”دھوپ اور وہ سخت موسم کہ جہاں راستے میں اُگے ہوئے کٹیے پودوں کے کانٹے بھی شدتِ عطش سے تڑپ رہے ہوں اور دعا کر رہے ہوں کہ ادھر سے کوئی آبلہ پا گزرے۔ جس کے پیروں کے چھالوں سے رسنے والے پانی اور لہو ہماری پیاس بجھا دیں۔ کر بلا اور شام کے علاوہ کہیں اور نہ ایسی کانٹوں بھری وادی نظر آتی ہے نہ ایسے راہ رو۔ یہاں اگر کانٹوں کو جبر و ستم کی علامت مانا جائے تو آبلہ پا جبر و ستم سے نجات دلانے والے انسان کی علامت ہوگا۔ کانٹے بعد کر بلا، شام و

کوفہ کی راہوں کے تمام مصائب و شدائد کا مفہوم ادا کرتے ہیں اور آبلہ پا سے ذہن میں بیمار کر بلا کا پیکر ابھرتا ہے۔ شعر کا ایک معنوی پہلو یہ بھی ہو سکتا ہے کہ وہ آبلہ پا اپنے خدا سے اجازت مانگ رہا ہے کہ تیری رضا ہو تو ان کانٹوں کو اپنے پاؤں کے چھالوں سے سیراب کر دوں۔“

(رثائی تنقیدیں: ص ۱۴۴)

ڈاکٹر عباس رضا نیر جو کچھ لکھتے ہیں غور و فکر کر کے موقع و محل کی مناسبت سے لکھتے ہیں۔ پورے وقار و دبدبے اور علمیت کے احساس و ادراک کے ساتھ لکھتے ہیں۔ تنقید کرتے ہوئے ان کی زبان نہ جلا دہنتی ہے اور نہ بے دست و پاچ رہتی ہے۔ وہ فیصلے سناتے ہیں تو محسوس ہوتا ہے کہ ان کے فیصلوں کا نفاذ ہو رہا ہے۔ یقیناً تحریر میں صداقت، استدلال، یقین اور اعتماد ہے۔ اس حرف باریاب کی صداقت کے لیے درج ذیل اقتباسات پر غور کریں:

۱۔ ”کہانی کہنے کا فن یوں تو ہر اچھے مرثیہ نگار کے یہاں پایا جاتا ہے لیکن میر انیس نے کہانی کہنے کے فن کو اعتبار و عظمت کی جن اونچائیوں تک پہنچا دیا ہے وہ فقید المثال ہے۔“

(رثائی تنقیدیں: ص ۳۷)

۲۔ ”آپ نے دیکھا کہ پوری فضا کو سوز و الم انگیز بنانے میں دبیر نے بیمار کر بلا کے کردار کو کس طرح پیش کیا ہے۔ منظر نامے کی اس فضا میں دبیر کی جزئیات کے انتخاب کا کمال ہے۔ بیمار ناتواں سے تکالیف و تاثرات کی فضا پیدا کرنے کے لیے دبیر کی محنت اور فصاحت و روانی قابل دید ہے۔“

(رثائی تنقیدیں: ص ۱۷۱)

۳۔ ”جمیل مظہری انسانی نفسیات، اضطرابی کیفیات اور اضطرابی کشمکشوں کی تصویر کشی کا سلیقہ بدرجہ اتم رکھتے ہیں بلکہ انہیں خصوصیات کی بنا پر وہ اردو ادب میں اپنی علاحدہ شناخت رکھتے ہیں چنانچہ انہوں نے اپنے مرثیے ’شام غریباں‘ میں ان کشمکشوں اور کیفیتوں کو الفاظ کا جامہ دینے کی ایک مختصر ہی سہی لیکن نہایت کامیاب کوشش کی ہے۔“

(رثائی تنقیدیں: ص ۹۵)

۴۔ ”پیشک پورے ناول میں عصمت چغتائی کی نثر اپنی دلآویزی کے سبب قاری کو اپنی گرفت میں رکھتی ہے۔ اکثر جگہوں پر عبارت میں نثری نظم کا لطف آتا ہے۔ اور کیوں نہ ہو انیس کے مصرعوں سے کشید کی ہوئی نثر اتنی حسین تو ہونی چاہیے۔ لیکن جہاں کہیں عصمت چغتائی اپنی جانب سے ایک جملہ لکھنے کی کوشش کرتی ہیں وہ حفظ مراتب کے حدود سے تجاوز کر جاتی ہیں۔“

(رثائی تنقیدیں: ص ۲۲۳)

عباس رضا نیر کی شخصیت علمی و ادبی دونوں ہے مگر سب سے بڑا کمال ان کا اسلوب ہے۔ ان کے اسلوب میں رجب علی بیگ سرور کی خوبیاں، میرامن کی سادگی، سرسید کا استدلال، غالب کی برجستگی اور حالی کا دھیماپن ہے۔ ان تمام خصوصیات کے علاوہ ان کی تحریروں میں جو خطیبانہ جوش پایا جاتا ہے وہ ان کے احساس و عقیدے کی دین ہے۔ مثلاً:

”بات فتح مکہ کی ہے۔ ابوطالب اور خدیجہ کی وفات کے بعد ہجرت کی رات حسرت بھری نظروں سے مکہ کو الوداع کہنے والا رسولؐ بلا

تغ فاتح مکہ بن کر مدینہ سے واپس آیا ہے۔ کفر ہمیشہ کے لیے ہار مان رہا ہے اور تو حید ہمیشہ کے لیے فتیاب ہو رہی ہے۔“

(رثائی تنقیدیں: ص ۱۱۸)

”اللہ نے مسجد نبوی میں اپنے رسولؐ کو سجدے کے طول کا حکم دے کر حسینؑ کی لاج رکھ لی۔ نواسے نے کہانا اگر آپ نے مجھے معراج عطا کرنے کے لیے ایک سجدے میں ستر بار سبحان ربی الاعلیٰ کہا تھا۔ میں ایک سجدے کو بچانے کے لیے بہتر سر نہ دے دوں تو آپ مجھے انا من الحسین نہ کہنا۔“

(رثائی تنقیدیں: ص ۱۲۱)

ڈاکٹر نیر عباس رضا نیر کا تنقیدی سرمایہ ان کی ذہانت، وسیع مطالعے اور تجزیاتی نظر کے مقابلے میں بہت کم ہے۔ ان کی رثائی تنقید نگاری اصول تنقید سے متعلق کم اور عملی تنقید سے زیادہ ہے۔ ان کا انداز نظر بنیادی طور پر قدیم ہے اسی لیے ان کا مذاق شعر بنیادی طور پر مرثیے کا پروردہ ہے۔ ان کی تنقید کو منطق کی اصطلاح میں DEDECTIVE کہنا چاہئے۔ وہ پہلے شعر پر غور کرتے ہیں اور پھر اسی کے معنوی اور لفظی خوبیوں کے سلسلہ وار نتائج نکالتے ہیں۔ وہ نفس مضمون سے زیادہ انداز بیان پر نظر رکھتے ہیں۔ انداز بیان کی نزاکتوں اور پینتروں میں انھیں لطف آتا ہے۔ اس سلسلے میں شہزاد معصومی کے مرثیے کے بند کے ساتھ یہ اقتباس دیکھیے:

طبع رواں کی آج روانی دکھائیے
مضمون میں حسن لفظ و معانی دکھائیے
کہتے ہیں کس کو زورِ بیانی دکھائیے
تغ زباں کی دھار کا پانی دکھائیے

ترسیل فکر روش فصل بہار ہو
اشعار میں ترنم صوت ہزار ہو
”کیا مطلع ہے؟ پہلا مصرعہ ہی شاعر کی طبع رواں کا پتہ دے رہا
ہے۔ ’روانی‘، ’معانی‘، ’زور بیانی‘ اور ’دھار کا پانی‘ سارے کے سارے
قافیہ متحرک ہیں۔ کوئی لفظ منجمد نہیں ہے۔ بیت کا آغاز لفظ ’ترسیل‘ سے
ہو رہا ہے۔ جو اپنے کامیاب ابلاغ کا آئینہ ہے۔ محاکات اور پیکر تراشی کا
عمل بھی یہیں سے شروع ہو چکا ہے۔ ’فصل بہار‘ اور ’ترنم صوت ہزار‘
بصری اور سماعتی پیکر کی کامیاب مثال ہیں۔ طبع رواں کے پروں کی اٹھان
اور اڑان بتا رہی ہے کہ شاعر کو معراج کی بلندیوں کا سفر طے کرنا ہے۔“

(رثائی تنقیدیں: ص ۱۱۳)

یہ عرض کرنا حق بجانب ہے کہ ادب میں قطعی اور حتمی فیصلے نہیں ہوا کرتے بلکہ
غور و فکر کی لہریں ادبی شعور کی نئی تہیں کھولتی ہیں۔ سچی تنقید آغاز بے انجام ہوتی
ہے۔ ڈاکٹر عباس رضا نیر قاری کو نتیجوں تک انگلی پکڑ کر نہیں پہنچاتے بلکہ اسے صرف نئی
آگہی اور ذہنی فضا سے روشناس کراتے ہیں۔ اس اعتبار سے فاضل ادیب کی رثائی
تنقیدوں نے یقیناً ایک عہد آفریں کارنامہ سرانجام دیا ہے۔ اس سلسلے میں یہ اقتباس
قابل غور ہے:

”آپ نے دیکھا کہ میر انیس نے اب تک حضرت عباسؑ
کے کردار کے صفات حسنہ اور ان کے مزاج کی مختلف کیفیات کو اس
طرح اپنے قارئین و سامعین کے سامنے پیش کر دیا ہے کہ آپ کو یہ محسوس
ہونے لگا کہ آپ خود رزم گاہ کر بلا میں کھڑے ہو کر پنچشم خود کا ندھے پر
مشک رکھے ہوئے، نیزے سے دفاعی جنگ لڑتے ہوئے اس بہادر،

جری، دلیر، سورا، ساونت، عالی حوصلہ، عالی نسب کردار کو دیکھ رہے ہیں،
جسے عباسؑ کہتے ہیں اور اس کردار کی گفتگو، عادات و اطوار، حرکات و
سکنات یہ سب آپ کی سماعتوں میں سما کر آپ کی مدح اور شعور کا حصہ
بنتی جا رہی ہیں۔ اسی کو تو میر انیس کی پیکر تراشی کا معجزہ کہتے ہیں۔“

(رثائی تنقیدیں: ص ۳۴)

اس کے علاوہ مضمون نگار کے طرز نگارش کا ایک بہت بڑا وصف یہ ہے کہ وہ
بڑے بڑے واقعات مختصر جملوں اور چند لفظوں میں اس طرح ادا کرتے ہیں کہ بحر کلام
پیدا نہیں ہوتا بلکہ مافی الضمیر پوری طرح مختصر سی عبارت میں ادا ہو جاتا ہے۔ یہ خوبی سہل
ممتنع کے قبیل سے ہے۔ مثلاً:

۱۔ ”کر بلا کا تاریخی حوالہ زندگی کی تمام جدوجہد میں سردار
جعفری کو کبھی مایوس نہیں ہونے دیتا۔ چونکہ کر بلا کبھی مرنے نہیں سکتی۔
ایک آواز قتل ہوتی ہے تو دوسری ابھرتی ہے اور اپنے وقت کا ہر یزید
اپنے انجام کو پہنچ جاتا ہے۔“.... ”بلا شبہ کر بلا شر پر خیر کی فتح کا ابدی
استعارہ ہے۔“

(رثائی تنقیدیں: ص ۱۷۷)

۲۔ وہ شام غریباں جو حق و صداقت کی پامال شدہ لاشوں
پر گردِ غربت بن کر برس رہی ہے جو فقط ایک لمحہ بیکیسی و یاس ہی نہیں
بلکہ فکر و شعور کے ایک نئے انقلاب عظیم کی آہٹ بھی ہے۔“... حسین
فتح و کامرانی کے ساتھ قربانیوں کا ایک عظیم سمندر پار کر چکے
ہیں۔ اب مصائب و آلام کی کالی، گھور اور سفاک رات سے زینب گما
سامنا ہے۔ وہ زینب جو ایک طرف بہتر لاشوں کی عزادار ہیں وہیں

دوسری طرف اجڑے اور لٹے ہوئے قافلہ بے کساں کی قافلہ سالار
بھی ہے۔“

(رثائی تنقیدیں؛ ص ۸۳)

مجموعی طور پر یہ حرف بھی قابل تحریر ہے کہ ڈاکٹر عباس رضا نیر کے تنقیدی مضامین اردو ادب کا قابل قدر سرمایہ ہیں۔ وہ جس شخصیت کے بارے میں قلم اٹھاتے ہیں اسے بے نقاب کرنا، یا اس کی کمزوریوں کا تذکرہ کرنا خلاف تہذیب جانتے ہیں اور مشرقی تہذیب کے پرانے آئین و ادب کے مطابق اپنے پیرو کے مناقب پر اکتفا کرتے ہیں۔ اس لحاظ سے ان کی شخصیت اور اسلوب دونوں دور حاضر میں متاع رفتہ کا حسین ترین سراغ ہے۔ بلاشبہ نیر صاحب ہمارے دور کے نقادوں میں شمار کیے جائیں گے اور ان کا مدہم لہجہ، ان کی تہہ داری، رمزیت، ان کی طرح داری اور خلوص کی کھنک ایک زمانے تک اردو دنیا کے کانوں میں گونجتی رہے گی اور رثائی نقادوں کو راہ دکھاتی رہے گی۔

☆☆☆

رثائی تنقیدیں: ایک مطالعہ

کرار حسین

کسی شاعری کی عظمت کا فیصلہ اس بنیاد پر بھی کیا جاسکتا ہے کہ اس کا کتنا حصہ عالمی ادب میں جگہ پانے کا مستحق ہے۔ اردو مرثیہ یقیناً اس قابل ہے کہ اسے دنیا کی بڑی سے بڑی شاعری کے مقابلے میں مکمل اعتماد کے ساتھ پیش کیا جاسکتا ہے۔ یہ ایک مسلمہ حقیقت ہے کہ جب دل کو ٹھیس لگتی ہے تو زبان سے فطری و حقیقی کلمات ادا ہوتے ہیں۔ کسی کی موت پر کیے جانے والے بین اس کی مثال ہیں۔ حساس دلوں سے اپنے عزیزوں کی موت پر جو درد انگیز کلمات بے اختیار ادا ہوئے وہ مرثیہ کہلائے اور شاید دنیا کی ہر زبان میں انہیں احساسات و جذبات کے تحت شاعری کا آغاز بھی ہوا۔ مرثیہ نظم کی وہ قسم ہے جو کسی کی وفات کا غم اور مرنے والے کی خوبیاں بیان کرے۔ مرثیہ ہمارے یہاں خاص طور پر شہدائے کربلا کی شہادت کے بیان سے مخصوص ہے۔ اس کے علاوہ بھی مراثری لکھے گئے ہیں مثلاً شخصی مرثیے جیسے مرثیہ حالی، مرثیہ غالب وغیرہ۔

اردو ادب میں کربلائی و عاشورائی مراثری کے حوالے سے میر انیس اور مرزا دبیر کے نام صف اول میں ممتاز مقام رکھتے ہیں، انہوں نے اردو مرثیہ کو نہ صرف یہ کہ اعلیٰ انسانی اقدار اور زبان و بیان کے اچھوتے زیورات سے مزین کیا بلکہ اسے ترقی کی اس منزل تک پہنچا دیا جہاں وہ دیگر اصنافِ شعری میں بعض خصوصیات کے سبب قدر کی نگاہ

سے دیکھی جاتی ہے۔ انہوں نے مرثیہ گوئی میں زبان و بیان کے جملہ محاسن کو انتہائی حسن و خوبی کے ساتھ کچھ اس انداز سے برتا کہ لفظ بہ لفظ اور مصرعہ بہ مصرعہ ہنر و فنکاری آشکار ہے اور ان کی شاعری آتش کے اس شعری بہترین مصداق ہے:

بندش الفاظ جڑنے سے نگوں کے کم نہیں
شاعری بھی کام ہے آتش مرصع ساز کا

اسی طرح یہ بھی ایک مسلمہ حقیقت ہے کہ جس طرح مرثیہ نگاری ہر کس و ناکس کے بس کا کام نہیں اسی طرح رثائی شاعری پر نقد و تبصرہ کرنا بھی ہر کسی کے بس کا روگ نہیں ہے۔ ڈاکٹر عباس رضا نیر کی ادبی شخصیت کا قد اس عنوان سے اور بھی اونچا ہو جاتا ہے کہ انہوں نے جہاں ادب کے مختلف چمن زاروں کی آبیاری کے لیے خود کو وقف کر دیا ہے وہیں انہوں نے مرثیہ جیسی نازک اور مشکل صنفِ سخن کو ادبی نقد کی کسوٹی پر پرکھنے کا اہم کام بھی اپنے ذمہ کر لیا۔ ان کی تصنیف ”رثائی تنقیدیں“ اس بات کی زندہ گواہ ہے۔

ڈاکٹر عباس رضا نیر اردو زبان و ادب کا وہ تابندہ ستارہ ہیں جو اپنی بھرپور صلاحیت و کمالات کے ذریعہ ہر طرف روشنی بکھیر رہے ہیں۔ آپ کی شخصیت محتاج تعارف نہیں ہے، آپ ایک دانشور، ناظم، خطیب، شاعر، ادیب اور اہل قلم ہونے کے ساتھ ساتھ بہترین مربی اور استاد بھی ہیں۔ آپ جس سرعت اور حسن و خوبی کے ساتھ اپنے ادبی سفر کو طے کر رہے ہیں وہ آپ کے معاصرین کے لیے باعثِ رشک بھی ہے اور مشعلِ راہ بھی۔ اب تک آپ کی متعدد تصنیفات و تالیفات منظرِ عام پر آچکی ہیں، جن میں شعری تخلیقات اور نثری فن پارے شامل ہیں۔ آپ کی تازہ ترین تصانیف میں ”رثائی تنقیدیں“ اپنی جگہ ایک جداگانہ اہمیت کی حامل ہے۔ اس کتاب میں اردو مرثیہ کے معتبر شعراء و ادباء مثلاً میر انیس، مرزا دبیر، جمیل مظہری، نسیم امروہوی، مرزا غالب، عرفان صدیقی، سردار جعفری، اور میر تقی میر جیسی عظیم المرتبت شخصیتوں کی شاعری خصوصاً مرثیہ

پر قابلِ قدر نکات و معروضات پیش کیے ہیں۔ خدائے سخن میر انیس کا مرثیہ:
”جب کربلا میں داخلہ شاہِ دیں ہوا“
کے سلسلے میں فرماتے ہیں:

”میر انیس کی قدرتِ منظر نگاری اور ملکہِ پیکر تراشی پر ناقدینِ ادب کی جانب سے ہزار ہا تبصرے اور اعترافات آچکے ہیں۔ بلکہ یوں کہا جائے کہ رزمیہ شاعری میں انیس نے آج جو حیثیت حاصل کی ہے۔ اس کی وجہ ان کی یہی فطری اور حقیقی منظر نگاری اور تاریخ کے اوراق میں صدیوں کے اس پار کے کرداروں کو اپنے عہد کے جیتے جاگتے حقیقی ماحول کا ایک واقعی حصہ بنا کر پیش کرنے کا ہنر ہی ہے۔ انیس کے اس ہنر تک پہنچنے میں انسانی عقل و تصور ابھی تک حیران و عاجز ہے۔ تمام عالمِ ادب اس واقعہ کو بیان کرنے میں انیس کی قدرتِ کلام کا لوہا مانتا ہے۔“

(رثائی تنقیدیں: ص ۱۹)

اسی طرح وہ ”بیانیہ اور انیس“ میں جناب شیریں سے متعلق مرثیہ:
”اے مومنو! کیا صادق الاقرار تھے شبیر“
پر نقد و تبصرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

”اردو ادب کے بہت سے مرثیہ نگاروں نے کربلا کی تاریخ کو اسی قدر خوبصورتی کے ساتھ کہانی بنا کر عوام تک پہنچایا ہے۔ حالانکہ مرثیہ نگاروں کی کہانی نے کہیں کہیں تاریخ سے تجاوز کیا ہے، لیکن کہانی کو محض تخیل یا مفروضات کے حوالے بھی نہیں کیا ہے۔“
(رثائی تنقیدیں: ص ۳۶)

جناب شیریں کے حال میں کہا ہوا یہ مرثیہ اپنی بعض خصوصیات کی بدولت مستورات میں بے حد مقبول ہے۔ میر انیس نے صادق الاقرار ہونے کی جو دلیلیں نظم کی ہیں، وہ قابلِ تحسین ہیں۔ امام حسینؑ نے بچپن میں ملاقات کا جو وعدہ کیا تھا، اسے سجدہ شکر کے ساتھ اپنا سر قلم کرا کے پورا کیا۔ جب ہم مرثیہ کا تنقیدی جائزہ لیتے ہیں تو اس نتیجہ تک پہنچتے ہیں کہ ہمارے تنقید نگاروں نے انیس شناسی پر جتنی توجہ صرف کی ہے اس کے مقابل دیر شناسی پر کم توجہ دی ہے۔ ڈاکٹر نیر نے ”اسٹیج مکالمہ اور دبیر“ میں دبیر کے مشہور مرثیے ”قید خانے میں تلاطم ہے کہ ہند آتی ہے“ کا تجزیاتی مطالعہ کرتے ہوئے مرزا دبیر کی مرثیہ نگاری کے اہم نکات کی طرف توجہ دی ہے اور مرزا دبیر کی شاعری کے ان نادیدہ پہلوؤں کو اجاگر کیا ہے جسے اکثر ناقدین نے عمدائاً سہواً چھوڑ دیا ہے۔

ڈاکٹر نیر نے اپنی جودت فکر سے الفاظ کے ذخیرے کو جس طرح سجا سنوار کر پیش کیا ہے وہ ہر عنوان سے اعلیٰ نثر کا بہترین نمونہ ہے۔ ان کے اندازِ تحریر کی شکستگی اور زبان و بیان کی چابک دستی قاری کو کہیں ذرا بھی اکتاہٹ محسوس ہونے نہیں دیتی۔ جمیل مظہری جدید مرثیہ کے عظیم شاعر ہیں۔ ان کے مشہور و معروف مرثیے ”شامِ غریباں“ کا تجزیہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

”جمیل مظہری انسانی نفسیات، اضطرابی کیفیات اور اضطرابی کشمکشوں کی تصویر کشی کا سلیقہ بدرجہ اتم رکھتے ہیں بلکہ انہیں خصوصیات کی بنا پر وہ اردو ادب میں اپنی علاحدہ شناخت رکھتے ہیں۔ چنانچہ انہوں نے اپنے اس مرثیہ شامِ غریباں میں ان کشمکشوں اور کیفیتوں کو الفاظ کا جامہ دینے کی ایک مختصر ہی سہی لیکن نہایت کامیاب کوشش کی ہے۔ انہیں محاسن اور انہیں خصوصیات کی بنا پر جدید اردو مرثیے کے سرمائے میں جمیل مظہری کا یہ مرثیہ شاہکار کی

حیثیت حاصل کر گیا ہے۔“

(رثائی تنقیدیں: ص ۹۵)

تسیم امروہوی کا شمار جدید مرثیہ نگاروں کے اولین شعراء میں ہوتا ہے۔ ڈاکٹر عباس رضا نیر نے ان کا مرثیہ ”عابد بیمار، آنسو، تلوار اور کربلا کے عنوان سے مرثیہ کا تجزیہ کر کے مرثیہ کی عظمت و معنویت کو روشن کیا ہے۔ ڈاکٹر نیر کے وسیع مطالعے کا اندازہ ذیل کے اقتباس سے لگایا جاسکتا ہے:-

”مرثیہ اور سانحہ کربلا کے تعلق سے آنسو اور تلوار کے مختلف اثر و نفوذ کی بحثیں کچھ بہت زیادہ پرانی نہیں ہیں۔ مرثیہ گو شعراء میں جوش ملیح آبادی نے یہ بحث قائم کی تھی کہ کربلا کے معرکے میں تیغ کی للکار زیادہ اہم ہے یا آنسوؤں کی بوچھاڑ میں نشوونما پانے والے شعور کی دین تھی۔ جب کہ وہ آنسوؤں کی اثر پذیری کو اس کی شدت کے ساتھ محسوس کر بھی نہیں سکتے تھے۔ بلاشبہ مارشل مزاج رکھنے والے انسان، جنگجویانہ فکر کی حامل قوتیں یا اشتراکی نظریات کی تائید کرنے والا جاگیردارانہ نظام تلوار کی دھار کے قصیدے تو پڑھ سکتا ہے لیکن ان کا ضمیر و خمیر بھلا آنسوؤں کی عظمت کا قائل کہاں سے ہو سکتا ہے؟ جب کہ حقیقت میں دیکھا جائے تو تلوار کی جھنکار کے اثر و نفوذ انسانی سر تو تسلیم کر سکتے ہیں لیکن انسانی دل تسلیم نہیں کر سکتے۔ لیکن یہ آنسوؤں کے چراغ ہیں جن کی روشنی براہِ راست انسانی دلوں کی زمینوں کو منور کرتی رہتی ہے۔“

(رثائی تنقیدیں: ص ۹۶-۹۷)

ڈاکٹر عباس رضا نیر نے میر کی غزلوں میں علاماتِ کربلا کے ذیل میں ان کی

غزلوں سے جس طرح سے اس نوعیت کی نشاندہی کی ہے وہ قابلِ غور ہیں۔ انہوں نے میر تقی میر کے اس شعر:

حاصل نہ پوچھ باغِ شہادت کا بوالہوس
یاں پھل ہر اک درخت کا حلق بریدہ ہے

کا جس طرح تجزیہ کیا ہے اس میں جدت اور نیا پن ہے۔

”عرفان صدیقی کی شاعری میں علاماتِ کربلا“ کے عنوان سے بھی ڈاکٹر عباس

رضانیر نے معیاری مقالہ پیش کیا ہے۔ انہوں نے ان کی غزلوں سے ایسے شعروں کو منتخب کیا ہے جن میں علاماتِ کربلا کے عناصر موجود ہیں۔ شعر ملاحظہ ہو:

سروں کو ربط رہا ہے سناں سے پہلے کبھی
گزر چکے ہیں یہ لشکر یہاں سے پہلے کبھی

یہ سرخ پھول سا کیا کھل رہا ہے نیزے پر
یہ کیا پرندہ ہے شاخِ شجر پہ وارا ہوا

ڈاکٹر عباس رضانیر عرفان صدیقی اور ان کی شاعری کے حوالے سے بھی اپنی

خاص رائے رکھتے ہیں:

”عرفان صدیقی نے جہاں روایتی اور مروج علامتوں کو نئے

مفہیم سے آشکار کیا وہیں نئی اور پر قوت علامتیں بھی اختراع کیں۔ اس

معاملے میں عرفان صدیقی افتخار عارف کے بالمقابل اس لیے قدرے

دشوار پسند واقع ہوئے ہیں کہ وہ کسی بھی لفظ کے یک سطحی، قطعی اور قابل

شناخت مفہوم کے بجائے معنی در معنی کے قائل ہیں۔“

(رثائی تنقیدیں: ص ۸۷/۱)

اسی طرح آپ کے مضامین جو اس کتاب میں شامل ہیں من جملہ ”مطالعہ“
مراثی کی خشت اول موازنہ انیس و دہیر، ”پروفیسر فضل امام بحیثیت انیس شناس“،
”ایک قطرہ خون: ایک جائزہ“ کا بھی انتہائی ناقدانہ و مبصرانہ مطالعہ کیا گیا ہے اور ہر
مقالہ نہ صرف بیش قیمت ادبی انتقاد سے مالا مال ہے بلکہ ڈاکٹر نیر کی نثر نگاری کی قدرت
ومہارت کا ثبوت ہے۔ یہی قادر الکلامی اور تخلیقی نثر کی قوت کا زور ہے کہ آپ کے تمام
مقالات و مضامین میں ارسال و ترسیل کا فریضہ بڑی خوبصورتی سے ادا ہوا ہے۔

☆☆☆

رثائی ادب کی افہام و تفہیم

سید غلام عباس رضوی

انسان کا وجود فانی ہے۔ اکثر و بیشتر دیکھا جاتا ہے کہ دنیائے فانی میں ۶۰-۷۰ برس عیش و عشرت کی زندگی گزارنے والا انسان، جب دار فنا سے دار بقا کی طرف روانہ ہوتا ہے تو اس کے تذکرے اور اذکار حسن اس دنیا میں چند دنوں کے مہمان ہوتے ہیں اور دیکھتے دیکھتے ۲۵-۵۰ سال کے بعد اس کا نام لینے والا بھی کوئی نہیں رہ جاتا۔ لیکن یہ ناقابل تردید حقیقت ہے کہ تحریریں انسان کو زندہ رکھتی ہیں۔

ڈاکٹر عباس رضانیر کی شخصیت ایسی ہمہ گیر ہے جس میں جا بجا انسانی کمالات کے جلوے اور خوبیاں بکھری ہوئی نظر آتی ہیں۔ اپنی محنت اور لگن کی بنا پر ڈاکٹر نیر صاحب نے تحریری اور تقریری دونوں میدانوں کو بخوبی سر کیا ہے۔ خواہ وہ ادبی محافل میں نظامت ہو یا عالمانہ اور عارفانہ بیان، وہ شاعری کی دنیا ہو یا تصنیف و تالیف کا میدان، غرض کہ ڈاکٹر عباس رضانیر صرف کمالات کی بلندیوں تک پہنچے ہی نہیں بلکہ منزل کمال پر بنے ہوئے نظر آ رہے ہیں۔ دور جدید میں دنیائے ادب کو ایک سمت و رفتار عطا کرنے والے ڈاکٹر نیر کی تخلیقی، تصنیفی اور ادبی صلاحیتوں کا زمانہ معترف ہے۔ وقفے وقفے سے ان کی تصنیفات اور نایاب تخلیقات دنیائے ادب کو چونکا رہی ہیں۔

یہاں ہم ۲۰۱۶ء میں شائع ہوئی مرثیہ کی تنقید پر مشتمل ڈاکٹر عباس رضانیر کی کتاب ”رثائی تنقیدیں“ کا جائزہ لیں گے۔ ڈاکٹر عباس رضانیر نے اپنی اس کتاب میں

اردو مرثیہ کی تنقید سے متعلق کئی گرہیں کھولیں ہیں اور مشکل گتھیوں کو سلجھایا ہے۔ چودہ مضامین پر مشتمل یہ کتاب رثائی ادب کا ذوق رکھنے والوں کے لیے نایاب تحفہ ہے۔ کتاب کے مضامین پر بحث کرنے سے پہلے اس بات کا اعتراف کرنا ضروری ہے کہ کتاب میں شامل ڈاکٹر منتظر مہدی کے مضمون ”رثائی تنقیدیں: ایک جائزہ“ میں کتاب کی تعبیر و تفہیم کے سلسلے میں اضمحسون میں بڑی گہرائی سے جائزہ لیا گیا ہے۔

کتاب کا پہلا مضمون پیکر تراشی اور انیس کے عنوان سے ہے اس مضمون میں ڈاکٹر نیر نے انیس کے مشہور مرثیے ”جب کربلا میں داخلہ شاہ دیں ہوا“ کا تجزیہ کیا ہے۔ واقعات کربلا میں حسینی لشکر کے علمبردار حضرت عباس اس مرثیے کا مرکزی کردار ہیں۔ اس مرثیے میں انیس نے واقعات کربلا میں حضرت عباس کے کردار کے ہر پہلو کو شاعرانہ خوبیوں کے ساتھ ابھارنے کی کوشش کی ہے۔ ڈاکٹر عباس رضانیر نے اس مرثیے کا تجزیہ اس فنی بصیرت کے ساتھ کیا ہے جس کا یہ مرثیہ متقاضی تھا۔ اور انہوں نے اپنے تجزیے میں انیس کے ملکہ پیکر تراشی پر سیر حاصل بحث کی ہے اور انیس کے فنی کمالات کو واضح کرتے ہوئے لکھا ہے:

”انیس واقعہ کو بیان کرتے وقت واقعہ کو فطری اور منظر کو حقیقی

بنانے میں مددگار ثابت ہونے والی چھوٹی سے چھوٹی جزئیات کو بھی نظر

انداز نہیں کرتے اور پھر ان معمولی سی معمولی جزئیات پر نگاہ رکھنے کے

ساتھ وہ اپنی منزل مقصود سے کسی بھی لمحہ بے خبر نہیں ہوتے کہ انہیں کس

طرح لفظ لفظ اور قدم قدم پورے منظر نامے کی تشکیل کرنا ہے۔“

مندرجہ بالا عبارت سے واضح ہو جاتا ہے کہ ڈاکٹر نیر کی نظر کتنی عمیق ہے اور انہوں نے کتنی گہرائی سے میر انیس کی فنی خوبیوں کو تنقید کی کسوٹی پر پرکھنے کی کوشش کی ہے اور انیس کی منظر نگاری، واقعہ نگاری اور جزئیات نگاری کے متعلق اہم رائے پیش کی ہے۔

ڈاکٹر نیر کا انداز تحریر اتنا آسان اور سلیس ہے کہ ہر خاص و عام اس سے مستفید ہوتا ہے۔ ڈاکٹر نیر کی تنقیدی بصیرت کا یہ عالم ہے کہ باریک سے باریک نکات کو بھی کئی جہات سے روشن کر دیتے ہیں۔ کتاب میں شامل ”کہانی بیانیہ اور انیس“ کے عنوان سے شامل مضمون میں میر انیس کے مقبول مرثیے ”اے مومنو! کیا صادق الاقرار تھے شبیر“ کا تجزیہ بالکل نئے انداز سے کیا گیا ہے جس میں میر انیس کی فنی خوبیوں کے ساتھ ساتھ کتاب کے مصنف کی بھی تنقیدی بصیرت ابھر کر سامنے آتی ہے انیس نے اس مرثیہ میں مرکزی کردار شیریں کو بنایا ہے جو کہ حضرت شہر بانو (زوجہ امام حسینؑ) کی کنیر ہے اور امام حسینؑ نے اس کنیر کو داد و دہش دے کر آزاد کر دیا ہے یہ مرثیہ پوری ایک کہانی کی شکل میں ہے جس کو انیس نے بڑی خوبصورتی سے پورے جذبات و احساسات اور عظمت اہلبیتؑ کا خیال رکھتے ہوئے نظم کیا ہے۔ ڈاکٹر عباس رضا نیر نے اس مرثیے پر بڑی گہرائی سے ناقدانہ نظر ڈالی ہے اور میر انیس کے کہانی کہنے اور اس کو بیانیہ میں ڈھالنے کے گر کو اپنی تجزیاتی صلاحیتوں کو بروئے کار لاتے ہوئے اجاگر کرنے کی کوشش کی ہے مثلاً کتاب کا یہ اقتباس ملاحظہ کیجئے:

”کہانی کہنے کا فن یوں تو ہر اچھے مرثیہ نگار کے یہاں پایا جاتا ہے لیکن میر انیس نے کہانی کہنے کے فن کو اعتبار و عظمت کی جن اونچائیوں تک پہنچا دیا ہے وہ فقید المثال ہے۔ انیس اپنی فکری و فنی صلاحیتوں کی بنا پر تمام مرثیہ نگاروں میں منفرد اور ممتاز نظر آتے ہیں۔“

ڈاکٹر نیر کی تحریروں کا ایک امتیاز یہ بھی ہے کہ وہ چھوٹے سے چھوٹے نکتے کو بھی نظر انداز نہیں کرتے اور اس کی تشریحات میں بھی لطیف گوشہ نکال لیتے ہیں۔ مثلاً اسی مرثیہ کے تناظر میں ایک جگہ لکھتے ہیں:

”کہانی کا آغاز شیریں کی آنکھوں کے حسن کی تعریف سے

ہوتا ہے اور کہانی کے اختتام میں شیریں قدرت سے شکوہ کرتی نظر آتی ہے کہ کیا اسی اندوہ ناک منظر کو دیکھنے کے لیے میری آنکھیں سلامت ہیں۔ کیوں! ہے ناں انیس کو کہانی اور بیانیہ کے فن پر پوری قدرت!“

ڈاکٹر نیر کی اس تحریر کو پڑھنے کے بعد اندازہ ہوتا ہے کہ انہوں نے ہر پہلو سے انیس کے اس مرثیے کا تجزیہ کیا ہے اور کیا خوبصورت اور نادر خیال، آنکھوں کی تعریف اور آنکھوں کا رنج و غم و ملال، دونوں کو آپس میں مرتبط کیا ہے نیز عبارت میں مکالمے کی آمیزش پیدا کر دی ہے جس کو پڑھنے کے بعد بے ساختہ غالب یاد آتے ہیں۔ ڈاکٹر عباس رضا نیر کی تحریروں میں سحر انگیزی اور مقناطیسیت ہے جو قاری کو اپنی گرفت سے نکلنے نہیں دیتی۔ ڈاکٹر نیر کا ایک کمال یہ بھی ہے اختلافی موضوعات پر بھی اپنی صحیح اور ناقدانہ رائے دینے سے گریز نہیں کرتے، کتاب میں شامل مضمون ”سٹیج مکالمہ اور دبیر“ کے عنوان سے مرزا سلامت علی دبیر کے مشہور مرثیے ”قید خانے میں تلاطم ہے کہ ہند آتی ہے“ کا گہرائی سے تجزیہ کیا ہے۔ انیس ودبیر پر ایک دوسرے کو فوقیت کا مسئلہ بھی کافی حد تک آسان کر دیا ہے، حالانکہ شبلی نے جانبدارانہ اور اکابر پرستی کا ثبوت دیتے ہوئے مرزا دبیر کی شاعرانہ خوبیوں کو نظر انداز کر دیا تھا لیکن ڈاکٹر نیر نے ان کے اس مرثیہ کا اس انداز میں تنقیدی جائزہ لیا ہے جس کے سبب دبیر کی شاعرانہ عظمت بالکل صاف شفاف نظر آرہی ہے اور صاف محسوس ہوتا ہے کہ مرزا صاحب مرثی کی فنی خوبیوں، مضمون آفرینیوں اور معنی آفرینی میں انیس سے انیس نہیں نظر آتے ہیں۔ ڈاکٹر عباس رضا نیر نے مرزا صاحب کے اس مرثیے پر ناقدانہ نظر ڈالتے ہوئے سٹیج اور مکالمہ کا بہترین خاکہ کھینچا ہے اور دبیر کے فنی محاسن پر سیر حاصل بحث کی ہے۔ ڈاکٹر نیر کی تنقیدی صلاحیت اور اپنے نفس مضمون پر گرفت کا اندازہ لگانا ہو تو یہ اقتباس ملاحظہ کیجئے:

”قید خانے میں تلاطم ہے کہ ہند آتی ہے“ مذکورہ مرثیے میں

اسٹیج پر کئی کردار ایک ساتھ ابھرتے ہیں مرکزی کردار حضرت زینبؓ ہیں۔ دوسرا اہم کردار زوجہ یزید ہند کا ہے جو اس وقت کی ملکہ ہے۔ حضرت زینبؓ کے ساتھ زندان میں جتنے قیدی ہیں اسٹیج پر بیک وقت نمودار ہوتے ہیں جن میں اہم کردار عابد بیمار، کلثوم، شہر بانو، سکینہ اور کبریٰ ہیں۔ دوسری طرف قید خانے کے دربان کے ساتھ ہند کی خواص، کنیریں اور نقیب ہیں جو اس کہانی کا اسٹیج تیار کرتے ہیں۔“

مذکورہ بالا اقتباس کی روشنی میں مرزا دبیر کی خلافت اور مصنف کتاب کی وسعت نظر کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ کس خوبصورتی کے ساتھ ڈاکٹر نیر نے زندان میں بھی رٹائی ادب کا باقاعدہ ایک اسٹیج تیار کر کے مرزا دبیر کی فنی خوبیوں کو ظاہر کیا ہے اور اسٹیج کے اہم کرداروں پر باقاعدہ مکالماتی انداز میں گفتگو کرتے ہوئے نظر آ رہے ہیں۔ دبیر نے جس طرح سے پوری ایک روایت کو مرثیے کا جامہ پہنایا ہے، چاہے وہ منظر کشی ہو یا مکالمہ نگاری، اعلیٰ اخلاقی اقدار کے نمونے ہوں یا حالات کی ستم ظریفی، ڈاکٹر نیر نے مرزا صاحب کی فنی خوبیوں کو ہر نبج سے روشن کرنے کی کامیاب کوشش کی ہے۔ ڈاکٹر نیر نے دبیر کے اس مرثیے کے تجزیے میں مرزا دبیر کی مکالمہ نگاری پر اس خوبصورتی سے بحث کی ہے کہ مکالمہ نگاری کے لحاظ سے جتنی اور خوبیاں کلام میں ہونا چاہئے سب واضح اور روشن ہو گئی ہیں۔ بیت ملاحظہ ہو:

آہ کرنے کا سبب پوچھا تو شرماتے لگے
تازیانوں کے نشان پشت پہ دکھلانے لگے

چنانچہ لکھتے ہیں:

”ان مکالماتی لہجوں میں آپ نے دبیر کا ہنر ملاحظہ کیا دبیر کے علاوہ کوئی اور یہاں ہوتا تو شاید مکالمے کا فطری پن غارت ہو جاتا

لیکن دبیر کا کمال یہ ہے کہ ایسی کشمکش کے باوجود مکالمے کو کہیں سے غیر فطری نہیں ہونے دیا بلکہ مکالمے کا نقطہ کمال یہ ہے کہ جہاں کردار خاموش ہو وہاں منظر بولنے لگے۔“

مندرجہ بالا اقتباس کی روشنی میں یہ کہا جاسکتا ہے کہ ڈاکٹر نے اپنے تجزیے کے لیے جو عنوان قائم کیا ہے وہ اس سے کہیں بھی انحراف نہیں کرتے بلکہ ان کا نقطہ نظر اسی مرکز پر گھومتا رہتا ہے اور وہ اپنے قائم کردہ عنوان کی جامعیت اور مانعیت کو برقرار رکھتے ہیں۔

انیس و دبیر کے بعد مرثیہ نگاری نے کس حد تک پیش قدمی کی ہے اور وہ کون سے مرثیہ نگار ہیں جنہوں نے اردو مرثیہ نگاری کی قدیم روایت سے انحراف کرتے ہوئے جدید مرثیہ نگاری کی بنیادوں کو استوار کرنے میں اہم کردار ادا کیا ہے۔ تو ان میں سب سے پہلا نام جمیل مظہری کا ہے۔ جمیل مظہری اردو ادب کی صنف مرثیہ سے تعلق رکھنے والے وہ شاعر ہیں جن کا انداز جداگانہ ہے انسانی نفسیات اور کشمکش کے حالات اور کیفیات کے بیانیے میں جمیل اپنا ثانی نہیں رکھتے۔ کتاب میں شامل مضمون ”جمیل مظہری کا مرثیہ شام غریباں“ کے مطالعے کے بعد یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ جمیل مظہری فن کے حصول کے لیے مقصدیت کو فراموش نہیں کرتے۔ مرثیہ شام غریباں میں جمیل مظہری نے مرکزی کردار کر بلا کی شیردل خاتون حضرت زینبؓ کے کردار کو پوری فنی اور فکری توانائی کے ساتھ پیش کیا ہے۔ کتاب کے مصنف ڈاکٹر عباس رضا نیر نے جمیل مظہری کے اس مرثیے کا تجزیہ کر کے صاحبان ذوق کے لیے جمیل فنی کا ایک نیا باب کھولا ہے۔ اقتباس ملاحظہ کیجئے:

”جمیل مظہری انسانی نفسیات، اضطرابی کیفیات اور اضطرابی کشمکشوں کی تصویر کشی کا سلیقہ بدرجہ اتم رکھتے ہیں بلکہ انہیں

خصوصیات کی بنا پر وہ اردو ادب میں اپنی علاحدہ شناخت رکھتے ہیں۔ چنانچہ انہوں نے اپنے اس مرثیہ شامِ غریباں میں ان کشمکشوں اور کیفیتوں کو الفاظ کا جامہ دینے کی ایک مختصر ہی لیکن نہایت کامیاب کوشش کی ہے۔ انہیں محاسن اور انہیں خصوصیات کی بنا پر جدید اردو مرثیے کے سرمائے میں جمیل مظہری کا یہ مرثیہ شاہکار کی حیثیت حاصل کر گیا ہے۔“

کتاب میں شامل مضمون ”جمیل مظہری کا مرثیہ شامِ غریباں“ ڈاکٹر نیر کی تنقیدی بصیرت کا غماز ہے انہوں نے اس مضمون کے ذریعہ جمیل مظہری کی فنی خوبیوں اور وسعت نظری پر ناقدانہ نظر ڈالی ہے اور جدید مرثیہ نگاروں میں جمیل کو ممتاز مقام حاصل ہونے کے اسباب و علل تلاش کئے ہیں۔ جدید مرثیہ کی تاریخ میں جوش کے ہم عصر رہے اور نادر خیالات کی پیش کش میں اعلیٰ مقام رکھنے والے مرثیہ گو نسیم امر و ہوی ہیں جن کے مرثیہ کا تجزیہ کتاب کی زینت بنا ہے۔ ڈاکٹر نیر نے اپنے مضمون ”آنسو، تلوار اور کربلا“ میں نسیم امر و ہوی کے مرثیے عابد بیمار کا تجزیہ کر کے مرثیے کی اہمیت و معنویت کو واضح کیا ہے نیز ایک اچھا نفاذ ہونے کا ثبوت دیتے ہوئے غیر جانب دارانہ انداز میں آنسو اور تلوار کے اس معرکے میں جوش کے برخلاف نسیم امر و ہوی کے ساتھ کھڑے نظر آ رہے ہیں۔ (حالانکہ ڈاکٹر نیر نے اپنے اس مضمون میں جوش کے نظریے کی وجہ بھی بتائی ہے جس کی وجہ سے جوش آنسو اور تلوار کی جنگ سے متعلق نظریے کے سلسلے میں بری الذمہ نظر آتے ہیں) اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جاسکتا کہ اگر آنسو کا جہاد نہ ہوتا تو باطل پرست طاقتوں کے کالے کارنامے تاریخ کے گھٹا ٹوپ اندھیروں میں چھپ جاتے اور پھر حق و باطل میں تمیز کرنا مشکل ہو جاتا۔ تاریخ گواہ ہے کہ یہی وہ آنسو ہیں جو باطل کی ذلت و رسوائی کا سبب بنے ہیں عصر عاشور سے لے کر شام و کوفہ کی منزلیں اور اس کے بعد عابد

بیمار کی مدینہ کی بقیہ زندگی پر نظر کی جائے تو عابد بیمار نے اپنے آنسوؤں کا سہارا لیتے ہوئے باطل کی قلعی کھولی ہے اور یہی آنسو آج بھی باطل کو سراٹھانے سے روکے ہوئے ہیں۔ اقتباس ملاحظہ ہو:

”آنسو اور تلوار کے معرکوں میں اثر و نفوذ کے حوالے سے تقابلی گفتگو کرتے وقت حد امکان پر نظر ڈالی جائے تو تسلیم کرنا پڑے گا کہ خندق و خیبر اور بدر و احد کی شجاعتوں کو بھی معتبر اور مستند کرنے کے لیے کربلا کو آنسوؤں کا جہاد کرنا لازمی تھا۔ شاید اسی لئے حسینؑ عباسؑ و علی اکبرؑ اور حبیبؑ و سعیدؑ جیسے سوراؤں اور ساونتوں کے ساتھ سجادؑ اور زینبؑ کو بھی لے کر صحرائے کربلا تک آئے تھے کہ یہ جنگ فقط تلوار کے وار سے فتح نہیں ہو سکتی اس کے لیے زنجیروں کی جھنکار بھی ضروری ہے اور آنسوؤں کی للکار بھی اور خود حضرت عابدؑ نے امام حسینؑ کے مقصد عظیم کو اس طرح سے پورا کیا“

عبارت بالا کی روشنی میں ڈاکٹر نیر کی تاریخ پر دسترس کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔ بہر حال اس مضمون میں ڈاکٹر نیر نے نسیم امر و ہوی کو جدید مرثیہ نگاری کے سارے تقاضوں کو پورا کرنے والا ایک عمدہ مرثیہ نگار قرار دیا ہے جس کے وہ ہر لحاظ سے مستحق ہیں۔

اردو مرثیہ کے ارتقاء میں شہزاد معصومی کا بھی اہم کردار رہا ہے۔ سائنسی اور اخلاقی پہلوؤں کو مرثیہ میں چہرے کے طور پر استعمال کرنے والے شہزاد معصومی انیس سے زیادہ متاثر نظر آتے ہیں کتاب میں شامل مضمون ”سفر معراج اور شہزاد معصومی“ کے حوالے سے ڈاکٹر نیر نے ان کے مخصوص مرثیے کا تجزیہ کیا ہے، شہزاد معصومی نے اس مرثیے میں مرسل اعظم کے سفر معراج پر خوبصورت بحث کرتے ہوئے حضرت علیؑ اور امام

مضمون ”میر کی غزلوں میں علامات کر بلا“ کے حوالے سے تجزیہ شدہ غزل کے دو شعر ملاحظہ ہوں:

اس دشت میں اے سیل سنبھل کر ہی قدم رکھ
ہر سمت کو یاں دفن مری تشنہ لبی ہے
زیر شمشیر ستم میر ترپنا کیسا
سر بھی تسلیم محبت میں ہلایا نہ گیا

ہم دیکھتے ہیں کہ میر کے یہ اشعار اپنے اندر کر بلا کی پوری تاریخ سموئے ہوئے ہے اور دشت، دفن، تشنہ لبی کا بدیہی تعلق سانحہ کر بلا میں موجود ہے اسی طرح مرزا غالب کی غزلوں میں واقعہ کر بلا کے متعلق استعارات، علی سردار جعفری اور عرفان صدیقی کی شاعری میں مبہم پیغامات و علامات کر بلا کے عناصر کو ڈاکٹر نیر نے اپنی فنکارانہ بصیرتوں کی بنیاد پر پرکھا ہے اور ان شعراء کے کلام پر مستقبل قریب میں کام کرنے کے نئے امکانات روشن کئے ہیں۔ دنیائے اردو ادب میں مرثیہ کی تنقید کے حوالے سے شبلی کی شہرہ آفاق تصنیف موازنہ انیس و دہر اپنی ایک الگ حیثیت کی حامل ہے اور یہی وہ کتاب ہے جس کے ذریعہ اردو ادب میں تقابلی تنقید کا آغاز ہوتا ہے۔ شبلی کی اس کتاب پر دنیائے ادب میں کافی کچھ لکھا جا چکا ہے۔ ڈاکٹر نیر نے ”مطالعہ مراٹھی کی خشت اول“ کے عنوان سے موازنہ انیس و دہر کو موضوع بناتے ہوئے کچھ نئی باتوں کو پیش کرنے کی کامیاب کوشش کی ہے نیز شبلی پر اکابر پرستی کے الزام کو کچھ کم کرنے کی کوشش کی ہے اور اس بات پر زور دیا ہے کہ شبلی نعمانی نے مرزا دبیر کے کلام میں جو خامیاں بیان کی ہیں وہ انیس کے کلام کی خوبیاں بیان کرنے کے لیے ان کی ضرورت بن گئی تھیں اس لیے شبلی کو موازنے کا سہارا لینا پڑا۔ اقتباس ملاحظہ ہو:

حسین کی معراج پر جداگانہ ارتباط پیش کیا ہے۔ اس مرثیے میں شہزاد تین معراج کا ذکر کرتے ہیں پہلی معراج رسول عربی کی معراج ہے اور دوسری معراج دوش نبی پر حضرت علی کی معراج نیز تیسری معراج کو دوران طفلی میں امام حسین کا پشت نبی پر سوار ہونے سے تعبیر کیا ہے۔ ڈاکٹر نیر نے پورے مرثیے کا تجزیہ کر کے آئندہ کے لیے شہزاد معصومی کو سمجھنے اور ان پر کام کرنے کے لیے نئے راستے ہموار کئے ہیں۔ شہزاد اپنے مراٹھی میں سائنسی خیالات ضرور پیش کرتے ہیں مگر وہ خیالات قرآنی تعلیمات کے مخالف نہیں ہیں۔ ڈاکٹر نیر صاحب کے مضمون کا اقتباس ملاحظہ ہو:

”کم نظر انسان سائنسی ترقیوں کو قرآنی افکار کا مخالف سمجھتا ہے۔ لیکن شہزاد معصومی واضح کرنا چاہتے ہیں کہ سائنسی اور قرآنی فکر میں کوئی اختلاف نہیں ہے۔ بلکہ سائنسی افکار کی کامیابی اسی میں ہے کہ وہ قرآنی افکار کی انگلی تھام لیں۔ دنیا لاکھ ترقی کر لے لیکن اپنے حدود سے باہر نہیں جاسکتی۔“

(رثائی تنقیدیں)

اس لحاظ سے بھی اہم ہے کہ اس میں مخصوص مزاجی کے علاوہ اردو ادب کے بلند پایہ شعراء، جو سانحہ کر بلا سے کافی زیادہ متاثر نظر آتے ہیں ان کی غزلیات میں علامات کر بلا کے پہلوؤں کو تلاش کیا گیا ہے حالانکہ زیادہ تر نقاد اردو غزل کو عشق و عاشقی کے رشتے والی صنف قرار دیتے ہیں، ڈاکٹر نیر نے میر، غالب، سردار جعفری، اور عرفان صدیقی جیسے نامور شعراء کی غزلوں میں کر بلا اور اس کے تعلقات پر سیر حاصل بحث کی ہے اور اپنی تنقیدی بصیرت کے ذریعہ غزلیات کا بہترین تجزیہ کر کے دور جدید کے نقادوں کے لیے راہ ہموار کی ہے۔ چونکہ میر کی پوری زندگی رنج و الم و غم کا نمونہ رہی ہے اس لیے ان کی غزلوں میں علامات کر بلا کے پہلو زیادہ صاف نظر آتے ہیں۔ کتاب میں شامل

”موازنہ انیس و دبیر“ کا بنیادی موضوع انیس و دبیر کا موازنہ نہیں بلکہ میر انیس کے شعری امتیازات کو واضح کرنا ہے۔ چونکہ عربی ادب کی ابتدائی تنقید میں موازنے کا چلن عام تھا۔ جریر اور فرزدق جس کی روشن مثال ہیں۔ عربی کے ہی زیر اثر اردو میں بھی میر و سودا، آتش و ناسخ، انشا و مصحفی اور نسیم و حسن کے موازنے کا سلسلہ چل پڑا۔ اسی روایت کے تحت شبلی نعمانی نے بھی انیس کے شعری امتیازات کو نمایاں کرنے کے لیے مرزا دبیر کی شاعری کو ان کے پہلو میں رکھ کر موازنے کا ہی سہارا لیا۔“

یوں تو انیس شناسی کے حوالے سے بیشتر محققین نے اپنی اپنی رائے قائم کی لیکن تاریخ ادب گواہ ہے کہ اکثر و بیشتر ناقدین شبلی کے حصار سے نہیں نکل سکے لیکن پروفیسر فضل امام نے اپنا الگ راستہ چنا اور محض انیس شناسی کو موضوع بنا کر نادر و نایاب کتاب لکھی جسے اردو ادب میں ”انیس: شخصیت اور فن“ کے نام سے جانا جاتا ہے اس کتاب کو انیس فہمی کے سلسلے میں گرافندر سرمائے کے طور پر دیکھا جاتا ہے اس میں پروفیسر فضل امام نے پانچ الگ الگ باب قائم کئے ہیں اور اردو مرثیہ قبل انیس، انیس کی شخصیت، انیس کی مرثیہ نگاری، انیس کی رباعیات اور انیس کی سلام نگاری جیسے نادر موضوعات پر سیر حاصل بحث کی ہے پروفیسر فضل امام کی یہ کتاب دور جدید میں کافی مقبول ہوئی ہے اس کے مطالعہ کے بعد مصنف کی عمیق نظری اور تنقیدی بصیرت کا اندازہ بخوبی لگایا جاسکتا ہے کتاب میں شامل مضمون کے ذیل میں ڈاکٹر نیر لکھتے ہیں:

”اردو میں ڈی۔ لٹ کے لیے تحقیقی و تنقیدی مقالے تو بہت سے لکھے گئے ہیں لیکن پروفیسر فضل امام کے مقالے ”انیس: شخصیت اور فن“ نے جس طرح اپنے زمانے کے نامور ادیبوں اور دانشوروں

سے داد و تحسین حاصل کی اس کی دوسری مثال نہیں ملتی۔“

ڈاکٹر نیر نے پروفیسر فضل امام کی تصنیف پر گہری نظر ڈالتے ہوئے کتاب کی اہمیت و افادیت کو بخوبی واضح کیا ہے۔

عصمت چغتائی فکشن کی دنیا سے تعلق رکھنے والی ایسی ناول نگار ہیں جنہوں نے عورتوں کے حقوق اور ان کی راہوں میں آنے والے مشکل مسائل کو اپنے ناولوں کا موضوع بنایا ہے۔ ڈاکٹر نیر نے ان کے مشہور زمانہ ناول ”ایک قطرہ خون“ کا تنقیدی جائزہ لیکے ناول کے متعلق کئی تیسرے سوالات قائم کیے ہیں۔ جن کے جوابات کے متلاشی صاحبان ذوق اور صاحبان فکر و نظر کو نئے سرے سے عصمت کو سمجھنے کا موقع ملتا نظر آ رہا ہے۔

سرزمین کر بلا پر ۱۰ محرم کو رونما ہونے والے المناک واقعے کو ناول کی شکل عطا کرنے والی عصمت چغتائی نے کر بلا کے واقعہ کو مراٹھی انیس سے اخذ کیا ہے۔ ۳۷۹ صفحات پر مشتمل اس ناول کو عصمت نے ۲۶ ابواب پر منقسم کر کے واقعہ کر بلا کے تناظر میں اپنی فکری و فنی صلاحیت کا اظہار کیا ہے، امام حسینؑ کے وعدہ طفلی سے لے کر کے ولید کا دربار اور پھر ۱۰ محرم کے احوال کو بیان کرتے ہوئے شام و کوفہ کی منزلوں کو بیان کیا ہے۔ کہنے کو تو عصمت نے ایک اچھی کوشش کی ہے لیکن ڈاکٹر نیر کے اس ناول کے تنقیدی جائزے کے بعد ناقابل تردید حقیقت سامنے آتی ہے کہ عصمت چغتائی ناول ایک قطرہ خون میں ناول کے سارے تقاضوں کو پورا کرنے سے قاصر رہی ہیں چاہے وہ پلاٹ اور کردار ہو یا آغاز و انجام۔

اس سلسلے میں اقتباس ملاحظہ ہو:

”ناول ”ایک قطرہ خون“ لکھ کر عصمت چغتائی کا ذہنی اور فکری مقصد بہر حال پورا ہو گیا لیکن بحیثیت فن سوال یہ ہے کہ تکنیک، پلاٹ، کردار، مکالمے، آغاز، انجام، منظر، ماحول، کرافٹ اور کلائمکس

کے جو خاکے سامنے رکھ کر ایک ناول نگار اپنے ناول کا تانا بانا جس طرح تیار کرتا ہے کیا وہ سب ”ایک قطرہ خون“ میں موجود ہے۔ پلاٹ مختلف واقعات کو مربوط کرتا ہے، تو کیا، ”ایک قطرہ خون“ کا پلاٹ واقعے کے سارے وقوعوں کو مربوط کر سکا ہے؟ کہیں ایسا تو نہیں ہے کہ عصمت کے ناول کے سارے ابواب انیس کے الگ الگ مرثیوں کی تلخیص ہو کر رہ گئے ہیں؟ کیا کر بلا کے بعد اسیران کر بلا سے زندان شام تک صرف اور صرف شیریں اور ہند کی ہی ملاقات ہوتی ہے، کہیں ایسا تو نہیں ہے کہ کہانی کے تسلسل میں تاریخ کا تسلسل ٹوٹ گیا ہو،

ایسے بیشتر سوالات ہیں جو تشنہ ہیں اور ناول ایک قطرہ خون پر سوالیہ نشان قائم کرتے ہوئے نظر آ رہے ہیں۔

اردو کے رثائی ادب پر موقع موقع سے تنقیدی اور تجزیاتی مضامین منظر عام پر آتے رہے ہیں لیکن مرثی، غزل اور فلشن میں رثائی عناصر کس حد تک پائے جاتے ہیں اور رثائی ادب نے اردو ادب کے ارتقا میں کیا کردار ادا کیا ہے۔ اس کی تعبیر و تفہیم کے لیے کوئی مبسوط کتاب منظر عام پر نہیں آئی تھی اس لیے ڈاکٹر عباس رضانیر کی کتاب ”رثائی تنقیدیں“ رثائی ادب کی افہام و تفہیم کے لیے ایک دستاویز کی حیثیت رکھتی ہے۔

☆☆☆

رثائی تنقیدیں: میری نظر میں

صبیحہ

ساڑھے چودہ سو سال پہلے رونما ہوا تاریخ کا سب سے المناک سانحہ واقعہ کر بلا جس میں امام حسینؑ اور ان کے عزیز واقارب اسلام اور انسانیت کی بقا کے لیے اپنے بہتے ہوئے خون سے تلوار کو سیراب کیا۔ ہر ہر فرد انسانیت کے پیکر میں تراشا ہوا وہ کوہ نور ہیرا جس کی چمک وقت کے تیز قدموں کے ساتھ بڑھتی جا رہی ہے۔ اس پرسوز واقعہ کو ہر دور میں ادبا، شعرا و دانشوروں نے کبھی مرثیہ میں کبھی غزل و نظم کے استعارات میں پیش کیا ہے۔ تو کبھی فلشن کے انداز میں پیش کیا ہے۔ ان سارے رثائی استعارات کو ان کے متعلقات کی افہام و تفہیم ڈاکٹر عباس رضانیر نے اپنی کتاب ”رثائی تنقیدیں“ میں ایک ساتھ پیش کرنے کی کوشش کی ہے۔ آگے کتاب میں شامل سارے مضامین کی تعبیر و تفہیم کے لیے الگ الگ روشنی ڈالی جائے گی۔

جب کسی شخص کی شخصیت بن جاتی ہے تو وہ چھوٹی ہو یا بڑی تو سب اس پر لکھتے اور پڑھتے رہتے ہیں اور جب اس پر لکھا اور پڑھا جانے لگے تو وہ شخصیت دوسروں کے لیے مشعل راہ بنتی ہے۔ ”رثائی تنقیدیں“ مجھے ایک گلدستے کے مانند لگی جس میں مختلف پھول ہیں جو اپنی بھینی بھینی خوشبو سے دل و دماغ کو تروتازہ کر رہے ہیں۔ اور ان پھولوں کی سب سے بڑی خاصیت یہ ہے کہ یہ کبھی نہ مرجھانے والے پھول ہیں اور ان کی خوشبو بھی نہ ختم ہونے والی خوشبو ہے۔

مختلف پھولوں کے ثبات میں آپ کے وہ انتخاب اور زاویے ہیں جو عنوان سے ظاہر ہوتے ہیں مثلاً انیس کا ایک خاص مرثیہ ”جب کربلا میں داخل شاہ دیں ہوا۔“ کے تحت آپ نے پیکر تراشی عنوان دیا۔ اور اس مرثیے کے مرکزی کردار حضرت عباس کے پیکر کو مرثیے کی روشنی میں اتنا نکھار کے پیش کیا ہے کہ اخلاقی قدروں کے لیے صرف اور صرف حضرت عباسؑ کی مثال کافی ہوگی۔ آئیے سنتے ہیں حضرت عباسؑ کو نیر صاحب کے لفظوں میں:

”عباسؑ قبر بنی ہاشم ہیں۔ ابوطالب کی فصاحتوں کے ہی نہیں بلکہ سخاوت، شجاعت، جرأت اور پیمان پروری کے بھی وارث ہیں۔ علیؑ کی بلاغتوں کے ہی نہیں بلکہ علمبرداری اور مشکل کشائی کے بھی ورثہ دار ہیں۔ حسینؑ مظلوم کے قوت بازو ہی نہیں لشکر حسینؑ کے اعتماد و اعتبار بھی ہیں۔ حسینؑ کے لشکر کے ہی علمدار نہیں مقصد کے بھی علمدار ہیں۔ مخدرات عصمت کی امیدوں کا سہارا، اطفال حسینؑ کے دلوں کی ڈھارس اور پیاسوں کی امیدوں کا اول و آخر مرکز ہیں۔“

نیر صاحب نے انیس کا ایک اور مرثیہ ”اے مومنو! کیا صادق الاقرار تھے شبیر“ کو بیانیہ اور کہانی پن کی عینک سے دکھایا ہے۔ قصہ امام حسینؑ اور ان کی بیوی شہر بانو کی گفتگوئے محبت سے شروع ہوتا ہے اور پھر حضرت شہر بانو کی خاص کنیر شیریں پر آتا ہے۔ جسے امام حسینؑ بعد میں آزاد کر دیتے ہیں۔ امام حسینؑ کے اس وعدے پر کہ کسی دن امام حسینؑ اور دیگر حضرات اس کے یہاں مہمان ہوں گے رخصت طلب کرتی ہے۔ امام حسینؑ وعدہ کر لیتے ہیں۔ شیریں کا قصہ وعدے سے شروع ہوتا ہے۔ لیکن یہ وعدہ کیسے پورا ہوتا ہے یہ بیانیہ کا حسن اور کلائمکس ہے۔:

فرمایا نہ کڑھ پورے سب ارماں ترے ہوں گے
ہم ساتھ حرم کو لئے مہماں ترے ہوں گے

لٹوا کے گھر اور تیغ سے کٹوا کے سر آئے
فرمایا تھا آؤں گا سویوں میرے گھر آئے

”رثائی تنقیدیں“ میں نیر صاحب کی ایک جداگانہ خصوصیت جس کی وجہ سے قاری مرثیوں میں مزید لطف حاصل کرتا ہے۔ وہ ہے نیر صاحب کا انداز بیان۔ آپ مرثیے کو جس زاویے سے قاری کو سمجھانا چاہتے ہیں اس زاویے کے تمام لوازمات کو سادے اور سلجھے ہوئے الفاظ میں بیان کر دیتے ہیں۔ خواہ وہ پیکر تراشی کا ہو یا پھر کہانی اور بیانیہ کے۔ بقول ڈاکٹر نیر صاحب:

”اچھی کہانی، بری کہانی، بڑی کہانی، چھوٹی کہانی، کہانی بہر حال کہانی ہوتی ہے۔ کبھی کبھی کہانی کہنے کا فن بری کہانیوں کو اچھی کہانیوں میں بدل دیتا ہے، چھوٹی کہانیوں کو بڑی کہانی بنا دیتا ہے اور کبھی کہانی کہنے کے فن کی کوتاہی کے نتیجے میں اچھی کہانیاں بھی انسانی فکر کو متاثر کرنے میں ناکام رہ جاتی ہیں۔ یہ کہانی کہنے کا فن ہی ہے۔ جو فرضی واقعات کو تاریخی واقعیت کے زمرے میں داخل کر دیتا ہے اور کبھی کبھی تاریخی واقعیت کہانی کہنے کے فن کے فقدان کے سبب داستان گم گشتہ ہو کر رہ جاتی ہے۔“

ڈاکٹر عباس رضا نیر صاحب نے اپنے اس گلدستہ میں دبیر کا ایک خاص مرثیہ ”قید خانے میں تلاطم ہے کہ ہند آتی ہے۔“ شامل زینت کیا ہے اور اس مرثیے کو ڈرامائی عناصر میں پیش کر کے قاری کو مستفید کیا ہے۔ انداز بیان جداگانہ ہے۔ وہ قاری کو پہلے ڈرامائی عناصر کی چند باتوں کی تنبیہ کرتے ہیں۔ ڈرامے میں پائے جانے والے کردار کی حرکات و سکنات اور بدلتی ہوئی اسٹیج کی حالت سے مکمل طور پر آگاہ کرتے ہیں اور پھر وہ مرثیہ کے بندوں کا تجزیہ پیش کرتے ہیں۔ ڈرامائی عناصر سے آگاہ کرتے ہوئے اپنے

قاری سے یوں مخاطب ہیں:

”اسٹیج ڈرامے کی بنیادی ضرورت ہے اس لحاظ سے بھی اسٹیج کو کہانی پر اہمیت حاصل ہے کہ کہانی کی بہت سی ان کہی باتوں کو اسٹیج ادا کر دیتا ہے۔ روشنیاں بولتی ہیں۔ رنگ گفتگو کرتے ہیں۔ اسٹیج کی تزئین میں کام آنے والی اشیاء بات کرنے لگتی ہیں۔ کہانی میں موجود بہت سے ڈرامائی عناصر اپنی زبان بھی نہ کھول سکیں اگر اسٹیج نہ ہو“

امام حسین اور حسین کے رفقا و اعزا کے قتل اور لاشوں کی پامالی کے بعد یزیدی فوج نے حرم کو اسیر کر کے بے کجاوہ اونٹوں پر تشہیر کی تاکہ ان کی تحقیر کی جاسکے اور انہیں قید خانے میں ڈال دیا۔ اس مرثیہ کا مرکزی کردار حضرت زینبؓ ہیں اور دوسرا اہم کردار زوجہ یزید ہند ہے جو کل تک حضرت زینبؓ کی کنیز تھی۔ ہند، حضرت زینبؓ کے آنے کی خبر سنتی ہے۔ جو ابھی تک عزیز و اقارب کے قتل پر تاسفانہ رویے کی عکاسی کر رہی تھیں وہی بی بی ہند کی آمد سے بے چین ہوئیں۔ اس غیرت مند بی بی کا اضطراب بڑھتا جاتا ہے کہ کہیں ہند بدگمان ہو کر طعن و طنز پر آمادہ نہ ہو جائے۔ موت کی تمنا کرنے لگتی ہیں:-

آسمان دور زمیں سخت کدھر جاؤں میں

بی بیول کے دعا مانگوں کی مرجاؤں میں

حضرت زینبؓ کا کردار واقعہ کر بلا میں ایسا ابھر کر آیا ہے کہ انسانی شعور کی دسترس سے ارفع و اعلیٰ نظر آتا ہے۔ ”شام غریباں“ جمیل مظہری کے مرثیے کو نیر صاحب نے فنی بصیرت کے ساتھ تجزیہ کر کے اپنی کتاب میں درج کر انسانی قدروں کی ایک اور مثال پیش کی ہے۔ حضرت زینبؓ کی شخصیت کا تعارف آپ نے کچھ یوں رقم کیا ہے:

”صاحب ذوالفقار کی بیٹی زینبؓ جس نے اپنے خطبوں سے

ذوالفقار کا کام لے لیا۔ ملکہ تطہیر کی لاڈلی زینبؓ جس نے اپنی بے

ردائی سے آیہ تطہیر کی لاج رکھ لی۔ اسلام کے پیغام حریت کی وارث زینبؓ جس نے اپنی اسیری سے آزادی فکر کی نئی صبح طلوع کر دی۔ بلاغت باب العلم کی امین زینبؓ جس نے اپنے لہجے کے اجالوں سے اندھیرے ذہنوں میں معرفت کے آفتاب روشن کر دیے، خلق حسن کی پیغامبر زینبؓ جس نے اپنے حصے کی غذائیں بیواؤں اور یتیموں کو دے کر فاقہ کش اسیروں کے دلوں میں تحت و تاج الٹنے کے حوصلے پیدا کر دیے۔ شہادت حسینؑ کی نقیب زینبؓ جس نے حسینؑ سے زیادہ عزیزوں کی قربانیاں حسینؑ کے سامنے سجا کر حسینؑ کے جذبہ فداکاری کو استحکام عطا کر دیا۔“

آنسو آنکھوں میں بھرے شام غریباں آئی

اپنے کاندھوں پہ لئے زلف پریشاں آئی

حضرت زینبؓ کے کردار کو آسانی سمجھانے کے لیے آپ نے جناب زینب کے کردار کو تین حصوں میں منقسم کر دیا ہے۔ بھائی کی محبت میں لمحہ لمحہ اضطراب و اضطراب سے گذرتی ہوئی ایک بہن۔ بیٹوں کو شہادت کے لیے آمادہ کرتی ایک ماں اور بھتیجے کی نیکی میں نصرت کا عصابتی ہوئی ایک پھوپھی۔

کچھیلی عبارتوں میں ہم نے جہاں حضرت عباسؑ کی تلوار کی چمک دیکھی تھی تو وہیں شیریں اور حضرت زینبؓ کے آنسوؤں کی بوچھاڑ دیکھی۔ اپنے اگلے مضمون کے لیے آپ نے نسیم امروہوی کا مرثیہ ”عابد بیمار“ منتخب کیا ہے اور عنوان رکھا ہے ”آنسو، تلوار اور کر بلا جس میں ایک سوال کھڑا کرتے ہوئے کہ تلوار کی کاٹ زیادہ ہے یا آنسوؤں کی مار؟ اس کا جواب دیتے ہوئے آپ یوں رقم طراز ہیں:

”واضح رہے کہ ہمارا موضوع یہ ہرگز نہیں ہے کہ کر بلا کے

سانحے میں اشک اہم ہیں یا تیغ۔ لیکن ہاں ہمارا کامل عقیدہ ہے کہ کربلا کے واقعے میں آنسوؤں کا معرکہ تلواروں کے معرکے سے کہیں زیادہ اثر انگیز ثابت ہوا ہے۔“

جہاں بھی تھے یہ بہر حال راہ عشق میں تھے
شریکِ معرکہ کربلا دُشمن میں تھے

عابد بیمار کے سلسلے میں کہی گئی بیت آنسو اور زنجیروں کے علاوہ ان کی دعائیں ان کے سجدے اور ان کی عبادتیں اپنے آپ میں خود ایک عظیم جہاد کا حصہ ہیں۔ وہ کہیں مجبور نظر نہیں آتے۔

نیر صاحب نے اپنے اگلے مضمون میں شہزاد معصومی کا مرثیہ ”قتل حسین اصل میں مرگ یزید ہے“ کے حوالے سے تین طرح کے سفر معراج کو ہمسفر بنایا ہے اس تین طرح کے اور تین اشخاص کی معراج کو نیر صاحب نے الگ الگ اور واضح انداز میں بیان کیا ہے۔ پہلا سفر معراج خاتم النبیین محمدؐ کا ہے جس کی صداقت میں قرآنی آیت پیش کی ہے اور پھر آیت کی نحوی تشریح بھی کی ہے۔ اس کے بعد حضرت علیؑ کے سفر معراج کو بتایا ہے۔ حضرت علیؑ کے دوش محمدؐ پر قدم رکھنے کو سفر معراج سے تعبیر کیا ہے۔ بقول عباس رضا نیر صاحب:

”قابِ قوسین پر قدم رکھنا۔ محمدؐ کی معراج ہے اور خود صاحبِ معراج کے دوش پر قدم رکھنا یہ علیؑ کی معراج ہے۔ محمدؐ کی معراج عرشِ اعظم پر ہوئی اور علیؑ کی معراج کعبہٴ معظم میں۔“

اس کے بعد تیسرا سفر معراج امام حسینؑ کا چونکہ نماز بندوں کی معراج ہے جس کا سفر تکبیر سے شروع سلام پر ختم ہوتا ہے۔ اس معراج کی تین منزلیں ہیں قیام، رکوع، اور سجدہ۔ سجدہ معراج بندگی کے لیے منزلِ قوسین ہے اور حسینؑ عالمِ طفلی میں اس وقت دوشِ رسولؐ پر آئے جب وہ حالتِ سجدہ میں تھے۔ جسے حسینؑ کے لیے معراج قرار دیا گیا۔

پشتِ نبیؐ پر سجدے میں شبیر آگئے
بچپن کے کھیل کھیل میں معراج پاگئے

آپؐ نے اپنی کتاب کی تزئین کے لیے صرف مرثیوں کا سہارا نہیں لیا بلکہ ان غزلوں کا بھی جائزہ لیا ہے جن میں استعارات کربلا پائے جاتے ہیں۔ لہذا آپؐ نے میرؒ اور غالبؒ کی وہ غزلیں پیش کی ہیں جن میں بونے کربلا آتی ہے۔ مثلاً میرؒ کا یہ شعر:

اس دشت میں اے سیل سنبھل کر ہی قدم رکھ
ہر سمت کو یاں دفنِ مری تشنہ لبی ہے

دھوپ میں جلتی تھیں غربتِ وطنوں کی لاشیں
تیرے کوچے میں مگر سایہٴ دیوار نہ تھا

تشنہ لبی، دھوپ میں بے گور و کفن لاشیں جلنا یہ سب علامات کربلا ہی ہیں جن کو میرؒ نے اپنے شعور کا حصہ بنالیا۔

بھلے ہی غالبؒ نے کوئی مرثیہ نہ لکھا ہو لیکن غالبؒ کی غزلوں میں پائی جانے والی علامات کربلا کی بنا پر سانحہٴ کربلا سے وابستگی کا انکار نہیں کیا جاسکتا۔ مثلاً غالبؒ کا یہ شعر:

سر پر ہجومِ دردِ غربتی سے ڈالے
وہ ایک مشتِ خاک کہ صحرا کہیں جسے

کانٹوں کی زباں سوکھ گئی پیاس سے یارب
اک آبلہ پا وادیٰ پر خار میں آوے

غریب الوطن، دردِ غربتی لئے صحرا میں پھر رہا ہے اور اس کے حوصلے کی شان کیا کہئے کہ صحرا سے ایک مشتِ خاک کے مانند نظر آ رہا ہے۔ اسی پر خار وادیٰ کربلا کے علاوہ کیا ہو سکتی ہے۔

نیر صاحب نے غزلوں کے علاوہ علی سردار جعفری کی وہ نظمیں بھی منتخب کی ہیں جن میں علامات کر بلا پائی جاتی ہیں۔ ذرا غور کیجئے کہ میر، غالب، انیس و دیر اور پھر سردار جعفری اور عہد حاضر تک ہر دور میں ساڑھے چودہ سو سال قبل رونما ہوا یہ سانحہ اپنے اپنے زمانہ کے لیے مشعل راہ بنا۔ سب اپنے اپنے دور میں پھیلے یزیدیت پرست ذہنوں کو للکار تے ہوئے نظر آتے ہیں۔

سردار جعفری کی ایک نظم ”لہو پکارتا ہے“ کے بارے میں نیر صاحب کچھ اس طرح عہد حاضر کے یزید سے مخاطب ہیں:

”لہو صرف آواز نہیں لگاتا بلکہ دعوتِ عمل دیتا ہے۔ سچائی کی تشہیر اور حق کی تبلیغ کرتا ہے۔ اپنی عظمت کا اعلان کرتا ہے۔ اپنی فتح کا پرچم بلند کرتا ہے۔ اپنے اوپر ہونے والے مظالم کے خلاف احتجاج بلند کرتا ہے۔ جو لہو اپنی مظلومی پر خاموش ہو جائے وہ لہو نہیں آنسو ہے“

لہو پکارتا ہے جیسے خشک صحرا میں
پکارا کرتے تھے پیغمبران اسرائیل

میر، غالب اور سردار جعفری کے علاوہ عرفان صدیقی کی وہ نظمیں اور غزلیں منتخب کی ہیں جن میں علامات کر بلا پائی جاتی ہیں۔ عرفان صدیقی کی ایک نظم ”شب درمیاں“ کے بارے میں آپ کہتے ہیں کہ اس صدائے مسلسل کا تعلق خارجی آواز سے نہیں بلکہ اندرون ذات سے ہے۔ عرفان صدیقی کی نمایاں خوبی یہ ہے کہ انہوں نے روایتی الفاظ میں نئی معنویتوں کی سیر بھی کرائی ہے۔ مثلاً سیل خون، دشت بلا، سناں وغیرہ۔ عرفان صدیقی کا ایک شعر دیکھیے:

زرد دھرتی سے ہری گھاس کی کونپل پھوٹی
جیسے اک خیمہ سردشت بلا لگتا ہے

اس کا ایک معنی نیر صاحب یوں بیان کرتے ہیں۔ شعر میں زرد دھرتی سے ہری گھاس کی کونپل پھوٹنے کا استعارہ اگر شر سے خیر کی نمو ہے تو اس سے ذہن حر کے کردار کی طرف منتقل ہوتا ہے جو باطل کی زمین چھوڑ کے حق کے خیمے میں آگیا کونپل وہ امید ہے جو حر کی طرف سے امام حسین کو پہلے سے تھی۔

بلاشبہ علامہ شبلی نعمانی کی موازنہ انیس و دیر، موازنہ کے اعتبار سے خشتِ اول ہے اور خشتِ اول کی بنا پر اہمیت کی حامل ہے بھلے ہی اس کتاب کے سلسلے میں بعض ناقدین نے شبلی پر اعتراض کیا ہے کہ انہوں نے انیس کے مرثیوں سے اس قدر طویل اور شاندار مثالیں پیش کی ہیں اور دیر کے کام کو تراشنے میں کوئی خاص مشقت نہیں کی ہے۔ اعتراض یہاں تک ہوتا ہے کہ شبلی نے دیر کے حوالے سے جو مثالیں پیش کی ہیں یا تو مرزا دیر کی نہیں بلکہ ان کے معاصرین کی ہیں یا پھر ان پر ایسا گمان ہوتا ہے کہ ضرورت کے تحت خود شبلی نے سرسری طور پر مصرعے گڑھ لیے ہیں۔

ان اعترافات پر جواب کا کام نیر صاحب کی یہ چند سطریں کر سکتی ہیں کہ ان کا مقصد تو صرف اور صرف عربی حماسے کے مقابلے میں اردو کے ایک جامع اور مکمل شاعر کو پیش کرنا تھا اور اس سلسلے میں انہیں انیس سے بڑا کوئی شاعر نظر نہ آتا تھا۔ شبلی نعمانی کے یہاں شاعری کے جو معیار تھے میر انیس کی شاعری اس پر پوری اترتی ہے۔

نیر صاحب نے ”انیس: شخصیت اور فن“ کے مصنف پروفیسر فضل امام کو بحیثیت انیس شناس پیش کیا ہے۔ نیر صاحب کہتے ہیں:

”انیسیات کی تعبیر و تفہیم میں پروفیسر فضل امام نے کتنا خون

جگر صرف کیا ہے۔“

فضل امام نے مرثیہ سے جڑی اور انیس سے وابستہ تمام معلومات کو الگ الگ باب میں منظم طریقے سے بیان کیا ہے انیس سے قبل کی مرثیہ نگاری ہو یا انیس کے بعد

کی۔ بلاشبہ ”انیس: شخصیت اور فن“ انیس: شناسی کے میدان میں پروفیسر فضل امام کا ایک یادگار تحقیقی و تنقیدی کارنامہ ہے۔ اور آئندہ جو کچھ بھی لکھا جائے گا تو اس کتاب کو بنیادی حیثیت حاصل رہے گی۔

”رثائی تنقیدیں“ کا سفر انیس کا مرثیے سے شروع ہوتا ہے اور عصمت چغتائی کے ناول ”ایک قطرہ خون“ پر ختم ہوتا ہے۔

عصمت چغتائی نے اس عظیم الشان واقعہ کو بیان کرنے کے لیے انیس کے مرثیوں کا سہارا لیا ہے۔ جس طریقے سے انیس نے واقعہ کو بلا کو دیکھا ہے اسی طریقے سے عصمت چغتائی نے بھی دیکھنے کی کوشش کی ہے۔ ”ایک قطرہ خون“ سے پہلے پریم چند کا مشہور ڈرامہ ”کربلا“ اور بعد میں حسین الحق کا ناول ”فرات“ منظر عام پر آیا۔ لیکن اپنی زبان و بیان کی دل آویزی کی وجہ سے ”ایک قطرہ خون“ اپنے ماقبل اور مابعد دونوں ہی اہم فن پاروں سے بہر حال ایک درجہ آگے ہے۔

نیر صاحب نے ”ایک قطرہ خون“ کے تمام عنوانات ”طلوع“ سے ”مجرم کون“ جیسے ابواب پر مکمل بحث کی ہے۔ جہاں آپ نے یہ کہا ہے کہ عصمت چغتائی اپنے مقصد میں تو کامیاب ہو گئیں وہیں فنی لحاظ سے اس ناول کی کمیوں پر آپ یوں لکھتے ہیں:

”لیکن پھر بھی ایسا محسوس ہوتا ہے کہ جس طرح ایک ناول

نگار کو اپنے کرداروں میں ڈوب کر اپنے ناول کا آرٹ اور کرافٹ تیار کرنا چاہیے اس طرح عصمت چغتائی خود اپنے ناول کے کرداروں کی گہرائی میں اتر نہیں سکی ہیں۔ ناول میں ایک پھول کا مضمون ہو تو سو رنگ سے باندھوں والی شان دیکھتے دیکھتے اچانک ”بہت شور سنتے تھے پہلو میں دل کا“ والی کیفیت بھی پیدا ہونے لگتی ہے۔ ظاہری بات ہے نقش نام تمام کو کتاب سنگ ہونے کے لیے خون جگر ہونا پڑتا ہے۔ یا

”آگ کا دریا“ سے ڈوب کر ابھرنا ہوتا ہے۔ ”ایک قطرہ خون“ مکمل ناول تو نہیں کہا جاسکتا۔“

بہر حال زبان و بیان اور خراج عقیدت کے اعتبار سے عصمت چغتائی کا یہ ناول ”ایک قطرہ خون“ ایک اہم ناول ہے۔

مجموعی اعتبار سے ”رثائی تنقیدیں“ کا بالاستیعاب مطالعہ کرنے کے بعد ڈاکٹر عباس رضانیر کی فنی بصیرت، عمیق مشاہدہ اور وسیع مطالعہ کا بخوبی اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔ ہم یہاں یہ کہنے میں بھی حق بجانب ہیں کہ ڈاکٹر عباس رضانیر کی ”رثائی تنقیدیں“ اردو ادب کے رثائی ادب کی افہام و تفہیم میں اہم کردار ادا کرے گی۔



رثائی تنقیدیں: ایک جائزہ

ڈاکٹر منتظر مہدی

ڈاکٹر عباس رضا نیر ایک ہمہ جہت شخصیت کے حامل ہیں۔ یہ صرف دعویٰ نہیں اس کی دلیل میں ادب کے پرکھنے کی کسوٹی ”ادبی میزان“ اور تخلیقی ادب میں ”الہام“ کی شکل میں الہامی شاعری، عصری تقاضوں کی عکاسی کرنے والی متعدد نظمیں، جدید شاعری کے معیار پر پوری اترنے والی غزلیں، عزائی شاعری کو نئے افق سے روشناس کرانے والے سلام، قطعات اور مقبتیں، علم و دانش سے بھرپور تقریریں اور علمی و ادبی مجلسوں کی نظامتیں پیش کی جاسکتی ہیں۔ ڈاکٹر نیر کے مطالعے اور مشاہدے کے عمق کا اندازہ ”رثائی تنقیدیں“ کے مطالعے سے بخوبی لگایا جاسکتا ہے۔ وہ جس سمینار، کانفرنس یا جلسے میں ہوتے ہیں کوئی نہ کوئی نئی بات یا نیا نکتہ پیش کر کے اپنی برجستگی سے حاضرین کو اپنی جانب متوجہ کر لیتے ہیں۔

ڈاکٹر نیر کی تحریروں کی ایک اہم خصوصیت یہ ہے کہ وہ جس موضوع کو اپنے مطالعے کا حصہ بناتے ہیں اس کے سارے نکات و جہات کا احاطہ اتنی سلاست اور روانی کے ساتھ کرتے ہیں جس کے سبب قاری بڑی جلدی ان کی تحریروں سے حظ اٹھانے لگتا ہے۔ اس کا ثبوت کتاب میں شامل پہلے مضمون ”پیکر تراشی اور انیس“ کے درج ذیل اقتباس سے لگایا جاسکتا ہے:-

”میر انیس کی قدرت منظر نگاری اور ملکہ پیکر تراشی پر

ناقدین ادب کی جانب سے ہزار ہا تبصرے اور اعترافات آچکے ہیں۔ بلکہ یوں کہا جائے کہ رزمیہ شاعری میں انیس نے آج جو حیثیت حاصل کی ہے وہ دنیا کے عظیم سے عظیم شاعر کو میسر نہ ہو سکی اور اس کی وجہ ان کی یہی فطری اور حقیقی منظر نگاری اور تاریخ کے اوراق میں صدیوں کے اس پار کے کرداروں کو اپنے عہد کے جیتے جاگتے حقیقی ماحول کا ایک واقعی حصہ بنا کر پیش کرنے کا ہنر ہی ہے۔ انیس کے اس ہنر تک پہنچنے میں انسانی عقل و تصور ابھی تک حیران و عاجز ہے، نہ صرف یہ کہ شعور انسانی انیس کے مشاہدے کی باریک بینی کا معترف ہے بلکہ تمام عالم ادب واقعہ کو بیان کرنے میں انیس کی قدرت کلام کا لوہا مانتا ہے۔“

اس مضمون میں انیس کے جس مرثیے ”جب کربلا میں داخلہ شاہ دیں ہوا“ کا انتخاب کیا گیا ہے اس کا مرکزی کردار حضرت عباسؓ علمدار ہیں۔ واقعہ کربلا میں حضرت عباسؓ کے کردار کی معنویت کو میر انیس نے ہر رخ سے شعری پیکر میں ڈھالنے کی کامیاب کوشش کی ہے۔ انیس اپنی اس کوشش میں کس منزل کمال کو پہنچے ہیں اس کا اندازہ مضمون کے بالاستیعاب مطالعے سے بخوبی لگایا جاسکتا ہے۔

میر انیس کی شعری خوبیوں کو پرکھنے کے لیے ”کہانی، بیانیہ اور انیس“ کے عنوان سے میر انیس کے اہم مرثیے ”اے مومنو! کیا صادق الاقرار تھے شبیر“ کے انتخاب سے اس بات کا اندازہ ہوتا ہے کہ اگر انیس کے مرثیوں کی سنجیدگی سے تجزیہ کیا جائے تو ابھی بہت سے ایسے گوشے ہیں جن کو ان کی فنی خوبیوں کے ساتھ اجاگر نہیں کیا گیا ہے۔ ڈاکٹر نیر نے اپنے اس مضمون میں میر انیس کے مرثیوں میں پائے جانے والے کہانی پن اور اس کہانی پن کو واضح کرنے والے مضبوط بیانیہ کی جستجو کی ہے۔ ڈاکٹر نیر نے انیس کے اس مرثیہ میں کہانی اور بیانیہ کی تعبیر و تفہیم کے لیے جو تمہید باندھی ہے وہ اتنی مضبوط

بنیادوں پر استوار ہے کہ مضمون کو پورا پڑھے بغیر قاری اس کی گرفت سے باہر نہیں نکل پاتا۔ ثبوت میں شروع کا یہ اقتباس ملاحظہ کیجئے:

”اچھی کہانی، بری کہانی، بڑی کہانی، چھوٹی کہانی، کہانی بہر حال کہانی ہوتی ہے۔ کبھی کبھی کہانی کہنے کا فن بری کہانیوں کو اچھی کہانیوں میں بدل دیتا ہے، چھوٹی کہانیوں کو بڑی کہانی بنا دیتا ہے اور کبھی کہانی کہنے کے فن کی کوتاہی کے نتیجے میں اچھی کہانیاں بھی انسانی فکر کو متاثر کرنے میں ناکام رہ جاتی ہیں۔ یہ کہانی کہنے کا فن ہی ہے۔ جو فرضی واقعات کو تاریخی واقعیت کے زمرے میں داخل کر دیتا ہے اور کبھی کبھی تاریخی واقعیت کہانی کہنے کے فن کے فقدان کے سبب داستانِ گم گشتہ ہو کر رہ جاتی ہے۔ کہانی کو اگر تاریخی صداقت کا سہارا مل جائے تو جہاں کہانی کی معنویت اور اثر انگیزی ہزاروں گنا بڑھ جاتی ہے وہیں کہانی کہنے والے کی اپنی ذمہ داریوں میں بھی ہزار گنا اضافہ ہو جاتا ہے۔“

ڈاکٹر نیر نے اس مضمون میں میر انیس کے جس مرثیے کا تجزیہ کیا ہے اس کا مرکزی کردار امام حسینؑ کی زوجہ جناب شہر بانو کی کنیز شیریں ہیں۔ شیریں نے کنیزی سے ملکہ تک کا سفر طے کیا ہے اس سفر میں کتنے پیچ و خم آئے ہیں اور کن جذبات و احساسات سے دوچار ہوئی ہے یہ ایک دلچسپ کہانی ہے لیکن ایک تاریخی حقیقت بھی ہے اور تاریخی حقیقت کی واقعیت کو برقرار رکھتے ہوئے کہانی کو کلائمکس تک پہنچانا انیس کا فنی کمال ہے جو اس مرثیہ میں ظاہر ہوا ہے اور ان کے اس کمال کو ہر زاویے سے اس مضمون میں اس طرح واضح کیا گیا ہے کہ انیس کی فنی خوبیاں روشن ہونے کے ساتھ ساتھ مضمون نگار کی تنقیدی بصیرت بھی سامنے آ جاتی ہے۔

مرثیے کے تنقیدی ذخیرے کا جب ہم جائزہ لیتے ہیں تو اس نتیجے تک پہنچتے ہیں کہ ہمارے تنقید نگاروں نے انیس شناسی پر جتنی توجہ صرف کی ہے اور انیس کی فنی خوبیوں کو جس باریک بینی سے واضح کیا ہے اس کے مقابل میں دبیر شناسی پر کم توجہ دی گئی۔ حالانکہ اگر انیس و دبیر کا موازنہ شبلی نعمانی سے قطع نظر غیر جانبداری کے ساتھ کیا جائے تو اس نتیجے تک رسائی ہوگی کہ دبیر کی فنی خوبیاں اور شعری معنویتیں انیس سے کسی درجہ کم نہیں ہیں۔ ڈاکٹر عباس رضانی نے اپنے مضمون ”اسٹج مکالمہ اور دبیر“ میں دبیر کے مشہور مرثیے ”قید خانے میں تلاطم ہے کہ ہند آتی ہے“ کا تجزیاتی مطالعہ پیش کیا ہے۔ بقول ڈاکٹر نفی عابدی:

”ڈاکٹر عباس رضانی نے ایک بابی مکالمے کو اسٹج اور کہانی سے ربط دے کر تحقیق کی ایک نئی راہ کھولی ہے۔“

(انیس اور دبیر: گوپی چند نارنگ، ساہتیہ کادمی، دہلی ۲۰۰۵ء،

ص ۲۸۴)

اس مضمون کو ”رثائی تنقیدیں“ کا اہم ترین مضمون قرار دیا جاسکتا ہے کیونکہ اس مضمون میں جس گہرائی کے ساتھ دبیر کی شعری معنویت کو روشن کیا گیا ہے وہ دبیر شناسی کے نئے باب واکر تا ہے۔ کس طرح یہ اس اقتباس میں ملاحظہ کیجئے:

”ان مکالماتی لہجوں میں آپ نے دبیر کا ہنر ملاحظہ کیا دبیر کے علاوہ کوئی اور یہاں ہوتا تو شاید مکالمے کا فطری پن غارت ہو جاتا لیکن دبیر کا کمال یہ ہے کہ ایسی کشمکش کے باوجود مکالمے کو کہیں سے غیر فطری نہیں ہونے دیا بلکہ مکالمے کا نقطہ کمال یہ ہے کہ جہاں کردار خاموش ہو وہاں منظر بولنے لگے۔ چنانچہ اس مکالمے میں ہند کے ذریعہ عابد بیمار سے آہ بھرنے کا سبب پوچھے جانے پر جہاں بیمار قیدی کے لب

خاموش ہو جاتے ہیں وہاں پشت پر تازیانوں کے نشان بولنے لگتے ہیں۔ جو دبیر کی قدرت فن کا بے مثال نمونہ ہیں۔“

دبیر کے جس مرثیے کا جائزہ اس مضمون میں لیا گیا ہے وہ دبیر کا معرکہ آرا مرثیہ ہے۔ مرثیے کو منزل کمال تک پہنچانے میں جن اجزا کی ضرورت تھی ان سب کو بروئے کار لاتے ہوئے مرزا دبیر نے ایک شاہکار تخلیق کیا ہے۔ دبیر کا یہ مرثیہ شاہکار کیوں ہے اس کا اندازہ مضمون کے بہ نظر غائر مطالعے سے لگایا جاسکتا ہے۔

جدید مرثیہ نگاری کی تاریخ میں جمیل مظہری ایک اہم ستون کی حیثیت رکھتے ہیں مرثیے کے کلاسیکی شعر کی قائم کردہ روایت کی پیروی کے باوجود بھی جمیل مظہری نے معاصر تقاضوں کے اظہار کے لیے وہ انداز بیان اختیار کیا ہے جو جدید شعرا میں ان کو منفرد بناتا ہے۔ جمیل مظہری کے مراٹھی میں ”شام غریباں“ ان کا اہم ترین مرثیہ شمار ہوتا ہے کیونکہ جمیل مظہری نے اس مرثیے میں وہ اسلوب پالیا ہے جو جدید مرثیے میں المیہ و عزائیہ تاثر پیدا کر کے اس کے تمام تر لوازمات و رجحانات کو یکساں طور پر ایک کل کی شکل دینے پر قادر ہو گیا ہے۔ یہ مرثیہ اپنی منزل کمال کو اس وقت پہنچتا ہے جب جناب زینب اپنی ماں سے خطاب کرتی ہیں۔ جدید مرثیہ میں اس طرح کے مافوق الفطرت عناصر کی ادائیگی نہایت دشوار ہے لیکن جمیل مظہری نے اس منزل کو نہایت کامیابی سے طے کیا ہے۔ جمیل مظہری نے اس مرثیے میں اپنی جس فنی بصیرت کا ثبوت فراہم کیا ہے اس کو ڈاکٹر نیر نے اپنے تجزیے میں اسی تنقیدی بصیرت کے ساتھ واضح کیا ہے۔ کربلا اور اس کے متعلقات جس طرح جمیل مظہری کی سائیکی کا حصہ ہیں اسی طرح ڈاکٹر نیر کی بھی سائیکی کا حصہ ہیں اس لیے جب وہ مرثیے کا تجزیہ کرتے ہیں تو مرثیے کے بین السطور کو بھی واضح کرتے ہیں اس وضاحت کے بعد جو نتیجہ سامنے آتا ہے وہ قاری کی فکر کو مبہیز کرنے کا کام کرتا ہے۔ مضمون کا یہ اقتباس ملاحظہ کیجئے:

”شام غریباں کے تناظر میں جمیل مظہری نے اپنے اس مرثیے میں جناب زینب کے کردار کے جن پہلوؤں کو اجاگر کیا ہے وہ تاریخ کے صفحات پر بہت زیادہ نمایاں نہ سہی لیکن انسانی نفسیات کے مطالعے سے دلچسپی رکھنے والے صاحبان نظر حضرات کے لیے کشش کا موضوع ضرور ہے۔ اور یہ پہلو ہیں مصیبت و آفات سے نبرد آزما ایک عورت کی کیفیات و نفسیات۔ وہ عورت جو قربانیوں کی راہ میں ایک سنگ میل اور عزیمت باطل کا عزم صمیم بنی ہوئی کھڑی ہے۔ یہ عورت حالات کے جبر کا سامنا کرتے وقت ایک ماں بھی ہے ایک بہن بھی ہے ایک بیٹی بھی ہے۔ لیکن اس کی شخصیت کے تمام پہلوؤں کو ایک نقطے پر سمیٹا جائے تو کہنا پڑے گا کہ وہ عورت روح انقلاب کی امین ہے۔“

جمیل مظہری نے اپنے مراٹھی میں قوم کو رلانے سے زیادہ جگانے کی طرف توجہ دی ہے اور ان کے کلام میں مایوس اور شکست خوردہ عوام کو امید افزا فضا میں لانے کی کوشش نظر آتی ہے۔ وہ اپنے مراٹھی سے قوم میں ایثار و قربانی اور حریت و انقلاب کا جذبہ پیدا کرنا چاہتے تھے۔ جمیل مظہری زبان و بیان پر اس قدر زور نہیں دیتے کہ قاری شاعرانہ محاسن میں کھو کر رہ جائے بلکہ موضوع کا تاثر اس کے ذہن پر غالب رہتا ہے۔ ڈاکٹر نیر نے اپنے مضمون میں بظاہر جمیل مظہری کے ایک مرثیہ ”شام غریباں“ کا تجزیہ پیش کیا ہے لیکن اس تجزیہ میں جمیل کی مجموعی مرثیہ نگاری کی خصوصیات اپنی پوری معنویت کے ساتھ اجاگر ہوئی ہیں۔ گویا یہ مضمون جمیل مظہری کی تعبیر و تفہیم کے لیے ایک سنگ میل کی حیثیت رکھتا ہے۔

نسیم امرہوی کا شمار جدید مرثیہ نگاری کے اولین شعراء میں ہوتا ہے۔ سید وقار عظیم اور ڈاکٹر ضمیر اختر نقوی نے نسیم امرہوی کی مرثیہ نگاری کا تفصیل سے جائزہ لیا ہے

اور ان دونوں نقادوں نے نسیم امر وہوی کی فنی بصیرت کو بہت خوبصورتی سے واضح کیا ہے۔ وقار عظیم اور ضمیر اختر نقوی کے جائزے کے بعد ڈاکٹر عباس رضا نیر نے نسیم امر وہوی کے مشہور مرثیہ ”عابد بیمار“ کا جو تجزیہ کیا ہے وہ نسیم امر وہوی کی تعبیر و تفہیم میں ایک اضافے کی حیثیت رکھتا ہے۔

آنسو، تلوار اور کربلا کے عنوان کے ضمن میں ڈاکٹر نیر نے نسیم امر وہوی کے یہاں نکات و جہات کے تنوع، فکر کے نئے نئے پہلو، خیال و بیان کے انوکھے اور نرالے طریقوں کی تلاش کے ساتھ ساتھ خیال آفرینی، تسلسل اور منطق و فلسفہ کی پیچیدہ گتھیوں کو سلجھایا ہے اور مرثیہ کی عظمت و معنویت کو روشن کیا ہے۔ ڈاکٹر نیر کے مطالعہ کی وسعت کا اندازہ ذیل کے اقتباس سے لگایا جاسکتا ہے:-

”مرثیہ اور سانحہ کربلا کے تعلق سے آنسو اور تلوار کے مختلف اثر و نفوذ کی بحثیں کچھ بہت زیادہ پرانی نہیں ہیں۔ مرثیہ گو شعراء میں جوش ملیح آبادی نے یہ بحث قائم کی تھی کہ کربلا کے معرکہ میں تیغ کی للکار زیادہ ہے یا آنسو کی بوچھاڑ میں نشوونما پانے والے شعور کی دھار۔ جب کہ وہ آنسوؤں کی اثر پذیریری کو اس کی شدت کے ساتھ محسوس کر بھی نہیں سکتے تھے۔ بلاشبہ مارشل ذہن رکھنے والے انسان، جنگجو یا نہ فکر کی حامل قوتیں یا اشتراکی نظریات کی تائید کرنے والا جاگیر دارانہ نظام تلوار کی دھار کے قصیدے تو پڑھ سکتا ہے لیکن ان کا ضمیر و خمیر بھلا آنسوؤں کی عظمت کا قائل کہاں سے ہو سکتا ہے؟ جب کہ حقیقت میں دیکھا جائے تو تلوار کی جھکاکر کے اثر و نفوذ انسانی سر تو تسلیم کر سکتے ہیں لیکن انسانی دل تسلیم نہیں کر سکتے۔ لیکن یہ آنسوؤں کے چراغ ہیں جن کی روشنی براہ راست انسانی دلوں کی زمینوں کو منور کرتی رہتی ہے۔“

عصر عاشور کے بعد تلوار کا جہاد ختم آنسوؤں کا جہاد شروع ہوتا ہے اور آنسوؤں کے جہاد نے پوری انسانی تاریخ کے دھارے کو موڑ دیا۔ عابد بیمار کے آنسوؤں نے سانحہ کربلا کے بعد وہ اثر دکھایا کہ جس سے پوری انسانی تاریخ متاثر نظر آتی ہے۔ نسیم امر وہوی نے اس مرثیہ میں عابد بیمار کے کردار میں آنسوؤں کے معرکہ کو تلواروں کے معرکہ سے کہیں اثر انگیز ظاہر کیا ہے۔ اور ڈاکٹر نیر نے مرثیہ کی ان ساری گرہوں کو کھولا ہے جو مرثیہ کے بطن میں پوشیدہ تھیں۔

شہزاد معصومی نے اردو مرثیے کی تاریخ میں وہ مقام نہیں پایا جو واقعاً ان کا حق تھا۔ ان کو حق کیوں نہیں ملا اگر اس نقطے پر غور کیا جائے تو ایک کہانی بن سکتی ہے۔ جدید مرثیہ نگاری میں شہزاد معصومی کے مرثیوں کی تعین قدر کن خطوط پر کی جاسکتی ہے۔ ڈاکٹر نیر نے اپنے مضمون ”سفر معراج اور شہزاد معصومی“ میں ان خطوط کی نشاندہی کر دی ہے۔ آئندہ کبھی شہزاد معصومی کی تعبیر و تفہیم کی کوشش کی جائے گی تو ڈاکٹر نیر کا مضمون حوالے کی حیثیت اختیار کر لے گا۔

غزل قدیم ہو یا جدید اس کی اہم ترین خصوصیت رمزیت و ایمائیت اور تہہ داری رہی ہے یہ رمزیت و ایمائیت کبھی اشارے و کنایے سے پیدا ہوتی ہے اور کبھی استعارے اور علامت سے اور اردو کے غزل گو شعراء نے ہر عہد میں علامتوں کے پردے میں اپنے مافی الضمیر کا اظہار کیا ہے۔ علامت کے لیے تہذیبی پس منظر ضروری ہے۔ سیاسی و سماجی تبدیلیاں علامت میں نئی معنویت ضرور پیدا کرتی ہیں لیکن اس کے پس منظر سے واقفیت کے بغیر اس کی تہہ داری سے محظوظ نہیں ہو جاسکتا مثلاً سانحہ کربلا اپنے اندر مذہبی، سیاسی، سماجی اور تاریخی پس منظر رکھتا ہے۔ اس پس منظر سے واقفیت کے بغیر ہم ان علامتوں سے لطف اندوز نہیں ہو سکتے جن کو اردو کے پیشتر شعراء نے اپنی غزلوں میں استعمال کیا ہے۔ سانحہ کربلا جس شاعر کی سائیکی کا حصہ ہے اس شاعر نے علامات کربلا کو

بڑی کامیابی سے اپنی شاعری میں برتا ہے۔ اس مجموعہ میں میر، غالب، علی سردار جعفری اور عرفان صدیقی کی غزلوں اور نظموں میں علامات کر بلا کی معنویت پر شاید اس لئے توجہ صرف کی گئی ہے کہ ان شاعروں نے علامات و استعارات کر بلا کو جتنی تہہ داری سے پیش کیا اور عصری تناظر میں جس فنکاری کے ساتھ اجاگر کرنے کی کوشش کی ہے دوسرے شعراء نے اتنی معنویت اور تہہ داری سے علامت و استعارات کر بلا کو پیش نہیں کیا ہے۔ ڈاکٹر نیر خود ایک اچھے شاعر ہیں اور شاعری کے پیچ و خم سے بخوبی واقف ہیں اور چھوٹی اور بڑی شاعری کی پرکھ کی بہترین صلاحیت کے بھی حامل ہیں لہذا اپنی صلاحیت اور تنقیدی بصیرت کو بروئے کار لاتے ہوئے میر، غالب، علی سردار جعفری اور عرفان صدیقی کی شاعری کا جو تجزیہ کیا ہے وہ ان شاعروں کی تفہیم کے سلسلے میں ایک بامعنی مطالعہ ہے جس سے ہر سطح کا قاری فیض حاصل کر سکتا ہے۔

مجموعہ میں شامل آخر کے دو مضامین انیس شناسی سے متعلق ہیں۔ پہلا مضمون موازنہ انیس و دبیر کو ایک قاری کی حیثیت سے پرکھنے سے متعلق ہے۔ موازنہ کے اوپر ادبی دنیا میں طویل بحثیں ہو چکی ہیں اور ان کا سلسلہ اب تک جاری ہے۔ ڈاکٹر نیر کا مضمون بھی اسی بحث کا حصہ سمجھا جاسکتا ہے۔ کتاب کا آخری مضمون پروفیسر فضل امام کی کتاب ”انیس: شخصیت اور فن“ کے جائزے سے متعلق ہے۔ اس کتاب میں پروفیسر فضل امام نے بہت ہی غیر جانب داری کے ساتھ انیس کی شخصیت کو پیش کرنے کے ساتھ ساتھ ان کے فن کو ادبی معیاروں پر پرکھا ہے۔ پروفیسر فضل امام کی انیس شناسی ادبی دنیا سے پوشیدہ نہیں ہے کیونکہ انیس فہمی کے سلسلہ میں فضل امام نے ہمارے ادب کو ایک وقیع سرمایہ فراہم کیا ہے۔ اس وقیع سرمایے کی ادبی دنیا میں کیا اہمیت و معنویت ہے اس کو ڈاکٹر نیر نے اپنے اس مضمون میں بہت خوبصورتی سے واضح کرنے کی کوشش کی ہے۔ عصمت چغتائی کی تخلیقات کو بنیاد بنا کر ادبی دنیا میں بہت کچھ لکھا جا چکا ہے اور

ہرز اوئے سے عصمت کی تخلیقات کو پرکھنے کی کوشش کی گئی ہے۔ لیکن ان کی ساری تخلیقات کے درمیان ”ایک قطرہ خون“ کی کیا اہمیت ہے اس پر بہت کم بحث کی گئی ہے۔ اس کا سبب کیا ہو سکتا ہے یہ قارئین کے صوابدید پر چھوڑتا ہوں۔ عصمت کی تخلیقات کے درمیان ”ایک قطرہ خون“ کا کیا مقام ہے اس کو سمجھنے کی اس مضمون میں ایک بہترین کوشش کی گئی ہے۔ ڈاکٹر نیر نے اپنے مضمون ”ایک قطرہ خون: ایک جائزہ“ میں جو سوالات قائم کیے ہیں ان کے جوابات کی تلاش میں عصمت چغتائی کے فن کے کچھ اور گوشے روشن ہو سکتے ہیں یہی اس مضمون کا امتیاز ہے۔

مجموعی اعتبار سے یہ کہا جاسکتا ہے کہ ”رثائی تنقیدیں“ کے بیشتر مضامین ڈاکٹر عباس رضا نیر کے وسیع مطالعے، عمیق مشاہدے، گہری فکر و نظر، تجزیے کی بہترین صلاحیت اور ان کی تنقیدی بصیرت کے غماز ہیں۔



ڈاکٹر نیر کی تنقیدی کتاب ”ادبی میزان“ پر ایک نظر

پروفیسر قمر رئیس

عباس رضا نیر ایسے نوجوان ادیب ہیں جو یوپی کی بستیوں سے اب کم ہی نکلتے ہیں۔ زیر نظر کتاب متفرق مضامین اور ادبی تبصروں پر مشتمل ہے۔ ان میں ایک طرف انیس و دیر اور پریم چند ہیں تو دوسری جانب ن، م، راشد، جمیل مظہری اور ممتاز صفائی معصوم مراد آبادی کی نگارشات کا جائزہ لیا گیا ہے۔ بقول مصنف یہ مختلف سمیناروں میں پڑھے جانے والے مضامین ہیں اور طالب علمانہ جستجو کی حیثیت رکھتے ہیں۔ البتہ اس مجموعہ کا پہلا مضمون ”نئی صدی اور نیا ادب“ معاصر ادب کے رجحانات اور مسائل کا احاطہ کرتا ہے۔ ان کا یہ خیال صحیح ہے کہ ادب پر اثر انداز ہونے والے نظریے تو پیدا ہوتے رہیں گے اور جو نظریہ سماج کے اجتماعی لاشعور سے ہم آہنگ ہوگا وہ قبول کر لیا جائے گا۔

☆☆☆

ادبی میزان: ڈاکٹر نیر کا ادبی و تنقیدی مراقبہ

افتخار امام صدیقی

اردو میں تازہ کار اور زرخیز نقاد، روشن ہو رہے ہیں۔ وہ اپنی سوچ کے پرکار سے اپنے ادب کی ناپ تول کرتے ہیں۔ کسی سے مرعوب ہوئے بغیر، اپنی بات دلائل و شواہد کے ساتھ کہنے میں کوئی باک نہیں رکھتے۔ استدراک و استدلال میں توازن و تناسب کا خیال رکھتے ہیں۔ اپنے ارادات کو ’میں‘ کے خود ساختہ قول میں نہیں رکھتے۔ زیادہ پڑھنا اور پھر تفکر و تدبر کرنا۔ کم لکھنا، لکھے ہوئے پر غور کرنا، اپنے حرف و لفظ کا مراقبہ، لغت دوستی، فرہنگ شناسی، مطالعے کی میز کو، اعلیٰ و ارفع شعروادب سے مہکانا، ملکی و غیر ملکی معیاری ادب کو اپنے لیے تناظر اور میزان کرنا۔ کم گوئی اور بہت زیادہ، گوش کار سمجھنے کو اپنا شعار بنارہے ہیں۔ ایسے ہی ایک نم مٹی قلم کار عباس رضا نیر ہیں۔ ان کے تنقیدی مضامین کا اولین مجموعہ ”ادبی میزان“ ان کی مشرقی فکر اور اسلامی سوچ کا مظہر ہے۔ تمام مضامین ان کے وسیع و عمیق مطالعے کا عطر ہیں۔ ابھی ان کی فکری پرواز، اپنی جستجو کے پر تول رہی ہے۔ وہ ایک تخلیق کار ہیں۔ شاعری کرتے ہیں اور غزل و نظم کائنات میں اپنے خیال ٹانکتے رہتے ہیں۔ انہوں نے اپنے پیش گفتار میں لکھا ہے کہ:

”احساس ہے کہ ادب کے تعلق سے مجھے ابھی لکھنے سے

زیادہ، پڑھنے پر توجہ دینی چاہئے۔ چنانچہ ایسا ہی ہوتا ہے کہ کسی ادب پارے کا مطالعہ کرتے ہوئے افہام و تفہیم کے حوالے سے، اگر ذہن

میں کوئی سوال قائم ہوتا ہے یا کسی مضمون کے سلسلے میں استنباط
واستشہاب کوئی لیکر روشن ہوتی ہے کافی دیر تک مجھ پر رقت کی ایک
کیفیت طاری رہتی ہے اور مطالعے کے وہ خوشگوار لمحات مجھے میرے
ادبی ذوق کی تسکین کے اسباب فراہم کرتے ہیں اور پھر ضروری نہیں
ہوتا کہ میں وہ سارے نکات قلم بند کر لوں۔“

(ص ۵، پیرا گراف اول)

کتاب میں جو لوازمہ سمویا گیا ہے اس میں قینچی کا عمل کم اور ذہنی افتق کی رمت
زیادہ ہے۔ دوسرا قول یہ ہے کہ پہلی کتاب ہونے کے باوجود پہلے سے تیار شدہ فلیپ،
پیش لفظ، مقدمہ وغیرہ کی تعریفی جھالیں کتاب میں نہیں لٹکائی ہیں۔ قاری کی صوابدید
پر کتاب کو رکھ دیا ہے۔ کتاب اہل ادب کو مطالعے کی دعوت دیتی ہے۔

☆☆☆

تدوین

کلیات کیف اور عباس رضائیر بھولی بسری یادیں

پروفیسر سید فضل امام رضوی

یادش بخیر! اب تو یادیں بھی دھندلی ہو گئی ہیں۔ بات ہے تقریباً ۱۹۶۲ء کی، جب میں ایس۔ این۔ انٹر کالج، انڈی پور، فیض آباد میں درس و تدریس کے پیشے سے وابستہ تھا۔ ایک میرے ساتھی جناب بادشاہ حسین مرحوم تھے وہ محلہ جعفر آباد، جلال پور کے رہنے والے تھے۔ اس وقت جلال پور کی علمی و ادبی فضا میں شعر و ادب کی بہار تھی۔ محافل، مجالس، مشاعر اور مذاکرے باقاعدہ پابندی سے ہوتے تھے۔ میں تقریباً ہر تقریب میں شریک ہوتا تھا۔ میرے کالج سے جلال پور کا فاصلہ لگ بھگ بیس کلومیٹر کا تھا۔ ہم دونوں یعنی بادشاہ حسین اور میں بذریعہ سائیکل جلال پور آ جاتے۔ قیام جعفر آباد میں بادشاہ مرحوم کے گھر پر ہی رہتا۔ ان کے ایک بڑے بھائی مرحوم شہنشاہ حسین عرف چھیدی میاں تھے بڑے خلیق اور متواضع تھے۔ میرے پہنچ جانے پر بہت خوش ہوتے تھے۔ حضرت قاسم کے روضہ پر محافل اور مجالس کا انعقاد ہوتا تھا۔ بڑا کثیر مجمع ہوتا تھا۔ قرب و جوار کے مواضع کے لوگ شریک ہوتے تھے۔ مدرسہ جعفریہ بھی اسی طرح کے پروگراموں کے لیے مخصوص تھا۔

ایک مولوی ضمیر صاحب ہوا کرتے تھے جو نریندر دیو کالج میں اردو کے استاد

تھے۔ بڑے مہذب انداز میں نپنی تلی گفتگو کرتے تھے۔ ان کی ذات بھی ایک انجمن تھی۔ اس وقت نریندر دیو کالج کے سالانہ مشاعرہ میں بڑی شہرت رکھتے تھے۔ اس دور میں عرفان جلال پوری مرحوم، فاتر، فراق، صدایزدی، زاہد جعفری، عابلس، معجز وغیرہ کے نام کافی مقبول تھے۔ ایک ادبی کہکشاں تھی۔

ہاں! مجھے اچھی طرح یاد ہیں حکیم مولوی انصار حسین کیف صاحب۔ جو پتلے دبلے، خشکی ڈاڑھی، سفید کرتا پاجامہ، بزم میں شیروانی اور ٹوپی سے آراستہ رہتے تھے۔ کم سخن تھے لیکن آنکھوں کی چمک ان کی ذہانت اور فراست کا اعلان کرتی تھی۔ محافل میں ان کے کلام بلاغت نظام کو سننے کا موقع ملتا رہتا۔ نجی ملاقاتوں میں خاص طور سے سردیوں میں دھوپ میں بیٹھ کر ان کا کلام سننے کا موقع ملا ہے۔ بہت سنجیدہ اور متین انداز سے گفتگو کرتے تھے۔ اکثر ٹھٹھ کی نے کو بھی جنبش دیتے ہوئے دیکھا ہے بہت ہی نستعلیق تھے۔ پابند وضع اور قطع رہے تھے۔ شعر و سخن سے بھی فطری مناسبت رکھتے تھے۔ طرز خواندگی بہت سادہ تھا۔ زیادہ چیخا اور ہاتھ پاؤں کو حرکت نہیں دیتے تھے۔ بہت اطمینان سے مصرعوں کو ادا کرتے تھے۔ کس لفظ پر اور کس ٹکڑے پر کہاں زور دینا ہے اس کا ہنر جانتے تھے۔ میں نے انہیں ادبی شعری نشستوں اور محافل میں پڑھتے سنا اور دیکھا ہے کلام سناتے وقت ان پر ایک کیف ضرور طاری ہو جاتا تھا۔

کیف صاحب نے نعت و منقبت اور قصائد کے علاوہ غزلیں بھی کہی ہیں۔ غزل کا فن مشکل ضرور ہے لیکن انہوں نے اس صنف میں بھی اپنا منفرد انداز پیش کیا ہے۔ چند اشعار ملاحظہ فرمائیے:

قتل کے بعد نہ خنجر نہ ستم گر بولے
خون بسمل تھے کچھ ایسے جو فلک پر بولے



کیف صاحب کے منقبتی قطعات و رباعیات خاصے اہم ہیں۔ جن میں دلیل و منطق کے تلازمے ملتے ہیں۔ ملاحظہ ہوں:

رباعیات

تعلیم سے پہلے تو رسالت آئی
درپردہ مگر شان خلافت آئی

ہرگز نہ پڑی بنائے کار تبلیغ
جب تک پئے نصرت نہ امامت آئی

☆

وہ نفس کی ہو جنگ کہ میدان وفا
ہر جا ہے بندھا فتح کا سر پر سہرا

خود روئے اجل دیکھ کے وقت ضربت
حیدرؑ نے کہا فزت برب الکعبہ

☆

کوثر کی ہراک موج بڑھی جاتی ہے
تسنیم کی لہر ہاتھ پھیلاتی ہے

وہ چشم علیؑ بانٹتی ہے جامِ حیات
جنت بھی فقیروں میں نظر آتی ہے

کیفؒ، رباعی کے فن شیشہ گری سے واقف ہیں۔ اس لیے بڑی نزاکت سے رباعیوں میں تاریخی کوائف کو نظم کیا ہے۔

آپ لاتے ہیں موت کا پیغام
آپ سمجھے بھی زندگی کیا ہے

☆

مذاق عاشقی نے زندگی کا رخ بدل ڈالا
حیات چند روزہ جاوداں معلوم ہوتی ہے

☆

اکیلا ہی سہی بڑھتا رہوں گا جانب منزل
ابھی کچھ کچھ تو گردِ کارواں معلوم ہوتی ہے

☆

چمن میں اپنے پرانے کو آزمانے میں
لگادی آگ ہمیں نے خود آشیانے میں

☆

ہمارے خون کی سرخی ہے زینت عنوان
ہمارا نام نہ آیا کہیں فسانے میں

☆

دنیا کا کوئی غم مرے دل تک نہیں آتا
شاید غمِ جاناں، غمِ دوراں کی دوا ہے

پہنچے نہیں کس جا پہ بھلا اہل محبت
تاروں کی جبینوں پہ بھی نقشِ کفِ پا ہے

شعور تغزل سے بھرپور اشعار، واقعہ کربلا اور معراج رسولِ عربی کی طرف بھرپور اشارہ کرتے ہیں۔ یہ شاعر کی فکر اور فن کے اظہار کا اعلیٰ نمونہ ہیں۔

کیف کا جذبہ بیدار اس وقت زیادہ طرحدار ہو جاتا ہے جب وہ عرفان و آگہی سے سرشار ہو کر مدح محمد و آل محمد میں جنبش قلم سے کام لیتے ہیں۔ وہ جوش کی طرح کربلا کو روح انقلاب قرار دیتے ہیں۔ کہتے ہیں:

بیدار تیرے ذکر سے ہے روح انقلاب
کیوں کر نہ کربلا ترا باقی نشان رہے

دنیا وہیں پہ سمجھے گی مقصد حیات کا
شبیّر کی عزا کی تمنا جہاں رہے

☆

لگا بھی تیر مگر آنکھ اجل ملا نہ سکی
قضا کی شرم پہ بے شیر کو ہنسی آئی

شہید راہ خدا سچ ہے مرنے والے
جو آئی نیند تو ہم شکل زندگی آئی

کیف کے بعض قصائد میں تشبیب، گریز اور مدح کے اجزا شامل ہیں وہ شگفتہ بحروں میں بڑے دلکش انداز سے شعر کی تزئین کاری کرتے ہیں۔ ملاحظہ ہو:

شہ دیں کے خون کی سرخیاں نظر آرہی ہیں کہاں کہاں
جو حنا کے دل میں نہاں نہاں تو شفق کے رخ سے عیاں عیاں

جو مٹا رہے تھے وہ خود مٹے نہ تو نام ہے نہ نشان ہے
کوئی ڈھونڈھتا ہے جہاں جہاں تمہیں پار ہا ہے وہاں وہاں

نہ وہ دوتیں نہ وہ حشمتیں نہ امارتیں نہ جلالیتیں
وہ جو سلطنت کے قصور تھے ہیں جہاں میں اب تو دھواں دھواں

ترے سر کو کاٹ کے اہل شر پھرے لے کے نیزے پہ در بدر
تجھے پاس حکم خدا جو تھا، دیا درس تو نے کہاں کہاں

رہا چھاکے سارے جہان پر ترا ایک سجدہ آخری
وہ تری زباں پہ خدا خدا وہ چھری گلے پہ رواں رواں

کیف صاحب بڑی اعلیٰ خوبیوں کے مالک تھے ان کا شعری سرمایہ بڑا قیمتی ہے اس کا تحفظ از بس کہ لازمی ہے۔ وہ ایک صاحب شعور، فن کار اور سخن ور تھے۔ موصوف کا درج ذیل شعر ان کے افکار و اشعار کی ترجمانی کر رہا ہے:

زندگی مانگ رہی ہے کوئی شے دنیا سے
نطق اشعار میں پھر کوئی سخنور بولے

میں ”کلیات کیف“ کی اس خوبصورت ترتیب و تدوین و اشاعت کے لیے ڈاکٹر عباس رضا نیر صدر شعبہ اردو لکھنؤ یونیورسٹی لکھنؤ کو مبارکباد پیش کرتا ہوں اور امید کرتا ہوں کہ حکیم انصار حسین کیف جلال پوری کا یہ مجموعہ کلام ادبی حلقے میں پسند کی نگاہ سے دیکھا جائے گا۔

☆☆☆

ہندوستان کی شناخت ہے۔

یہ درست ہے کہ آگے بڑھتے ہوئے وقت کی رفتار کے ساتھ کسی مخصوص علاقے کے سماج اور اس کی تہذیب میں تبدیلیاں رونما ہوتی ہیں۔ کبھی کوئی تہذیب ترقی کرتی ہے نکھرتی ہے تو کبھی اس پر زوال بھی آتا ہے۔ اودھ کی تہذیب بھی ایسے ہی نشیب و فراز سے گزری ہے۔ ۱۸۵۷ء کے غدر نے پورے ہندوستان کو اپنی گرفت میں لے لیا تھا۔ دہلی اور اودھ کے حالات پر بھی اس کے منفی اثرات مرتب ہوئے بالخصوص لکھنؤ کی شان و شوکت نوابی دور کے خاتمے کے بعد کافی متاثر ہوئی۔ لوگوں کی معیشت بھی خراب ہوئی اور معاشرت بھی۔ ظاہر ہے ایسے منفی حالات میں ادبی سرگرمیوں کا متاثر ہونا ایک فطری بات تھی۔ لکھنؤ میں غدر سے قبل شعر و ادب کی محفلیں سچی رہتی تھیں۔ آسمان ادب پر آتش، ناسخ، نسیم، انیس، شوق اور دوسرے فنکاروں کا سورج جگمگا رہا تھا۔ وہ زبان و ادب کا زریں دور تھا۔ اس دور کے مراٹھی، مثنوی اور غزلیں نصاب تعلیم میں شامل ہیں۔ لیکن غدر نے سارے اجالوں کو اپنی گرفت میں لے لیا۔ حالانکہ بعد کے شعرا نے مسائل کے باوجود اپنی سرگرمیاں جاری رکھیں۔ پھر ہندوستان میں انگریزوں کے دور کا آغاز ہوا۔ اس طویل دور حکومت میں یہاں کے عوام نے کیا حاصل کیا اور کیا گنوا یا اس کی ایک طویل داستان ہے۔ انگریزوں سے نبرد آزمائی کے بعد ملک کے عوام نے انہیں شکست تو دے دی لیکن انگریز ہندوستان سے چلے گئے ایسا نہیں ہوا۔ جاتے ہوئے بھی اپنی مغربی تہذیب کے نقوش چھوڑ گئے۔ ملک میں ان کی حکومت کے دوران مشرقی مغربی تہذیب کے درمیان سرد جنگ کا ماحول رہا۔ یہ کہنا غلط نہیں ہوگا کہ اس لڑائی میں مغربیت مشرقیت پر حاوی ہو گئی۔ انگریزی زبان نے ہمیں فائدہ پہنچایا لیکن مغربی کلچر نے ہمارے معاشرے، ہمارے تہذیب اور زبان و ادب کو نقصان پہنچایا۔ بلا تفریق مذہب و ملت سبھی انگریزی کلچر کا شکار ہوئے۔ کسی نے مجبوراً مغربی

اردو ناول اور اودھ: ایک مطالعہ

ناصر جرولی

جب اودھ کا ذکر ہوتا ہے تو ذہن میں ایک مخصوص تہذیب اور معاشرے کا تصور ابھرتا ہے۔ حالانکہ جغرافیائی اعتبار سے غور کیا جائے تو اودھ کا علاقہ کافی وسیع ہے لیکن اس ریاست کے ضمن میں سب سے پہلے لکھنؤ کا خیال آتا ہے۔ اودھ کے تاریخی نقشے کے مطابق اس میں پارہ اضلاع لکھنؤ، بہرائچ، رائے بریلی، فیض آباد، دریاباد، اناؤ، پرتاپ گڑھ، گونڈہ، لکھیم پور، سلطانپور، ہردوئی اور سینٹاپور شامل ہیں۔ اودھ کی تہذیب اور معاشرت سے مراد ان تمام اضلاع کی تہذیب اور معاشرت ہے۔ لیکن شہر ادب لکھنؤ کو ان سب میں ایک خاص اور امتیازی حیثیت حاصل ہے۔ اہل علم نے مختلف اصنافِ سخن میں اودھ کے حالات کی عکاسی کی ہے۔ اس کے لیے کہیں ناولوں کا سہارا لیا گیا ہے تو کہیں شعرا نے اپنے کلام میں اودھ کی ثقافت کی ترجمانی کی ہے۔ ناول نگاروں نے اپنے ناولوں میں اودھ کی مسلم معاشرت کا ذکر کیا تو کبھی گنگا جمنی تہذیب کی عکاسی کی۔ اودھ کی تہذیب کا جنم ہندوستان کی رنگا رنگ تہذیب کی کوکھ سے ہوا ہے۔ شاہان اودھ کا ۱۳۴ سالہ دور حکومت اس لحاظ سے قابلِ فخر اور یادگار دور ہے کہ اس نے ہمیں تہذیب اودھ کی شکل میں بیش قیمت سرمایہ عطا کیا ہے۔ اس کا سلسلہ سعادت خاں برہان الملک (۱۷۲۲ء) سے شروع ہوا اور واجد علی شاہ (۱۸۵۷ء) پر ختم ہوا۔ آج یہ تہذیب نہ صرف اودھ بلکہ

تہذیب کو گلے لگایا تو کسی نے شوقیہ۔

اودھ خاص طور سے لکھنؤ کی تہذیب بھی ان تغیرات سے متاثر ہوئی۔ ایسے منفی حالات میں ہماری تہذیب زبان اور ادب کی ڈوبتی ناؤ کو سہارا ملا تو شاعروں، ادیبوں دینی درسگاہوں اور ادبی، مذہبی و سماجی تقریبات سے۔

نوابین اودھ پر ایک اعتراض یہ کیا جاتا ہے کہ انہوں نے اپنے دور میں طوائفوں کو بہت عزت دی، عیش و طرب کی پر تصنع زندگی گزاری، دولت کو بے دردی سے لٹایا۔ لیکن اس دور کا روشن ترین پہلو یہ ہے کہ اس میں باوقار اور شاندار عمارتیں بھی تعمیر ہوئیں جن میں امامباڑے، مساجد، روضے اور محلات وغیرہ شامل ہیں۔ آصف الدولہ کے دور میں تعمیر ہونے والا تاریخی آصفی امام باڑہ اس کی جیتی جاگتی مثال ہے۔ یہ امامباڑہ سیاحت کا مرکز ہونے کے ساتھ ہندوستانی کلچر کی پہچان اور سرکاری آمدنی کا ذریعہ بھی ہے۔ شاہان اودھ کے دور میں شاعروں، ادیبوں اور فنکاروں کو عزت ملی۔ اگر اس دور کا عہد حاضر سے موازنہ کیا جائے تو آج کے دور میں بھی عیب نظر آئیں گے۔ خامیاں آج کے حکمرانوں میں بھی ہیں۔ عوام کی دولت دوسرے انداز میں لٹائی جاتی ہے۔ زبان اور ادب کے شعبے میں جوابدہی آئی ہے۔ اس کے لیے ہم ارباب اقتدار سے تو شکوہ کرتے ہیں لیکن تلخ حقیقت یہ ہے کہ اس کی ذمہ داری خود ہم پر عائد ہوتی ہے۔ اردو کا دائرہ محدود ہوتا جا رہا ہے۔ ہماری زبان خود ہمارے گھر میں اجنبی اور یتیم ہو گئی ہے۔ ہمارا سماج مغربیت کا غلام ہے۔ بچوں کی تعلیم اور روزگار کے نام پر ہم دوسری زبانوں کو اپنا رہے ہیں۔

یقیناً اودھ کی تہذیب کے بعض ایسے روشن پہلو ہیں جن کی وجہ سے یہ تہذیب آج بھی زندہ ہے۔ ہم اس پر جتنا بھی فخر کریں، سیمینار اور کانفرنس کریں وہ کم ہے لیکن سوال یہ ہے کہ اب جس معاشرے میں ہم سانس لے رہے ہیں اور زبان کی جو

حالت زار ہے کیا وہ اطمینان بخش ہے؟ کیا ہم اپنی تہذیب پر فخر کر سکیں گے۔؟ اودھ کی تہذیب کے ماضی پر فخر کرنے کے ساتھ ہمیں اپنی تہذیب کے حال اور مستقبل پر غور کرنا چاہئے۔

وقتاً فوقتاً منعقد ہونے والے ادبی سیمیناروں میں دانشوروں نے اپنے مقالات کے وسیلے سے اودھ کی تہذیب اور معاشرت کے مختلف پہلوؤں کا جائزہ لیا ہے۔ لکھنؤ یونیورسٹی میں شعبہ اردو کے زیر اہتمام دوروزہ بین الاقوامی سیمینار ۲۱/۲۲ مارچ ۲۰۱۵ء کو منعقد کیا گیا جس میں ادبی دنیا کی اہم شخصیات نے شرکت کی اور بیش قیمت و معلوماتی مقالے پیش کیے۔ سیمینار کے منتظم اور کنوینر صدر شعبہ اردو ڈاکٹر عباس رضانیر نے ان مقالوں کو مرتب کر کے ”اردو ناول اور اودھ“ کے عنوان سے ایک کتاب کی شکل میں پیش کیا ہے جس میں دو درجن سے زائد مقالے شامل ہیں۔ کراچی کے نامور ادیب علامہ ضمیر اختر نقوی نے اپنے مقالے میں تفصیل سے اس بات کو واضح کیا ہے۔

اردو ناول میں اودھ کی تہذیب کی عکاسی کس طرح کی گئی ہے ڈاکٹر اعظم انصاری نے اپنے مقالے میں مرزا محمد ہادی رسوا کے ناول امراء جان ادا پر تبصرہ کیا ہے جس میں ایک طوائف کے کردار کی عکاسی کرتے ہوئے لکھنؤ کے زوال پذیر معاشرے کا ذکر کیا گیا ہے۔ ڈاکٹر فاروق جائسی نے اپنے مقالے میں واضح کیا ہے کہ قرۃ العین حیدر نے کس طرح اپنے ناولوں میں گنگا جمنی تہذیب، مسلم معاشرہ بالخصوص چھوٹے طبقے کے مسائل کو اجاگر کیا ہے۔ عبدالحلیم شرر کے ناولوں کے حوالے سے ڈاکٹر عبید الرحمن نے مسلم معاشرت کا جائزہ لیا ہے۔ ڈاکٹر عشرت ناہید اور حنیف خاں نے حیات اللہ انصاری کے ناول ”لہو کے پھول“ کے پس منظر میں اودھ کی گنگا جمنی تہذیب اور معاشرت پر تبصرہ کیا ہے۔ اسی طرح پنڈت رتن ناتھ سرشار کے

ناولوں بالخصوص فسانہ آزاد میں اودھ کی تہذیب کو بڑے دلکش انداز میں پیش کیا گیا ہے۔ علی احمد فاطمی کے مقالے میں سرشار کے ناولوں کا تجزیہ پیش کیا گیا ہے۔ ۲۷۶ صفحات پر مشتمل اس کتاب اردو ناول اور اودھ کی ابتداءس ڈاکٹر عباس رضانیر کا مبسوط مقدمہ ”حرف مرتب“ کے نام سے شامل ہے۔ جو اس سیمینار اور اس میں پیش کیے جانے والے مقالوں کے اغراض و مقاصد کو پوری طرح واضح کر دیتا ہے۔ اسی طرح کتاب کے آخر میں خود ان کا مقالہ ”اختری بیگم: ایک تہذیبی دستاویز“ شامل ہے۔ اس سے پہلے ہمارے ادیبوں نے ناول ”امراؤ جان ادا“ کے حوالے سے ضرور اودھ کی تہذیب کو پیش کیا لیکن پہلی بار اس قدر شرح و بسط سے ڈاکٹر عباس رضانیر نے مرزا ہادی رسوا کے ناول اختری بیگم کو اودھ کی تہذیب کی روشنی میں اپنے محاکمے اور مکالمے کا موضوع بنایا جس کے لیے وہ مبارک باد کے مستحق ہیں۔ اس طرح کے سیمینار منعقد ہوتے رہنا چاہئے اور ان کے مقالوں کو بھی کتابی شکل میں محفوظ ہونا چاہئے۔ ڈاکٹر نیر سے ہمیں امید ہے کہ وہ اپنے زمانہ صدارت میں اسی طرح ادبی تقریبات لکھنؤ یونیورسٹی میں منعقد کراتے رہیں گے اور اسی طرح شعبہ اردو کے وقار میں اضافہ کرتے رہیں گے۔ مجموعی طور سے ڈاکٹر عباس رضانیر کی کتاب اودھ کی تہذیب کے سلسلے میں ایک اہم معلوماتی دستاویز کی حیثیت رکھتی ہے اور نئی نسل کے قارئین کے لیے کافی مفید ثابت ہو سکتی ہے۔

☆☆☆

خطوط بنام ضمیر: ایک تبصرہ

ڈاکٹر سید علی سلمان رضوی

خطوط نگاری ادب کی ایک ایسی صنف ہے جس سے ہر خاص و عام لطف اٹھاتے ہیں۔ یقیناً خطوط کے ذریعے انسانی زندگی کے ہر پہلو پر تنقید، دنیا کے ہر ادب اور آرٹ و خیال پر تبصرہ اور کائنات کی تمام جاندار اور غیر جاندار اشیاء پر بحث کی جاتی ہے۔ جیسا کہ مولوی عبدالحق نے خطوط شبلی کے مقدمہ میں تحریر کیا ہے:

”خانگی خطوں میں اور خاص کر ان خطوں میں جو اپنے عزیزوں اور مخلص دوستوں کو لکھے جاتے ہیں ایک خاص دلچسپی ہوتی ہے جو دوسری تصانیف میں نہیں ہوتی۔ . . یہ دلی جذبات اور خیالات کا روزنامہ اور اسرار حیات کا صحیفہ ہے پھر کون ہے جو اس خاموش آواز کے سننے کا مشتاق نہ ہوگا۔ یہ ہماری فطرت میں ہے اور یہی وجہ ہے کہ ہم روزناموں، آپ بیتیوں اور خطوں کو بڑے ذوق و شوق سے پڑھتے ہیں۔“

(مقدمہ خطوط شبلی، عبدالحق)

یہ سچ ہے کہ خطوط کے ذریعے ہمارے سامنے خط تحریر کرنے والے کے ذہنی ارتقاء کی تمام کیفیتیں ابھر کر سامنے آ جاتی ہیں۔ یہ قول بھی مشہور ہے کہ ”خطوط سوانح نگاری کی جان ہیں“ یہی وجہ ہے کہ ترقی یافتہ ممالک میں بزرگ اور قابل قدر ادیبوں کے خطوط جمع کرنے کا کام بہت تیزی سے انجام پا رہا ہے۔ ان خطوں کے ذریعے نقد و نظر

کے جدید اصولوں کو پرکھا جاسکتا ہے۔ ان خطوط میں تمام موضوع معروض بحث میں آتے ہیں۔ جو کسی بھی ادب عالیہ کا سرمایہ ہو سکتے ہیں۔

خط لکھنے کی تاریخ ہزاروں سال قدیم ہے۔ حکومت اور مذہب کے نمائندوں کے ذریعے اس کی ابتدا ہوئی۔ ہر زبان میں خطوط نویسی کی تاریخ اپنی اپنی جگہ نہایت دلچسپ ہے۔ دور نبوت سے ہی خطوں کی حفاظت کا کام جاری رہا۔ دیگر ممالک کو دعوت اسلام کے لیے تحریر کردہ خطوط جو اس سال کیے جاتے تھے ان پر نظر ڈالنے سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ ان کے خطوط مکمل طور پر انشاء پر دازی میں مہارت رکھتے تھے۔ خلافت بنی امیہ اور خلافت عباسیہ کے دور میں فن خطوط نویسی کو عروج حاصل ہوا۔ اس دور میں خط لکھنے کے فن میں کتابیں تحریر کی گئیں۔ خلافت عباسیہ کے دور حکومت کے بعد مغلوں کے زمانے میں عربی خطوط نویسی کے بجائے فارسی خطوط نویسی کا رواج ہوا۔ یہی وجہ ہے کہ فارسی میں خطوط و رقعات کے مجموعے کی تعداد بہت زیادہ ہے۔ ’پنج رقعہ‘، ’رقعات ابوالفضل‘، ’رقعات عالمگیر‘، ’انشاء خلیفہ‘، ’مادھورام‘، ’فائق‘، ’منیر‘، ’بہارِ نجم‘ وغیرہ فارسی مکاتیب کے وہ مجموعے ہیں جو ہندوستان میں تالیف کیے گئے۔ فارسی خطوط کے اثرات سے متاثر ہو کر اردو کے ادیبوں نے اردو میں خطوط تحریر کیے۔ جس کی بنا پر ’انشاء خرد افروز‘، ’مکتوبات احمدی و محمدی‘، ’رقعات عنایت علی‘، ’انشاء اردو سرور‘ وغیرہ اردو خطوط کے ابتدائی مجموعے منظر عام پر آئے۔ اور اس کے بعد خطوط نویسی کے سلسلے غالب، رقعات قتیل، غلام امام شہید اور غلام غوث وغیرہ کے خطوط بہت مشہور ہوئے۔ اس کے بعد سرسید اور محمد علی شہلی، حالی، محمد حسین آزاد، نذیر احمد، اقبال، ابوالکلام آزاد، عبدالرحمن بجنوری، مہدی حسن افادی اور نیاز فتحپوری وغیرہ کے خطوط ادب میں ایک ممتاز جگہ لیتے رہے۔

ڈاکٹر عباس رضا نے خطوط کی ادبی حیثیت کو مد نظر رکھتے ہوئے ”خطوط بنام ضمیر“ کے عنوان سے مشاہیر ادب کے خطوط تالیف کر کے شمع ادب کی لو کو تیز کرنے کی

سعی کی ہے۔ اس میں وہ خطوط پیش کیے گئے ہیں جو پاکستان کے مشہور ادیب، نقاد، مرثیہ شناس علامہ ضمیر اختر نقوی کے نام دانشوروں، ادیبوں، ماہرین تعلیمات، مصنفین، مترجمین، اسکالرز اور شعراء وغیرہ نے ادبی مفاد کی خاطر تحریر کیے ہیں۔ اس سلسلے میں ڈاکٹر عباس رضا نے رقمطراز ہیں:

”ان میں کچھ خطوط مشاہیر کے ہیں جنہوں نے علامہ صاحب کے کاموں پر علامہ صاحب کو خراج عقیدت پیش کیا ہے، کچھ خطوط ایسے ہیں جن میں ادب اور ادبی شخصیات کے حوالے سے سوالات کیے گئے ہیں اور علامہ صاحب سے معلومات حاصل کی گئی ہیں ان میں محققین بھی ہیں، شعراء بھی ہیں، اسکالرز بھی ہیں، مولفین بھی ہیں، مصنفین بھی ہیں اور مترجمین بھی ہیں۔ ایک بات جو سامنے آئی ہے ان مشاہیر نے علامہ صاحب سے جو استفسارات کیے ہیں ان میں کتابی حوالہ جات کے متعلق بھی دریافت کیا گیا ہے اور بعض ایسی معلومات ہیں کہ جو کتابوں سے ہٹ کر وہ ہیں جو صرف علامہ صاحب کے ذہن میں محفوظ ہیں۔ کچھ خطوط ایسے ہیں جن میں کچھ اسکالرز پی ایچ ڈی کی تکمیل کے لیے علامہ صاحب کی رہنمائی چاہتے ہیں۔ کچھ خطوط ایسے ہیں جن میں مشاہیر نے معاشی اور معاشرتی حوالوں سے علامہ ضمیر اختر نقوی صاحب سے امداد طلب کی ہے۔ کچھ خطوط ایسے ہیں جن میں شاعری اور شعراء کے حوالے سے گفتگو ہے اور اسی طرح دیگر خطوط بھی ہیں، اور ان خطوط سے علامہ ضمیر اختر نقوی کی شخصیت کی گہیرتا اور وسعت کا اندازہ ہوتا ہے۔“

(خطوط بنام ضمیر، مرتب ڈاکٹر عباس رضا، ص ۲۲، ۲۰۱۵ء کراچی)

ڈاکٹر نیر نے خطوط کا ایسا مجموعہ مرتب کیا ہے جس میں نہ صرف یہ کہ ہر مذاق و ہر رنگ کے خطوط موجود ہیں بلکہ ڈاکٹر ضمیر اختر نقوی کی زندگی کے بہت سے پس پردہ حالات بھی واضح ہو گئے ہیں۔ اس طرح سے اس مجموعہ کا ہر خط ایک آئینہ ہو گیا ہے۔ عباس رضا نیر نے ضمیر اختر نقوی کے خطوط کو مرتب کر کے ایک نفیس مجموعہ قارئین کے سامنے پیش کیا ہے۔ جس کی بنا پر ۲۷۸ حضرات کے تحریر کردہ خطوط کا ایک بہترین مجموعہ نیر جلاپوری صاحب کی کوششوں کی بدولت ہمارے ہاتھوں میں ہے جو بڑی اہم ادبی چیز ہے۔ یہ سارے خطوط بحساب حروف تہجی مرتب کیے ہیں۔ جو ۸۴۴ صفحات کو محیط ہیں۔

یقیناً خطوط ہی انسان کے اخلاق، کردار، عمل، مذہب، شرافت، مروّت، و سعداری، رواداری، غیرت اور خودداری کے آئینہ دار ہوتے ہیں۔ مذکورہ خطوط کے ذریعے قارئین کو ضمیر اختر نقوی کی شرافت، انسانیت، اخلاق اور مروّت و اخلاص کے گہرے نقوش ملیں گے۔ یہ خطوط درحقیقت ضمیر اختر نقوی کے یقین و عمل، و سعداری، رواداری، غیرت و خودداری کی تصویریں ہیں۔ ساتھ ہی ساتھ ضمیر اختر نقوی کی علمی و ادبی زندگی سے بھی متعارف کراتے ہیں۔ ضمیر اختر نقوی صاحب ایک جگہ جوش ملیح آبادی کے خط کے متعلق اپنا تاثر پیش کرتے ہیں جو قابل غور ہے:

”آپ کا خط پڑھ کر میں نے محسوس کیا کہ مجھے عظیم دولت مل گئی۔ میرے مضمون کے متعلق آپ کی دو سطر میں میرے لیے بہت ہیں۔ شکریہ“

(خطوط بنام ضمیر، ص ۱۸۱)

مگر یہاں پر جوش ملیح آبادی کے متعلق ضمیر اختر نقوی کے تاثرات میں بہت فرق نظر آ رہا ہے۔ وہ مہتاب حراذ فر کو خط لکھتے ہوئے جوش ملیح آبادی کے متعلق اس طرح اظہار خیال کرتے ہیں:

”جوش ملیح آبادی کی یہ دونوں نظمیں (۱) ذاکر سے خطاب، (۲) سوگواران حسین سے خطاب۔ ان کے مجموعہ کلام ”شعلہ و شبنم“ میں شائع ہوئی تھیں۔ جوش ملیح آبادی روشن فکری اور بین الاقوامیت کے دعویدار تھے۔ اس کے باوجود لکھنؤ میں نخاس، وزیر گنج گولہ گنج کی مذہبی چھچھوری اور دو کوڑی کی معرکہ آرائی کے شکنجے میں پھنس گئے۔۔۔۔۔ میرا نیس کی صد سالہ برسی کے موقع پر عالیہ امام نے اسلام آباد سے جوش صاحب کو فون کیا کہ آپ پہنچ رہے ہیں تو انھوں نے کہا کہ ہاں ہم دو ہزار روپیہ علاوہ جہاز کے ٹکٹ کے لیں گے۔ جوش صاحب کی اس چھچھوری حرکت پر کیا ان کے خلاف نظم لکھ دی جاتی۔۔۔۔۔ جوش ملیح آبادی کے پاس غالب اور میرا نیس والی ذہانت ہوتی تو وہ ایسی پست حرکت کبھی نہ کرتے۔“

(خطوط بنام ضمیر، ص ۶۶)

محولہ خطوں کے ذریعے ضمیر اختر نقوی صاحب کے تاثرات جوش ملیح آبادی کے متعلق کہیں عظیم دولت ہے تو کہیں چھچھوری حرکت جیسے الفاظ، معلوم نہیں ضمیر اختر نقوی صاحب نے اس طرح کے الفاظ اپنے خط میں کیوں استعمال کیے ہیں۔ اگر جوش صاحب ہوتے اس کا جواب صحیح طور سے دیتے۔ لیکن ڈاکٹر ضمیر اختر نقوی کے متعلق جوش ملیح آبادی کے تاثرات ملاحظہ کریں:

”حضرت نقوی، خط ملا، شکر یہ قبول کیجئے۔ اپنی مرثیہ گوئی پر آپ کا مضمون پڑھا، داد اس لیے نہیں دوں گا کہ اس میں میری تعریف کی گئی ہے۔ آپ میرے مراثی کے متعلق ضرور کتاب چھپوائیں میری جانب سے اجازت ہے، اگر ”اللہ“ کا سا میرا مزاج ہوتا تو آپ کی

زبان سے اپنی مدح سن کر آپ کے دامن کو موتیوں سے بھر دیتا۔“
مخلص.....جوش (۳۵۱) ایف ۲/۳-اسٹریٹ (۶۰)
اسلام آباد“

(خطوط بنام ضمیر، ص ۱۸۱)

”خطوط بنام ضمیر“ میں ۸۰۵ خطوط ہیں، مذکورہ خطوط میں سے ۳۶۲ خطوط قدیم و جدید مرثیے کے اہم مسائل سے متعلق ہیں، جن میں سے ۴۸ خطوط ڈاکٹر ضمیر اختر نقوی صاحب نے مرثیے سے متعلق تحریر کردہ خطوط کے جواب میں لکھے ہیں۔ اس کے علاوہ دیگر اصنافِ سخن پر بھی خطوط موجود ہیں۔ مزید تقریباً ۳۰۰ سے زائد خطوط غیر مطبوعہ ہیں۔ جس کی فہرست مطبوعہ خطوط میں ”وہ خطوط جو ٹائپ ہونے سے رہ گئے“ کے عنوان سے ص ۸۱۹ پر درج ہے۔

مرثیے سے متعلق تحریر کردہ خطوط کی نشاندہی ضروری اس لیے سمجھتا ہوں تاکہ ریسرچ اسکالرز کے استفادے کا ذریعہ بن سکیں۔ طوالت سے بچنے کی خاطر ان حضرات کے نام پیش کیے جا رہے ہیں جنہوں نے قدیم و جدید مرثیے سے متعلق خطوط تحریر کیے ہیں۔ جو قابلِ غور ہیں:

۱۔ آل رضا، الخط ۲۔ انور سدید، الخط ۳۔ اسداریب، الخط ۴۔ احمد ندیم قاسمی، الخط ۵۔ امیر امام حر، الخط ۶۔ پروفیسر اطہر رضا بلگرامی، الخط ۷۔ امجد علی خاں، الخط ۸۔ اقبال کاظمی، الخط ۹۔ افتخار عارف، الخط ۱۰۔ ڈاکٹر اخلاق حسین عارف، الخط ۱۱۔ امیر علی جوہر پوری، الخط ۱۲۔ ڈاکٹر احراز نقوی، الخط ۱۳۔ امتیاز علی، الخط ۱۴۔ اصغر نقوی مصطفیٰ آبادی، الخط ۱۵۔ اثر جلیلی، الخط ۱۶۔ ڈاکٹر اکبر حیدری، الخط ۱۷۔ پروفیسر شیخ انصار، الخط ۱۸۔ امیر زہرا رضوی، الخط ۱۹۔ ابن حسن قیصر، الخط ۲۰۔ سیف جاسی، الخط ۲۱۔ سید الرضی عباس

نقوی، الخط ۲۲۔ بہار لکھنوی، الخط ۲۳۔ ڈاکٹر پیکر جعفری اترولوی، الخط ۲۴۔ جوش ملیح آبادی، الخط ۲۵۔ جمیل احمد رضوی، الخط ۲۶۔ جعفر زیدی، الخط ۲۷۔ پروفیسر جعفر رضا، الخط ۲۸۔ حاتم علوی، الخط ۲۹۔ حیدر طباطبائی، الخط ۳۰۔ حیدر نواب جعفری، الخط ۳۱۔ سید حسن عباس، الخط ۳۲۔ کیپٹن حسن جعفر، الخط ۳۳۔ ڈاکٹر خاور رضوی، نگرامی، الخط ۳۴۔ خلش پیرا صحابی، الخط ۳۵۔ خیال امروہوی، الخط ۳۶۔ خالد صدیقی، الخط ۳۷۔ رفیق رضوی، الخط ۳۸۔ رئیس احمر، الخط ۳۹۔ سید محمد رضا زیدی، الخط ۴۰۔ سید علی رضا کاظمی، الخط ۴۱۔ رفاقت علی شاہد، الخط ۴۲۔ سید محمد رضا موسوی، الخط ۴۳۔ زیڈ اے نجدی، الخط ۴۴۔ زاہد نقوی، الخط ۴۵۔ زاہد قریشی، الخط ۴۶۔ زوار حسین شاہ، الخط ۴۷۔ ساحر لکھنوی، الخط ۴۸۔ سکندر آغا، الخط ۴۹۔ ڈاکٹر سبط حسن فاضل زیدی، الخط ۵۰۔ ڈاکٹر سید سبط حسن رضوی، الخط ۵۱۔ سید سعید حسنین عابدی، الخط ۵۲۔ ڈاکٹر سید محمد سیادت نقوی، الخط ۵۳۔ سید سمیع الحسن کاظمی، الخط ۵۴۔ سلطانہ ذاکر ادا، الخط ۵۵۔ مرز سلطان حیدر، الخط ۵۶۔ سجاد ہاشمی، الخط ۵۷۔ شمس الرحمن فاروقی، الخط ۵۸۔ پروفیسر شارب ردولوی، الخط ۵۹۔ شریف الحسن، الخط ۶۰۔ ڈاکٹر سید صفدر حسین، الخط ۶۱۔ ضمیر حیدر نقوی، الخط ۶۲۔ ظہیر الدین حیدر، الخط ۶۳۔ پروفیسر ظل صادق، الخط ۶۴۔ پروفیسر عبدالقوی دسنوی، الخط ۶۵۔ علی جواد زیدی، الخط ۶۶۔ علی احمد دانش، الخط ۶۷۔ عظیم امروہوی، الخط ۶۸۔ عاشور کاظمی، الخط ۶۹۔ فرمان فتحپوری، الخط ۷۰۔ فضل قدیر، الخط ۷۱۔ سید فیضی، الخط ۷۲۔ قمر حسین رضوی، الخط ۷۳۔ قیصر نجفی، الخط ۷۴۔ پروفیسر کاظم علی خاں، الخط ۷۵۔ کوثر الہ آبادی، الخط ۷۶۔ کنیز عذرا نقوی، الخط ۷۷۔ کوثر پانی پتی، الخط ۷۸۔ کیفی

سنبل، اخط-۷۹۔ گوپی چند نارنگ، ۲/خط-۸۰۔ سید مرتضیٰ حسین فاضل، ۱۱/خط-۸۱۔ ڈاکٹر مصطفیٰ فطرت، ۱/خط-۸۲۔ ممتاز حسین، ۱/خط-۸۳۔ پروفیسر محمد حیات خاں سیال، ۱/خط-۸۴۔ محمد رفیق اسلم، ۱/خط-۸۵۔ مسعود رضا خاکی، ۳/خط-۸۶۔ محمد زماں آزرده، ۱/خط-۸۷۔ مہتاب حراذفر، ۱/خط-۸۸۔ محمد عسکری جدید لکھنوی، ۲/خط-۸۹۔ پروفیسر مظاہر عباس، ۱/خط-۹۰۔ مکرّم لکھنوی، ۲/خط-۹۱۔ مضطر لکھنوی، ۱/خط-۹۲۔ ڈاکٹر مرزا امام علی بیگ افسر، ۱/خط-۹۳۔ سید مرتضیٰ اختر جعفری، ۲/خط-۹۴۔ ڈاکٹر نیر مسعود، ۱۲/خط-۹۵۔ ڈاکٹر عباس رضا نیر جلاپوری، ۲/خط-۹۶۔ ڈاکٹر نعیم تقویٰ، ۱/خط-۹۷۔ نسیم درّانی، ۱/خط-۹۸۔ سید نواز حسین زیدی، ۱/خط-۹۹۔ ثار نقوی مصطفیٰ آبادی، ۱/خط-۱۰۰۔ سید نصیر رضا رضوی، ۱۰/خط-۱۰۱۔ نجیب حسن، ۱/خط-۱۰۲۔ نصرت فاطمہ، ۲/خط-۱۰۳۔ نیساں اکبر آبادی، ۱/خط-۱۰۴۔ سید نفیس عباس نقوی، ۱/خط-۱۰۵۔ ناصر لکھنوی، ۱/خط-۱۰۶۔ ناصرہ خاتون رضوی، ۱/خط-۱۰۷۔ وحید الحسن ہاشمی، ۲۲/خط-۱۰۸۔ سید ہاشم رضا، ۶/خط-۱۰۹۔ ڈاکٹر ہلال نقوی، ۲/خط-۱۱۰۔ سید یاد علی جعفری، ۲/خط-۱۱۱۔ یاسر مولانا لیاقت علی، ۱/خط-۱۱۲۔

اتنے زیادہ مرثیے پر تحریر کردہ خطوط سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ فن مرثیہ نگاری میں علامہ ضمیر اختر کا مرتبہ نہایت بلند ہے۔ اس سلسلے میں انہوں نے جو کچھ لکھا سوچ سمجھ کر اور فہم و بصیرت کے ساتھ لکھا۔ ان کی تحریر میں سچائی، سادگی، اصلیت، جوش اور افادیت بدرجہ اتم موجود ہے۔ ادق سے ادق، علمی و فلسفیانہ مسائل کو سلیس، فصیح اور بلیغ انداز میں بیان کر دینا علامہ ضمیر اختر کی خاص خصوصیت ہے۔ اس قول کی تائید میں علامہ ضمیر صاحب کے چند خطوط کے اقتباس درج کیے جا رہے ہیں:

ضمیر اختر صاحب وحید الحسن ہاشمی کو خط میں ڈاکٹر اکبر حیدری کشمیری کے متعلق تحریر کرتے ہیں جو قابل غور ہے:

”میری رائے میں ڈاکٹر اکبر حیدری کا جتنا بھی کام ہے سب غیر معیاری غیر مستند اور چربہ سازی ہے۔ ڈاکٹر حیدری زبان کے بھی بد تمیز ہیں اور یہ ان کا کشمیری پن ہے۔ وہ اپنی عادتوں سے مجبور ہیں، انہوں نے مسعود حسن ادیب، مہذب لکھنوی، نائب حسین نقوی، ڈاکٹر محمد حسن، آل احمد سرور، پروفیسر امیر حسن عابدی، ڈاکٹر کاظم علی خان، کے لیے ہمیشہ گھٹیا زبان استعمال کی ہے۔ وہی رویہ انہوں نے میرے ساتھ اختیار کیا ہے لیکن وہ بچ کر نکل نہیں پائیں گے۔ بحث چونکہ ”طلوع افکار“ میں شروع ہوئی ہے اس لیے ”القلم“ میں ابھی بحث کا آغاز نہیں ہوا ہے۔ مرثیے کا وقار تو ڈاکٹر اکبر حیدری مجروح کر رہے ہیں۔ مرثیہ ہے:

جب صبح شب قتل ہوئی رن میں نمودار
کیا یہ ممکن ہے کہ ایک ہی مرثیہ ایک وقت میں میرا نئیس کا بھی
ہو اور مرزا دبیر کا بھی ہو، اکبر حیدری نے پہلے یہ مرثیہ میرا نئیس کے نام
سے ”باقیات انیس“ میں شائع کیا پھر مرزا دبیر کے نام سے ”باقیات
دبیر“ میں، حالانکہ یہ مرثیہ میرا نئیس کا ہے اور نہ مرزا دبیر کا۔ یہ مرثیہ تو
کلیم کا ہے۔

مرزا دبیر کے شاگرد مرزا محمد تقی اختر لکھنوی کا مشہور
مرثیہ ہے:

رن میں ابرو کماں کی آمد ہے
یہ مرثیہ اکبر حیدری نے مرزا دبیر کے نام سے
”باقیات دبیر“ میں شائع کر دیا۔ ابھی حال میں ”رثائی ادب“

شمارہ نمبر ۱۶ میں اکبر حیدری نے میر عشق کا مشہور مرثیہ جو ان کی مرثیوں کی جلد میں مطبوعہ ہے:

برباد الہی نہ کوئی پردہ نشیں ہو
گوہر آرا بیگم کے نام سے شائع کر دیا ہے، جب کہ لکھتے ہیں کہ یہ گوہر آرا بیگم کون ہیں؟

اکبر حیدری کی تحقیق کا معیار ملاحظہ ہو، گوہر آرا بیگم سے واقف بھی نہیں ہیں اور انھیں مرثیہ نگار بنائے دے رہے ہیں، وہ بھی میر عشق کا مطبوعہ مرثیہ دن دھاڑے ڈاکا ڈال کر، تفصیلات ”طلوع افکار“ میں دیکھئے، گوہر آرا بیگم اودھ کے وزیر اعظم نواب علی نقی خاں کی بیوی تھیں۔..... اکبر حیدری نے تمیں برسوں میں اردو مرثیے کو بہت سخت نقصان پہنچایا ہے جس کی تلافی ناممکن ہے۔“

(خطوط بنام ضمیر، ص ۷۹۲)

ڈاکٹر ضمیر اختر نقوی ایک خط میں وحید ہاشمی کو اکبر حیدری کی تحقیق سے اس طرح باخبر کرتے ہیں:

”اکبر حیدری پر میں نے جو کتاب لکھی ہے ڈھائی سو صفحات پر مشتمل ہے جلد ہی چھپ جائے گی۔ ان کی تحقیقی غلطیاں ہزاروں کی تعداد میں ہیں۔ اگر ابھی تصحیح نہ کی گئی تو آئندہ یہ کام مشکل ہو جائے گا۔“ لاہور پاکستان، ۲۰۰۲ء جنوری۔

(خطوط بنام ضمیر، ص ۷۹۲)

مکرم لکھنوی صاحب کو ایک خط میں اپنے علمی کارناموں سے متعلق تحریر

کرتے ہیں کہ:

”محمد رضا کاظمی کی کتاب ”جدید مرثیے“ کا مواد بھی میں نے ہی دیا اور انہیں ہر طریقے سے گائیڈ کرتا رہا وہ بھی آج کل محسن کشی پر آمادہ ہیں حالانکہ شوگر کے مہلک مرض میں مبتلا ہیں اور تو ندی بھی آتی ہے رات کو راستہ چلنا دشوار ہے مگر بغض کا کوئی علاج نہیں ہے۔..... پاکستان میں اگر سیاسی رہنما، صحافی، ادیب اور شاعر اپنے نام کے ساتھ پروفیسر یا ڈاکٹر لکھتے ہیں تو لکھتے رہیں کبھی یہ بحث نہیں اٹھائی گئی کہ کیوں لکھتے ہیں۔ اگر ادب میں اس بحث کو اٹھایا گیا تو کتنے لوگوں کے منہ کالے ہوں گے اس کا تصور بھی کوئی نہیں کر سکتا۔ بہت سے ڈاکٹر ادب کے ایسے موجود ہیں جنہوں نے ایک حرف بھی پی ایچ ڈی کا نہیں لکھا اور ڈاکٹر ہیں۔ میرے پاس ایسی فہرست بھی موجود ہے جب کہیے شائع کر دوں۔“

(خطوط بنام ضمیر، ص ۶۸۵)

یہ حقیقت ہے کہ ڈاکٹر ضمیر اختر صاحب دل کی بات زبان سے اس طرح ادا کرتے ہیں کہ سننے والا یا پڑھنے والا متاثر و مسحور ہو جاتا ہے۔ ان کا مبلغ علم، ان کی وسیع النظری، ان کی رنگارنگ طبیعت، حسن پسند فطرت، ان کی ہمہ دانی و جدت پسندی، ان کی سادگی و پرکاری، ان کے ذوق ادب کا معیار، الفاظ کے پیکر میں ہر جگہ نمایاں ہے۔ اس سلسلے میں پری وش فاطمہ (خاقان منزل وزیر گنج لکھنؤ) کے اس خط کو ملاحظہ کریں۔ جس میں وہ ڈاکٹر ضمیر اختر کے علم و اخلاق کا اظہار کرتی ہیں۔

”معظم محترم فخر قوم و ملت! علامہ سید ضمیر اختر صاحب قبلہ کو

دست بستہ سلام!

میں اپنے آپ کو بہت خوش نصیب سمجھتی ہوں جس نے ایک ایسے روشن چراغ کے ساتھ کچھ لمحے گزارے ہیں جو علم میں، کردار میں،

اخلاق میں، گفتار میں اور پیروی معصومین و اہل بیت میں اپنا ثانی نہیں رکھتا۔ ایسی ہستیاں ایک عرصہ دراز کے بعد ہی پیدا ہوتی ہیں جیسا یہ شعر خود بیان کر رہا ہے۔

مدّت کے بعد ہوتے ہیں پیدا کہیں وہ لوگ
مٹتے نہیں ہیں دہر سے جن کے نشان کبھی

حالانکہ فاصلے بہت طویل اور سرحدوں کی مشکلات سے دوچار ہوتے ہیں، آپ کہیں بھی رہیں چاہے امریکہ یا برطانیہ ہی کیوں نہ ہو اب تو انٹرنیٹ نے ساری دنیا کو ہی ایک محلّہ بنا دیا ہے آپ جیسے لوگوں کے لیے تمام عالم کا کوئی بھی حصہ معنی نہیں رکھتا صرف مقصد معنی رکھتا ہے جو ہدایت کے چراغ جلائے رکھے جو اس شعر کی ترجمانی ہے۔ شکر یہ۔

جہاں رہے گا وہیں روشنی لٹائے گا
کسی چراغ کا اپنا مکان نہیں ہوتا“

(خطوط بنام ضمیر، ص ۸۴۴)

ڈاکٹر ضمیر اختر نقوی نے بہت کچھ لکھا اور ہر موضوع پر لکھا۔ فلسفہ و مذہب، تاریخ و تنقید، تحقیق و سوانح وغیرہ شاید ہی کوئی ایسا موضوع ہو جو ان کی دسترس سے باہر ہو۔ اور جس میں ان کی قابلیت و صلاحیت کے ساتھ ساتھ سلاست، روانی، سادگی اور شگفتگی نہ پائی جاتی ہو۔ اسی کے ساتھ ساتھ اس حقیقت سے بھی انکار نہیں کیا جاسکتا کہ یہ خطوط کا مجموعہ مرثیہ اور دیگر اصنافِ سخن سے دلچسپی رکھنے والوں کے لیے بڑا عجیب اور دلچسپ تحفہ ہے۔ ”خطوط بنام ضمیر“ کی شاندار ترتیب و تدوین کے لیے ڈاکٹر عباس رضا نیر مبارک باد کے مستحق ہیں۔

☆☆☆

ڈاکٹر عباس رضا نیر: وادی ادب میں

”محروح: کچھ یادیں کچھ باتیں“ کے حوالے سے

اختر سعید

لکھنؤیوں تو ہمیشہ سے علم و ادب کا گوارہ رہا ہے، اس لیے کہ یہاں کے نوابین اور دیگر حکمران علم و ادب کے شیدائی رہے ہیں، ان کی سرپرستی میں یہاں علم و ادب کی شمع ہمیشہ فروزاں رہی ہے، جب بھی دہلی حیدر آباد اور رام پور جیسی مسلم اور اردو ادب کی بستیوں کا ذکر ہوتا ہے، دہلی اور لکھنؤ کا نام ضرور آتا ہے، لکھنؤ کی تاریخی ادبی حیثیت مسلم ہے اور بہت کچھ لکھا جا چکا ہے، خاص طور پر شعر و ادب کے معاملے میں تو یہاں کے شاعر و ادیب بہت پہلے ہی بین الاقوامی شہرت دلا چکے ہیں، وادی ادب کے سالار اردو ڈاکٹر عباس رضا نیر محتاج تعارف نہیں ہیں، یہ ایک ایسی روشن شخصیت ہیں جس سے سارا ملک اور بیرون ملک واقف ہے۔ ان کی شخصیت کثیر الجہات ہے، بیک وقت بے باک ناظم، ادیب، مترجم اور شاعر ہیں، مجھے یہ فیصلہ کرنا مشکل ہو رہا ہے کہ وہ شاعر بڑے ہیں یا ناظم، ادیب بڑے ہیں یا مترجم، ہر جگہ اور اپنی ہر حیثیت میں مجاہد اردو کے طور پر پوری استقامت اور بلندی کے ساتھ اپنا نام درج کروا رہے ہیں پھر چاہے وہ نظامت کی دنیا کی بات کی جائے شاعری ہو یا ترجمہ نگاری۔ جس طرف بھی نظر جاتی ہے ان کا قد اونچا نظر آتا ہے:

بڑے دعوے تھے سب کو اپنی اپنی شعر گوئی پر
مگر سب ہو گئے خاموش جب 'الہام' بول اٹھا

نکلے ہیں گھر سے ہم دل ویراں لیے ہوئے
نیر ترے کلام کا دیواں لیے ہوئے

ڈاکٹر نیر کو اردو سے والہانہ محبت ہے، وہ اردو زبان کی صفات و ضرورت بتانے والے اور اسے خوبصورت بنانے والوں کی فہرست میں سب سے اوپر کی منزل پر مسند نشین ہیں، ڈاکٹر نیر ایک عظیم تخلیق کار ہیں ان کے تخلیقی عمل میں ایک نوع کا رجائی پہلو پایا جاتا ہے، یہ قاری کو مایوس اور فرسودہ نہیں کرتے بلکہ خوش آئند مستقبل کی نوید سناتے ہیں، یہ بیک وقت اقدار و روایت، مشاہدات و تجربات اور مختلف النوع مسائل و موضوعات کے شاعر ہیں، جہاں ایک طرف ان کی نظمیں موضوع، ہیئت اور اسلوب کے اعتبار سے شعری دنیا میں انفرادیت کی حامل ہیں تو وہیں، دوسری طرف غزل کے میدان کے اکیسے شہسوار ہیں، ان کی نثری تصانیف بھی شہرہ آفاق کی حیثیت رکھتی ہیں۔

استاد محترم نے مختلف موضوعات پر کتابیں لکھی ہیں اور ترجمہ کی ہیں مگر میرے مطالعہ کا دائرہ صرف ڈاکٹر نیر کی مرتب کردہ کتاب 'مجرور سلطانی پوری: کچھ یادیں کچھ باتیں' سے متعلق رہے گا کہ یہ وقت کا تقاضا بھی ہے اور میری کم علمی کی مجبوری بھی، اس کتاب میں مجروح صاحب کی شخصیت اور فن کو کچھ یادیں کچھ باتیں نامی کوزے میں سمونے کی کامیاب کوشش کی ہے۔

مجرور کے بارے میں یہ ایک مختصر لیکن مکمل کتاب ہے یہ کتاب مجروح کی ذات و صفات اور فنی صلاحیتوں کو مختلف زاویوں سے متعارف کرانے کا موقع قاری کو فراہم کراتی ہے، اس غیر معمولی شخصیت کی بے پناہ خصوصیات سے روبرو ہونے کا ایک

خزانہ کم وقت میں ادبی دنیا کو میسر آیا۔

یہ نایاب خزانہ کل دو سو چھپیس ۲۲۶ صفحات پر مشتمل ہے، ان صفحات میں مجروح صاحب کی بہترین اور نادر غزلیات بھی شامل ہیں، اس کتاب کے ابتدائی صفحات میں گفتنی کے ذریعہ مجروح صاحب کا مختصر تعارف جس میں حیات اور خدمات پر روشنی ڈالی گئی ہے اور کتاب میں شامل مختلف مقالات کی اہمیت اور افادیت کو بیان کیا گیا ہے، جس میں مجروح کے شخصی اور ادبی کارناموں سے متعلق کسی بھی گوشہ کو نظر انداز نہیں کیا گیا ہے، اس کتاب کے ابتدائی صفحات انھیں کے بیش قیمتی الفاظ سے جگمگاتے نظر آتے ہیں، جن کے وسیلے سے ہم سبھی کو یہ خزانہ ہاتھ لگا، یہ غیر معمولی شخصیت کوئی اور نہیں ڈاکٹر عباس رضا نیر ہیں، کسی غیر معمولی شخصیت کی پہچان کسی معمولی نہیں غیر معمولی شخصیت کے قلم کا سہارا چاہتی ہے، کہنے کا مطلب یہ ہے کہ اس کتاب کے محدود صفحات میں ایسی وسعت سمٹ آئی ہے، کہ اس سے کئی کئی کتابیں برآمد ہو سکتی ہیں۔

اس کتاب کو پڑھنے کے بعد مجھے مجروح کے کلام کی پرواز کا علم ہوا، ملک زادہ منظور احمد جو کسی تعارف کے محتاج نہیں وہ خود اس کتاب کے پہلے مقالے میں مجروح کی عظمت کے قائل ہیں، اور یہ تسلیم کرنے میں کوئی دریغ نہیں کرتے کہ ان کی غزلیں غزلوں کا مستقبل بن گئیں۔

مجرور نے غزلوں میں رمز کو اس طرح برتا ہے کہ اپنے معاصرین میں سب سے زیادہ کامیاب نظر آتے ہیں، ملک زادہ منظور صاحب نے مجروح کی فن کاری کی کتنی بہترین عکاسی کی ہے، ہر رخ سے انھوں نے اس کتاب میں مجروح کو مجروح ہونے سے بچایا ہے، صرف فلمی نغمہ نگاری کی حیثیت سے ہی نہیں بلکہ اپنے دور کے ایک بہترین غزل گو اور ساتھ ہی ترقی پسند غزل گو کی صف اول میں لاکھڑا کیا ہے، منظور صاحب نے ان کی شاعری کو دو حصوں میں تقسیم کرتے ہوئے پورے استحقاق کے ساتھ بحث کی ہے اور

سند میں نادر اور مشہور و معروف اشعار پیش کیے ہیں جو زبان زد عام و خاص رہتے ہیں:-

میں اکیلا ہی چلا تھا جانب منزل مگر
لوگ ساتھ آتے گئے اور کارواں بنتا گیا

جس طرف بھی چل پڑے ہم آبلہ پایاں شوق
خار سے گل اور گل سے گلستاں بنتا گیا

صفحہ اٹھارہ پر اردو دنیا کی جانی مانی ہستی پروفیسر علی احمد فاطمی صاحب نے مجروح کی زندگی پر ابتدا سے آخر تک کے حالات سے قاری کو مکمل معلومات سے روشناس کروایا ہے، کسی بھی صاحب قلم کی یہی خوبی ہوتی ہے کہ وہ ایسی معلومات فراہم کرے جس سے قاری نا آشنا ہو، فاطمی صاحب نے یہی کام اس کتاب میں انجام دیا ہے۔

مجروح صاحب کی تعلیم کے دوران مدرسہ کے ماحول کا عجیب واقعہ بیان کیا ہے، جو مدرسہ کے آداب و احترام سے متعلق ہے، اس کے علاوہ وطن ٹانڈہ میں مقیم رہنے کے دوران عشق میں گرفتار ہونا اور ٹانڈہ چھوڑنے پر مجبور ہونا وغیرہ زندگی کے گزرے ہوئے حالات ہیں، فاطمی صاحب نے مجروح کی زندگی کے مختلف واقعات جن سے ان کی زندگی عبارت ہے، تذکرہ کرتے ہوئے قاری کی دلچسپی کو قائم رکھا ہے اور جب فاطمی صاحب نے مجروح کے فن پر بات کرنا شروع کی تو کوئی گوشہ ان سے نہیں چھوٹا اور انہوں نے ترک طبابت کے بعد مشاعروں سے لے کر ترقی پسند فلمی نغمہ نگاری تک پوری ادبی زندگی کا اس طرح سے احاطہ کیا ہے کہ جس کے لیے قاری کو بہت سی کتابوں کا مطالعہ کرنا پڑتا جس کو انہوں نے کچھ مختصر صفحات میں قلم بند کر دیا ہے اور مجروح کی پوری شخصیت اور فن ہمارے سامنے چند سطروں میں پیش کر دیا ہے۔

ہر اچھی شاعری کے لیے ضروری ہے کہ اس میں سب کی بات ہو لیکن انداز

شاعر کا ہو، یہی وہ انفرادیت اور اجتماعیت ہے جو شاعر کو عظمت بخشی ہے، مجروح کے اندر یہ خوبی بدرجہ اتم موجود ہے، وہ شاید پہلے شاعر ہیں جنہوں نے سیاسی مسائل کو بھی غزل کی زبان میں تغزل کی کیفیت کو برقرار رکھتے ہوئے پیش کیا ہے، مثلاً درج ذیل اس شعر پر فاطمی صاحب کی بات ختم ہوتی ہے:-

سوال ان کا، جواب ان کا، سکوت ان کا، خطاب ان کا
ہم ان کی انجمن میں سر نہ کرتے خم تو کیا کرتے

اس کتاب سے قاری کو ترقی پسند غزل کی واضح ابتدا ۱۹۴۵ء کی صداقت کا احساس ہوا جو خود مجروح کے جملے ہیں، مجروح نے اقرار کیا ہے کہ میرے ساتھیوں نے ترقی پسند غزل کو ایک تازہ روایت کی حیثیت دے کر ہی دم لیا، مجروح کی یاد کے عنوان سے فیاض رفعت بھی مجروح کا استقبال شہر ممبئی میں کرتے ہوئے ان کی غزل کی خوبیوں کو اس طرح سے بیان کرتے ہیں کہ مطالعہ کے وقت قاری کے ذہن میں اپنے حق کو حاصل کرنے کا جوش اور جذبہ ابھرتا ہے، ان کے اشعار کی حسین وادیوں میں کھوجاتا ہے:

جلا کے مشعل جاں ہم جنوں صفات چلے
جو گھر کو آگ لگائے ہمارے ساتھ چلے

استاد محترم نے ان مقالات کو اس طرح سے ترتیب دیا ہے کہ ایک ایک گوشہ کھلتا چلا جاتا ہے اور مجروح کی فن کارانہ شخصیت سے پردے اٹھتے چلے جاتے ہیں اور قاری محفوظ ہونے سے محروم نہیں رہ سکتا۔

اب ذرا یہ دیکھئے فیاض رفعت صاحب نے مجروح کی انا جوان کی شخصیت کا جزو اعظم ہے اس کو کس طرح سے عیاں کیا ہے وہ ”انا“ ہے اور انہوں نے اشعار کا حوالہ دیتے ہوئے ان کی انا کو عیاں کیا ہے، ملاحظہ فرمائیے:-

ہم ہیں کعبہ، ہم ہیں بت خانہ، ہمیں ہیں کائنات
ہوسکے تو خود کو بھی اک بار سجدہ کیجئے

کہیں ظلمتوں میں گھر کر ہے تلاش دست رہبر
کہیں جگمگا اٹھی ہیں مرے نقش پا سے راہیں

مجروح کی فلمی دنیا سے وابستگی پر ڈاکٹر راشد انور نے روشنی ڈالی ہے، جس میں انہوں نے چند سطروں میں کئی سالہ فلمی نغمہ نگاری کو محققانہ انداز میں پیش کیا ہے کہ مجروح نے تین سو سے زیادہ فلموں میں ہزاروں گیت لکھے، ان کے نغموں میں فلسفے کی آمیزش محسوس کی جاسکتی ہے، لیکن ان کے برتنے کا انداز اتنا فنکارانہ ہے کہ یہ فلسفہ ہمیں نامناسب نہیں لگتا اور یوں محسوس ہوتا ہے کہ افکار کے فطری بہاؤ کے لیے ان کی شمولیت ناگزیر تھی۔

مجروح کے نغمے ان کے دل کی آوازیں ہیں، ایسی آوازیں جو جانی پہچانی سی لگتی ہیں، دل سے نکلی ہیں، اور دلوں کو اپنا شیدائی بنا لیتی ہیں، مجروح صاحب نے ادب اور نغمہ نگاری دونوں کو بخوبی نبھایا، ایک ہی وقت میں دو کشتیوں پر سوار ہو کر بھی دونوں محاذوں پر اپنے وجود کو سلامت رکھا۔

ترتیب نگاری بھی سلیقہ چاہتی ہے، کون سی بات کا کہاں محل ہے اور کون سا عنوان کس گوشہ کو زیب دے گا اور کس کس طرح سے اس کو ایک کے بعد دوسرے سے جوڑنا اور اس کی قدروں کی شناخت کرنا وغیرہ یہ کام ڈاکٹر عباس رضانیر نے نہایت خوبصورتی سے انجام دیا ہے، اپنے مقالے مجروح سلطانپوری کے عنوان سے انیس امر و ہوی نے بھی ان کے مختلف گیتوں کو پیش کرتے ہوئے ان کی پچپن سالہ فلمی زندگی کا ذکر کیا ہے، مجروح سلطانپوری کے اثر سے نئی نسل میں اپنی تہذیبی میراث کا احترام آیا اور سستی مغربیت سے بیزاری انہیں کے اثر سے آئی، سیاست میں ترقی پسند اور حریت پسند عناصر پیدا ہوئے، ان کی علمی تصانیف سے ذہن کو جلا ہوئی، ان کی شاعری اور نظریہ

شاعری سے غیر محسوس طور پر سیاسی اور سماجی قدریں حاصل ہوئیں، مجروح کو یاد کرنا دراصل ایک شخص، شاعر، فلمی نغمہ نگار کو یاد کرنا نہیں بلکہ پوری اس علمی و تاریخی روایت کو یاد کرنا ہے، اور اس مشن کو نہ صرف یاد کرنے بلکہ اسے (ترقی پسند تحریک) جاری رکھنے کی تلقین کرنے کے مترادف ہے، مجروح کے اشعار ہر دور میں پڑھے گئے، پسند کیے گئے، یہ پسندیدگی ذاتی یا اتفاقی نہیں بلکہ اس کے اسباب ہیں، وجوہات ہیں۔

مجروح نے باقاعدہ ترقی پسند غزل کا آغاز کیا، اسے فن دیا، اسلوب دیا، ترقی پسندیت کو غزل کی طرز میں ڈھالا، غزل کو وقار بخشا، ادب اور فلمی نغمہ نگاری کے رشتہ کو عام کیا، تین سو سے زیادہ فلموں میں ہزاروں گیت لکھے، ان کے بعض نغموں میں ایسی ادبیت پوشیدہ ہے کہ اگر انہیں علیحدہ طور پر کوئی عنوان دے کر شائع کیا جائے تو انہیں باقاعدہ نظم تسلیم کرنے میں کوئی اشکال نہیں ہوگا۔

مختصر یہ کہ مختلف مقالہ نگاران نے الگ الگ زاویوں سے مجروح کے فن اور شخصیت کو قاری کے لیے کچھ یادیں کچھ باتیں نامی نسخہ میں پیش کیا، یہ ڈاکٹر عباس رضانیر کی محنت شاقہ کا نتیجہ ہے، یہ نہ صرف ایک بڑی ضرورت کی تکمیل کرتا ہے بلکہ کلام کی تاریخی ترتیب و صحت اور ان کی پُرکمال صلاحیتوں اور کوششوں کی بھی نشاندہی کرتا ہے۔ اردو ادب میں مجروح کے فن اور شخصیت سے متعلق ادبی تحقیق و عالمانہ نظر کا ایک قابل فخر اور اور ناقابل فراموش کارنامہ ہے، ڈاکٹر منتظر مہدی نے ترقی پسند شعرا میں مجروح کی انفرادیت کے عنوان سے مجروح سلطانپوری پر جو اپنا خیال پیش کیا ہے لائق تحسین ہے، مجروح کی انفرادیت کو اشعار کے ذریعہ پورے استدلال کے ساتھ بحث کرتے ہوئے یہ ثابت کیا ہے کہ ان کی غزلوں کی مقبولیت قدیم و جدید شعرا سے کسی طرح بھی کم نہیں ہے، اور ساتھ ہی ساتھ ان کے تمام اشعار اور فلمی نغمے عام اور خاص لوگوں کو ایسے یاد تھے جیسے وہ خود ہی تخلیق نگار ہوں، ڈاکٹر مسیح الدین خان نے بھی خطوط کے ذریعہ مجروح صاحب کو

ایک نئے زاویے سے پیش کیا ہے اور قاری کو مجروح کے نئے نام 'تماشائی' سے روبرو کروایا ہے، صفحہ ۱۳۱ پر محمد حنیف خان نے مجروح کی احتجاجی شاعری کو احتجاجی رنگ میں ہی گرج دار لفظوں کے ذریعہ قاری کو گرمانے کی حوصلہ مندی کا ہنر دیا ہے، جو انہی کا ملکہ ہے، جو کہ پوری طرح سے ادبی پیرائے میں بخوبی نبھانے کی کامیاب کوشش ہے، جس سے قاری محظوظ ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا ہے۔

ابتدا اور انتہا یہ دو کڑی ہیں، جو ایک دوسرے میں پیوست ہونا چاہتے ہیں، بات جہاں سے ختم ہوتی ہے وہیں سے شروع ہوتی ہے، ادبی اعتبار سے ڈاکٹر عباس رضا نیر کی شخصیت پورے آب و تاب کے ساتھ جلوہ گر ہے، تخلیقی، تحقیقی اور ترجمہ کی بدولت ادبی دنیا کی ممتاز شخصیتوں میں شمار کیے جاتے ہیں، ان کا مضمون! ”مجروح کی شعری جمالیات“ پوری کتاب کا حاصل بحث ہے اور مجروح سلطانپوری کی فن کارانہ صلاحیتوں کا سرچشمہ ہے، جو اس سرچشمے تک آجائے گا وہ مجروح کے فن کی افادیت کا قائل ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا ہے، ڈاکٹر عباس رضا نیر نے چند سطروں میں اپنے زور قلم سے مجروح کے فن کے نادر نمونے اشعار کی تشریحات کے ساتھ دنیائے ادب کے سامنے پورے جمال اور کمال کے ساتھ پیش کئے ہیں۔ مجروح نے اپنی شاعری کو کن کن لفظوں سے سجایا، اور سنوارا ہے، ان لکینوں کی چمک یہاں موجود ہے ساقی، دریا، قطرہ، جام، شراب، پیمانہ، میخانہ، شمع، حرم، صنم وغیرہ جیسے الفاظ سے متعارف کروایا ہے، مجروح کے یہاں لفظیات کے جو جواہر ریزے ہیں ان کی ترتیب اور ترکیب کی بھی ایک خاص سلیقہ مندی کو نہایت عرق ریزی اور جہد و جدوجہد سے اشعار کی تشریحات میں انہوں نے ڈھونڈ نکالا ہے یہ کسی بڑے شاعر اور تنقید نگار کا ہی ملکہ ہوتا ہے، دیکھئے:-

ہم ہیں متاع کوچہ و بازار کی طرح
اٹھتی ہے ہر نگاہ خریدار کی طرح

علم و ادب کی دنیا سے فلمی نغمہ نگاری کی دنیا تک کے طویل سفر اور ضروریات زندگی کے لیے اٹھایا گیا قدم اور اس میں سمائی ہوئی ان کی مجبور یوں کو بہت ہی خوش اسلوبی سے بیان کیا ہے، وہ بھی صرف ایک شعر سے پورے کلام میں ڈوب کر صرف ایک شعر کو نکالنا اور جو مجروح کے اسی گوشہ زندگی سے متعلق ہو یہ کسی بڑے فن کار کا ہی ملکہ ہے، اسی طرح آگے دوسرے شعر میں قاری کے ذہن کے دریچے کو کھولنے کے لیے مجروح کی شعری جمالیات سے ملاقات کرواتے ہیں:-

چاہے وہ کسی کا ہو لہو دامن گل پر
سیا دیہ کل رات کی شبنم تو نہیں ہے

مندرجہ بالا دو مصرعوں میں اس وقت کے ملک کے نامساعد حالات جدوجہد آزادی، اپنے حق کے لیے صدا بلند کرنے کے جرم دار و رسن کی سزائیں، پھانسی پر چڑھتے ہوئے بے قصور لوگ دراصل احساس ایک ایسی خوبی ہے جو خداداد ہوتی ہے، اور یہ کسی کوشش یا مشق سے حاصل نہیں کی جاسکتی ہے، ڈاکٹر عباس رضا نیر کے یہاں یہ حساس طبیعت موجود ہے اور یہی وجہ ہے کہ یہ مجروح کے کلام میں اس طرح جھانک آتے ہیں جس طرح کوئی جوہری نگینہ ساز ایک ہی نگاہ میں کلام موزوں کی پرکھ کر لے اور شعرا اٹھالیا اور اسکے دریچے کھولنا شروع کر دیئے۔

معنوی جمالیات کے ساتھ ہی انھوں نے لفظی جمالیات کو بھی باریک بینی سے پرکھا ہے، جیسے ملاحظہ فرمائیے:-

فریب کھا کے ان آنکھوں سے کب تک اے دل
شراب خام پیئیں رقص ناتمام کریں

مجروح کے اشعار میں لفظی جمالیات بھی موجود ہے جس کو یہ بخوبی اپنی باریک بین نظر سے اوجھل نہیں ہونے دیتے ہیں، شراب خام اور رقص ناتمام دونوں تراکیب نئی تو

ہیں ہی اور دونوں کی لفظی جمالیات بھی نکھری ہوئی ہے۔

البتہ معنوی اعتبار سے شعر میں کوئی خاص جدت فکر نہیں ہے لیکن آنکھوں کا بر محل تصرف اور آنکھوں سے فریب کھانا، بڑا خوبصورت زاویہ احساس ہے، لیکن یہاں ہر فریب میں اور اس فریب میں ذرا سا فرق ہے، اور یہی فرق مجروح کو دوسرے معاصر شعرا سے ممتاز کرتا ہے، یہی بتانے کی کوشش اشعار کے حوالے سے ڈاکٹر نیر نے پورے استحقاق سے کی ہے جو ادبی دنیا کے لیے مشعل راہ ہے، ڈاکٹر عباس رضا نیر نے ہر ہر زاویہ سے مجروح کے شعروں کو پرکھا اور سمجھا ہے، وہ مجروح کے شعر میں تخیل کی اونچائی اور احساس کی گہرائی کو منظر عام پر لے کر آئے ہیں اور مجروح کے اشعار میں جہاں پر انسان کی بے بسی اور لا چاری کا ذکر ہوا ہے، اس کو بھی غور سے دیکھا اور بتا ہے، اس کتاب میں اس وقت کے تاریخی حالات کو مجروح کے شعر کے ذریعہ قلم بند کیا ہے۔

مثال کے طور پر شعر ملاحظہ کریں:-

تقدیر کا شکوہ بے معنی، جینا ہی تجھے منظور نہیں

آپ اپنا مقدر بن نہ سکے اتنا تو کوئی مجبور نہیں

مندرجہ بالا دو مصرعوں میں زندگی کی دشواریوں کا ذکر کسمپرسی اور بے بسی کا نوحہ اس سے بہتر انداز میں ممکن نہیں تھا، رونا، ہنسنا، انسان کی فطرت میں شامل ہے، ہر جسمانی قلبی اذیت پر رنج ہوتا ہے، اور ہر خوش کن واردات پر کیف و لطف ملتا ہے، نصیب کا رونا تو زندگی سے بیزاری کی علامت ہے، اگر زندہ رہنا ہے تو اپنے آپ ہی اپنا مقدر بنانا ہوگا، شوکت الفاظ کا محل استعمال اور اس سے بھی زیادہ قابل اور لائق ستائش مجروح کے اشعار کا انتخاب انہیں کی فنی قابلیت کو پرکھنے کے لیے زیب دیتا ہے، یہ انہیں کا ملکہ ہے کہ ہر بار سمندر کی گہرائیوں میں اترتے ہیں تو گوہر ہی گوہر ہاتھ لگتا ہے۔

ڈاکٹر نے اپنے اس مقالے میں مجروح کی انفرادیت کو ثابت کرنے میں انہیں

کے کلام کے ایسے ایسے شعروں کا انتخاب کیا ہے جو ضرب المثل کی حیثیت رکھتے ہیں، دیکھئے کتنی خوبی بیان ہے ان کے اس مختصر مقالے میں پورے استدلال کے ساتھ:-

روک سکتا ہمیں زندان بلا کیا مجروح

ہم تو آواز ہیں دیوار سے چھن جاتے ہیں

مجروح یوں ہی اتنے بڑے ترقی پسند غزل گو نہیں ہیں پوری ایک دہائی تک ان کی غزلوں اور نغموں نے ساری دنیا میں دھوم مچا دی تھی۔

مندرجہ بالا شعر سے ہی اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ کلام مجروح کے چند اشعار کے لیے کئی صفحے درکار ہیں لیکن ڈاکٹر عباس رضا نیر نے اپنے زور قلم اور اپنی جودت طبع کے جوہر دکھلائے ہیں، ان قیمتی سطروں کو دیکھتے ہوئے میں پورے یقین اور اعتماد سے کہہ سکتا ہوں کہ ڈاکٹر نیر ہی کلام مجروح کا چند صفحات میں احاطہ کر سکتے ہیں اور ان کے ہر شعر سے تمام پردوں کو اٹھانے کا ہنر جانتے ہیں، ادبی دنیا کو لفظ آواز کے لیے چار الگ الگ طریقوں سے قاری کو سمجھانا چاہتے ہیں جس کے لیے قدرت کی عنایت کی ہوئی زندگی تک گئے ہیں، اور آوازی کی حیثیت زندگی ہے جو کہ اس شعر میں کردار کی حیثیت رکھتی ہے، یہاں پر جو دیواروں سے چھن جاتی ہے جس کے لیے دنیا میں آج تک کوئی زنجیر نہیں بنی ہے، دوران اسیری قیدیوں نے خطبوں کے انبار لگا دیے ہیں، تاریخ گواہ ہے اس بات کی! کہ ڈاکٹر عباس رضا نیر نے جس شعر پر قلم کی نوک رکھ دی اس شعر کو قابل قدر بنا دیا، اور اسکی پرتوں کو کھول کر رکھ دیا ہے۔

اپنے مقالے میں کسی بھی شعر سے اس طرح مخاطب ہوتے ہیں جیسے کوئی شاعر دوران محفل سامعین سے مخاطب ہے، انکی تشریحات میں گہرائی بھی ہے، اور گیرائی بھی اثر بھی ہے، اور توانائی بھی روانی بھی ہے، اور صفائی بھی۔ مجموعی طور سے ”مجروح“ کچھ یادیں کچھ باتیں“ مجروح شناسی کے حوالے سے ایک دستاویزی کتاب کی حیثیت رکھتی ہے۔

فن ترجمہ کے ماہر ڈاکٹر عباس رضا نیر

فرزانہ اعجاز

’ساتوں آسمان‘ سنا تھا اور ’ساتواں آسمان‘ بھی سنا اور پڑھا تھا، لیکن، اب جو یہ نئی کتاب، ’سات قدم آسمان‘ میں، نظر سے گزری تو یہ خیال بھی گزرا کہ ابھی تک تو پہلے آسمان ہی میں چمکتے چاند ستاروں کو محض ٹکٹکی باندھ کر دیکھنے کی باتیں ہوا کرتی تھیں۔ یہ سات قدم آسمان کے اندر جانے کی جرأت کس نے کر ڈالی؟۔ گجراتی ادب کی نامور ادیبہ اور کئی انعامات کی حقدار کنکدینکا کا پڑیا، صاحبہ کی مقبول ترین گجراتی کتاب ’ست پگلاں آکاش ماں‘ کو ڈاکٹر عباس رضا نیر صاحب نے بہت خوبصورتی سے سلیس اردو میں ترجمہ کیا ہے۔ اس سے قبل نیر صاحب ہندی مونو گراف آچاریہ رام چندر شکل کو بھی اردو کا مرصع لباس زیب تن کرا چکے ہیں،

دنیا کی کسی بھی زبان کے ادبی سرمائے کے لیے اسی زبان کی مختلف اشکال اور جدا جدا انداز تحریر ہوا کرتے ہیں، جیسے کوئی اردو میں شاعری کرتا ہے تو اس کو اردو کی نازک نازک، مہکتی اور دہکتی زبان کا استعمال ہی مناسب ہوگا، اسی طرح مرثیہ، قصیدہ، نظم گوئی یا ہزل گوئی یا نثر کی زبان کا ’ردھم‘ بھی الگ الگ ہوتا ہے۔ اسی ضمن میں ترجمہ بھی آتا ہے، دوسری زبان کی قیمتی چیزوں کا اردو میں ترجمہ، تحقیق اور تنقید کی طرح ایک الگ اور بہت

ترجمہ

اہم فن ہے۔ جو کہ ہر کس و ناکس کے بس کی بات نہیں ہوا کرتی ہے، مترجم کو دونوں زبانوں پر یکساں قدرت اور گرفت اور مشاقی درکار ہوتی ہے اور ساتھ ہی ساتھ اس ماحول سے واقفیت بھی ضروری ہوتی ہے، جس میں وہ کتاب لکھی گئی ہو، اصل زبان کی چاشنی اور سب سے اہم لکھنے والے کے احساسات اور اس کے دل و دماغ میں چکراتے پھر رہے خیالات اور پیغام کی روح کی لطافت کو مجروح کئے بغیر دوسری زبان میں خوبصورت اور میٹھے الفاظ اور بھینی بھینی کسک کے ساتھ، قاری کی طرف منتقل کرنے کا بھی خیال رکھنا پڑتا ہے، ایسی تمام نزاکتوں کا نیر صاحب نے خوب خیال رکھا ہے۔

یہ کتاب ’ست پگلاں آکاش ماں بقول مترجم‘ سات قدم آسمان میں، جو اردو کے ماحول سے بہت دور گجراتی ماحول میں بے انتہا حساس سبجیکٹ پر گجراتی کی نامور ادیبہ ’کندیکا کا پڑیا‘ نے تحریر کی ہے، جس میں ایک عام عورت کے بالکل ذاتی اور نسائی خیالات اور تجربات کا درد انگیز انداز میں ذکر کیا گیا ہے، کتاب پڑھتے ہوئے کئی بار محسوس ہوا کہ جیسے ’سامنے ایک دھندلا سا شکستہ آئینہ ہے جس میں عورت کا چٹخا ہوا وجود لہرا رہا ہو۔

اگر کوئی خاتون اس کتاب کا ترجمہ کرتی تو شاید اہم بات نہ ہوتی، لیکن، ڈاکٹر نیر صاحب جو صنف قوی سے تعلق رکھتے ہیں، اتنی مشاقی اور مہارت سے بالکل نسائی اور ذاتی محسوسات کو عین مین اردو میں ڈھال سکے، یہ بھی شاید اس وجہ سے ممکن ہوا کہ وہ حساس، بہت باہمت نوجوان اور سنجیدہ ادیب ہیں، جو لکھنؤ یونیورسٹی سے وابستہ ہیں۔ مختلف سنجیدہ موضوعات پر ان کی بہت سی تصانیف منظر عام پر آچکی ہیں اور انشا اللہ آتی بھی رہیں گی، کتاب کئی سو صفحات کی ہے، جو قاری کو رک کر سانس بھی نہیں لینے دیتی ہے، ترجمے کے ایک ایک حرف کو اپنی جگہ ’جڑا ہوا نگینہ‘ پایا، سلیس اردو میں گجراتی محاوروں اور ماحول کی سچی تصویر کشی، اپنے قاری کو اپنی طرف بلکہ گجراتی ماحول کی طرف متوجہ رکھتی

ہے، کتاب کی مصنفہ کے دلپذیر اور دلگداز انداز نے اپنے ان پڑھنے والوں کو ضرور جھنجھوڑا ہوگا، جو عورت کی شخصیت کو اب بھی فرسودہ رسومات میں جکڑا اور دبا اور کچلا دیکھنا چاہتے ہیں، اور سچ بھی یہی ہے کہ محض گجرات میں نہیں، تمام دنیا میں عورت آج بھی ایک درجہ نیچے ہی نظر آتی ہے، دنیا نے خواہ کتنی بھی ترقی کر لی ہو، آج بھی گول گول دنیا کے گول گول گلوب میں، کسی نہ کسی شکل میں عورت ’سکینڈ کلاس شہری‘ ہی کا درجہ رکھتی ہے، اگر ایک طرف وہ ’دیوی‘ ہے اور کہیں اس کے قدموں کے نیچے جنت بتائی گئی ہے تو ساتھ ساتھ یہی زمانہ اس کی تحقیر اور تذلیل کر کے دلی تسکین حاصل کرتا ہے، اس کو اپنے حضور نچوڑتا ہے، اس کو کہیں بھی کسی جگہ بھی اپنا سر بلند کئے دیکھنا نہیں چاہتا، افسوس کہ اپنی زندگی داؤں پر لگا کر نسل انسانی کو بقا دینے والی عورت کو احترام دینا آج بھی پسند نہیں کرتا۔

ترجمہ کی ہوئی تحریر پڑھنے والوں کو شاید ایسا محسوس ہوتا ہو کہ ’ارے، یہ کون سا مشکل کام ہے؟۔ لیکن، درحقیقت ایسا ہے نہیں۔ محاوروں کو ہی لے لیجیے ان کا اگر لفظی ترجمہ کیا جائے تو اس کے معنی ہی خبط ہو سکتے ہیں، جیسے کہ تاریخ کا ایک ترجمہ، جو فارسی سے انگریزی میں کیا گیا، وہ فارسی جملہ یوں تھا، ’از آسماں بلا نازل شد‘ جو کہ ایک عام محاورہ ہے، لیکن، انگریزی میں اس کا ترجمہ یوں ہوا، ’آسمان سے بلا‘ یعنی ’بجلی‘ گری، اب، ’بلا‘ اور ’بجلی‘ میں جو فرق ہے، وہ کوئی بھی اردو یا فارسی جاننے والا بخوبی جان سکتا ہے۔

مترجم پر بہت بڑی ذمہ داری ہوتی ہے کہ وہ اصل مضمون کی ہر گرہ اور مصنف یا ناول نگار جو کہنا چاہا رہا ہے اسکو عین مین ویسا ہی قاری تک پہنچا پائے۔ ایسا نہ ہو کہ ترجمہ، کہانی کے اصل متن کی راہ سے بھٹک کر قاری تک ایک نئی کہانی کی شکل میں پہنچے۔ ایسا کرنے کے لیے کئی اصول ہیں، سب سے پہلے تو کہانی یا مضمون کو بہت سنجیدگی سے اول تا آخر پڑھنا چاہیے اور ’نوٹس‘ بنا کر جلد از جلد ترجمہ کر دینا اچھا ہوتا ہے، تاکہ

مترجم کا ذہن ادھر ادھر نہ بھٹکے، اور سہل اور خوبصورت زبان اپنانا چاہئے، تجربہ بھی یہی کہتا ہے کہ بہترین سے بہترین ناولیں جب جب فلم کی شکل میں عوام کے سامنے آئیں تو وہ اپنے ناظرین پر وہ تاثر قائم نہ کر سکیں جو اصل کتاب یا ناول قاری کو دے سکتی تھیں۔

ڈاکٹر عباس رضا نیر صاحب جیسا سنجیدہ اور خاموش مترجم اگر کسی کو میسر آجائے تو اصل گجراتی کتاب 'ست پگلاں آکاش ماں' کی طرح ہی ترجمے کا دھنک رنگ لباس زیب تن کئے 'سات قدم آسمان میں' بھی ویسی ہی شاندار پذیرائی کی حق دار ہوگی، وہ کہیں بھی پڑھنے والے کو یہ محسوس نہیں ہونے دیتے کہ 'کند نیکا کا پڑیا' کا قلم اس سے مخاطب ہے یا مترجم کا جادو سر چڑھ کر بول رہا ہے، یہ بھی کہنے کی ضرورت نہیں کہ نیر صاحب ہمیشہ جو شیریں اور لطیف اردو زبان بولتے اور لکھتے ہیں وہ اجنبی لوگوں کے دل میں بھی سیدھی اترتی چلی جاتی ہے، اب اس گجراتی ناول کے ترجمے کی بھی اتنی ہی پذیرائی ہوگی۔

چار سو سے زیادہ صفحات پر پھیلی، مختلف ماحول، مختلف مزاجوں اور مختلف عمروں کی فرسودہ رسم و رواج میں جکڑی ہوئی عورتیں، جو تفریق سہتے سہتے اور گھٹتے گھٹتے خود اپنی ہی 'نئی' کرنے اور تل تل مرنے پر مجبور ہوتی ہیں اور اتفاق سے ساتھ آجانے پر ایک نیا 'نگر' آباد کر لیتی ہیں، ایک ایسا خطہ زمین جو 'جنت نظیر' ہو جاتا ہے، جہاں ہر ذی روح بغیر کسی جنسی تفریق کے محض 'انسان' بن کر رہتا اور ایک دوسرے کا درد اپنے دل میں محسوس کرتا ہوا ہنستا مسکراتا اور زندگی کے پتھر یلے میدان میں سکون اور شانتی کے پھول کھلاتا جاتا ہے۔

اگرچہ پلاٹ بہت دلچسپ ہے لیکن، افسوس کہ 'کند نیکا کا پڑیا' کی یہ خوبصورت دنیا ابھی اونچ نیچ اور رسم و رواج میں جکڑے، ہمارے عالمی سماج میں دور دور نظر نہیں آتی ہے، مصنفہ کی یہ خواہش کہ 'کاش' کبھی ایسا ہوتا، اور اپنے آپ سے یا کھلے آسمان سے دل

کی باتیں کرنا، خاموشی کی زبان میں وہ تمام اذیتیں اور دکھ درد بیان کرنا جو ایک عورت ہونے کی سزا میں وہ پل پل جھیلی اور اپنی ہر خواہش اور خوبی کو گنوا تی رہتی ہے جو اس کو کہیں زیادہ معزز مقام دلا سکتی تھی، یہ دکھ درد کسی ایک عورت کے نہیں، یہ تو بار بار قارئین کو اپنے ارد گرد دیا کبھی کبھی اپنے عکس میں بھی نظر آ سکتے ہیں۔

☆☆☆

مظاہر تخلیقیت کا پاسدار مترجم عباس رضائیر

سدھارتھ سدھیپ

’کند نیکا کا پڑیا‘ کا نام گجراتی ادب میں تعارف کا محتاج نہیں ہے۔ ان کا نام ایک درد مند و سنجیدہ تخلیق کار اور سماجی کارکن کی حیثیت سے پوری دنیا میں مشہور ہے۔ گجراتی ادب میں ان کے کئی ناول شائع ہو کر کامیابی کی بلندیوں تک پہنچے ہیں ان کو کئی ادبی انعامات سے نوازا جا چکا ہے۔ ان کی ناول نگاری کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ یہ انسانی زندگی کے حقیقی مسائل کو اپنا موضوع بناتی ہیں۔ جس میں زندگی کی تمام تر خوبیاں اور خامیاں وابستہ ہوتی ہیں۔ عورتوں کے مسائل جیسے جہیز، کم عمر میں شادی، طلاق، تعلیم، آبروریزی، گندی سیاست اور مردوں کے دوسرے زور زبردستی وغیرہ مسائل ان کے ناولوں میں خاص طور سے نمایاں ہیں۔

ناول ’سات قدم آسمان میں‘ ایک بڑا اور کامیاب ناول ہے، جس کی خوب پذیرائی ہوئی، اس ناول کو اب تک چھ انعامات سے نوازا جا چکا ہے۔ اس ناول میں عورتوں کی زندگی کے مختلف پہلوؤں کو پیش کیا گیا ہے، جس میں خاص طور سے عورتوں کے حقوق ان کی تعلیم اور فکر و خیال میں آزادی لانا ہے۔ یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ ناول ’سات قدم آسمان میں‘ عورتوں کے حق میں ایک انقلاب برپا کرتا ہے۔ یہ ادب کا پہلا انقلاب

ہے جو آزادی نسواں کے مسائل کو بڑی بے باکی اور مضبوطی سے منظر عام پر پیش کرتا ہے۔ کند نیکا کا پڑیا نے خاص طور سے ہندو معاشرے کی عورتوں کے مختلف مسائل کو ناول کا موضوع بنایا ہے۔ جس میں کسی عمر اور تعلیم کی پابندی نہیں ہے بوڑھی، جوان اور بچی تک کے مسائل ان کے اس ناول میں دیکھنے کو ملتے ہیں۔ عورتوں کی تعلیم، مرد اور عورتوں میں فرق، بیواؤں کے مسائل، شادی، جہیز، اقتصادیت وغیرہ جیسے مختلف موضوعات پر بے باکی سے قلم اٹھایا ہے۔ ان کے قلم نے نہ صرف گجراتی ادب میں بلکہ گجراتی سماج میں بھی ہلچل پیدا کر دی اور اب دوسری زبانوں میں میں ترجمہ ہو رہا ہے جس میں ایک زبان اردو بھی ہے۔

کند نیکا کا پڑیا کا یہ ناول تعلیم یافتہ معاشرے کو سوچنے کی دعوت دیتا ہے انسانی ذہنوں کو جھنجھوڑتا ہے اور عورتوں کے حقوق اور ان کے مسائل پر غور و فکر کرنے پر مجبور کرتا ہے۔ ناول کا موضوع ہندوستانی عورتوں کی گھریلو، سماجی، اقتصادی، مذہبی، اور تعلیمی زندگی کے ہر پہلو کے پر نظر ڈالتا ہے۔ اس ناول کے مطالعے سے یقین ہو جاتا ہے کہ مرد آج بھی عورتوں کے حقوق کے لیے سنجیدہ نہیں ہیں جب کہ عورت انسانی زندگی کی ایک حصہ ہے اور مردوں کی ہم سایہ ہے۔ اس لئے عورت کو بھی ہر وہ سہولت ملنی چاہئے، جو مردوں کے لیے ہے۔ لیکن افسوس کہ ایسا نہیں ہے۔ اس ناول میں تعلیم یافتہ، بے خوف، بے باک اور بے جھجک کرداروں کے ذریعے ناول نگار نے عورتوں کو اپنے حقوق کے لیے اور قدیم و فرسودہ رسم و رواج کی کشمکش کو بڑی ہی خوبصورتی سے دکھایا ہے۔

ناول ’سات قدم آسمان میں‘ گجراتی ناول ’ست پگلاں آکاش ماں‘ کا ہندی سے اردو ترجمہ ہے۔ جس کے مترجم اردو ادب کے مشہور و معروف شاعر، ناقد و محقق ڈاکٹر عباس رضائیر ہیں۔ اس سے قبل وہ ساہتیہ اداکار کے ہندی مونوگراف ’آچار یہ رام چندر شکل‘ کا بھی اردو میں ترجمہ کر چکے ہیں۔ اس کے علاوہ ’ادبی میزان‘ تنقیدی کتاب

کے علاوہ دو درجن سے زیادہ کتابیں شائع ہو چکی ہیں۔ اس وقت آپ لکھنؤ یونیورسٹی کے شعبہ اردو میں درس و تدریس کے فرائض انجام دے رہے ہیں اور صدر شعبہ کی بھی ذمہ داری نبھا رہے ہیں۔ ڈاکٹر نیر ایک اچھے استاد کے علاوہ ایک اچھے شاعر بھی ہیں جو ملک اور غیر ملک میں اپنے نام اور کام کو اس حوالے سے منوا چکے ہیں۔ اتنا ہی نہیں مونوگراف ”آچار رام چندر شکل“ اور ناول ”سات قدم آسمان میں“ اور ”چریویتی چریویتی“ اور ادھار کارڈ کی ویب سائٹ کا ترجمہ کر کے اپنے آپ کو اس میدان میں بھی ثابت کر چکے ہیں۔

ترجمے کا کام ایک مشکل کام ہے، جس کے لیے کم سے کم دونوں زبانوں پر گرفت ہونا ضروری ہے۔ ترجمہ وہ فن ہے جس کی اہمیت ادب میں برقرار ہے۔ ایک اچھا ترجمہ کسی تخلیق سے کم نہیں، کبھی کبھی ترجمہ کو اصل تخلیق سے زیادہ شہرت حاصل ہو جاتی ہے۔ جس کی زندہ مثال داستان باغ و بہار ہے۔ جن خوبیوں کے ساتھ ’نوطر زمر صبح‘ کا ترجمہ داستان باغ و بہار کے نام سے میرامن دہلوی نے کیا، زبان و بیان کی انہیں خوبیوں کے ساتھ ڈاکٹر عباس رضا نیر نے عام بول چال کی زبان استعمال کرتے ہوئے ’ست پگلاں آکاش ماں‘ کا ترجمہ ہندی سے اردو ’سات قدم آسمان میں‘ کے نام سے کیا ہے ترجمہ کرنا ہی بڑی بات نہیں بلکہ اصل کہانی اور اس فن پارے کی بنیادی مقصد کو ترجمے میں برقرار رکھنا ہی نہایت اہمیت کا حامل ہے ان سب سوالوں کے جواب ڈاکٹر نیر کی کتاب ”سات قدم آسمان میں“ کے مطالعے سے ہو جاتی ہے اور اس ناول کی خوبیوں کا اندازہ بھی بخوبی ہوتا ہے۔ ایک خاص بات اور اس ناول کے بارے میں یہ کہی جاسکتی ہے کہ عورتوں کے مسائل پر ناول کی ابتداء سے پہلے کنڈینکا کاپڑیا نے جو ایک بہترین مقالہ لکھا ہے وہ ناول کی اہمیت میں اور اضافہ کرتا ہے اور اس کو ڈاکٹر نیر نے اپنے لفظوں میں جس طرح ڈھالا ہے وہ اور بھی اہمیت کا حامل ہو جاتا ہے کیوں کی اس

مقالے میں ناول نگار نے عورتوں کے قدیم استحصال کا جائزہ لیا ہے۔ اس بات کا بخوبی اندازہ صرف ناول ”سات قدم آسمان میں“ کے مطالعہ سے ہی ہو سکتا ہے۔

ناول نگار کو اس بات کا بہت افسوس ہے کہ خواتین کے ساتھ زمانے میں نا انصافیاں ہو رہی ہیں جو جدید معاشرے میں بھی جاری ہیں۔ یہی سبب ہے کہ جس کے خلاف ناول نگار آواز بلند کرتی ہیں، اور عورتوں کو وہ حق دلانے کی کوشش کرتی ہیں، جس کی عورتیں حقدار ہیں اور مرد اس معاشرہ ان سے یہ ان کا حق چھینتا رہا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ انھوں نے ناول کا موضوع آزادی نسواں کو بنایا ہے۔ جس سے تعلیم یافتہ معاشرہ عورتوں کی حقوق کی طرف متوجہ ہو جس سے مردوں نے چشم پوشی کر رکھی ہے۔ یہاں وہ ہندوستان کی قدیم تاریخ کی طرف بھی اشارہ کرتی ہیں، جہاں عورتوں کے حقوق قائم تھے۔ موضوع کے اعتبار سے یہ ناول ایک تاریخی ناول بھی ہے اور جدید بھی کیوں کہ کنڈینکا کاپڑیا نے حال اور ماضی دونوں کو ناول کا موضوع بنایا ہے۔ ناول کے عنوان سے پہلے عورتوں کے قدیم مسائل پر ایک بہترین مضمون ہے جو عورتوں کے استحصال کی تاریخ بیان کرتا ہے جس میں وہ ویدوں کے عہد کے پہلے کا ذکر کرتی ہیں جب عورتوں کو برابری کا حق تھا۔ لیکن اس کے بعد ’منوسمرتی‘ نے ’شودروں‘ کے ساتھ ’عورتوں‘ کے سارے حقوق کو چھین لیا۔ اور اپنا مذہبی قانون قائم کیا۔ اس قانون نے دونوں کو ذلت کی زندگی جینے پر مجبور کر دیا جس کے اثرات آج بھی سماج میں نمایاں طور پر دیکھے جاسکتے ہیں۔ ناول نگار رامائن کو بھی سوالوں کے گھیرے میں لاتی ہیں جہاں ہمیشہ صرف عورت سے ہی پاکدامنی کا امتحان لیا جاتا ہے اور بے گناہ سیتا کو جنگل میں بھٹکنے کے لیے چھوڑ دیا جاتا ہے۔ مہابھارت جس میں عورت کو جوئے میں داؤ پر لگا دیا جاتا ہے۔ مہاپرش کہلانے والوں نے بھی عورتوں کے ساتھ نا انصافیاں کی ہیں۔ جنھوں نے کبھی تعریف سے تو کبھی زور و ظلم سے کام لیا جب اس سے بات نہ بنی تو لاج، شرم اور تیاگ کی دیوی قرار دیا۔ اسی کڑی

میں عورت کے لیے سو بھاگیہ وتی ہو، سو ہاگن ہو، دودھوں پھلوں پوتوں نہاؤ، وغیرہ جیسے لفظ تراشے، جو عورت کی زندگی کے لیے نہیں بلکہ مردوں کی زندگی کی دعا مانگنے کے لیے ہیں۔ عورت کا شوہر جیسا بھی ہو اسے سات جنم تک قبول کرنے کے لیے مجبور کیا جاتا ہے۔ کیوں کہ شادی سات جنموں کا بندھن ہے ایسا عورتوں کو ہمیشہ سمجھایا جاتا ہے۔ جس کا رشتہ اس دنیا میں نہیں بلکہ دوسری دنیا سے جوڑا جاتا ہے۔ ناول نگار اپنے اس ناول میں ان باتوں کو نہ صرف غلط قرار دیتی ہیں بلکہ ثابت کرتی ہیں کہ یہ سب عورتوں کا استحصال کرنے کے ذریعے ہیں۔

ناول نگار سماج میں بیوہ عورتوں کی زندگی کی حقیقت کو بیان کرتی ہیں، جہاں ان کی زندگی کو جہنم بنا دیا جاتا ہے۔ بیواؤں کو بدشگون کی سند دے دی جاتی ہے جن پر بہت ساری پابندیاں لگا دی جاتی ہیں جبکہ مرد کے ساتھ ایسا نہیں ہوتا۔ رائٹ مرد سے سماج میں کسی طرح کی بدشگونی نہیں ہوتی اس کی پہچان کا کوئی ثبوت نہیں، مرد کو کوئی نام نہیں دیا جاتا ہے۔ لیکن اب تعلیم یافتہ نوجوان لڑکیاں ان برے اور فرسودہ رواجوں کو اپنی دلیلوں سے خارج کرنے لگی ہیں جسے ناول نگار اس طرح پیش کرتی ہیں۔

’اینا جان بوجھ کر زور سے بول پڑی ارے ارے ماموں کو یہاں نہ آنے دینا‘ بدشگونی ہو جائے گی۔ ماں تو ایک دم سے دم بہ خود رہ گئیں ”کیا بکتی ہے؟“

’اینا نے بھولپن سے کہا“ خالہ کو آپ نے اس رسم سے دور ہٹایا تھا، لہذا میں نے سوچا کہ رائٹ ماموں بھی اس خوشی کی رسم میں کیسے موجود رہ سکتے ہیں“۔

ناول نگار چاہتی ہیں ایسے رسم و رواج جن میں عورتوں کے ساتھ نا انصافیاں ہوں انھیں اب ختم کر دینا چاہئے۔ اپنا ایک تعلیم یافتہ لڑکی ہے، جسے اچھے برے کا اندازہ ہے، جو عورتوں کے حق کے لیے آواز بلند کرتی ہے، وہ ان رسموں کو ختم کرنا چاہتی ہے جو صرف عورتوں کے لیے ہوں۔ مرد اس معاشرہ میں عورت کی وفات کے

بعد مرد اس کی چتا ٹھنڈا ہونے سے پہلے ہی اپنی دوسری، تیسری شادی کی فکر کرنے لگتا ہے جبکہ عورتوں کو اس بات کی اجازت نہیں ہے پہلے تو ان کو سستی ہی ہونا پڑتا تھا دوسری شادی کی بات تو دور کی تھی اب سستی کا رواج سماج میں نہیں ہے لیکن اب بھی سماج میں یا جہیز کے لیے مرد پہلی بیوی کو طلاق دیتا ہے، یا پھر طلاق لینے پر مجبور کر دیتا ہے، نہیں تو بیوی کو موت کی نیند سلا دیتا ہے یا خودکشی کرنے پر مجبور کرتا ہے نہیں تو یہ کہہ کر کہ بچہ نہیں پیدا کر سکتی، وغیرہ خامیاں نکال کر دوسری شادی کرتا ہے۔ جبکہ مرد اپنی خامی نہیں دیکھتا۔ ناول نگار کا سوال ہے کہ ان سب باتوں کے لیے عورت کو دوسری شادی کی آزادی کیوں نہیں ہے؟۔ جبکہ ان حالات میں عورت کو مرد سے زیادہ دوسری شادی کرنے کی ضرورت ہے اس لئے عورتوں کی اس معاملے میں حمایت کرتے ہوئے لکھتی ہیں:

”اور یہ بھی ہوتا ہے کہ مرد کی کمیوں کے سبب اولاد نہ ہو۔ لیکن مرد کو کوئی طعنہ یا دشنام نہیں سننا پڑتا۔ ملا بہن کے شوہر نے اولاد کے لیے دوسری شادی کی اور دوسری بیوی سے بھی اولاد نہ ہوئی۔ تیسری بار سولہ سال کی ایک غریب لڑکی سے شادی کی۔ اپنا پوچھنا چاہتی تھی کہ ملا بہن کے شوہر میں ہی خامی ہو تو؟ کیا ملا بہن شوہر کو چھوڑ کر اولاد کے لیے دوسرے مرد سے شادی کریں گی؟“۔

یہ سوال سماج کو اس معاملے میں غور کرنے پر مجبور کرتا ہے کیا سماج عورت کو اولاد کے لیے یہ سب کرنے کی آزادی دے سکتا ہے جس طرح مرد اپنا حق سمجھ کر ایسا کرتا آ رہا ہے؟ عورتوں کے ساتھ اس طرح سماج نا انصافی کرتا آیا ہے۔ اپنا کا کردار ایسے لوگوں کے لیے سوال چھوڑتا ہے۔ اپنا بے جھجک، بے خوف اور بے باک کردار ہے جو شادی کے بعد لندن جاتی ہے۔ جہاں اس کے شوہر وپل کی وفات کے بعد بھی اپنا بیوہ کے لباس کو اختیار نہیں کرتی، وہ ہر اس غلط رسم و رواج کو دلیلوں کے ساتھ رد کر دیتی ہے جو

ہزاروں سالوں سے نا انصافیوں پر مبنی ہے۔ لیکن امریکی ہندو معاشرہ اپنا کی مخالفت کرتا ہے جس سے وہ اپنے خاندان کے ساتھ ہندوستان واپس آ جاتی ہے۔

ناول نگار افسوس کرتی ہیں کہ عورت کو ان کا حق نہیں حاصل ہے، جبکہ ان کے بغیر دنیا کا تصور ممکن ہی نہیں، وہ عورت جو گھر اور خاندان کی ہر ضرورت پر حاضر رہتی ہے۔ لیکن سماج عورت کے ان کاموں کی کوئی قیمت نہیں ادا کرتا نہ محبت سے پیش آتا ہے اوپر سے ہمیشہ مرد عورت پر اپنی برتری کو ظاہر کرتا ہے۔ عورت کو اپنے حق میں فیصلہ لینے کی آزادی نہیں اتنا ہی نہیں عورت سے گھر کے کسی کام میں صلاح تک بھی نہیں لی جاتی، جس دن وہ ایسا کرنے کی کوشش کرے، اسی دن گھر سے باہر نکلنے کی دھمکی ملتی ہے، یہ کہتے ہوئے، یہ گھر میرا ہے، اس گھر میں اب تیرا کوئی کام نہیں۔ یہی باتیں ہیں جو عورتوں کو سب سے زیادہ پریشان کرتا ہے۔ ناول نگار لکھتی ہیں:

”چلی جا اپنے باپ کے گھر، مجھے تیری ضرورت نہیں“

سب سے بڑا خوف یہی ہے بے گھر بے آبرو اور بے سہارا

ہو جانے کا خوف۔“

عورت کسی بات کو کہنے کی ہمت کرے یا اپنے کام کی قیمت مانگے تو عورت کو اسی طرح کا جواب ملتا ہے۔ اتنا ہی نہیں زور دینے پر طمانچہ اور گالیاں بھی کھانی پڑتی ہیں ناول کا ایک کردار سودھا ہے جس کا شوہر ہر وقت اس کو انگلیوں پر لیے رہتا ہے۔ ہر بات میں ہر کام میں سختی دکھاتا ہے اور ہاتھ بھی اٹھاتا ہے مثلاً۔

”سٹاک.... ایک زوردار طمانچہ سودھا کے گال پر پڑا۔ بیمار

وسودھا سر سے پیر تک کانپ گئی۔

”حد سے باہر جانا ٹھیک نہیں ہے سودھا، گہنے تمہارے کیسے

ہو گئے؟ میں نے تمہیں دیے ہیں۔ میں نے کما کر خریدے ہیں۔ بچپن

سے محنت کی ہے، پسینہ بہا کر کمایا ہے۔

اس گھر میں ایک ایک چیز میری کمائی کی ہے۔

بھرائی ہوئی آواز میں وسودھا بولی، ”اور کیا اتنے برس تک

میں نے کچھ نہیں کیا ہے؟ میں نے کوئی محنت نہیں کی ہے؟“

وہ بے زبان عورتیں جو سب کچھ چپ چاپ سن لیا کرتی تھیں، اب وہ گھر کے معاملوں میں اپنا حق چاہتی ہیں۔ ناول نگار وسودھا کے ذریعہ بتانا چاہتی ہیں کی عورت نے جس گھر میں دن رات محنت کی جس کی کوئی قیمت نہیں حاصل کی، اس گھر میں انکا بھی برابر کا حق ہے وہ بھی گھر کے معاملے میں سوال و جواب کرنا چاہتی ہیں۔ لیکن مرد یہ سب پسند نہیں کرتا۔ عورتوں کے منہ سے سوال و جواب نہیں سننا چاہتا۔ گھر کے کسی بھی کام کو کرنے نا کرنے کا حق مرد صرف اپنا سمجھتا ہے جبکہ ناول نگار کا ماننا ہے کہ عورت کو بھی اس طرح کا حق حاصل ہونا چاہئے، جس کی نمائندگی وسودھا یہاں طمانچہ کھا کر بھی کرتی ہے مثلاً۔

”وسودھا نے آہستہ لیکن واضح لہجے میں کہا، ”میں بھی یہ سب

نہیں مانتی۔“

”یو پیمیش کی آنکھوں میں غصہ ابھر آیا، ”تم مانتی ہو کہ نہیں اس

کا تو کوئی سوال ہی نہیں پیدا ہوتا۔ میں مانتا ہوں، بس یہی کافی ہے۔“

مرد جو بھی کرے یا کہے اسی کو وہ صحیح سمجھتا ہے، عورت کتنا بھی صحیح بولے اس کی باتوں سے ہر کوئی انکار کر دیتا ہے۔ اس کی زبان کو بند کر دیا جاتا ہے۔ مرد گھر اور گھر کی ساری جائیداد کو اپنا سمجھتا ہے، وہ عورت کو اس جائیداد کا حصہ دار نہیں سمجھتا۔ یہی وجہ ہے عورتوں کے ساتھ زیادتی ہوتی آرہی ہے۔ مرد عورت کی تعریفیں کر کے اپنی ضرورتوں کو پورا کرتا ہے، اور عورتوں کو گمراہ کرتا ہے، جس سے وہ اپنے حق کی تلاش میں نہ نکل سکے لیکن ناول نگار نے عورتوں کو ان مشکلات سے نکالنے کے لیے آواز بلند کی ہے مثال کے

طور پر یہ اقتباس ملاحظہ کیجئے:

”بہنوا! ہم اس سلسلے میں جو کچھ کریں گے وہ زیادہ تر مردوں کو پسند نہیں آئے گا۔ ہم اپنے درد کو زبان دیں۔ اپنی حالات کو سدھارنے کی کوشش کریں۔ ہمارا معاشرہ مرداساس معاشرہ رہا ہے۔ اب تک ان مردوں نے کیا کیا؟ ”ناری تو نارائی“ اور آدرش بھارتی ناری جیسے خوبصورت لفظوں سے ہمیں فریب دیا، سستی کہہ کر ہمیں چتا پر چڑھا دیا۔ ان باتوں کو عورتوں کی صفت کا نام دے دیا جن سے ان کا اقتدار بنارہے“

یہ بات بالکل درست ہے کہ عورتوں کے ساتھ مرد معاشرہ میں دوہرا معیار رکھتا ہے، ہندو مذہب میں تو عورتوں کو دیوی بنا کر ایک طرف عبادت کرتے ہیں تو دوسری طرف عورتوں کے استحصال کا سلسلہ بھی قائم رکھتے ہیں۔ عورت کو فریب میں رکھنے کے لیے مرد نے کئی طرح کے اصول قائم کر رکھے ہیں اور اس کو کئی طرح سے جاری بھی رکھتے ہیں۔ مصنفہ عورت کی تعلیم کے حوالے سے کہتی ہیں کہ مردوں کی وجہ سے عورتوں کی تعلیم مکمل نہیں ہو پاتی، اور صرف اتنی ہی تعلیم دی جاتی ہے جس سے عورت گھر چلا لے اور آسانی سے اس کی شادی ہو جائے۔ اس کی ایک وجہ لڑکی کو پرایا دھن سمجھنا جسے پرانے گھر بھیجنے کی فکر زیادہ اور تعلیم دلانے کی کم ہوتی ہے مثلاً۔

”رنجنا کی بیٹی کو ڈاکٹر بننے کی تمنا تھی۔

لڑکوں کو پڑھانے کا خرچ تو مشکل سے نکل پاتا ہے۔ اب آشنا کو ڈاکٹر کہاں سے بنائیں؟“ رنجنا کہتیں۔

شو بھانچ میں ہی کہتی، ”ہاں، اور وہ تو ایسے بھی پرانے گھر جائے گی۔ اس کے لیے خرچ کرنے سے کیا فائدہ؟ وہ تھوڑے ہی کماکر کھلائے گی،“

یہ بات کافی حد تک درست ہے کہ لڑکیوں کے والدین یہی سمجھتے ہیں کہ لڑکیاں پرایا دھن ہیں اور تعلیم کے لیے کم جہیز کے لیے زیادہ دولت جمع کرتے ہیں لیکن اب لڑکیوں کی تعلیم کے حوالے سے لوگوں کے خیالات بدل گئے ہیں لیکن ابھی بھی یہ سوال قائم ہے کہ لڑکیوں کو تو پرانے گھر جانا ہے۔ لڑکیاں لڑکوں کی طرح گھر نہیں چلائیں گی۔ لیکن ناول نگار نے ان باتوں کو خارج کیا ہے، یہ ثابت کرتے ہوئے کہ لڑکیاں بھی کما کر گھر چلا سکتی ہیں۔ جس کی مثال ناول کی خاتون کردار اینا ہے۔

اینایک تعلیم یافتہ خاتون ہے۔ وہ چھوٹی عمر سے ہی دوئم درجے کے تعلقات پر سوال اٹھاتی رہی ہے۔ جہیز ایک بڑی لعنت ہے، جسے دورِ حاضر میں رواج کے طور پر تسلیم کر لیا گیا ہے۔ جہیز جو انسانی معاشرے میں ہزاروں خامیاں پیدا کرتا ہے وہی ایک خاندان کو برباد کر کے دوسرے خاندان کو آباد کرتا ہے۔ سماج کی حقیقت تو یہ ہے کہ جہیز مانگنے والے سے زیادہ دینے والا ذمہ دار ہے کیونکہ لڑکی کا خاندان شادی کے بازار سے اپنی لڑکی کے لیے سب سے مالدار دولہا تلاش کرتے ہیں جہیز مانگنے کے کئی طریقے ہیں۔ ہر کوئی نیا طریقہ جہیز لینے کا نکالتا ہے لیکن ستمراہمت کے ساتھ اس برے رواج سے لڑتی ہوئی نظر آتی ہے۔ اس لیے وہ گھر سے بھاگ جاتی ہے اور اس کے خلاف آواز بلند کرتی ہے اور اپنے انقلاب کو جاری رکھتی ہے۔ اس کا جواب بہت ہی خاردار ہے جو جہیز مانگنے والوں کو ہوشیار کرتا ہے مثلاً۔

”ستمرا کے پاپاجی نے تقریباً منظور کر لیا تھا۔ لیکن ستمرا غصے سے لال پیلی ہو گئی۔ آپ کے والدین نے آپ کے لیے خرچ کیا، اس کا بدلہ آپ میرے والدین سے لینا چاہتے ہیں؟ کیا میرے والدین نے میرے لیے کوئی خرچ نہیں کیا؟ اس کے پیسے آپ کے والدین مجھے دیں گے؟ آپ کے والدین نے خرچ کیا ہے تو آپ کما کر انھیں ادا

کچھے۔ اس میں میرے والدین کو کیوں بچ میں لارہے ہیں؟“۔

ناول نگار جہیز کو سرے سے ختم کرنا چاہتی ہیں۔ سمتر جس کے لیے آواز بلند کرتی ہے، سمتر اکا کردار عورتوں کے لیے مثال ہے۔ یہ بتانے کے لیے کہ نا انصافیوں کے خلاف اگر عورتوں نے آواز نہیں اٹھائی تو اس کو نہ جانے کتنی مشکلوں سے روبرو ہونا پڑے گا۔ سمتر یہاں خطرناک روایت سے لڑتے ہوئے نظر آتی ہے۔ وہ کہتی ہے کہ جس شادی میں جہیز لیا جائے اور جہیز دیا جائے ایسی شادی میں شامل ہونے والے بھی قصور وار ہیں، اور ان کے گناہ ناقابل معافی ہیں۔ شادی کے نام پر ایک بڑی رقم لے کر سودے بازی ہوتی ہے، کسی بھی زندہ انسان کی سودے بازی کرنا گناہ عظیم ہے۔ اس طرح سے جہیز لینے اور دینے والی روایت کو سمتر توڑتی ہوئی نظر آتی ہے لیکن جس طرح سے ناول نگار نے ناول کا یہ کردار اٹھایا ہے آج کے سماج میں تو اسے نہیں دیکھا جاسکتا یہ حقیقت سے پرے معلوم ہوتی ہے۔ دولت جو زندگی کی آج اہم ضرورت ہو گئی ہے اسے کوئی کیسے چھوڑ سکتا ہے۔ سمتر کے والدین اس کے لیے جس دو لہجے کی تلاش کرتے ہیں وہ ضرور سمتر کے والدین سے دولت میں بہتر ہوگا اگر ایسا نہیں تو اس کے والد اس شادی سے خود منہ موڑ لیتے اور اگر لڑکا غریب ہوتا تو جہیز مانگنے کی اس کے والدین میں ہمت ہی نہ ہوتی۔

کہنے کو تو عورتوں کو شریک حیات کہا جاتا ہے، لیکن اصل زندگی میں ایسا نہیں ہے، کچھ کام سماج نے صرف عورتوں سے منسوب کر دیئے ہیں جسے کرنے میں مرد شرمندگی محسوس کرتا ہے، ایسا اس لیے ہوتا ہے کیونکہ والدین بچپن سے ہی لڑکوں اور لڑکیوں کو اس طرح کی تعلیم دیتے ہیں اور کوئی بھی تعلیم چاہے بری ہو یا بھلی، بچوں کو جو تعلیم مل جاتی ہے تا عمر ان کے ساتھ رہتی ہے اسی لیے کوئی عورت اپنی بنیادی تعلیم سے ہٹ کر نہیں سوچتی مثلاً۔

”کوئی مجھے گرم روٹی پرو سے اور میں کھاؤں..... ایسا تو میں

سپنوں میں بھی نہیں سوچ سکتی ارے، کبھی آفس میں دیر ہو جائے اور شام جلدی گھر آیا ہو، پھر بھی وہ کو کر تک نہیں چڑھاتا، کبھی کبھی محسوس ہوتا ہے کہ وہ دال چاول دھو دے گا تو کیا اس کے ہاتھ زخمی ہو جائیں گے؟ کبھی کبھی تو اتنا تھک جاتی ہوں کہ دل کرتا ہے نوکری چھوڑ دوں۔ لیکن شام کی اکیلے کی کمائی سے چلے گا بھی نہیں۔ عورت کو لوگ صنف نازک کہتے ہیں، لیکن اس کے سر پر کام اتنا لادتے ہیں، جیسے وہ بہت طاقتور ہو۔“

یہ بات بالکل درست ہے کہ عورتوں کو بہت کام کرنا پڑتا ہے پھر چاہے وہ اپنے گھر کا ہی کیوں نہ ہو آج کے دور میں عورت مردوں کی طرح دفتر میں اس کے ساتھ برابر کام کرتی ہے اس کے علاوہ عورت کو گھر کے بہت سارے کام خود کرنے پڑتے ہیں۔ ہزاروں سال پہلے جو کام عورتوں سے منسوب کر دیئے گئے وہ کام جدید دور میں بھی عورت کو ہی کرنے پڑتے ہیں۔ چاہے عورت گھر کے باہر مرد کے برابر کام کرتی ہو، لیکن گھر کے سبھی کام عورت کو ہی کرنے پڑتے ہیں۔ جس میں ہاتھ بٹانا مرد اپنی توہین سمجھتا ہے۔ ہزاروں سال سے لڑکیوں اور عورتوں پر یہ ظلم ہوتا چلا آ رہا ہے، بے گناہ عورت کو وہ سزا ملتی ہے۔ جس کو اس نے کیا ہی نہیں۔ جیسے کوئی مرد اس کی آبرو پر ہاتھ ڈالے، یا اجتماعی آبروریزی کی شکار ہو جائے، تو سماج اس بے گناہ کو سزا سنا دیتا ہے، جس کا گھر سے باہر نکلنا مشکل ہو جاتا ہے، اس کا جینا مشکل ہو جاتا ہے۔ گنہگار کو سزا دینے کے علاوہ سزا اس لڑکی کو کاٹنی پڑتی ہے۔ گھر والے انصاف دلانے کے علاوہ منہ بند رکھنے کی بات کرتے ہیں، ماں، باپ اور بھائی کی عزت گھر اور خاندان کی عزت کا واسطہ دے کر۔ جہاں انہیں انصاف نہیں مل پاتا۔ جس کو حاصل کرنے کے لیے ناول نگار عورتوں کے متحدہ مورچے کا اعلان کرتی ہیں۔ رتنا جس کو منسٹر کا بیٹا غنڈوں کے ساتھ مل کر رات

میں اٹھالے جاتا ہے۔ صبح بے ہوش حالت میں اپنے گھر کے قریب ملتی ہے جسے دھمکی ملی ہے منہ کھولنے پر پورے خاندان کا نام و نشان مٹا دینے کی، جس کو انصاف دلانے کے لیے سلینا کی ایک تنظیم سامنے آتی ہے جو ان ظالموں کے خلاف مورچہ کھولتی ہے، جہاں ہمارے ملک کی پولیس اور سیاست دانوں کی حقیقت فاش ہوتی ہے، جنہیں دولت اور جھوٹی شہرت کے لیے انسانیت کو کچلتے ہوئے دیکھا جاسکتا ہے مثلاً۔

”بے حیائی نہیں بیٹا یہ تو خوف ہے۔ اپنا ڈر چھپانے کے لیے وہ آنکھیں دکھا رہے ہیں۔ جو انسان گناہ کرتا ہے؟ اسے بہر حال انجام کا خوف تو لگا ہی رہتا ہے۔“ لیکن اب ہم کیا کریں؟ منسٹر کا بیٹا اس میں شامل ہے۔ اس لیے پولیس کچھ نہیں کرے گی۔ غنڈے چھوٹ جائیں گے اور کاویری کے، یعنی ہمارے سر پر تلوار لٹکتی رہے گی اس کے علاوہ وہ لوگ رتنا کے ماں باپ کو پریشان کریں گے۔ اس وزیر کے بیٹے نے تو اور بھی کئی عورتوں کو پریشان کیا ہے ہم نے ساری معلومات جمع کر لی ہیں۔“

ناول نگار دور حاضر کے انجام پر سوال کرتی ہے جس سے ہم آپ پوری طرح واقف ہیں قانون کے رکھوالوں کے گھروں میں ہی قانون کے خون کی ہولی کھیلی جاتی ہے ایسے میں عوام کی حفاظت کیسے ممکن ہے۔ یہی سبب ہے انسانیت کی نہیں بلکہ دولت کی سنوائی ہوتی ہے، جس سے ٹکرانا بہت مشکل ہے۔ انصاف پانے کے لیے جان کی بازی لگانی پڑتی ہے، سلینا کی تنظیم کے ساتھ عورت اور مرد شامل ہوتے ہیں اور رتنا کے انصاف کے لیے سامنے آتے ہیں اور آوازیں بلند کرتے ہیں۔ روشن خیال اور انصاف پسند وسودھا، اینا، مترا، کاویری، جیا بہن، سمترا، رتنا، اولوپا، مترا، وغیرہ جس میں پولیس کی لاٹھی سے مترا کی وفات ہو جاتی ہے اور بہت ساری عورتیں زخمی ہو جاتی ہیں آخر میں عورتوں کا مورچہ کامیاب ہوتا ہے۔ اور تنظیم کا احتجاج ختم ہو جاتا ہے لیکن اس کی کئی چھوٹی چھوٹی

شاخیں عوام میں پھیل جاتی ہیں اور اپنا کام جاری رکھتی ہیں۔ جس سے زندگی کے ہر موڑ پر تبدیلیاں شروع ہوتی ہیں۔ ناول نگار یہ خیال عوام میں پیدا کرنے میں کامیاب ہوتی ہیں کہ گناہ گار وہ نہیں جس پر یہ ظلم ہوا ہے بلکہ گناہ گار وہ ہے جو اس طرح کے واردات کو انجام دیتا ہے اور اس طرح کے حادثے کی شکار بے گناہ لڑکیوں کو ڈرنے، خاموش رہنے اور شرمانے کی ضرورت نہیں بلکہ جو اس طرح کے گناہ کرتے ہیں ان کو ڈرنے شرمانے اور خاموش رہنے کی ضرورت ہے۔ یہ خیالات اب عورتوں کو انصاف کے لیے آواز اٹھانے میں مدد کرتے ہیں۔

آنند گرام کی بنیاد پہلے ہی ڈالی جا چکی ہے۔ جہاں پر سماج کے برے قاعدے قانون اور تعلقات سے پریشان ہو کر کچھ لوگ اپنی الگ دنیا بناتے ہیں۔ جہاں پر ہر کوئی آزاد زندگی جیتا ہے، دکھاوے کی زندگی سے دور اور حقیقت کے قریب۔ سب ایک دوسرے کے ساتھ مل کر جیتے ہیں اور کام کرتے ہیں، محبت کرتے ہیں۔ جہاں آزادی ہے، اپنی بات کہنے اور سننے کی، کسی کام کے لیے دباؤ نہیں۔ کسی کے شوہر کو ناراض ہونے کا ڈر نہیں۔ کسی کا کوئی حکم نہیں ہے، جھوٹے وعدے اور جھوٹے رواجوں سے بہت دور ہیں۔ آنند گرام اپنے آپ میں ایک تنظیم ہے، جہاں سبھی لوگ انسانیت کے قائل ہیں۔ ویومیش ایک خاتون سے نزدیکیاں بڑھاتا ہے اور وسودھا سے ہر طرح بے رخی سے پیش آتا ہے۔ وسودھا ویومیش کے اس تعلق سے تنگ آ کر، اپنی الگ دنیا آنند گرام میں قائم کرتی ہے۔ اب خود کماتی ہے اور اپنی زندگی اپنی طریقے سے گزارتی ہے۔ جہاں پہلے تیس سال کی زندگی میں اس کے کاموں کا، اس کی محبتوں کا صلہ اسے نفرت ملتا رہا۔ اس دنیا کو چھوڑ کر اپنی نئی دنیا اپنے بچپن کے دوست اور عاشق آدتیہ کے ساتھ جینے کی امید لے کر باقی زندگی ہمالیہ میں گزارنے چلے جاتے ہیں۔

ناول نگار نے اس ناول میں ایک نیا خواب دیکھا ہے جو انسان اور انسانیت

کے لیے بے حد مفید ہے لیکن دور حاضر میں بڑھتی مہنگائی اور بے روزگاری نے انسان کو انسانیت کی راہ سے الگ کر دیا ہے یہی وہ سبب ہے کہ آج ایک زندگی کے لیے ایک نوکری خرچ کو پورا نہیں کر پاتی اور گھر کے تمام افراد اس فکر میں آپسی محبت سے دور ہوتے جا رہے ہیں۔ جس سے بیوی اور شوہر کے تعلقات بھی خراب ہوتے جا رہے ہیں ایسے میں ناجائز تعلقات کا بھی کاروبار زوروں پر چل رہا ہے بہر حال ناول نگار نے جس طرح کے موضوعات کو اس ناول کا موضوع بنایا ہے اس سے عوام میں بڑے پیمانے پر بیداری آئے گی اور انسان محبت کی بنیادی ضرورتوں کی طرف دوبارہ مائل ہوگا۔ یہ ہم سب جانتے ہیں کوئی بھی برائی اگر جڑ بن جائے تو اس کو ختم کر پانا بہت مشکل ہوتا ہے لیکن کوشش کرنے سے یہ کام مشکل جیسا لگتا ہے اس لئے زندگی کے اور انسانیت کی بہتری اور برابری کے لیے ہمیشہ جدوجہد کرتے رہنا چاہئے۔ جس طرح سے عوام میں عورتوں کو لے کر تعلیم اور دوسرے کام کے طے کرنے کا ذہن محدود تھا لیکن آج کوشش نے اُس دائرے کو بھی پار کر لیا ہے شائد یہی کوشش انسانیت، محبت اور دوستی کے رشتے کو بھی بلند کرے اور ناول نگار کا خواب بھی پورا ہو کیوں کہ ان کا آخری خواب انسانی محبت اور ایک دوسرے کی قدر و قیمت ہے میرا خیال ہے کہ یہی خیال ہر اس انسان کا ہوگا جو اپنی قیمت اور محبت کو سمجھتا ہوگا۔ آخر میں ایک بات یہ بھی عرض کرنا چاہوں گا کہ ناول کی مصنفہ کے انداز تحریر میں کہیں کہیں جو شدت آ جاتی ہے وہی شدت کبھی کبھی رشتوں کو بنانے کی بجائے توڑنے کا کام کرتی ہے۔ اس لیے مرد اور عورت دونوں کو رشتوں کے رکھ رکھاؤ سے کام لینا چاہئے۔ بہر حال ناول کے ترجمہ نگار ڈاکٹر عباس رضانیر نے ترجمے میں تخلیق کی شان پیدا کر کے اسے اردو قارئین کے لیے خوشگوار بنا دیا ہے۔

☆☆☆

ہندی مونو گراف آچار یہ رام چندر شکل کے اردو مترجم ڈاکٹر عباس رضانیر

ڈاکٹر فردوس جہاں

تخلیق کے مقابلے میں ترجمہ کہیں پیچیدہ اور مشکل فن ہے کیونکہ ترجمہ نگار کو تخلیق کار کے ذہن اور تقاضوں کے تحت ڈھلنا پڑتا ہے۔ تخلیق کار کو تخلیق کے دوران شعور تحت الشعور اور لاشعور سادہ سپاٹ اور پیچیدہ راہوں سے بھی گزرنا پڑتا ہے جس سے کبھی کبھی لازوال علمی سرمایہ وجود میں آ جاتا ہے لیکن مترجم کو براہ راست ان تجربات سے نہیں گزرنا پڑتا ہے جس کرب اور کشمکش سے تخلیق کار گزرتا ہے اس کو مترجم بالواسطہ طور پر محسوس کرتا ہے یہ بڑا صبر آزما اور مشکل عمل ہے ترجمہ کا پہلا اور آخری اصول اس کا اصل سے صفحہ بہ صفحہ نکتہ بہ نکتہ مطابق ہونا ہے جو یقیناً جوئے شیر لانے سے کم نہیں۔

پیش نظر کتاب آچار یہ رام چندر شکل جس کے مصنف رام چندر تیواری ہیں اس کتاب کو اردو میں ترجمہ کرنے والے ڈاکٹر عباس رضانیر کسی تعارف کے محتاج نہیں۔ انہوں نے نہ صرف بطور تخلیق کار تنقید نگار کے اپنی شناخت پیدا کی بلکہ شاعری کے ساتھ ساتھ ترجمہ نگاری میں بھی مہارت رکھتے ہیں۔ شدہ ہندی کا اتنا خوبصورت ترجمہ وہی کر سکتا ہے جو ہندی اور اردو زبان کا بھی ماہر ہو اور شعری لوازمات کو بھی برتنے کا ہنر جانتا

ہو۔ ڈاکٹر نیر نے زبان کی پوری قوت کے ساتھ نہ صرف نثر کا ترجمہ کیا بلکہ دونوں زبانوں کی اصطلاحات کو بھی مجروح نہیں ہونے دیا۔ انہیں ہندی اور اردو زبان کے مشترکہ حسن کا بخوبی احساس ہے۔ شفیق جو پوری نے خوب کہا تھا:

ہندی بھی ہماری ہے اردو بھی ہماری ہے

یہ خالدہ خانم ہے وہ راج کمار کی ہے

اس حوالے سے ڈاکٹر نیر نے جہاں رام چندر شکل کی شاعری کے ترجمے کئے ہیں وہ قابل تحسین ہے۔ آزادی فکر کے ساتھ اس ہندی منوگراف کا ایسا ترجمہ کیا کہ نفس مضمون کو کوئی ٹھیس نہیں پہنچی اور اپنی ذاتی صلاحیتوں کو بھی بخوبی منوالیا۔ ادب کا کوئی مذہب یا مسلک نہیں ہوتا۔ شاعری کی کوئی زبان نہیں وہ تو دل کے حوالے سے دلوں کو چھوتی ہوئی گزر جاتی ہے۔ ہندی کی اس مایہ ناز کتاب کا ترجمہ کر کے انہوں نے اردو دنیا پر ایک احسان کیا ہے۔ ہندی اردو زبانیں ہماری لنگا جمنی تہذیب کا مشترکہ سرمایہ ہیں۔

رام چندر شکل ہندی کے مایہ ناز ادیب تھے۔ شعر و ادب میں انسانیت کے خیر خواہ تھے انہوں نے اپنی تحریروں میں غمزدہ انسانیت کی فلاح و بہبود کی بات کی ہے ان کا نظریہ ادب برائے زندگی تھا انہوں نے عالمی ادب میں بھی اپنی آواز پہنچانے کی کوشش کی۔ اس حوالے سے ڈاکٹر نیر کا کام قابل تحسین ہے انہوں نے اپنی ایک منفرد پہچان شاعر اور ناظم مشاعرہ کی حیثیت سے بھی بنائی ہے۔ شعر کہنے کا ہنر، نثر لکھنے میں کافی معاون ثابت ہوا ہے۔ لکھنؤ یونیورسٹی میں شعبہ اردو کے صدر کی حیثیت سے نہیں بلکہ ملک اور ملک کے باہر اردو زبان کو عملاً فروغ دینے کا فریضہ انجام دے رہے ہیں۔ ۱۶ اگست ۲۰۱۶ء کو یونیورسٹی کا مالویہ ہال ان کی مقبولیت کا گواہ بن چکا ہے۔ کچا کھج بھرے ہال میں ڈاکٹر نیر کی تین کتابوں کی ایک ساتھ رسم اجرا گورنر رام نائیک کے

ہاتھوں سے ہوئی۔ ایک ساتھ اتنا بڑا ادبی سرمایہ ادبی دنیا کے ہاتھوں لگایہ بہت کم دیکھنے کو ملتا ہے۔ اتنی کم عمری میں اتنے کمالات کا مظاہرہ وہ بھی اتنی سادگی اور سعادت مندی کے ساتھ قابل ستائش ہے اردو دنیا کا یہ روشن ستارہ اپنی تابناکی کے ساتھ جلوہ گری کرتا رہے میری یہی دعا ہے۔

تمہارا عزم سلامت تمہاری عمر دراز

زمانہ تم سے بڑے کام لینے والا ہے

☆☆☆

آچاریہ رام چندر شکل

ترجمہ: ڈاکٹر عباس رضانیر: ایک جائزہ

ڈاکٹر محمد آل احمد (ہندی)

اجے کمار سنگھ (ترجمہ اردو)

ادب زندگی کا آئینہ ہوا کرتا ہے۔ شاعری، افسانہ، ناول، یادگیر صفحہ سخن ہو کسی خاص دور کا ادب اس دور کا عکاس ہوتا ہے۔ ادب کا وجود معاشرے سے الگ نہیں ہوتا۔ موجودہ صورت حال سے آشنا ہوئے بغیر اس پر کچھ لکھنا قطعی ممکن نہیں۔ کسی بھی زبان یا ادب کی تاریخ بہت تاریخی تصنیف ہوتی ہے۔ آچاریہ رام چندر شکل نے تاریخ لکھنے سے پہلے ادب کا بہت قریب سے مشاہدہ کیا، ادب اور سماج کا رشتہ واضح کرتے ہوئے انہوں نے بر محل تبصرہ کرتے ہوئے کہا ہے کہ ”جبکہ ہر ایک ملک کا ادب وہاں کی عوام کی ذہنیت کا عکاس ہوتا ہے، تب یہ ممکن ہے کہ عوام کی ذہنیت میں تبدیلی کے ساتھ ساتھ ادب میں بھی تبدیلی آتی چلی جاتی ہے“ یہ تو بات ہوگئی ادب اور سماج کے رشتے کی جس کے ذریعے ہم ادب سے اور ادب ہم سے وابستگی رکھتا ہے۔

ایک مشہور ادیب (ڈاکٹر رام چندر شکل) کے بارے میں ایک معزز ادیب

(ڈاکٹر رام چندر تیواری) کے ذریعے لکھی کتاب کو اردو کے مشہور ادیب (ڈاکٹر عباس

رضانیر) کے ذریعے ترجمہ کیا جانا اور ایک مشہور مرکز (ساہتیہ اکادمی، دہلی) کے ذریعے

شائع کیا جانا یقیناً ایک بہترین کوشش معلوم ہوتی ہے۔ شکل جی کی تحریری دنیا اور ان کی فنکارانہ تفصیل اس کتاب میں ملتی ہے۔ ایک عظیم نقاد اور دانشور کے بارے میں بہت سے ادبا نے قلم فرسائی کی ہے اور ظاہر ہے کسی بھی تخلیق کو سمجھنے سمجھانے کے لیے تنقیدی کتابوں کا بہت اہم کردار ہوتا ہے۔ قاری بھی مبصر ہوتا ہے لیکن تنقید اسے آسان بنا دیتی ہے۔ یہاں پر ہم ایک اور بات کا بھی ضرور ذکر کریں گے کہ ڈاکٹر نیر کی ترجمہ نگاری کے ذریعے ہندی اردو کے قارئین اور نقادوں کو زبان اور مفہوم کی سطح پر بہت کچھ حاصل ہوگا۔

اس کتاب میں آچاریہ رام چندر شکل کی پیدائش سے لے کر ان تمام حالات کو پیش کیا گیا ہے جن میں ان کی شخصیت کے ساتھ ساتھ شکل جی کے تخلیقی کارناموں کا عکس نظر آتا ہے۔ ڈاکٹر نیر نے اردو زبان کی مٹھاس میں سنجیدہ نقاد کا زندگی نامہ پیش کر کے ہندی اور اردو زبانوں کے ادب میں قربت کو نیا مقام دیا ہے۔ انہوں نے بھی زبانوں کے ساتھ انصاف کرتے ہوئے سبھی کو معقول جگہ دی تاکہ زبان کی اہمیت بھی برقرار رہے اور تصنیف کے ساتھ نا انصافی بھی نہ ہو سکے۔ ان کی یہ پرکھ حیرت انگیز اور قابل قدر بھی ہے۔

شکل جی کی ذاتی زندگی ان جدوجہد کی کہانی اور کردار کا جو خاکہ اس کتاب میں موجود ہے وہ بہت منفرد ہے۔ جسے پڑھ کر مضبوط یقین اور عوام سے محبت کو تخلیق کرنے کی حوصلہ افزائی بھی ہوتی ہے۔ صرف عالم ہونا الگ چیز ہے، علم بائٹنا اس سے الگ اور منفرد عمل ہے۔ کتاب کے پہلے باب میں ”زندگی کی جدوجہد اور پس منظر“ میں شکل جی کی نجی زندگی کی جدوجہد کے ساتھ ساتھ آزادی کے جنگجوؤں سے ان کی قربت بہت منفرد ہے۔ آزادی کے جنگجوؤں کی آزادی کے لیے چاہت کی ترجمانی کو ڈاکٹر نیر نے اپنے الفاظ میں کچھ اس طرح پیش کیا ہے:

”جیل میں تلک پر پڑنے والی مصیبتوں سے ہندوستان کے

ذہن میں اندر ہی اندر بے چینی پھیل رہی تھی۔ اس کرب کی صاف گونج

شکل کی ”آشا اور دیوگ“ عنوان کی نظم۔“

(مطبوعہ ”دلکشی“ نومبر ۱۹۱۲) میں صاف سنائی دیتی ہے۔ ان

کی یہ دو مصرعے ملاحظہ کیجئے :

دیکھ دُکھ اپمان جاتی کا بدلا میں اوشیہ لونگا
انیاہ کے گھور پاپ کا دندُ اسے اوشیہ دونگا
(ملک کے مصائب اور ذات کی رسوائی کا
انتقام میں ضرور لوں گا، نا انصافی کے اس گناہ
عظیم کی سزا میں اسے ضرور دونگا)“

’چنتامنی‘ کے مرتب مضامین سے ان کے مطالعے اور گہرے نفسیاتی نظریے کا ثبوت ملتا ہے۔ ان کی سنجیدہ ذہنیت کو نفسیاتی بنیاد فراہم کی گئی۔ انہوں نے آہنگ کو شاعری کی روح تو مانا ہے لیکن اسکی روایتی تشریح انہیں درست نہیں لگتی تھی۔ مختلف تجربات و احساسات اور ذہنی صورت حال پر لکھے گئے ان کے مضامین بہت ہی خلاصے، غور و فکر اور مکمل تفصیلی مطالعہ کے ثبوت ہیں جیسے کہ:

”کرودھ، دیا، ایشیا، کُرنا، شرڈھا بھکتی، بھسے، گھرنا،
’لو بھ‘ اور پریتی‘ نام سے تصنیف دو حصوں پر مشتمل ہے۔ چنتامنی
میں موجود مضامین کے علاوہ شکل جی نے کچھ اور مضامین بھی لکھے
ہیں۔ ان کے طرز تحریر سے متعلق، ڈاکٹر گپنتی چندر گپتا کا ماننا ہے کہ شکل
جی کے طرز تحریر اور اسلوب میں ایک الگ اور نجی انفرادیت نظر آتی ہے
۔ بھارتیندو دور کی سی اصلیت ہے، لیکن ان میں گہرائی زیادہ ہے،
’دو ویدی دور‘ کا عکس ان میں نظر آتا ہے لیکن ویسی خشکی نہیں ہے۔

”کُرنا“ مضمون میں محبوب سے ہجر کے غموں کا ذکر کرتے

ہوئے تلخی گیتا ولی کا کے چند مصرعے (پد) اس طرح ہیں:-

من کو نکری گئے دوؤ بھائی

ساون گر جے، بھادوں برسے، پون چلے پروائی

کون بر چھ تر بھجیت ہوئے ہیں رام لکھن دوؤ بھائی

دل کو چھو لینے والے مذکورہ بالا مصرعوں کا ترجمہ ڈاکٹر نیر نے بڑے ہی خوبصورت انداز میں کیا ہے (دونوں بھائی جنگل کو چلے گئے ہیں ساون گرج رہا ہے، بھادوں برس رہا ہے، پروا ہوائیں چل رہی ہیں کسی درخت کے نیچے رام لکھن دونوں بھائی بھیگ رہے ہوں گے)

خیال کی سنجیدہ گھاٹیوں کے بیچ۔ بیچ میں طنز و مزاح کا اظہار کسی شفاف پانی کے میٹھے میٹھے سُرخ کی طرح نظر آتا ہے۔ شکل جی کے مطالعہ اور غور و فکر کا دائرہ صرف ادب تک محدود نہیں تھا، وہ سماجیات، لسانیات، سائنس وغیرہ جیسے میدانوں میں بھی منفرد علم و ہنر کے ماہر تھے۔ ڈاکٹر نیر نے بڑے خوبصورت الفاظ میں مترجم کے احساس کو واضح کیا ہے، ملک اور سماج کی بھلائی کے لیے ان کا حوصلہ صاف نظر آتا ہے۔ خود شکل جی کو اردو۔ ہندی دونوں زبانوں پر مہارت حاصل تھی۔ شکل جی کی کئی ترجمہ شدہ تصانیف بھی موجود ہیں۔ ’ششٹانک‘ ان کا بنگلہ سے ترجمہ شدہ ناول ہے۔ اسکے علاوہ انہوں نے ’ارنٹ ہیکل‘ کی پوری دنیا میں مشہور تصنیف ’ریڈل آف دی یونیورس‘ کا ترجمہ ’وشو پر بیچ‘ کے نام سے کیا۔ ’میگ استھنیز کا بھارت ورش ورن‘، ’کلپنا کا آئندہ‘ وغیرہ تصانیف کا بھی انہوں نے ترجمہ کیا۔ شکل جی ایک کامیاب مدیہ بھی تھے تدوین شدہ تصانیف میں ’ہندی شبد ساگر‘، ’ناگری پراچنی پتریکا‘، ’بھر مرگیت سار‘، ’سور‘، ’تلخی‘، ’جائسی گرنٹھا ولی‘، بہت اہم ہیں۔ کہنے کا مطلب یہ ہے کہ شکل جی کو سماج کے مختلف پہلوؤں پر پوری طرح گرفت حاصل تھی، جس کی بنا پر انہوں نے تخلیقی عمل کے

ذریعے ہر سطح پر فرد بہ فرد اپنی آواز پہنچا کر انہیں فیض یاب کیا۔ ڈاکٹر نیر نے رام چندر شکل پر لکھی گئی کتاب کا ترجمہ کر کے اس روایت کو آگے بڑھایا اور مجبان اردو کے لیے بھی ایک مشعل راہ فراہم کی ہے۔

سور، تلسی، جائسی پر کی گئی تنقید، شاعری میں رمزیت، شاعری میں ابھیراجن واد، شاعری کا آہنگ وغیرہ شکل جی کی تنقیدی تصانیف ہیں۔ ڈاکٹر رام ولاس شرمانے واضح الفاظ میں کہا ہے کہ: ”افسانوی ادب میں جو کام پریم چند نے کیا ہے، ہندی شاعری میں جو کام نرالا نے کیا ہے، وہی کام تنقید میں آچاریہ رام چندر شکل جی نے کیا ہے۔“ یہ کہنا قطعی غلط نہ ہوگا کہ آچاریہ رام چندر شکل ادب کی ایسی بنیاد ہیں جن کے بغیر ادب میں ایک خلا کا احساس ہوتا رہے گا۔

ڈاکٹر نیر صاحب نے لفظ بہ لفظ ترجمہ نہیں کیا بلکہ خود اپنے آپ کو اس تخلیق سے ہم آہنگ رکھتے ہوئے ترجمے کے عمل کو انجام دیا ہے۔ ایک مثال پیش ہے:

”ناگمتی کی آتش ہجر کی کیفیت نمایاں کرنے کے لیے جائسی کہتے ہیں:

اس پر جراورہ کراٹھا۔۔۔

میگھ سیام بھئے دھواں اٹھا

مذکورہ بالا مصرعے کا ترجمہ ڈاکٹر عباس رضانیہ کچھ اس طرح کرتے ہیں۔

”ہجر کے غم میں وہ ایسا جلی کہ دھواں اٹھنے سے بادل کالے ہو گئے ہیں۔“

گیتا کے چوتھے باب میں شری کرشن بھگوان نے کہا ہے:

चातुर्वर्ण्यं माया सुष्ट गुणकर्मविभागशः ।

तस्य कर्तारमपि मां विद्ध्यकर्तारमव्ययम् ”13“

گیتا کے درج بالا مصرعوں کو ڈاکٹر نیر نے تشریح کر کے واضح کیا ہے:

”چاروں طبقوں کو میں نے بنایا ہے اور انہیں اوصاف و اعمال کے بموجب تقسیم کر دیا ہے جو ان کی پیروی کرتے ہیں میں ان سے راضی ہوں ورنہ گمراہ ہو جاتے ہیں“

اس کتاب میں ڈاکٹر نیر نے واضح کیا ہے کہ آچاریہ رام چندر شکل گیتا کے اس نظام سے پوری طرح متفق تھے۔ تلسی داس کا تجزیہ کرتے وقت انہوں نے مضبوط منطوقوں سے اس کی حمایت کی ہے۔ تلسی داس کے یہ مصرعے ملاحظہ کریں:

”ورنہ شرمنج دھرم نرت وید پتھ لوگ! چلہ ہی سدا پاوہیں سکھیں نہیں بھئے سوک نہ روگ!! (چاروں آشرموں کی اپنی الگ۔ الگ اہمیت ہے۔ جو لوگ ان کے بتائے ہوئے اصولوں کے مطابق وید۔ ویدانتوں پر عمل کرتے ہوئے زندگی کی راہ پر گامزن ہیں وہ لوگ ہمیشہ خوشی پاتے ہیں۔ انہیں نہ کبھی درد ہوتا ہے نہ مرض۔)

ڈاکٹر نیر نے ضرورت کی بنا پر ترجمہ اور تشریح بھی کی ہے جس سے اس عظیم تخلیق کار کے نظریہ کے ساتھ انصاف ہو سکے۔ ڈاکٹر نیر نے ترجمہ کے لیے بالکل صحیح و مترادف الفاظ کا استعمال کیا ہے۔ جس سے اس ترجمہ کا مزہ اصل تصنیف جیسا ہی ہے۔ ڈاکٹر نیر نے جذبات، احساسات اور آہنگ وغیرہ کا بہت تفصیلی مطالعہ کیا ہے۔ ساتھ ہی ساتھ مختلف جذبات کی تشریح میں باریک بینی جگہ جگہ نظر آتی ہے۔ یقیناً ڈاکٹر نیر غیر معمولی صلاحیتوں کے مالک ہیں۔ وہ، ہندی، انگریزی اور دیگر کئی زبانوں کے ماہر اور عالمی شہرت یافتہ مقرر، استاد، شاعر، نقاد اور مترجم بھی ہیں۔ وقت اور صورت حال کو محسوس کرتے ہوئے واجب رائے دینا ان کی فطرت میں شامل ہے۔ احساس کی مٹھاس کو ڈاکٹر نیر نے اس کتاب میں بھر دیا ہے۔

نہ صرف ہندی بلکہ ہر ایک زبان کے ادب کو زرخیز کرنے والے عناصر ان سے ہمیں حاصل ہوئے ہیں۔ زبان صرف اظہارِ خیال کا ذریعہ ہوتی ہے، احساس تو سبھی میں ایک جیسے ہی ہوتے ہیں۔ انسان کوئی بھی لباس پہن لے انسانیت تو نہیں بدلی جاسکتی، ذہنیت تو وہی رہے گی۔ انسانی سماج کے قابل رسائی اعمال کسی بھی ملک، ذات، مذہب کی حدود میں باندھے نہیں جاسکتے۔ دوسری زبانوں کی بات دیگر ہو بھی جاتی ہے لیکن ہندی۔ اردو تو پاروتی اور سستی جیسی سگی بہنیں ہیں۔ رسم الخط کا فرق لباس کا فرق ہوتا ہے۔ شکل جی کو پڑھنے سمجھنے سے یہی ظاہر ہوتا ہے کہ ادب کو سمجھنے کے لیے کثیر الابعاد ہونا پڑے گا۔ رام چندر تیواری جی کی کتاب ”آچار یہ رام چندر شکل“ کا ڈاکٹر عباس رضانیر نے سنسکرت آمیز الفاظ کا بہترین اور سلیس ترجمہ کر کے، انگریزوں کے ذریعے بنی گئی ہندی اردو کے نام سے غلط رائے کی تردید کی ہے اور ساتھ ہی ساتھ یہ بھی ثابت کیا ہے کہ ہندی اردو والوں کے لیے یہ کتاب نہایت ہی کارآمد ثابت ہے۔

☆☆☆

ڈاکٹر عباس رضانیر کی ترجمہ نگاری

محمد یاسر انصاری

زندگی حرکت و عمل کا دوسرا نام ہے۔ بے عملی ہمیشہ انسان کی زندگی میں اسے بلندی اور معرزی سے محروم رکھتی ہے اور اسے بے ہنر کر دیتی ہے۔ انسان جس عمل کو اپنے محبوب ترین مشاغل میں شمار کر لیتا ہے وہی اس کا ہنر اور فن بن جاتا ہے۔ اپنے کام کے تئیں مسلسل مصروف عمل رہ کر انسان جب اسی میں خوشی تلاش کر لیتا ہے تو یہی حقیقی خوشی انسان کے فن اور اس کے ہنر میں چار چاند لگا دیتی ہے۔ بہت کم ہی ایسے انسان دیکھنے کو ملتے ہیں جو اپنی عملی زندگی میں وقت کی اہمیت کا تقاضا سمجھتے ہوئے، اپنی زندگی کے نشیب و فراز سے بلند و بالا ہو کے اپنی زندگی میں تخلیقی عمل کو اہمیت دیتے ہیں۔ اور جن کی زندگی کا ہر ایک لمحہ ادب، سماج اور تہذیب کے نشوونما میں وقف ہو۔ ڈاکٹر عباس رضانیر ایسی ہی ہمہ جہت شخصیت کا نام ہے جنہوں نے کم وقت میں اردو زبان و ادب میں شاعری اور نثر میں یکساں قدرت رکھنے کے ساتھ ساتھ اردو تنقید کے میدان میں بھی اپنی علمی اور ادبی لیاقتوں کا لوہا منوایا ہے۔ بے شک شاعری ان کا محبوب ترین مشغلہ ہے۔ وہ ایک بہترین استاد ہونے کے ساتھ ساتھ ایک مفکر، عالم دین، ادیب، نقاد اور ایک کامیاب اور ہر دل عزیز ناظم و مقرر ہیں۔

اردو ادب کے ارتقا میں دوسری زبانوں سے ترجمہ ہونے والے فن پاروں نے بھی اہم کردار ادا کیا ہے اور ترجمہ نگاری بڑی ہی جانفشانی اور دروں بینی کی متقاضی

ہوتی ہے کیونکہ ترجمے میں دونوں زبانوں پر یکساں قدرت رکھنا اس کی شرط اولین ہے۔ ڈاکٹر عباس رضانیر کے ترجمہ کئے ہوئے فن پاروں کے مطالعہ سے ہم اس نتیجے تک پہنچتے ہیں کہ اردو ترجمہ نگاری میں بھی ڈاکٹر عباس رضانیر نے کامیابی کا بہترین مظاہرہ کیا ہے۔ انہوں نے ہندی اردو ترجمے کے بہترین اور اہم ادبی اور غیر ادبی کام انجام دیئے ہیں۔

بلاشبہ ترجمہ نگاری ایک نہایت پیچیدہ عمل ہے جس میں ترجمے کے اصول و ضوابط اور تقاضوں کو پوری دیانت داری کے ساتھ پیش نظر رکھتے ہوئے ترجمہ نگاری کے کام کو انجام دیا جاتا ہے۔ اس عمل میں مترجم کے خیالات اور جذبات کی گنجائش نہیں کے برابر ہوتی ہے۔ ترجمے کی خوبی صرف یہ نہیں ہے کہ وہ اصل کے مطابق ہو اور اصل متن سے بالکل قریب ہو بلکہ جاذبیت اور حسن آفرینی اور فطری جذبات کی روانی بھی ہونا لازمی ہے۔ ہندی اردو ترجمہ نگاری کی اہمیت کو واضح کرتے ہوئے ڈاکٹر ابوالفیض سحر لکھتے ہیں:

”علمی، ادبی، سائنسی اور فنی و فکری منطقوں کے ساتھ ساتھ عام زندگی میں سرکاری اور غیر سرکاری زمروں میں بھی آئے دن ایک زبان سے دوسری زبان میں ترجمے کی ضرورت محسوس ہوتی ہے۔ ہندوستان میں تو ہندی اور اردو کا صدیوں سے چولی دامن کا ساتھ رہا ہے۔ ان کی ترقی اور ترویج کے لیے دو مختلف اور متضارب سمتوں کے بجائے متوازی مدد و معاون، خطوط وضع کئے جانے ضروری ہیں۔ یہی ہمارے ملک اور ہمارے عہد کا سب سے بڑا تقاضا ہے۔“

(فن ترجمہ نگاری: مرتبہ۔ خلیق انجم، ص ۱۵۹)

ہندی اور اردو کے باہمی رشتے کو لسانی، قواعدی اور اظہار و بیان کی اسلوبیاتی

سطح پر واضح کرتے ہوئے ڈاکٹر ابوالفیض سحر نے ترجمے کا فنی رمز اور شعور بھی واضح کیا ہے جس کی روشنی میں ڈاکٹر عباس رضانیر کی ترجمہ نگاری کے محاسن کو بخوبی سمجھا جاسکتا ہے۔

ایک کامیاب مترجم کے طور پر ڈاکٹر نیر نے سب سے پہلے ہندی زبان و ادب کی جس اہم اور سنجیدہ شخصیت کا انتخاب کیا ہے وہ آچاریہ رام چندر شُکل جی ہیں۔ ہندی ادب کی اس نامور ہستی نے مضمون نگاری، تنقید و تاریخ کے ساتھ ساتھ ترجمہ نگاری کے میدان میں اپنی قیمتی تخلیقات پیش کر کے ادبی سرمائے میں بیش بہا اضافہ کیا ہے۔ آج بھی ہندی ادب کا ایک عہد ”شُکل یگ“ کے نام سے جانا جاتا ہے۔ ہندی کی اس اہم شخصیت کی زندگی اور ادبی کارناموں پر مشتمل کتاب کو ساہتیہ اکادمی، نئی دہلی نے مونوگراف کے طور پر شائع کیا ہے جس کے مصنف پروفیسر رام چندر تیواری ہیں۔

ڈاکٹر عباس رضانیر نے اس مونوگراف کا اردو ترجمہ ۲۰۰۶ میں ”ہندوستانی ادب کے معمار۔ آچاریہ رام چندر شُکل“ نام سے کیا ہے۔ اس ترجمہ کو بھی ساہتیہ اکادمی نئی دہلی نے ہی شائع کیا ہے۔ ایک طرف جہاں مترجم نے ترجمہ نگاری کے اصول و ضوابط کو برقرار رکھتے ہوئے اردو زبان کی شیرینی اور اس کی خوش سلیقگی کا بھرپور استعمال کیا ہے وہیں دوسری طرف انہوں نے سنسکرت آمیز ہندی کے ثقیل الفاظ کا سلیس اور شستہ زبان میں ترجمہ کر کے ہندی اور اردو زبان کے بیچ ہم آہنگی کے نئے دریچے وا کیے ہیں۔ اس کتاب کے ترجمے میں مترجم کی ترجمہ نگاری کا ایک اور کارنامہ خاص جو قارئین کو یہاں دیکھنے کو ملتا ہے وہ ہے رام چندر شُکل جی کی ادبی اہمیت اور ان کی تنقید نگاری میں سنجیدہ اور آزادانہ طبیعت کو برقرار رکھنا۔ کتاب کے چوتھے باب میں شُکل جی کی تنقید نگاری پر درج ذیل اقتباس ملاحظہ کریں:

”آچاریہ شُکل دیگر ہندوستانی معیاروں، روایت، صنعت،

لہجہ، صفت، مترادفات، مناسبات اور رعایات کو بھی مناسب اہمیت

دیتے ہیں۔ لیکن شاعروں میں ان کا مقام انہیں وہیں تک قابل تسلیم ہے جہاں تک یہ جذبے کے مربی، خیر خواہ، سرپرست اور محافظ بن کر آتے ہیں۔ ان کے مطابق شاعری کی داخلی شکل یا تو روحانی جذبہ ہے یا پھر احساس ہے۔ صنعت شاعری کی خارجی شکل ہے۔ وہ پیش کی جانے والی معنویت کے حسن کی توسیع میں معاون ہوتی ہے۔“

(آچار یہ رام چندر شکل: ترجمہ ڈاکٹر عباس رضا نیر، ص ۶۶)

ہندی کے قارئین کے لیے پروفیسر رام چندر تیواری کی یہ تخلیق بقدر ادب بڑی ہی اہمیت کی حامل ہے لیکن اردو ترجمے میں رام چندر شکل جی کی ادبی حیثیت کے خد وخال نکھر کے سامنے آتے ہیں تو اس کامیاب عمل کے لیے مترجم کی اپنی صلاحیتوں کا اعتراف بھی کیا جانا لازمی ہے۔

ساتھیہ اکادمی کے ذریعے ہی شائع ہونی والی ایک اور ترجمہ شدہ کتاب ”سات قدم آسمان میں“ ڈاکٹر عباس رضا نیر کا اردو ترجمہ نگاری کے میدان میں ایک اہم کارنامہ ہے۔ گجراتی زبان کی معروف ادیبہ اور ناول نگار کنڈینکا کا پڑیا کے ساتھیہ اکادمی انعام یافتہ ناول ”ست پگلاں آکاش ماں“ مرداساس معاشرے میں نسائی سماج کی جدوجہد کی کہانی پر مبنی ایک بہترین ناول ہے۔ اردو میں اس ناول کا ترجمہ ۲۰۱۰ء میں ہوا۔ گجراتی زبان کی معروف ناول نگار کنڈینکا کا پڑیا نے مسائل نسواں پر کئی اہم افسانے اور ناول لکھے ہیں۔ ڈاکٹر عباس رضا نیر نے ”سات قدم آسمان میں“ میں بھی ناول کے اصل موضوع کی ہیئت اور ترجمہ نگاری کے فن کے ساتھ انصاف کیا ہے۔ مترجم نے اس بات سے قطع نظر کہ عورتوں کے مسائل اور ان کے دکھ درد کو صرف نسوانی طبقہ ہی سمجھ سکتا ہے، ترجمے میں اس بات کا بہترین مظاہرہ کیا ہے کہ اگر ترجمے میں پوری دیانت داری برتی جائے اور ترجمہ نگاری کے تقاضوں کو پوری طرح ذہن میں رکھا جائے تو کوئی بھی گوشہ تشنہ نہیں

رہے گا۔ ہر ترجمہ کی ہوئی کتاب کی طرح اس کتاب میں بھی اگر عرض مترجم پیش کیا جاتا تو قارئین اس بات سے ضرور آشنا ہوتے کہ ایک مترجم کی حیثیت سے اس ناول کو ایک کامیاب اردو ترجمہ بنانے میں کن احساسات سے دوچار ہونا پڑا ہوگا۔ لیکن شاید ساتھیہ اکادمی کے ذریعے شائع ہونے والے تراجم میں یہ پالیسی نہیں ہے۔

ترجمہ نگاری کے سلسلے میں ریاست اتر پردیش کے موجودہ گورنر رام نایک کی خودنوشت ”چریویتی چریویتی“ کا اردو ترجمہ اپنے آپ میں اہمیت کا حامل ہے۔ حالانکہ اس کتاب کا شمار غیر ادبی کتابوں میں ہوتا ہے پھر بھی زبان و بیان کے اعتبار سے یہ کتاب بھی اردو دنیا میں ایک مخصوص مقام رکھتی ہے۔ ۱۲۷ ابواب پر مشتمل یہ خودنوشت دراصل مراٹھی زبان کے کھفت روزہ ”سکال“ میں شائع ہونے والے مضامین کا ایسا مجموعہ ہے جس میں گورنر اتر پردیش جناب رام نایک جی نے بچپن سے لے کر عمر کے ۸۲ ویں سال تک اپنی زندگی کے نشیب و فراز سے دنیا کو بروکرایا ہے۔ دراصل قدیم ہندو فلسفے کی بنیاد پر مبنی سنسکرت زبان کے اشلوک سے ماخوذ لفظ ”چریویتی چریویتی“ کے معنی ہیں ”چلتے رہو، چلتے رہو۔“ مراٹھی زبان سے اس کتاب کا اب تک اردو سمیت کئی اہم ہندوستانی زبانوں میں ترجمہ ہو چکا ہے۔ ڈاکٹر عباس رضا نیر نے مراٹھی تہذیب و ثقافت اور مخصوص مراٹھی لب و لہجے سے شراپور اس کتاب کا اردو ترجمہ اردو زبان اور خاص کر اودھ کے خاص تہذیبی پس منظر کو ذہن میں رکھتے ہوئے کیا ہے۔ آج اس کتاب کو اردو دنیا میں بہترین پذیرائی مل رہی ہے جو کہ مترجم کی بہترین کاوشوں کی مرہون منت ہے۔

اردو زبان کے فروغ میں ڈاکٹر عباس رضا نیر کی غیر ادبی ترجمہ نگاری کا ایک اہم کارنامہ آدھار کارڈ کے لیے مخصوص ”یو آئی ڈی اے آئی“ کی آفیشل ویب سائٹ کا اردو ترجمہ کرنا بھی ہے۔ ہندوستانی عوام کی شناخت کے تحت ۲۰۰۹ء میں حکومت ہند کی طرف سے شروع کی گئی اس اتھارٹی کی آفیشل ویب سائٹ اب تک بارہ ہندوستانی

زبانوں میں دیکھی جاسکتی ہے۔ جلد ہی یہ ویب سائٹ اردو زبان میں پیش کی جائے گی۔ اس اہم کام سے اردو زبان جاننے والے اور محبان اردو آسانی سے اردو زبان میں اس ویب سائٹ کو استعمال کر سکتے ہیں۔ اردو زبان کے فروغ میں یہ ایک بڑی کامیابی ہے۔ ڈاکٹر عباس رضانیر کی ہندی سے اردو میں ترجمہ کی ہوئی کتابوں کے مطالعے سے یہ اندازہ لگانا مشکل نہیں ہے کہ ڈاکٹر نیر نے نہ صرف اردو زبان و ادب کی افہام و تفہیم کے سلسلے میں ہی کارہائے نمایاں انجام دیئے ہیں بلکہ ہندی زبان و ادب کی تعبیر و تفہیم میں بھی اہم کردار ادا کیا ہے۔ اردو دنیا میں ڈاکٹر نیر اپنی تصنیفات اور خدمات کی بنیاد پر کسی تعارف کے محتاج نہیں ہیں۔ ان کی ترجمہ کی ہوئی کتابیں ہندی اور دیگر زبان و ادب کی دنیا میں بھی ان کی شخصیت کو متعارف کرانے کے لیے کافی ہیں۔

☆☆☆

ڈاکٹر عباس رضانیر کی علمی ترجمہ نگاری

علی ظفر

اگر کوئی علم مادری زبان میں ہو تو اسے سمجھنا نسبتاً آسان ہوتا ہے۔ اس کے علاوہ یہ ضروری نہیں کہ ہر شخص اپنی زبان کے علاوہ دوسری زبان سے بھی واقف ہو۔ اور اگر علم کسی اجنبی زبان میں ہو تو اس کی تفہیم ممکن نہیں ہوتی۔ پھر بھی ایسے لوگ بھی ہوتے ہیں جو اپنی مادری زبان کے علاوہ دوسری زبانوں سے بھی واقفیت رکھتے ہیں۔ ان میں سے بھی کچھ ایسے ہوتے ہیں جو یہ چاہتے ہیں کہ انہوں نے دوسری زبان سے جو کچھ حاصل کیا ہے وہ دوسروں تک پہنچ جائے اور لوگ استفادہ کر سکیں۔ ایسی ہی ایک شخصیت عباس رضانیر کی بھی ہے۔ جنہوں نے ہمیشہ قوم، زبان اور ملک کی خدمت کی ہے۔ ان کی کوششوں سے بلاشبہ بہت اہم کتابوں کے ترجمے اردو میں انجام پائے جس سے اردو دنیا بخوبی مستفیض ہو رہی ہے۔

اردو میں ترجمے کی روایت اسی وقت سے ہے جب یہ زبان گھٹنوں کے بل چل رہی تھی۔ اردو میں سب سے پہلا ترجمہ حضرت میراں جی خدا نما کا ہے۔ انہوں نے عربی کی ایک بہت مشہور کتاب ”تمہیدات ہمدانی“ کا ۱۶۵۵ء میں دکنی میں ترجمہ کیا۔ قدیم ہندوستان کی غیر معمولی ترقی یافتہ تہذیب کو دیکھتے ہوئے یقین کے ساتھ کہا جاسکتا ہے کہ اس کے ہر عہد میں ترجمے کا رواج رہا ہوگا۔

مغلوں کے عہد میں سرکاری ضرورتوں کو مد نظر رکھتے ہوئے مختلف زبانوں

سے فارسی اور فارسی سے دیگر زبانوں میں لازمی طور پر ترجمے ہوئے تاکہ حکومت کے کام کاج میں کوئی پریشانی پیدا نہ ہو۔ عیسائیوں نے جب ہندوستان میں تاجروں کی حیثیت سے قدم رکھا تو ان کے مبلغین نے اپنی مذہبی کتابیں ترجمہ اور تالیف کر کے شائع کیں۔ اٹھارہویں صدی کے وسط میں انہوں نے توریت اور انجیل کے اردو ترجمے بھی شائع کیے۔ اردو میں قرآن شریف کا پہلا ترجمہ شاہ رفیع الدین نے کیا یہ ترجمہ لفظی تھا۔ اب تک اردو میں جتنے تراجم ہوئے تھے، وہ انفرادی کوششوں کا نتیجہ تھے۔ فورٹ ولیم کالج پہلا ادارہ تھا جس نے منظم اور باقاعدہ طریقے پر عربی، فارسی اور سنسکرت سے اردو میں ترجمے کیے۔ اس کے بعد دہلی کالج میں ہندوستانیوں کو مغربی تعلیم دینے کے لیے بڑے پیمانے پر ترجمے کیے گئے۔ اس فہرست میں تیسرا نام دارالترجمہ عثمانیہ کا آتا ہے۔ جو عثمانیہ یونیورسٹی حیدرآباد میں ۱۴ اگست ۱۹۱۷ء کو قائم کیا گیا تھا۔ اس ادارے نے بڑے پیمانے پر سائنس اور آرٹ کے مضامین کو اردو میں منتقل کیا گیا۔

دور جدید کے اردو ترجمہ نگاروں کی دنیا میں بہت سارے نام گردش کر رہے ہیں جنہوں نے ادبی اور غیر ادبی ترجمہ نگاری میں اپنی ذات کو بطور مترجم پیش کیا ہے انہیں میں ایک نام عباس رضائیر کا بھی ہے۔ ان کا شمار عصر جدید کے مضبوط قلم کاروں میں ہوتا ہے۔ انہوں نے حال ہی میں ادبی اور غیر ادبی ترجمہ نگاری میں کئی ایک تصنیفوں کو پایہ کمال تک پہنچایا ہے۔ ان کے ادبی تراجم کی فہرست میں سب سے پہلا اور کامیاب ترجمہ ”کندنیکا کا پڑیا“ کے گجراتی ناول ”ست پگلاں آکاش ماں“ کا اردو ترجمہ ”سات قدم آسمان میں“ ہے۔ یہ ترجمہ اپنے مفرد انداز کے لیے خصوصی اہمیت کا حاصل ہے۔ جب ہم ان کے ترجمے کا مطالعہ کرتے ہیں تو پتہ چلتا ہے کہ انہوں نے متن سے قریب رہ کر ترجمے کے کام کو بخوبی انجام دیا ہے اور اس کام پر اتنی محنت کی ہے کہ ان کے یہ

ترجمے بھی تخلیق کے درجے میں آگئے ہیں۔ حسب حال زبان اور موقع محل کے لحاظ سے اسلوب میں رد و بدل ان کے ترجموں کی اہم خصوصیت ہے۔ انہوں نے نقادوں کی آرا کی قطعاً پرواہ نہ کی اور ”کندنیکا کا پڑیا“ کے جیسے گجراتی ناول نگار کی تخلیق کو اردو میں منتقل کر کے اردو زبان کو ایک نئے اسلوب کے ذائقے سے آشنا کیا یہ ان کی ایک اہم خدمت ہے۔

ان کا دوسرا ادبی ترجمہ ”آچار یہ رام چندر شکل“ مونوگراف کا آتا ہے جو ہندی سے اردو میں ہے۔ جسے ہندوستان کے مشہور لسانی مرکز ساہتیہ اکیڈمی دہلی نے شائع کیا ہے۔ یہ ترجمہ بھی ان کے مذکورہ ترجموں کی طرح اپنے اندر ایک قسم کا خاص حسن تناسب اور جاذبیت رکھتا ہے۔ ڈاکٹر نیر نے ضرورت کی بنا پر ترجمہ کے ساتھ ساتھ تشریح بھی کر دی ہے تاکہ اس عظیم تخلیق کار کے نظریہ کے ساتھ انصاف ہو سکے۔ انہوں نے ترجمہ کے لیے بالکل صحیح اور مترادف الفاظ کا استعمال کیا ہے۔ یہ ترجمہ بھی ان کی قابلیت اور فنی مہارت کا منہ بولتا ثبوت ہے۔

عباس رضائیر نے ادبی ترجمے کے ساتھ ساتھ غیر ادبی ترجمہ نگاری میں بھی اپنی قابلیت کا لوہا منوالیا ہے۔ حال ہی میں منظر عام پر آنے والا ان کا ترجمہ ”چلتے رہو چلتے رہو“ جو عزت مآب جناب رام نائیک گورنر اتر پردیش کے حالات زندگی پر مبنی ان کی تصنیف ”چریویتی چریویتی“ کا اردو ترجمہ ہے۔ مترجم ڈاکٹر نیر نے یہ ترجمہ جس صاف اور سلیس انداز سے کیا ہے اس کی مثال ناپید ہے۔

”چریویتی چریویتی“ اردو میں یوپی کی تاریخ میں گٹن برگ پبلشرز لکھنؤ سے شائع ہونے والی پہلی کتاب ہے بلکہ اس کی بنیادی اہمیت یہ ہے کہ زندگی کی جدوجہد کی داستان ہے۔ اس کا عنوان ”چلتے رہو چلتے رہو“ اپنے اندر ایک جاذبیت رکھتا ہے جس سے قاری خود بخود اس کی طرف کھینچا چلا آتا ہے۔ بقول شارب ردولوی ”چلتے رہو چلتے

رہو، خود ایک ایسا منتر ہے جو اگر کوئی سیکھ جائے تو زندگی میں ناکام نہیں ہو سکتا۔

عباس رضا نیر چونکہ کئی زبانوں کے دسترس رکھتے ہیں۔ انگریزی، اردو اور ہندی کے ساتھ ساتھ گجراتی، عربی اور فارسی پر بھی اچھی دستگاہ رکھتے ہیں۔ انہوں نے اس ترجمہ کو رواں، سہل اور عام فہم زبان میں جس طریقے سے پرویا ہے اس کے لیے وہ بلا شبہ قابل مبارک باد ہیں۔ انہوں نے یہ طویل ترجمہ کرتے وقت زبان اور اسلوب کا خاص خیال رکھا ہے۔ حسب حال زبان اور اسلوب کو موقع کی مناسبت سے ڈھالنا ان کا وصف خاص ہے۔ انہوں نے متن کو ساتھ ساتھ رکھ کر ترجمے کا کام انجام دیا ہے۔ میرا خیال ہے کہ اگر کسی قاری کو گورنر صاحب کا نام ہٹا کر صرف مسودہ پڑھنے کو دے دیا جائے اور اس بات کا علم نہ ہو کہ یہ "چریویتی چریویتی" کا اردو ترجمہ ہے تو بلا مبالغہ وہ اس ترجمے کو ڈاکٹر نیر کی طبع زاد تصنیف سمجھے گا۔

ڈاکٹر نیر نے اپنے اس ترجمے میں جو زبان استعمال کی ہے وہ گورنر صاحب کی زبان کے بالکل قریب ہے۔ پڑھتے وقت ہمیں کہیں ایسا نہیں لگتا ہے کہ ہم کسی سیاسی انسان کی سوانح پڑھ رہے ہیں بلکہ ہمیں یہ محسوس ہوتا ہے کہ ہم کسی بڑے ناول نگار کا ناول پڑھ رہے ہیں کیونکہ اس کی زبان ناول کی زبان کے بالکل قریب ہے یہی وجہ ہے کہ قاری جب یہ کتاب پڑھنا شروع کرتا ہے تو پھر ختم کر کے ہی اٹھتا ہے۔ یہی اس ترجمے کی کامیابی کی دلیل ہے۔ اس کا ایک اردو اقتباس ملاحظہ ہو:

”میں بی کام کے آخری سال میں تھا، ششما ہی امتحان کے دن چل رہے تھے تبھی ممبئی سے آئے پیغام نے میرے دل کی دھڑکنیں بڑھا دیں امتحان اور پڑھائی چھوڑ کر آنے کی ضرورت نہیں“ ایسا کہہ کر والد کے پرانے السر کا مرض تیز ہو جانے کی وجہ سے ماں انہیں لے کر ممبئی گئی تھیں۔ اس زمانے میں یہ آپریشن آسان نہیں تھا لیکن

سوچا بھی نہیں تھا کہ وہ جان لیوا ہوگا۔ ظاہری بات ہے فوراً ممبئی آنے کا پیغام آتے ہی دل کی دھڑکنیں بڑھ گئیں۔ انجان ممبئی میں نے پہلا قدم رکھا۔ کے۔ ای۔ ایم اسپتال میں اور اس کے بعد وہاں سے والد صاحب کی میت لے کر گیا شیوا جی پارک کی شمشان بھومی میں، مایوسی میں پونے لوٹے وقت طے کیا کہ دوبارہ ممبئی نہیں جانا لیکن بی کام پاس ہوتے ہی کنبے کی ذمہ داری مجھ پر آن پڑی۔ لہذا چار ماہ بعد نوکری کی تلاش میں میرے قدم دوبارہ ممبئی کی سرزمین پر پڑے۔“

(چریویتی چریویتی، رام نائیک، مترجم عباس رضا نیر ص ۴۷-۴۸)

ترجمے کا کام یقیناً مشکل کام ہے۔ ہر آدمی ایک زبان سے دوسری زبان میں ترجمہ نہیں کر سکتا اس کام میں طبیعت کا میلان اور شوق ہونا ضروری ہے۔ ایک زبان سے دوسری زبان میں صرف لفظی مفہوم بیان کر دینے کو ترجمہ نہیں کہتے ہیں۔ ترجمے میں مترجم کی سوچہ بوجھ، خوش ذوقی اور دونوں زبانوں کے الفاظ کی معنوی اور صوتی خوبیوں کا علم بھی ضروری ہوتا ہے۔ جو ڈاکٹر نیر کے یہاں واضح طور پر نمایاں ہے۔

ترجمے میں مترجم مصنف کی شخصیت، فکر اور اسلوب سے بندھا ہوا ہوتا ہے۔ ایک طرف اس زبان کا کلچر جس کا ترجمہ کیا جا رہا ہے اور دوسری طرف اس زبان کا کلچر جس میں ترجمہ کیا جا رہا ہے اس کی توجہ اپنی طرف کھینچتا ہے۔ مترجم کو دونوں زبانوں کے کلچر کا بخوبی خیال کرنا پڑتا ہے۔ عباس رضا نیر اس مشکل مرحلے کو بخوبی عبور کر جاتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے ترجموں میں ہمیں اسالیب کا بڑا تنوع ملتا ہے۔ اس کے علاوہ اردو زبان کو بھی مجروح نہیں کرتے بلکہ اردو کے بنیادی مزاج میں مراٹھی اور ہندی زبان کی جھلکیاں دکھائی دینے لگتی ہیں۔

عباس رضا نیر کو صرف مترجم کی حیثیت سے ہی یاد نہیں کیا جائے گا بلکہ انہوں نے ”آدھار کارڈ“ کی ویب سائٹ کا اردو ترجمہ کر کے ملک کی ترقی کے لیے جو کارہائے نمایاں انجام دی ہیں اس سے ان کی دلش بھکتی، حب الوطنی اور ملک کو ڈیجیٹل انڈیا بنانے میں ان کے بے لوث جذبے کو بھی یاد کیا جائے گا۔

جب ان کے سامنے آدھار کارڈ کی ویب سائٹ کا اردو ترجمہ کرنے کے لیے بھارت سرکار نے پیش کش کی تو انہوں نے سرکار کی آواز پر لبیک تو فوراً کہہ دیا مگر یہ ترجمہ اتنا آسان نہیں تھا۔ کیونکہ اب تک انہوں نے جو بھی ترجمہ کیا تھا وہ ادبی یا غیر ادبی نثر کا ترجمہ تھا۔ اصطلاح سازی کا ترجمہ پہلی بار درپیش تھا۔ کیونکہ اصطلاح کا ترجمہ کوئی آسان کام نہیں ہے۔ اصطلاح کا مفہوم سمجھنا اور اس کا اردو ترجمہ کرنا اور اسی مفہوم کو ادا کرنے والی اصطلاح تراشنا آسان مرحلہ نہیں ہے۔ مختلف علوم و فنون کی اصطلاحوں میں فرق ہوتا ہے۔ مخصوص علم کے جس نوع کی اصطلاح درکار ہے ویسی اصطلاح تراشنا ایک صاحب علم، ماہر فن اور زبان پر قدرت رکھنے والی شخصیت ہی کا کام ہے اور وہ شخصیت عباس رضا نیر کی ہے جنہوں نے انگریزی اصطلاحوں کو اردو میں اس طرح تراشا ہے کہ اصطلاح کا مفہوم جو انگریزی زبان میں ہے وہی مفہوم اردو زبان میں بھی موجود ہے۔

ہندوستان میں اردو کو دوسری زبان کا درجہ حاصل ہے۔ آج ہندوستان میں کروڑوں کی تعداد میں اردو بولنے، لکھنے اور پڑھنے والے موجود ہیں۔ بلکہ کئی ریاستوں میں اردو داں طبقے کی تعداد دیگر زبان بولنے والے حضرات سے زیادہ ہے۔ یہاں تک کہ کشمیر میں اس کو سرکاری زبان کا درجہ حاصل ہے۔ انہیں وجوہات کو مد نظر رکھتے ہوئے بھارت سرکار نے آدھار کارڈ کی ویب سائٹ کا اردو میں ترجمہ کرایا جس کی سخت ضرورت تھی۔

۱۹۴۷ء میں جب ہندوستان آزاد ہوا تو یہاں کے ذمہ داروں کو یہ احساس ہوا

کہ ان کے ملک کی دفتری زبان ان کی قومی زبان ہونی چاہیے۔ اس مقصد کے لیے کئی ادارے قائم کیے گئے جن کا کام دفتری یادداشت کے نمونے تیار کرنا تھا۔ نیز دفتری کاروبار کے لیے اصطلاحات وضع کرنی تھیں۔ اور اس مقصد کے لیے ہندی کو منتخب کیا گیا۔ دفتری کام کے مختلف شعبوں میں استعمال ہونے والی اصطلاحوں کا انگریزی اور ہندی میں ترجمہ کیا گیا۔ یہیں سے اردو کو فروغ دینے کی روایت شروع ہوئی اگر اس وقت ہندی کے ساتھ ساتھ اردو پر بھی توجہ دی جاتی تو آج اردو زبان ایک اہم مقام پر کھڑی ہوتی۔

آدھار کارڈ کی ویب سائٹ کا اردو ترجمہ انتہائی طویل اور عظیم کام ہے۔ جو ملک کی ترقی کی عمارت سازی میں مثبت کردار ادا کرتا ہے۔ عباس رضا نیر نے اردو کو آدھار کارڈ کی زبان بنانے کے سلسلے میں بہت بڑا کام انجام دیا ہے۔ انہوں نے تمام مروج اصطلاحوں کو یکجا کیا اور بذات خود نئی نئی اصطلاحیں وضع کر کے ایک بہت ہی جامع اور مستند ترجمہ کیا ہے۔ جس پر اردو والے ہمیشہ رشک کریں گے۔ انہوں نے مناسب ترین اصطلاح استعمال کرنے کی کوشش کی ہے۔ سخت اور دشوار کن اصطلاحوں سے اجتناب کیا ہے۔ مثال ملاحظہ ہو:

اردو ترجمہ:

ہمارے اغراض و مقاصد

طے شدہ منصوبہ بند طریقے کے ساتھ بھارت کے

ساتھ کروڑ باشندوں کو سن دو ہزار چودہ تک باقاعدہ

اور باضابطہ طریقے سے آدھار نمبر مہیا کرانا۔

اصل متن:

Mission Statement

ان کی گہری واقفیت کا جیتا جاگتا ثبوت ہے۔ ان کا شمار دور جدید کے چند کامیاب مترجمین میں ہوتا ہے۔ انہوں نے ہر جگہ ترجمے کی فنی باریکیوں کو پیش نظر رکھا ہے۔ انہوں نے اپنے ترجموں میں اصل متن میں موجود اصطلاحات اور اس کے پیچھے چھپے ہوئے معانی و مفاہیم کو بھی ہر جگہ بڑی خوبصورتی کے ساتھ قاری کے سامنے اجاگر کیا ہے۔ اس بنا پر ہم کہہ سکتے ہیں کہ ڈاکٹر عباس رضانی کے تراجم اردو زبان میں ایک خاص اہمیت کے حامل ہیں۔



cr.Deliver Aadhar Numbers to over 60
defined-with a well residents by 2014
turnaround time and adhering
to stringent quality metrics.
official website of Aadhar, part 2, Translated by)
(A.R.Nayyar, page no.24

ان کے یہ تراجم اصل متن سے قریب ہوتے ہوئے اپنی جاذبیت برقرار رکھتے ہیں اور ان میں کہیں بھی کھر درا پن نظر نہیں آتا ہے۔ اس کی وجہ شاید یہی ہے کہ انہوں نے متن کی اصطلاحوں کا بہت زیادہ خیال رکھا ہے۔ انہوں نے ہندوستانی زبان کی معروف و مروج اصطلاحوں کے ساتھ ساتھ نئی اصطلاحیں بھی وضع کی ہیں۔ بہت سی جگہوں پر دونوں زبانوں میں یکسانیت رکھنے کی خاطر ایک ہی اصطلاح استعمال کی ہے۔ ثقیل تلفظ والی اور بڑی ترکیبوں والی اصطلاحوں سے گریز کیا ہے۔ جگہ جگہ پر اصطلاح وضع کرتے وقت اضافت اور واو عطف سے کام لیا ہے۔ عربی و ہندی کی ٹھیٹھ اصطلاحوں کو بھی نظر انداز کیا ہے۔ مگر اکثر جگہوں پر انگریزی اصطلاح جو مروج اور عام فہم ہیں انہیں جوں کا توں برقرار رکھا ہے۔ زیادہ تر ایسی اصطلاحیں استعمال کی ہیں جن سے دماغ پر کم زور پڑے۔

کسی علمی یا تکنیکی ترجمے میں بنیادی مسئلہ اصطلاحوں کا ہی ہوتا ہے۔ بعض اوقات اصطلاحوں کو ہم مستعار لے کر حاشیوں میں اس کی تشریح کر دیتے ہیں۔ مگر ڈاکٹر نیر کا یہی کمال ہے کہ انہوں نے جتنی بھی اصطلاحیں استعمال کی ہیں وہ مروج اور عام فہم ہیں اس کی الگ سے تشریح کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔

ڈاکٹر عباس رضانی کے غیر ادبی ترجموں کا یہ اجمالی جائزہ ترجمے کے فن سے

ڈاکٹر نیر کی تین کتابیں: ایک جائزہ

عزت مآب گورنر اتر پردیش رام نائیک جی

گورنر کو کبھی کسی پروگرام میں مدعو کیا جاتا ہے تو جو کنوینز ہوتا ہے اس سے ہم منٹ ٹو منٹ پروگرام لیتے ہیں۔ اور ڈانس پر کون کون بیٹھیں گے ان کے نام بھی لیتے ہیں۔ پھر یہ بھی دیکھتے ہیں کہ کیا پروگرام ہے یہ ساری جانکاری لیتے ہیں۔ اور ہم منٹ ٹو منٹ ہی پروگرام کرتے ہیں۔ لیکن ہمارے عزیز دوست ڈاکٹر عباس رضا نیر صاحب کی تین کتابوں کے اجرا کی تقریب میں ہم کو جو وقت دیا گیا تھا ہم اپنے وقت سے آگئے تھے اور مجھے تقریر کے لیے جو وقت دیا گیا تھا وہ وقت گزرے بھی ڈیڑھ گھنٹے سے زیادہ ہو گیا۔ دیکھئے کہاں کی گاڑی کہاں آگئی؟ لیکن بڑی خوشی ہو رہی تھی کہ ایک کے بعد ایک مقرر آرہے تھے اور ڈاکٹر نیر جی کی کئی کتابوں کی خوبیاں بتا رہے تھے اور یہ کرتے کرتے میرے بارے میں بھی کچھ اچھا کہتے تھے تو بڑا اچھا لگتا تھا کہ نیر صاحب کے ساتھ میرا اپنا بھی نام آرہا ہے۔

ویسے میں لکھنؤ یونیورسٹی کے مالویہ ہال میں دو سال کے اندر کم از کم ۱۰-۱۲ بار آیا ہوں الگ الگ پروگراموں میں۔ مگر نیر صاحب کی کتابوں کے اجرا کے پروگرام میں جتنی بارتالیاں بچیں اس سے پہلے کبھی نہیں جی تھیں۔ اور آخر تک پورا ہال بھرا ہوا ہے۔ تھوڑا میرے من میں شک تھا کہ اتنا بڑا ہال ہے اور صرف اردو کے متعلق یہ پروگرام ہے کتنے لوگ آئیں گے مگر بڑا اچھا لگا کہ پہلے سے آئے ہوئے بیچ میں سے اٹھ کر گئے نہیں

تاثرات

اور ایک جوش و جذبہ کے ماحول اور خوشی کے عالم میں تمام سامعین ہیں۔ مجھے یہ بھی پتہ چلا کہ ہال کے باہر بھی کم سے کم دو سو لوگ ابھی تک کھڑے ہوئے ہیں جو ان کتابوں کے بارے میں ہونے والی باتوں کا لطف لے رہے ہیں۔

یہ پروگرام تین کتابوں کی رسم اجرا کا ہے۔ ویسے یہ زمانہ تو Family Planig کا ہے اور پہلے دو اور بس اور اب یہ کرتے کرتے ایک اور بس۔ ایسا ہو گیا ہے اور اس میں ایسے Family Planig کے زمانے میں ایک نہیں دو نہیں بلکہ تین اور وہ بھی ایک ساتھ۔ کمال کی بات ہے اور اس لئے میں نیر صاحب کی خدمت میں مبارکباد پیش کرتا ہوں۔ لیکن بڑا اچھا لگتا ہے کہ ایسی شان سے کتابوں کی رسم اجرا ہوتی ہے ایک جگہ پر لوگوں کی پڑھنے کی عادتیں کم ہونے لگی ہیں۔ T V آگیا ہے خبریں دو منٹ تین منٹ کی آجاتی ہیں۔ ایسے میں اخبار کی Life ایک دن کی ہوتی ہے سب پڑھتے بھی نہیں ہیں کچھ لوگ صرف سیاست کا صفحہ پڑھتے ہیں تو کچھ لوگ کھیل کود کا صفحہ پڑھتے ہیں اور کچھ لوگ الگ الگ صفحہ پڑھتے ہیں۔ لیکن ایک دن سے زیادہ Life اخبار کی نہیں ہوتی ہے لیکن من کو سکون دینے والا ایسا کام تو کتاب سے ہی ہوتا ہے اور اس لئے ٹی وی آگیا ہے تب بھی کتاب کی وقعت میں کوئی کمی نہیں آئی ہے کیونکہ کتاب زندگی تک اپنے ساتھ رہتی ہے۔ اور ایسے میں نیر صاحب نے ایک ساتھ تین کتابیں چھپوائیں میں انہیں ایک بار پھر مبارکباد پیش کرتا ہوں۔ میرے ساتھ ڈائس پر ان کے والد صاحب بیٹھے ہوئے ہیں۔ سامنے کی صف میں ان کے گھر کے لوگ ان کی بیوی، بہن اور بیٹیاں بیٹھی ہوئی ہیں میں ان سب کو مبارکباد پیش کرتا ہوں۔

اب مجھے تھوڑا رشک بھی ہوتا ہے اور رشک اس بات کا ہے کہ اردو زبان اتنی میٹھی ہے اور یہ میں سنتا بھی آ رہا ہوں اور کبھی کبھی بولتا بھی ہوں کہ اردو زبان میٹھی ہے لیکن مجھے یہاں تقریباً دو سال رہنے کے بعد بھی اب تک چار جملے اردو میں بولنے کی

ہمت نہیں ہوتی ہے۔ مجھے لگتا ہے کہ کوئی دیکھے گا تو کیا کہے گا کہ گورنر ہے اتر پردیش کا اور چار جملے اردو میں بولتا بھی نہیں ہے اتر پردیش میں ایسا کوئی کہہ سکتا ہے ایسا ہمیشہ دل میں ڈر رہتا ہے۔ ایسے ڈر کی وجہ سے جب ایک سے ایک بہترین اردو بولنے والے بولتے ہیں تو ایسا لگتا ہے کہ سنتے ہی رہو سنتے ہی رہو۔ اور آج تو نیر صاحب نہیں بولے چونکہ انہیں کے اوپر سب بول رہے تھے لیکن جب یہ بولتے ہیں تو ایسا لگتا ہے کہ بھاشا کی گنگا بہہ رہی ہو۔ پروفیسر صابرہ حبیب نے کہا تو سب سے تھا کہ وقت کی پابندی سے مگر نہ بولنے والوں نے مانی ہے نہ مجھے کوئی اعتراض ہے۔ صابرہ حبیب صاحبہ کی نظامت میں بہت عمدہ طریقہ سے یہ پروگرام اپنی اختتامی منزل کی طرف بڑھ رہا ہے۔

ایک بات میں بھی بتادوں کی شاید اگلے سال کوئی پروگرام اردو کا یہاں ہوگا تو اگلے سال میری تقریر اردو میں ہی ہوگی اتنا میں یقین سے کہہ سکتا ہوں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ میرے پاس نیر صاحب اردو پڑھانے والے آتے تھے اس میں ایک پاٹھک تھے مجھے تعجب ہوا کہ پاٹھک اور اردو! اس پروگرام میں بھی پاٹھک جی موجود ہیں۔ تو ان صاحبان نے مجھ سے کہا کہ ہم لوگ آپ کو اردو پڑھادیں گے۔ آپ صرف ۱۵ دن میں ایک ایک گھنٹہ ہمیں دیتے۔ تو بول چال کی اردو اور پڑھنے کی اردو آپ کو پڑھادیں گے اور یہ مفت میں سب کچھ ہوگا۔ کوئی بات مفت میں ملتی ہے تو خوشی ہوتی ہے۔ تو پھر میں نے تمام افسران کو بلایا اور میں نے ان سب سے کہا کہ دیکھئے اتر پردیش کی دوسری سرکاری زبان اردو ہے۔ اور ہم لوگ یہ سب کچھ جانتے ہیں مگر پھر بھی ابھی تک گورنر ہاؤس میں اردو کا کوئی بورڈ نہیں لگا ہے۔ ابھی شہر، قصبہ، دیہات میں لگانے کی بات بعد میں پہلے تو گورنر ہاؤس میں اردو کا بورڈ لگنا چاہئے۔ تو صاحب اگلے مہینے سے یہ کلاس شروع ہونے والی ہے تو اس لئے میں نے کہا کہ اگلے سال تک میں حقیقی طور پر اردو میں تقریر کرنے کے لائق ہو جاؤں گا تب صرف یہ نہیں کہوں گا کہ اردو میٹھی زبان ہے بلکہ

اردو میں تقریر کر کے اس کی مٹھاس کو بھی ثابت کروں گا۔ دیکھئے میرا تو ماننا ہے کہ یہ زبانیں لوگوں کو جوڑنے کا کام کرتی ہیں۔ اور اپنا ملک اتنا بڑا ہے اور اس ملک میں اتنی بھاشائیں ہیں اور ان تمام زبانوں میں سب سے زیادہ بولی اور لکھی جانے والی قسمت سے ہندی ہے لیکن جب ہم پورے ملک کے بارے میں غور و فکر کرتے ہیں تو میں مہاراشٹر سے ہوں مراٹھی زبان والا ہوں۔ تو مہاراشٹر میں مراٹھی سب سے زیادہ بولی جاتی ہے کوئی گجرات میں جائے گا تو گجراتی بھاشا وہاں زیادہ ہے۔ لیکن قومی زبان ہندی کو چھوڑ کر اگر پورے ملک میں سب سے زیادہ بولی جانے والی کوئی زبان ہے تو وہ اردو ہے۔ اور دوسری بات یہ کہ بولتے بولتے عادت ہو جاتی ہے کہ ہماری قومی زبان ہندی ہے اور کوئی بولتا ہے تو کسی کو اعتراض بھی نہیں ہوتا ہے۔ لیکن تھوڑا سا میرا اعتراض یہ ہے کہ ہمارے ملک کے قانون میں جتنی بھی زبانیں ہیں وہ سبھی قومی زبان کا درجہ رکھتی ہیں۔ سب نیشنل ہیں اس لئے کوئی ایک دوسرے سے چھوٹی بڑی نہیں ہیں۔ ویسے سنسکرت بہت قدیمی ہے اور ہمارے ملک میں اس سے کئی اور زبانیں وجود میں آئی ہیں لیکن سب سے بڑی بہن تو ہندی ہے۔

اور ہندی کے بعد جیسا کہ میں نے کہا کہ اردو ہے یہ سبھی قومی زبانیں ہیں۔ اس لئے سبھی زبانوں کی قدر و عزت ہمیں کرنا چاہئے۔ اور سبھی زبانوں کی قدر کرتے وقت جس زبان کا جہاں زیادہ استعمال ہے اسے اپنانا چاہئے۔ اس زاویہ اور نقطہ نظر کے حساب سے اتر پردیش کی ایک ذمہ داری یہ ہوتی ہے کہ سب سے زیادہ اردو جاننے والے لوگ یہاں ہیں وہ اپنوں کو بھی سکھائیں اور جو حضرات باہر کے ہیں ان کو بھی اردو کی طرف راغب کریں۔ اس لئے ہم تمام زبان کے لیے کام کر رہے ہیں۔ دیکھئے کسی زبان کا کوئی گھر نہیں ہوتا ہے زبانیں دس۔ دس، بارہ کلومیٹر پر بدلتی رہتی ہے۔ یہی ہندی ہے ہماچل پردیش میں جو بولی جاتی ہے اور پھر مدھیہ پردیش کے گاؤں میں جو بولی جاتی

ہے۔ وہ سب ہندی ہے لیکن زبان بدلتی رہتی ہے۔

دیکھئے آج تین کتابوں کی رسم اجرا ہے میری کتاب کے متعلق بھی کچھ چرچا ہوتی رہی ہے اپنی کتاب کے متعلق میں بالکل آخر میں تذکرہ کروں گا۔ فی الحال نیر صاحب کی ان کتابوں کے ضمن میں میرا تو یہ ماننا ہے کہ ادب کے جو اکسپرٹ ہیں انہیں یہ بھی کام کرنا چاہئے کہ اگر اردو میں اچھی کتاب شائع ہوئی ہے تو اس کو ہندی میں بھی ترجمہ کر کے شائع کرنا چاہئے۔ دیکھئے آج بھی تین کتابیں ریلیز ہو رہی ہیں یہ سب اردو میں ہیں اب ہندی والے کیسے اس کو پڑھیں گے تو کم از کم ایک ہی سہی ہندی میں بھی اس کا ترجمہ کر کے شائع کرائیں تاکہ ہندی والے بھی اس سے مستفیض ہو سکیں۔ دیکھئے ایک ساتھ تین کتابیں جب ریلیز ہو رہی ہیں تو ہندی والوں کو کیوں نہیں ملنا چاہئے اور اسی طرح ہندی والوں کو بھی چاہئے کہ وہ اردو والوں کا خیال رکھیں۔ اور یہ کام علماء ادب ہی کر سکتے ہیں جس سے زبانوں کے درمیان جو فاصلے قائم ہیں وہ دور ہو سکیں اور ایک دوسرے کو قریب سے سمجھ سکیں۔ اور آج تو نیر صاحب کی کتابوں کے اجرا میں اردو کے ساتھ ہندی کے بھی تمام دانشور موجود ہیں۔ لکھنؤ یونیورسٹی کے سبھی شعبوں کے لوگ تو ہیں ہی ہیں دوسری یونیورسٹیوں کے لوگ بھی موجود ہیں۔ اردو اکادمی اور ہندی سنسٹھان کے لوگ بھی موجود ہیں یہ لوگ اردو سے ہندی اور ہندی سے اردو ترجمہ تو کرا ہی سکتے ہیں۔

بول چال کی زبان ہمارے ملک میں الگ الگ مقام کی وجہ سے الگ الگ ہے مگر پورے ملک میں بول چال کی زبان ہندی کے بعد اگر کوئی ہے تو وہ اردو زبان ہے جو ہندی کے بعد سب سے زیادہ بولی جاتی ہے اور سمجھی جاتی ہے۔ اور میں یہ سمجھتا ہوں کہ اردو جتنی ترقی کرے گی وہ ملک کے حق میں فائدہ مند ہوگی۔ یہ مجھے لگتا ہے۔ اب زیادہ پرانی بات کرنے کا کوئی فائدہ بھی نہیں ہے مگر میں یہ کہتا ہوں کہ ملک کی آزادی کے لیے

جو جدوجہد ہوئی اس جدوجہد میں انقلابیوں نے اپنی اپنی ذمہ داریوں کو بخوبی نبھایا۔ لیکن کبھی کبھی یہ چرچا ہوتی ہے کہ قلم کی طاقت زیادہ ہے یا تلوار کی طاقت زیادہ ہے؟ اور آزادی کے آندولن میں قلم نے بھی بہت کارہائے نمایاں انجام دیئے ہیں۔ اور یہ قلم کی طاقت ہندی کے ادیبوں کے ساتھ ساتھ اردو کے ادیبوں نے بھی دکھائی جو سنہرے حروف سے عبارت ہے۔

میری کتاب کے متعلق بھی چرچا ہو رہی تھی۔ کیسے شائع ہوئی میں بتاتا ہوں۔ دیکھنے میں کوئی مصنف نہیں ہوں۔ مجھے لکھنے کی کوئی عادت نہیں ہے۔ لیکن جیسے یہاں اتر پردیش میں مختلف اخبار شائع ہوتے ہیں اور اس کے کئی کئی ایڈیشن بھی نکلتے ہیں صرف اتر پردیش میں ہی نہیں بلکہ ہر پردیش میں اخبار نکلتے ہیں ویسے ہی مہاراشٹر میں ”سکال“ نامی ایک اخبار نکلتا ہے تو اخبار کے مالک نے ایک کالم لکھنے کے سلسلے میں مجھے فون کیا۔ اور مجھ سے درخواست کی کہ اب آپ سیاست کے میدان سے دور گورنر ہاؤس میں ہیں اب آپ کی حیثیت گورنر کی ہے۔ پہلے آپ سیاست میں بہت مصروف اور مشغول تھے لکھنے کا وقت نہیں مل سکا مگر اب آپ گورنر ہیں اور آپ کے پاس کچھ وقت بھی ہے تو کچھ لکھئے اور زندگی کے تجربات کو دوسروں کے درمیان پیش کریں تاکہ دیگر حضرات اس سے استفادہ کر سکیں۔ تو میں نے کہا کہ مجھے اس طرح رغبت نہیں ہے تو انہوں نے پھر مجھ سے درخواست کی اور بتایا کہ میں نے یعنی اخبار کے مالک نے آپ کے علاوہ ہندوستان کی تین عظیم شخصیات سے کالم لکھنے کے لیے رضا مندی حاصل کر لی ہے وہ اپنی زندگی کے اہم تجربات کو قارئین کے درمیان پیش کریں گے۔ آپ سے درخواست گزار ہیں کہ آپ کالم کے ذریعہ اپنے تجربات ہمارے قارئین تک منتقل کریں۔ وہ تین عظیم شخصیات میں ایک کانگریس کے بڑے لیڈر شکیل کمار شندے جو مہاراشٹر کے وزیر اعلیٰ بھی رہ چکے ہیں اور راجیہ سبھا کے ممبر بھی۔ اور دوسرے شیو سینا کے بڑے لیڈر منوہر جوشی اور تیسرے

NCD کے بانی شرد پوار جو مرکزی وزیر و دیگر عظیم عہدوں پر فائز رہ چکے ہیں جب یہ تین عظیم شخصیات نے رضا مندی دے دی تھی تو میں بھی راضی ہو گیا کالم لکھنے کے لیے۔ کیونکہ انہوں نے کہا کہ یہ تینوں لوگ الگ الگ پارٹی سے تعلق رکھتے ہیں اور اپنے تجربات و نظریات کو کالم کے ذریعے پیش کریں گے اگر آپ کچھ نہیں لکھیں گے تو سب یہ کہیں گے BNP والوں نے کچھ لکھنے پڑھنے کا کام نہیں کیا ہے۔ تو مجھے بھی سمجھ میں آیا تو اب میں سیاست کے میدان سے دور ہوں اور کچھ فرصت کے لمحات بھی میرے پاس ہیں تو کیوں نہ اپنی زندگی کے تجربات و نظریات کالم کے ذریعہ لوگوں تک پہنچاؤں۔ کبھی کبھی میں کالجوں میں گیا، طلباء کے درمیان گیا، اور یہ کہتا رہتا تھا کہ پڑھائی بہت اہم ہے تعلیم حاصل کرنا چاہئے اور حصول علم کے لیے جدوجہد جاری رکھنا چاہئے۔ اور تحصیل علم کے درمیان اپنے ماں باپ پر زیادہ بوجھ نہیں ڈالنا چاہئے۔ وغیرہ وغیرہ۔ میں نے اپنے بارے میں بتایا کہ کالج کے دنوں میں میرے والد صاحب کہتے تھے جو ایک اسکول کے استاد تھے تو انہوں نے مجھ سے کہا کہ چار سال کی پڑھائی کر کے تم انجینئر یا ڈاکٹر بننا چاہتے ہو تو اتنا پیسہ ہمارے پاس نہیں ہے چار سال کالج میں پڑھو مگر جو فیس ہے اس کا انتظام تمہیں خود کرنا پڑے گا باقی دیگر انتظام ہم کریں گے۔ کھانے پینے کا تو دیکھئے کیسے میں نے انتظام کیا؟ پونے کے ایک کالج میں پڑھائی کی۔ پونے میں پڑھائی کرنے والے زیادہ ہیں۔ دو سال تک میں نے اخبار نیچنے کا کام کیا اور ٹیوشن وغیرہ سے میں فیس کا انتظام کیا کرتا تھا جب میں اپنا یہ واقعہ بیان کر رہا تھا تو مجھے ایسا لگا کہ یہ باتیں طلباء کے لیے فائدہ مند ثابت ہوں گی تو بچپن سے گورنر ہاؤس تک آتے آتے ۲۶ آرٹیکل Life ہو گئے۔ چیف ایڈیٹر صاحب نے کہا کہ گورنر صاحب اس کو کتابی شکل دیجئے تاکہ ہمیشہ کے لیے محفوظ ہو جائے۔ اور جیسا کہ ابھی کچھ دیر پہلے میں نے ذکر کیا تھا کہ اخبار کی Life ایک دن کی ہوتی ہے تو میرے سارے آرٹیکل صرف ایک ایک دن کے لیے ہو کر

رہ جائیں گے۔ اس لئے مجھے بھی یہ بات اچھی لگی کہ ان تمام مضامین کو ایک کتاب میں یکجا کر کے شائع کراؤں اور ہمیشہ کے لیے قارئین کے دلوں میں بس جاؤں۔

میں نے کتاب بنوائی اور بمبئی میں اچھے گراہک بھی مل گئے تو پھر یہ بات سامنے آئی کہ اس کتاب کو ہندی اور انگریزی میں بھی شائع ہونا چاہئے۔ میں نے قبول کر لیا اور ہندی اور انگریزی میں بھی یہ کتاب شائع ہو گئی۔ اب میں اتر پردیش کا گورنر ہوں اور یہاں لوگ سب سے زیادہ اردو بولتے ہیں تو میں نے سوچا کہ اردو داں طبقہ تک میری یہ کتاب جانا چاہئے۔ یہی سبب بنا کہ اب میری کتاب بہت جلد اردو زبان میں بھی شائع ہونے کے قریب ہے۔ میری کتاب کا اردو ترجمہ بھی ڈاکٹر نیر جی نے ہی کیا ہے۔ مگر اس کے رسم اجرا کا پروگرام کہاں ہوگا یہ مجھے معلوم نہیں ہے لیکن میں آج ہی آپ لوگوں کو شرکت کی دعوت دے رہا ہوں۔

آج تین کتابوں کی رسم اجرا ہے میرا ہمیشہ سے دستور رہا ہے کہ جب مجھے کسی کتاب کی رسم اجرا کے پروگرام میں مدعو کیا جاتا ہے تو سب سے پہلے میں اس کتاب کو پڑھنے کی کوشش کرتا ہوں اور ایک کاپی ان سے مانگ لیتا ہوں اس کے دو فائدے ہیں ایک تو یہ کہ پہلے ہی ایک کتاب مل جاتی ہے اور جب افتتاح ہوتا ہے تو دوسری کتاب بھی مل جاتی ہے۔ کتاب کی قدر و قیمت اس کے عنوان، مضامین سے ہوتی ہے۔ ممکن ہے کوئی کتاب معاشرہ کے لیے فائدہ مند اور کوئی نقصان دہ ہیں۔ فائدہ و نقصان اس کے مضامین سے ہوتے ہیں۔ ہمارے مہاراشٹر میں کہاوت ہے کہ جو پڑھے گا وہی بچے گا۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ زندگی میں پڑھنے کی جو ضرورت ہے جو کبھی ختم نہیں ہوگی۔ یعنی ہمیشہ انسان کو پڑھنا چاہئے۔ مجھے امید ہے کہ نیر صاحب کی یہ تین کتابیں اردو ادب کے لیے بہت مفید ثابت ہوں گی اور قارئین کے لیے فائدہ مند۔

میری گزارش ہے آپ حضرات سے کہ یہ تینوں کتابیں آپ حضرات ضرور

خرید کر پڑھیں اور دیکھئے اگر آپ کتابیں خرید کر نہیں پڑھیں گے تو پبلشر کے سامنے پریشانی کھڑی ہو سکتی ہے اور پھر دوسری کتابیں شائع ہونے میں تاخیر ہوگی۔ لہذا آپ حضرات ضرور اس کو خرید کر پڑھیں تاکہ کتابوں کی قدر و قیمت کا اندازہ ہو سکے۔ میں ایک بار پھر اپنی طرف سے اور آپ تمام حضرات کی طرف سے نیر صاحب کی خدمت میں مبارک باد پیش کرتا ہوں اور ان کے تابناک مستقبل کے لیے دعا گو ہوں۔

عمار رضوی صاحب نے اپنی تقریر کے بعد میرے پاس اپنی کرسی پر بیٹھے بیٹھے مجھ سے کچھ کہا تو میں چاہتا ہوں کہ میں بھی عمار رضوی صاحب کے بارے میں کچھ کہوں۔ دیکھئے انہوں نے میری کتاب کے بارے میں ذکر کیا تھا۔ میری کتاب کا عنوان ہے ”چریوتی چریوتی“ یہ بہت قدیم سنسکرت نعرہ ہے۔ اس کے دو حصہ ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ انسان کو کیا برتاؤ کرنا چاہئے۔ جو انسان بیٹھ گیا اس کی قسمت بھی بیٹھ جاتی ہے اور جو سو گیا اس کی قسمت بھی سو جاتی ہے جو کھڑا رہا وہ کھڑا ہی رہا۔ مگر جو چلتا رہا اس کی قسمت بھی چلتی رہی۔ چریوتی چریوتی کا یہی مطلب ہے کہ چلتے رہو چلتے رہو۔ بہر حال اب میں بھی مصنف ہو گیا ہوں اور مجھے بھی مصنف ہونے کا مزہ آنے لگا ہے مجھے بھی امید ہے کہ میری کتاب ”چریوتی چریوتی“ کا بھی استقبال آپ سب اسی طرح سے کریں گے جس طرح نیر صاحب کی کتابوں کا استقبال کر رہے ہیں۔ میں نے تو آج تک کسی کتاب کے اجرا یا کسی زبان و ادب کے پروگرام میں اتنے دانشوروں کا اتنا بڑا مجمع نہیں دیکھا۔ اردو زبان کے بلکہ یہاں موجود سبھی زبانوں کے ادیبوں اور قلم کاروں کو ایک بار پھر مبارک باد۔

”تین کتابیں“

پروفیسر شارب روڈولی

سب سے پہلے میں عباس رضا صاحب کو ان کی تین کتابوں کی اشاعت پر مبارک باد دینا چاہتا ہوں۔ تین کتابوں کی اشاعت ایک ساتھ، معمولی کام نہیں تھا۔ اسپورٹس میں تین گول، تین وکیٹ ایک ساتھ لینے والا ہیٹر کہلاتا ہے، ادب میں اس کے برابر کی کوئی اصطلاح نہیں ہے جس سے ہم عباس رضا صاحب کو ڈیکوریٹ کر سکیں۔ لیکن ان کا جو ڈیکوریشن ہے وہ ان کی کتابیں ہیں۔ تین کتابیں مختلف تین الگ الگ موضوعات پر۔

ایک کتاب ”رثائی تنقیدیں“۔ رثائی ادب ہمارے یہاں بہت اہم ادب ہے۔ کلاسیکی ادب سے لے کر آج جدید زمانے تک رثائیت ہمارے یہاں کسی نہ کسی شکل میں خواہ وہ مرثیے کی شکل میں ہو، سلام کی شکل میں ہو، رباعیات کی شکل میں ہو، نوحوں کی شکل میں ہو، وہ موجود ہے اور اس پر کام بھی ہو رہا ہے اور شعراء لکھ بھی رہے ہیں۔ لیکن ان کا جائزہ لینا، یہ ایک مشکل کام ہے۔ عباس رضا نے یہ کوئی ایک مسلسل کتاب نہیں لکھی ہے، یہ ان کے مضامین کا مجموعہ ہے۔ اور یہ مضامین بہت اہم اس لئے ہیں کہ عام طور پر ہم دیکھتے ہیں کہ جب کوئی مرثیہ پر لکھنے کی کوشش کرتا ہے تو وہ ایک کتاب انیس پر لکھ دیتا ہے، یا دس بیس مضامین دبیر کے اوپر اور دوسرے کلاسیکی شعراء پر مضامین لکھ کر ایک کتاب تیار ہو جاتی ہے۔ عباس رضا نے یہ نہیں کیا۔ عباس رضا نے انیس پر بھی لکھا ہے ایک مضمون، دبیر پر بھی لکھا ہے ان کے مکالمات کے سلسلے میں، ان کے ہاں جو

گفتگو کا انداز ملتا ہے؛ اس سلسلے میں بھی انہوں نے لکھا ہے۔ لیکن میں سمجھتا ہوں اس کا سب سے اہم حصہ وہ ہے جہاں وہ جدید غزل میں رثائیت تلاش کرنے کی کوشش کرتے ہیں یا ان علامات کو ان تلازمات کو تلاش کرنے کی کوشش کرتے ہیں جو تلازمات ہمیں واقعہً کربلا کی طرف لے جاتے ہیں۔

خواہ وہ عرفان صدیقی کی شاعری میں ہو یا علی سردار جعفری کی شاعری میں یا دوسرے اور شعرا کی شاعری میں ہو۔ لہذا سب سے بڑی چیز یہ ہے کہ تین چار مضامین انہوں نے اس طرح کے اس میں شامل کئے ہیں جن میں انہوں نے جدید اردو غزل میں ان عناصر کو تلاش کرنے کی کوشش کی ہے۔ نیر صاحب نے صرف غزل میں ہی نہیں بلکہ فلشن میں بھی واقعہً کربلا کے تلازمات کو تلاش کیا ہے خاص طور سے عصمت چغتائی کے ”ایک قطرہ خون“ کا نہایت سنجیدہ مطالعہ کیا ہے جو ان کی کتاب کے آخر میں شامل ہے۔ چنانچہ اس طریقے سے، رثائی تنقیدیں ان کی کتاب اردو کی رثائی تنقید میں اپنی ایک بنیادی اہمیت رکھتی ہے۔

عباس رضا نیر کی دوسری کتاب خواجہ احمد عباس پر ہے۔ خواجہ احمد عباس کے نام سے کون نہیں واقف ہے، وہ لوگ جو پرانے ہیں، BLITZ کا آخری صفحہ ان کی نظروں میں ہے۔ یا وہ لوگ جو فلم کے شائقین ہیں اور ’نیا دور‘ اور دوسری ’آسمان محل‘ ایسی فلمیں دیکھ چکے ہیں وہ، یا وہ لوگ جو ڈرامے کے شوقین ہیں؛ ان سب کی نگاہ میں ہے کہ خواجہ احمد عباس کا نام ایک بہت اہم نام ہے ہماری فلشن کی تاریخ میں، ہمارے ادب کی تاریخ میں، ہمارے ڈرامے کی تاریخ میں، ہماری فلم سازی کی تاریخ میں۔ عباس رضا نے یہ کتاب بہت تفصیل سے لکھی اور کسی ایک حصے کو لے کر نہیں لکھی۔ یعنی وہ صرف ان کی افسانہ نگاری اور ناول نگاری تک محدود نہیں ہے، انہوں نے ان کی صحافت کا ذکر بھی کیا، انہوں نے ان کی ڈرامہ نگاری کا ذکر بھی کیا، ان کی فلم سے وابستگی کا ذکر بھی کیا۔ اس طرح سے اگر ہم ان کی پوری شخصیت کا احاطہ کرنا چاہیں تو عباس رضا نیر کی اس کتاب

پیغامِ تہنیت

علامہ ڈاکٹر ضمیر اختر نقوی (پاکستان)

ڈاکٹر عباس رضانیر کی تین کتابیں: ۱۔ تنقیدی بحثیں۔ ۲۔ رثائی تنقیدیں۔ ۳۔

خواجہ احمد عباس۔

چھپ کر منظرِ عام پر آگئی ہیں۔ تین کتابوں کا اجرا ایک ساتھ اس بات کی دلیل ہے کہ عباس رضائیر قلم کے دھنی ہیں۔ مجھے اُن کی مصروفیات کا اندازہ ہے، غیر ملکی دورے، فنِ خطابت کا مظاہرہ، لکھنؤ یونیورسٹی کی مصروفیات، شعرو شاعری سے شغف، اور پھر نثر میں متعدد کتابوں کا چھپتے رہنا، یہ سب کچھ تائیدِ ایزدی کے سوا اور کیا ہے؟ روئے زمین پر لکھنؤ جیسا شہر اب بسایا نہیں جاسکتا۔ اور نہ اہل لکھنؤ جیسے تہذیب یافتہ، با وفا، محبت کرنے والے، دنیا میں پیدا ہوں گے۔ لکھنؤ کے ہزاروں کارناموں میں سے ایک کارنامہ اور بھی ہے اور وہ یہ کہ بیرونی ادیبوں، شاعروں اور عالموں کو اپنا بنالینا اور فوراً قبول کر لینا یہ بھی لکھنؤ کا ایک بہت بڑا کارنامہ ہے۔

سرکارِ ناصر المملّت کا خاندان کثور سے آیا تھا۔ سرکارِ نجم المملّت کا خاندان امروہہ سے آیا تھا۔ خطیبِ اعظم سید سبط حسن جاس نصیر آباد سے آئے تھے۔ مولانا ابنِ حسن نونہروی نونہرا (غازی پور) سے آئے تھے۔ مولانا محسن نواب صاحب بنارس سے آئے تھے۔ میرانیس اور خواجہ حیدر علی آتش فیض آباد سے آئے۔ مرزا دبیر کا خاندان دہلی سے آیا تھا۔ انشاء مرشد آباد سے آئے تھے۔ مصحفی امروہہ سے آئے تھے۔ میر تقی میر اور

سے 'خواجہ احمد عباس' کی پوری شخصیت پر روشنی پڑتی ہے۔ ہو سکتا ہے، ان کے نقطہ نظر سے آپ کو اختلاف ہو لیکن جو ادبی اہمیت تنقید کی ہے، اس تنقیدی اہمیت سے آپ انکار نہیں کر سکتے کہ جو کام انہوں نے کیا ہے وہ ایک تاریخی کام ہے۔ اور ایسا کام ہے جو آنے والی نسلوں کی رہنمائی کرنے والا ہے۔ اب تک خواجہ احمد عباس پر ایسا کام نہیں ہوا تھا۔ ان پر عباس رضانیر کی یہ کتاب درحقیقت ایک ریفرنس بک کی حیثیت رکھتی ہے۔

عباس رضانیر کی تیسری کتاب 'تنقیدی بحثیں' ہے۔ یہ تنقیدی بحثیں بھی ان کی ایسی ہے جس میں انہوں نے مختلف چیزوں سے بحث کی ہے۔ تنقیدی بحثیں میں ایک اہم مضمون آپ کو ن۔ م۔ راشد پر ملے گا، اور وہ ہے ان کا، ایران میں اجنبی، جو لوگ شاعری سے شوق رکھتے ہیں، جنہوں نے پڑھا ہیوہ جانتے ہیں کہ ن۔ م۔ راشد کی چند نظموں پر مشتمل ان کا مونو لاگ کہیں یا جو بھی کہیں۔ 'بیٹے'، 'ہاں'، 'بیٹے'، تو اس کو آپ ضرور دیکھیں کہ کس طرح سے ایران کی تہذیب اور ہندوستان کی تہذیب ہے ہمارا یہ ایرانین کلچر اور انڈین کلچر how Noon Miim Rashid has taken

the best of thoughts of all those cultures and has put up in his poems.

عباس رضانیر صاحب نے کتنی خوبصورتی کے ساتھ ان نظموں کا تجزیہ کیا ہے اور ان پر تبصرہ کیا ہے۔ اسی کے ساتھ 'تنقیدی بحثیں' میں شامل دوسرے مضامین بھی ہر پہلو سے معیاری ہیں اور عملی تنقید کی بہترین مثال ہیں۔ خوشی کی بات ہے کہ لکھنؤ میں اور خاص طور سے لکھنؤ یونیورسٹی میں نئی نسل کی نمائندگی کرنے والے ایسے نوجوان نقاد موجود ہے جن کی تحریریں اعتبار کا درجہ رکھتی ہیں۔ میں عباس رضانیر کو ان تین کتابوں 'رثائی تنقیدیں'، 'تنقیدی بحثیں' اور خواجہ احمد عباس' پر دل کی گہرائیوں کے مبارک باد پیش کرتا ہوں۔

سودا دہلی سے آئے تھے۔ پروفیسر مسعود حسن رضوی ادیب نیوتنی سے آئے تھے۔ پروفیسر احتشام حسین ماہل (اعظم گڑھ) سے آئے تھے۔ اور سیکٹروں مثالیں ہیں۔ لیکن آپ نے دیکھا کہ لکھنؤ والوں نے ان سب کو کیسے اپنا لیا۔ اور ان آنے والوں نے اپنا اپنا وطن بھلا کر لکھنؤ کو اپنا وطن بنا لیا۔

عباس رضا نیر جلال پور کے رہنے والے ہیں۔ سابقہ مثالوں کی طرح اب وہ لکھنؤ کے ہیں اور لکھنؤ ان کا ہے۔ لکھنؤ کی خطابت، لکھنؤ کی شاعری، لکھنؤ کی تعلیم و تربیت میں سابقہ دانشوروں نے چار چاند لگائے تھے۔ عباس رضا نیر نے لکھنؤ کی تہذیب، سلطان المدارس، مدرسۃ الواعظین اور لکھنؤ یونیورسٹی کی تعلیم سے، لکھنؤ کی شاعری، دانشوری، تعلیم، تہذیب، علمی نثر، نفاست اور خطابت میں ہزار چاند لگا دیئے ہیں۔ اللہ تعالیٰ ان کو عمرِ نوح عطا کرے اور وہ ہمیشہ علم و ادب کی خدمت کرتے رہیں۔ ان کی کتابوں کے اجرا پر ہم انہیں بہت بہت مبارک باد دیتے ہیں۔ حاسدین کہاں نہیں پائے جاتے۔ مکے اور مدینے میں بھی تو صاحبانِ علم کے حاسدین رہتے تھے۔ اسی لیے اللہ تعالیٰ نے اپنے رسول پر یہ آیت اتاری۔

أَمْ يَحْسُدُونَ النَّاسَ عَلَىٰ مَا آتَاهُمُ اللَّهُ مِنْ فَضْلِهِ فَقَدْ آتَيْنَا آلَ إِبْرَاهِيمَ الْكِتَابَ وَالْحِكْمَةَ وَآتَيْنَاهُمْ مُلْكًا عَظِيمًا (سورہ نساء آیت ۵۴)

ترجمہ: آلِ ابراہیم سے کب تک حسد کرتے رہو گے۔ ہم نے ان کو فضیلت عطا کی کتاب اور حکمت عنایت کی اور انہیں ملک عظیم دیا۔ ملک عظیم محبت اہلیت ہے۔ اسی لیے غالب نے کہا:

حسد، سزائے کمالِ سخن ہے کیا کیجئے
ستم بہائے متاعِ ہنر ہے کیا کہیئے

غالب کہتے ہیں کہ یہاں کمالِ سخن کی سزا حسد ہے، یہاں متاعِ ہنر کے لیے جو قیمت مقرر کی جاتی ہے وہ ستم ہے۔

غالب نے کہا لیکن ہم حسد دور کرنے کا نسخہ بھی دیتے ہیں اور وہ نسخہ یہ ہے:

حسد سے دل اگر افسردہ ہے گرم تماشا ہو

کہ چشمِ تنگ شاید کثرتِ نظارہ سے وا ہو

یہ آنکھیں بند کر کے خفاش کی طرح سے اندھیرے ہی میں دیکھنے کی عادت مناسب نہیں ہے، کچھ اُجالے میں آؤ تا کہ دامن کے داغ نظر آئیں، اندھیرے میں کب تک ٹٹولتے پھرو گے اور اندھیرے میں کس کو پہچان سکو گے، جہاں اندھیرا ہوتا ہے وہاں انسان تمیز نہیں کر سکتا، جہاں تمیز کھودیتا ہے وہاں نیک و بد کی پہچان نہ ہونے کی وجہ سے غلطی کا ارتکاب کرتا ہے۔ انسان اپنی مجبوری کا جہاں اعلان کرتا ہے وہ حسد ہے۔ انسان جہاں اپنے معزول ہونے کا اعلان کرتا ہے وہ حسد ہے، کچھ کر نہیں سکتا، اس لئے حسد کرتا ہے، قوت نہیں ہے اس لئے حسد کرتا ہے، آلِ محمد حاسد نہیں ہیں بلکہ محسود ہیں، دنیا حاسد ہے، دنیا ان سے حسد کیے جا رہی ہے۔ حضرت علیؑ نے فرمایا کہ حاسد کی مجبوری یہ ہے کہ وہ محسود سے اس کا فضل چھین نہیں سکتا اور خود صاحبِ فضل ہو نہیں سکتا۔

حسد کرنے والوں کی چند مثالیں لکھنؤ میں بھی مل جائیں گی۔ لیکن ان کا الزام پورے شہر کے صاحبانِ علم کو نہیں دیا جاسکتا۔ ہماری دعا ہے کہ عباس رضا نیر حاسدین کے شر سے محفوظ رہیں۔ اور ان کے سر پر ہمیشہ حضرت عباسؑ کے علم کا پھریرا سایہ فگن رہے۔ آمین۔ عباس رضا نیر بچپن سے لکھنؤ میں زیرِ تعلیم رہے ہیں۔ انہوں نے مجھ سے بیان کیا کہ:

”جب آپ پاکستان سے لکھنؤ میں مجالس پڑھنے آتے تھے تو لکھنؤ کا مجمع آپ کے پیچھے پیچھے ایک جگہ سے دوسری جگہ بھاگ کر پہنچتا

تھا۔ اور آپ کی کوئی تقریر چھوڑنا نہیں چاہتا تھا۔ اُس لکھنؤ کے مجمع میں مدرسہ سلطانیہ اور ناظمیہ کے طلباء بھی ہوتے تھے اور اُن میں ایک میں بھی تھا۔ میں اُس وقت کم سن تھا لیکن آپ کی تقریروں کو پسند کرتا تھا۔“

یہ سعادت مندی بہت کم لوگوں میں پائی جاتی ہے۔ عباس رضائے نے بزرگوں کی وراثت کو سنبھالا ہے۔ لکھنؤ جیسے شہر میں تعلیم حاصل کی ہے۔ جب وہ مراد آباد کالج میں استاد تھے اُس وقت بھی مجھ سے رابطے میں تھے اور میرے سہ ماہی رسالے ”القلم“ کے لیے مضامین، نظمیں، قصائد، بھیجتے رہتے تھے۔ اتنی کم عمری میں اُن کے قلم کی توانائی کو دیکھ کر میں حیرت میں پڑ جاتا تھا۔ اصنافِ شاعری میں کوئی صنف ایسی نہیں ہے جس میں انہوں نے طبع آزمائی نہ کی ہو۔ علم عروض پر عبور ہونے کے باوجود اُن کی آزاد نظمیں بھی قابلِ مطالعہ ہیں۔ ہندوستان کے کئی بڑے پبلشرز نے ان کی کتابیں چھاپی ہیں۔ ساہتیہ اکادمی، دہلی نے ان کی کتاب ”سات قدم آسمان میں“ اور ”آچار یہ رام چندر شکل“ شائع کی ہے۔ کراچی میں ہم نے ان کی تین ضخیم کتابیں شائع کی ہیں۔ ”خطوط بنام ضمیر“ ۸۰۰ صفحات، ”کانگریس لائبریری امریکہ کے اردو مخطوطات“ ۴۰۰ صفحات اور ”احساس“ ۴۰۰ صفحات کو محیط ہیں۔ بلکہ ہم کو تو ایسا لگتا ہے کہ عباس رضانی کی کتابیں پڑھنے والے اور نئی کتابوں کا انتظار کرنے والے ہندوستان سے زیادہ پاکستان میں ہیں۔ ہماری خواہش ہے کہ عباس رضانی کی جو کتابیں بھارت میں چھپ رہی ہیں ان کا پاکستانی ایڈیشن بھی شائع ہو جائے۔

ہندوستان کی عظمت اور امام حسینؑ کی عزاداری کے موضوع پر اُن کا ایک نوحہ لاجواب ہے۔ جس کا ذکر میں نے حیدرآباد دکن کی ایک تقریر میں کیا تھا۔ جہاں ہزاروں کا مجمع تھا۔ اور جس کیسٹ میں اُن کا یہ نوحہ موجود ہے میں نے پورے پاکستان میں کیسٹ کی مزید کاپیاں بنوا کر مجالس میں تقسیم کروائیں تاکہ اہل پاکستان ہندوستان کی

عظمت سے واقف ہو جائیں کہ وہاں کتنی آزادی کے ساتھ عزاداری ہو رہی ہے۔ اور اس پیغام کو عباس رضائے ملکوں ملکوں میں عام کر رہے ہیں۔ عباس رضائے ہندوستان کے ادبی سفیر ہیں جو ادب کے ذریعے اہل بیتؑ کی تہذیب کو پوری دنیا میں پھیلا رہے ہیں۔ پاکستان، کراچی میں وہ عشرے پڑھ چکے ہیں اور ان کو یہاں بہت پسند کیا گیا ہے۔ ہم اُن کے لیے مزید دعا گو ہیں کہ اللہ تعالیٰ اُن کو ہمت و قوت عطا کرے اور وہ اسی طرح خدمتِ علم و تہذیب کرتے رہیں۔ (آمین)



ڈاکٹر عباس رضانیر کو اردو انجمن برلن کی مبارکباد

عارف نقوی

مجھے خوشی ہے کہ ڈاکٹر عباس رضانیر کی تین کتابوں ”خواجه احمد عباس“، ”رثائی تنقیدیں“ اور ”تنقیدی بحثیں“ کی رسم اجرا اتر پردیش کے گورنر جناب رام نائک جی کے ہاتھوں ہو رہی ہے۔ میں اپنی اور اردو انجمن برلن کے تمام اراکین کی طرف سے انھیں دلی مبارکباد دیتا ہوں۔

خواجه احمد عباس سے میرا ترقی پسند تحریک کے حوالے سے اچھا تعلق رہا ہے۔ ان کی بیش بہا تحریروں کو پڑھنے اور ان سے ذاتی ملاقاتوں کے مواقع صرف دہلی اور ممبئی میں ہی نہیں ملے بلکہ یہاں برلن میں بھی کئی دن ساتھ رہا اور میں نے دیکھا کہ وہ ایک مایہ ناز ادیب، صحافی اور فلم کار ہی نہیں بلکہ بہترین انسان بھی تھے۔ اس لئے مجھے خوشی ہے کہ نیر صاحب نے ان پر کتاب لکھی ہے۔ نقادوں اور تنقیدی بحثوں سے مجھے ہمیشہ خوف محسوس ہوتا ہے لیکن میں ان کا احترام کرتا ہوں۔ اس لئے مجھے یقین ہے کہ نیر صاحب نے دونوں کتابیں اپنے علم اور حقیقت پسند تنقیدی شعور کے ساتھ اس طرح تخلیق کی ہوں گی کہ صرف نقاد ہی نہیں عام اردو داں بھی سمجھ سکیں۔ بہر حال یہ بھی ان کا ایک بڑا کام ہے۔

مجھے اس بات کی خاص طور سے خوشی ہے کہ ڈاکٹر نیر کی تینوں کتابوں کی رسم اجرا ایک ایسے گورنر کے ہاتھوں ہو رہی ہے جس نے اتر پردیش اور خاص کر لکھنؤ کے اردو داں حلقوں کے دلوں کو جیت لیا ہے۔ وہ اپنے دلش کو ایک ایسا حسین گلشن سمجھتے ہیں جس کے سبھی گلوں کی اہمیت ہے۔ یہی وجہ ہے کہ وہ اردو زبان و ادب کے حسن اور اہمیت سے واقف ہیں اور اس کے فروغ میں خود اپنے ملک و قوم کی فلاح دیکھتے ہیں۔ چنانچہ وہ اردو زبان و ادب کے فروغ کے لیے ہونے والے مختلف سیمیناروں اور اردو کانفرنسوں میں باذوق شرکت کرتے ہیں اور اردو کی فلاح و بہبود کے لیے عملی قدم اٹھاتے ہیں۔ یہاں تک کہ راج بھون کے ملازمین میں بھی انھوں نے اردو سیکھنے کا رجحان پیدا کیا ہے۔

لکھنؤ یونیورسٹی کے اسی مالویہ ہال میں جس میں نیر صاحب کی کتابوں کی رسم اجرا ہونے جا رہی ہے، اس سال ۲۰۱۲ مئی کو رام نائک جی نے انٹرنیشنل اردو کانفرنس کا افتتاح کیا تھا جس میں میں برلن سے اردو انجمن کا ایک وفد لے کر گیا تھا۔ یہ کانفرنس محمود آباد کے مولانا آزاد گلنیکل انسٹی ٹیوٹ، لکھنؤ یونیورسٹی کے شعبہ اردو اور برلن کی اردو انجمن کے اشتراک سے کی گئی تھی، جس میں ڈاکٹر عمار رضوی، اودھ نامہ کے مینیجنگ ایڈیٹر وقار رضوی، پروفیسر شارب ردولوی، عرفان خاں وغیرہ کے ساتھ شعبہ اردو کے صدر ڈاکٹر عباس رضانیر نے بہت اہم رول ادا کیا تھا۔ اس کانفرنس میں بھی گورنر رام نائک جی کی شرکت نے رونق ہی نہیں پیدا کر دی تھی بلکہ انھوں نے اردو کی اہمیت، اس کے حسن اور اس کے اہم رول پر زور دیتے ہوئے کہا تھا کہ آپ لوگوں کے اردو کے فروغ کے لیے جو مشورے ہیں وہ ہمیں تحریری طور پر دیجئے صرف زبانی نہیں۔ تاکہ میں ان کی بنیاد پر عملی کارروائی کر سکوں۔ میرے خیال سے آج تک اتنے واضح الفاظ میں کسی دوسرے گورنر نے اردو کے لیے کچھ کرنے کا وعدہ نہیں کیا تھا۔ مجھے یقین ہے کہ ان کی آئندہ کتاب

”چریویتی، چریویتی“ جو جلد ہی ڈاکٹر عباس رضا نیر کے اردو ترجمے کے ساتھ منظر عام پر آنے والی ہے اردو حلقوں میں مقبول ہوگی۔

ڈاکٹر عباس رضا نیر سے میری پہلی ملاقات ۱۹۹۸ء میں ہوئی تھی، جب وہ اردو قبیلہ کی ایک شعری نشست کی نہایت ہی لطافت اور خوش بیانی کے ساتھ نظامت فرما رہے تھے۔ ایسا لگتا تھا جیسے ان کے پاس کلاسیکی اردو شعراء کے اشعار کا خزانہ بھرا ہوا ہے۔ میرے ایک پرانے دوست ریاض الحسن طاہر (مرحوم) نے نیر صاحب کا شعری مسودہ (جو غالباً پہلا مجموعہ تھا) پڑھنے کے لیے مجھے دیا یہ کہتے ہوئے کہ یہ نوجوان بہت ذہین، ہنرمند اور قابل ہے۔ بہت ترقی کرے گا۔ اس وقت نیر صاحب کا شعری مجموعہ پڑھ کر مجھے طاہر کی بات کی صداقت کا اعتراف کرنا پڑا۔ اب جب میں ان سے گفتگو کرتا ہوں، ان کی نظامت کے ہنر کو دیکھتا اور تقریروں کو سنتا ہوں یا تحریروں کو پڑھتا ہوں تو طاہر کی پیشین گوئی یاد آ جاتی ہے۔ لیکن مجھے سب سے زیادہ خوشی اس بات سے ہوتی ہے کہ وہ ایک طرف تو بیش بہا تخلیقی کام کر رہے ہیں دوسری طرف لکھنؤ یونیورسٹی کے شعبہ اردو کے صدر کی حیثیت سے یونیورسٹی اور اس کے باہر اردو زبان و ادب کے فروغ کے لیے بیش قیمت خدمات انجام دے رہے ہیں اور نئی نسل میں اردو کے لیے ذوق و شوق ہی نہیں حوصلے جگا رہے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ اس سال ممی میں ہماری اردو انجمن برلن نے ڈاکٹر نیر کی خدمات کو سراہتے ہوئے انھیں اردو انجمن کا اعزازی ایوارڈ دیا تھا، اس احساس کے ساتھ کہ جب تک ڈاکٹر عباس رضا نیر جیسے اردو کے پر خلوص پریمی ہمارے بیچ میں رہیں گے اردو پر آنچ نہیں آنے پائے گی۔ اس کا حسن اور مقبولیت بڑھتی جائے گی۔

خدا انھیں اور زیادہ کامیاب کرے۔

ڈاکٹر عباس رضا نیر جب ہیومن ویلفیئر ایسوسی ایشن فرینکفرٹ کی دعوت پر ستمبر

۲۰۱۵ء میں جرمنی تشریف لائے تھے تو میں جرمنی سے باہر تھا لیکن جرمنی کے ادبی حلقوں میں آپ کے اس سفر کی بڑی دھوم ہے۔ آپ نے اس سفر میں گوئٹے کے مکان، نیکر کے کنارے اقبال اسٹریسے پر اور مختلف سیمینار ہالوں میں علامہ اقبال پر توسیع خطبے دیئے تھے اگر سید اقبال حیدر صاحب کے پاس ان کی ریکارڈنگ محفوظ ہو یا آپ کے پاس ان لیکچرس کے کچھ نوٹس موجود ہوں تو میری خواہش ہے کہ ان خطبات کو بھی ایک کتابی شکل میں جمع کر دیا جائے تو یقیناً یہ بڑا کام ہوگا اور تب علامہ اقبال پر تحقیقی کام کرنے والے طلباء اس کتاب سے خاطر خواہ استفادہ کر سکیں گے۔

☆☆☆

”تنقیدی بحثیں، رثائی تنقیدیں خواجہ احمد عباس“

فیاض رفعت

ڈاکٹر عباس رضا نیر درس و تدریس کے پیشہ سے وابستہ ہیں۔ حال ہی میں بیک وقت ان کی تین کتابیں منظر عام پر آئی ہیں۔ ’رثائی تنقیدیں‘ ان کے مضامین کا مجموعہ ہے۔ رثائی تنقیدیں ایک جائزہ ڈاکٹر منتظر مہدی کا تعارفی مضمون بے حد محنت سے لکھا گیا ہے جس کی داد نہ دینا ظلم ہوگا۔ پیش نظر کتاب میں انیس و دیگر پر تفصیلی مضامین شامل ہیں۔ میر اور غالب کی غزلوں میں علامات کر بلا کی کامیاب تلاش و جستجو کی گئی ہے۔ علی سردار جعفری، عرفان صدیقی کی کر بلا شناسی، پروفیسر فضل امام کی انیس شناسی کی بہت سلیقہ کے ساتھ بازیافت کی گئی ہے۔ یوں تو سبھی مضامین طالب علموں کے لیے خاص طور پر مفید مطلب ثابت ہوں گے، مگر ہمیں نسیم امروہوی کے مرثیہ عابد بیمار کا ایک تجزیہ بہت پسند آیا۔ جہاں تک رثائی ادب کا سوال ہے بعض لوگ چھوٹ گئے ہیں جن کے ذکر کے بغیر رثائی ادب کی تاریخ مکمل نہیں ہوتی۔ ہمارے دوست جون ایلیا جو ایک زمانے میں (آج سے ۵۰ سال قبل) کراچی سے ماہنامہ انشا نکالتے تھے اور بہت باقاعدگی سے اپنے صفحات پر ہمارا نام بطور کہانی کار چھاپ کر ہمیں سرخرو کرتے تھے، وہ اردو شاعری کا ایک بڑا نام ہیں۔ مرثیے، سوز و سلام اور منقبت ان کی شاعری کے لیے سرمایہ افتخار

ہیں۔ ’رثائی تنقیدیں‘ میں گوپی چند نارنگ کی تحریر کردہ غیر معمولی کتاب ”سانحہ کر بلا بطور ایک شعری استعارہ“ کو کتاب کا ایک باب ہونا چاہئے تھا۔ نارنگ صاحب کی دانشوری کی ایک دنیا قائل ہے۔ یوں تو اس بے نظیر کتاب میں انہوں نے دیگر مرثیہ گو شاعروں کا بھی ذکر کیا ہے۔ مگر ان کی کتاب لکھنؤ کے افتخار عارف پر مرتکز ہے، جنہوں نے غزلیہ شاعری کے ساتھ ساتھ رثائی شاعری میں بھی امتیاز و انفرادی کی ایسی دنیا تخلیق کی جو ہماری روح کو سوز و الم سے بھر دیتی ہے۔ شاید ڈاکٹر نیر نے اسی موضوع پر پی۔ ایچ۔ ڈی کی ہے اور ان کا تحقیقی مقالہ ابھی شائع نہیں ہوا ہے۔ وہ مقالہ جلد از جلد شائع ہو جائے تو ہم یہ ساری چیزیں ایک ساتھ پڑھ سکیں گے۔

نیر صاحب کی دوسری کتاب ”تنقیدی بحثیں“ میں ان کے تاثراتی مضامین شامل ہیں۔ جن لوگوں کو انہوں نے بحث و تبحر کا موضوع بنایا ہے، ان میں بہادر شاہ ظفر، منشی دوار کا پرشاد افق، فراق، ن، م راشد، مجروح، پریم چند، قرۃ العین حیدر، انتظار حسین، مولانا باقر دہلوی، مولانا ابوالکلام آزاد، منشی نول کشور، مرزا غالب اور ہم، بیسیویں صدی میں لکھنؤ کا اردو ادب شامل ہیں۔ سبھی مضامین ہم نے بڑے ذوق و شوق سے پڑھے مگر ہمیں خصوصی طور پر ان کا مضمون ”اختری بیگم: ایک تحقیقی جائزہ“ بے حد اچھا لگا۔ تنقیدی بحثیں، کے سبھی مضامین پسندیدہ ہیں۔ مصنف نے بڑی کاوش سے انہیں لکھا ہے جس کے لیے ہمیں ان کا حوصلہ بڑھانا چاہئے۔ ہماری خواہش ہے کہ عباس رضا نیر اس سلسلہ کو جاری رکھیں۔

عباس رضا نیر نے خواجہ احمد عباس پر ۲۸۶ صفحات پر مشتمل تفصیلی کتاب لکھی ہے۔ جس میں ان کی زندگی اور شخصیت افسانہ نگاری، ناول نگاری، ڈرامہ نگاری، صحافت نگاری کے ساتھ ساتھ ان کی خود نوشت اور سفر نامہ پر بھرپور روشنی ڈالی ہے۔ کتاب بلاشبہ دلچسپ ہے اور عباس رضا نیر کے عمیق مطالعہ کی مظہر بھی۔ آخر میں ماحصل کے عنوان سے

نیر صاحب نے خواجہ صاحب کی ادبی اور فنی شخصیت کا دلچسپ تجزیہ کیا ہے۔ اچھا ہوتا کہ مختصراً احوال و کوائف کا عنوان قائم کر کے اجمالی طور پر ان کی پیدائش و وفات کی تاریخوں کے ساتھ ساتھ ان کے افسانوی مجموعوں، ناولوں اور ڈراموں کی فہرست مرتب کر دی جاتی۔ ان کی اہم کتابوں میں ”خروٹچیف کیا چاہتا ہے“، ”مسو لینی“، محمد علی کا بھی ذکر کیا جانا چاہئے تھا۔ ”سو نے چاندی کے بت“ کے عنوان سے ان کے افسانوں، مضامین اور خاکوں کا آخری انتخاب ان کے معاون مرحوم وحید انور نے شائع کیا تھا اس کا بھی ذکر ہو لیتا تو اچھا رہتا۔ خواجہ احمد عباس پر راقم کا ایک طویل مضمون مدیر شمع ادریس دہلوی کی فرمائش پر خواجہ احمد عباس کی ۵۰ سالہ فلمی، ادبی اور صحافتی خدمات کے پیش نظر ضبط تحریر میں لایا گیا تھا۔ اصل میں یہ مضمون خواجہ صاحب کے ساتھ ایک غیر رسمی گفتگو پر مشتمل تھا اور شمع کے مئی جون اور جولائی ۱۹۸۷ء کے شماروں میں قسط وار شائع ہوا تھا۔ غالباً یہ مضمون نیر صاحب کی نظر سے نہیں گذرا۔ ہماری کتاب زندہ اپنی باتوں میں عباس صاحب کا انٹرویو شامل ہے یہ کتاب پہلی بار ۲۰۰۰ء میں شائع ہوئی تھی۔ تخلیق کار پبلشرز دہلی کے انیس امر وہوی نے حال ہی میں اس کا دوسرا ایڈیشن اضافوں کے ساتھ شائع کیا ہے۔ ہماری خواہش ہے کہ خواجہ احمد عباس پر لکھی گئی کتاب کے دوسرے ایڈیشن کی اشاعت کے وقت ہمارا مضمون بھی پڑھ لیا جائے۔ ہم نیر صاحب کو تین کتابوں کی ایک ساتھ اشاعت پر دلی مبارک باد پیش کرتے ہیں۔ امید ہے وہ لکھنے پڑھنے کے کام کو سنجیدگی سے جاری رکھیں گے۔ ہماری نیک خواہشات ان کے ساتھ ہیں۔

☆☆☆

چراغِ وطن عباس رضانیر

ڈاکٹر انور جلال پوری

موت سے بچنے کی اک ترکیب ہے

دوسروں کے ذہن میں زندہ رہو

ایک ہی ترکیب ہے موت سے بچنے کی، ورنہ کوئی ترکیب آج تک کسی کو موت سے نہیں بچا سکی۔ وہ ترکیب یہ ہے کہ کچھ ایسا لکھ کر کے جائیے کہ اگلی نسلیں آپ پر لکھتی رہیں۔ اور اس کے بعد کی نسلیں، ان کے لکھے ہوئے پر لکھتی رہیں۔ اس طرح سے آپ نے جو چراغ جلا یا ہے وہ ہزاروں لاکھوں چراغوں کی شکل میں قیامت تک جلتا رہے۔

عباس رضانیر نے اتنی کم عمری میں جو کچھ کر دیا، جو کچھ لکھ دیا اور جتنے الگ الگ زاویوں سے لکھ دیا ہے، بہت سے لوگ اپنی عمر کی آخری منزل میں جو معیاری ادب فراہم کرتے ہیں اپنے قلم سے، عباس رضانیر نے اپنی ابتدائی عمر میں وہ معیاری ادب دنیا کو دے دیا ہے۔ یہ ان کا بہت بڑا کارنامہ ہے۔ لیکن ایک بات میں بتا دینا چاہتا ہوں کہ ہر منظر کا کوئی نہ کوئی پس منظر ہوتا ہے ایسا نہیں ہے کہ اچانک کوئی آدمی بڑا عظیم ہو جاتا ہے۔ عباس رضانیر مجھ سے عمر میں کم سے کم پچیس تیس برس چھوٹے ہیں۔ ان کا بچپن میری آنکھوں میں ہے۔ ان کے والد میرے کلاس فیلو رہے ہیں، ان کی بہن میری بیٹی کی کلاس فیلو رہی ہے۔ اس طرح سے میرا ان کا بڑا گھر یلو اور قریبی

رشتہ ہے۔ وہ بچپن میں جب سات آٹھ برس کے تھے تو وہ اور ان کی پوری فیملی میرے گھر آیا جایا کرتی تھی اور تین چار پانچ گھنٹے رہا کرتی تھی۔ اکثر ایسا ہوتا تھا کہ دس گیارہ بجے رات میں ہم لوگ اس فیملی کو پہنچانے ان کے گھر جاتے تھے۔ ہماری یہ قربت رہی ہے یہ سلسلہ رہا ہے۔

نیر کے دادا رفیق حسین رفیق کر بلائی صاحب، بہت اچھے شاعر تھے اور بہترین سوز خواں بھی تھے۔ ان کے نانا حکیم انصار حسین کیف صاحب استاد الاساتذہ تھے۔ اس وقت کے جلال پور کے تمام شعرا ان کے شاگرد تھے۔ کیف صاحب ڈرامہ نگار بھی بہت عمدہ تھے۔ اب آپ غور کریں ڈاکٹر نیر پر، آپ اندازہ لگائیے، نانیہال اور دادیہال دونوں طرف سے علم ہی علم جس کی جھولی میں آ رہا ہو، اور ابتدائی تعلیم کے فوراً بعد جو علم و ادب کے شہر لکھنؤ میں تربیت پائے بلکہ لکھنؤ کی تہذیب و ثقافت میں رچ بس جائے وہ اگر آج اہل لکھنؤ سے داد و تحسین، دعائیں اور شفقتیں سمیٹ رہا ہے تو کوئی حیرت کی بات نہیں ہے۔ آج تو ڈاکٹر عباس رضا نیر کی شہرتیں زمین سے آسمان تک اس طرح سے پھیلی ہوئی ہیں جیسے فضا میں آکسیجن اور کیوں نہ ہو وہ اردو زبان و ادب کے مہذب دیوانے ہیں جو ہر لمحہ اپنی تہذیب کے چہرے کو سرخ رو رکھنے کے لیے ہر جتن کرنے کو تیار رہتے ہیں۔

ڈاکٹر نیر نے آٹھ سال کی عمر میں جلال پور کے لوگوں کو چونکا دیا تھا۔ جلال پور میں ایک کالج ہے جسے میں نے ۱۹۶۹ء میں قائم کیا تھا۔ مرزا غالب جو نیر ہائی اسکول جو اب فل فیجڈ انٹر میڈیٹ کالج ہے، عباس رضا نیر اس کالج میں، آٹھ سال کی عمر میں، ۲۶ جنوری، ۱۵ اگست اور ۲ اکتوبر کو جو فنکشن ہوتے تھے، ان میں اس طرح سے بے باکی سے تقریریں کرتے تھے کہ لگتا تھا کوئی بہت بڑا خطیب اور مقرر بول رہا ہے۔

دوسری ایک خاص بات میں بتاؤں کہ عباس رضا نیر کو، جلال پور میں رام

لیلا گراؤنڈ میں، ۲۶ جنوری اور ۱۵ اگست کے جو فنکشن ہوا کرتے تھے، جن کی صدارت وہاں کے ایم۔ ایل۔ اے یا ایم۔ پی کیا کرتے تھے، عباس رضا نیر آٹھ برس کی عمر میں وہاں پر بلائے جاتے تھے اور ۱۵ اگست اور ۲۶ جنوری پر یہ تقریریں کرتے تھے، ان کی تقریروں کے سامنے ایم۔ ایل۔ اے اور ایم پی حضرات کی تقریریں پھینکی پڑ جایا کرتی تھیں۔ یہ تھا ان کا آغاز۔ تو آپ اندازہ لگائیے کہ جس شخص کا آغاز ایسا ہو، اس کی بلندیاں کہاں تک پہنچیں گی۔

جناب عزا دار حسین صاحب اسی کالج میں جس کا آج میں منبر ہوں، مرزا غالب انٹر میڈیٹ کالج، اس میں تیس برس تک اردو اور انگریزی پڑھاتے رہے۔ مخصوص طریقے سے وہ اردو پڑھاتے تھے۔ تیس برس سے ان کے اردو پڑھانے کا خدا جانے کون سا جادو ہے کہ ہر برس پچیس تیس غیر مسلم لڑکے ان سے اردو پڑھتے ہیں۔ اور عزا دار حسین صاحب کا یہ کارنامہ ہے کہ ان کے پڑھائے ہوئے بچے، اردو میں ایم۔ اے، نیٹ، جے آر ایف اور پی ایچ ڈی کرتے ہیں۔ جو غیر مسلم بچے ہیں اردو میں ایم۔ اے کر کے وہ بھی آج بہت اچھے اچھے عہدوں پر ہیں۔ ایک مرتبہ میں نے وہاں کے پرنسپل منیر احمد صاحب کو فون کر کے پوچھا کہ اس وقت غیر مسلم اردو پڑھنے والے کتنے ہیں؟ تو انہوں نے کہا کہ پچاس بچے درجہ ۶ سے ۸ تک غیر مسلم ہیں جو اردو پڑھتے ہیں۔ اور یہ سب کچھ جناب عزا دار حسین صاحب جو ڈاکٹر نیر کے والد ہیں، ان کی محنتوں کا نتیجہ ہے۔ انہوں نے اردو ماحول کی ایسی خوشبو وہاں پھیلائی کہ آج یہ امتیاز ہی ختم ہو گیا کہ اردو ہندوؤں کی زبان ہے یا مسلمانوں کی زبان۔

میرے بتانے کا مقصد یہ ہے کہ ہم اردو والے اپنے اسکولوں میں کم از کم ایسا ماحول پیدا کریں کہ غیر مسلم بچوں کا دل جیتیں، انہیں یہ سمجھ سکیں کہ اردو ہندوستان کی زبان ہے، اور اتنی پیاری زبان ہے کہ اسے اگر تم سیکھ لو گے تو مستقبل میں فائدے

میں رہو گے، یہ عزادار حسین صاحب کا کارنامہ ہے، تو جو بیٹا ایسے باپ کا لاڈلا ہوا اس کی ترقیوں کو کیسے روکا جاسکتا ہے۔

جناب عباس رضانیر بچپن میں ہی جن کی شخصیت بڑی ورثائیل بنتی جا رہی تھی۔ آج میں ایک بات اور بتاؤں کہ ایک شخص میں اگر اتنی خوبیاں آپ تلاش کریں تو آپ کو لاکھوں کروڑوں میں جانا پڑے گا۔ ایک شخص شاعر ہے، اور شاعر غزل کا بھی ہے، نظم کا بھی ہے، رباعی کا بھی ہے، مرثیے کا بھی، نوے کا بھی، سلام کا بھی، نعت کا بھی، غرض کوئی صنف ایسی نہیں ہے جس صنف میں اس نے طبع آزمائی نہ کی ہو۔ لوگ عموماً صرف غزلیں کہہ کہہ کے مر جاتے ہیں۔ لیکن شاعری کی کوئی صنف ایسی نہیں ہے جس میں عباس رضانیر نے اپنی اہمیت کو نہ اجاگر کیا ہو۔ الہام جوان کی کتاب آئی، وہ کتاب ایسی ہے کہ میرا خیال ہے آج کے بی۔ اے اور ایم۔ اے کے طلبہ اس شاعری کو اگر پڑھیں تو سہی طرح سے تلفظ نہیں ادا کر سکتے۔ ایسی شاعری ہمارے ادب عالیہ کے نصاب کا حصہ ہونی چاہئے۔

اس کم عمری میں امریکہ، انگلینڈ، فرانس، جرمنی، عراق، ایران، پاکستان، بنگلہ دیش، مسقط، بحرین، سعودی، ماریشس اور دیگر افریقی و خلیجی ممالک میں جس طرح عباس رضانیر نے اپنی اہمیت کو تسلیم کرایا ہے۔ ناظم کی حیثیت سے، ناقد کی حیثیت سے، انہوں نے کسی سے نہیں کہا کہ میں ناقد ہوں، مجھے ناقد مانو، لیکن ان کی تحریروں نے یہ بتا دیا کہ اگر اہل علم انہیں ناقد نہیں مانیں گے تو نا انصافی ہوگی، یہ عباس رضانیر کی خوبی ہے، وہ نیشنل ہونے سے پہلے ہی انٹرنیشنل ہو گئے تھے۔

میں چاہتا ہوں کہ عباس رضانیر اسی طرح ترقی کرتے رہیں۔ ان کے نام اور کام سے میرا جلال پور بھی روشن ہو، لکھنؤ بھی روشن ہو، اردو زبان بھی روشن ہو اور یہ سب کچھ عباس رضانیر کی ترقیوں سے وابستہ ہے۔

☆☆☆

اعزاز مسلسل

سہیل کا کوروی

زمین کا ایک حصہ وہ بھی ہی جہاں وجود آفتاب اپنا انداز ہی بدل دیتا ہے۔ یعنی وہاں چھ مہینے دن اور چھ مہینے رات رہتی ہے۔ یہی کچھ حال عباس رضانیر سے میرے تعلقات کی سرزمین کا ہے۔ وہ ملتے ہیں تو وہی اپنائیت کا اندازہ جس میں یہ سحر انگیزی ہے کہ ماضی کو یکساں فراموش کرا دیتا ہے۔ پہلے تو ان سے اس وقت ملاقات ہوئی جب وہ نوجوانی کی دہلیز پر قدم رکھ رہے تھے اور مدر سے کی تعلیم کا اثر صاف ظاہر تھا لیکن جب انہوں نے بولنا شروع کیا تو الفاظ کی روانی اور معانی آفرینی نے مجھے محو حیرت کر دیا۔ یہی وہ لمحہ تھا۔ جب مجھے اندازہ ہو گیا کہ ان کے پاس گنجینہ معانی کا طلسم ہے اور آج وہ جس مقام پر ہیں اس کی بشارت تبھی مل گئی تھی لیکن پھر دور آفتاب شروع ہوتے ہی ختم ہو گیا۔ برسوں ملاقات نہیں ہوئی، انہیں میں یاد نہیں رہا کوئی تعجب کی بات نہیں تھی اور میں انہیں یاد کرتا رہا یہ بھی کوئی تعجب کی بات نہیں ہے۔ ایک بار پھر بطرز نو وہ اپنے گولا گنج والے مکان پر ملے، کالج سے وہ یونیورسٹی کے لیکچرر ہو گئے۔ اس بچ وہ کہاں رہے یہ میں نے پوچھا نہ انہوں نے بتایا۔ بہت خلوص سے ملے تو واضح کی لیکن پھر جو سلسلہ منقطع ہوا تو وہ جڑا اس وقت جب کہ وہ ہر دوئی روڈ پر شاندار مکان بنوا چکے تھے۔ اس کے ایک ایک کمرے میں مجھے لے گئے اور اس مکان میں علم کی راہ سے مستقبل میں کیا ہوگا مجھے تفصیل سے بتایا۔ اس مکان کے درو دیوار علم و ادب کی تابانی سے جگمگا رہے تھے۔ ڈاکٹر عباس

رضانیر کی گفتگو مجھ تشنہ کام علم کو سیراب کر رہی تھی وہ بہترین شاعر بھی ہیں۔ ان کو جو اعزازات مل رہے ہیں وہ ہر صورت سے مناسب ہیں لیکن جو کچھ قلم سے صفحہ قرطاس پر منتقل ہو چکا ہے اہل دل جب اسے پڑھتے ہیں تو ستائش کا جو جذبہ پیدا ہوتا ہے وہ اعزاز مسلسل ہے اور ان کو روز حاصل ہوتا رہتا ہے۔ عزت مآب گورنر اتر پردیش محترم رام نائیک نے کاشی و رامپٹھ، وارانسی کی ایک شاندار تقریب میں ڈاکٹر عباس رضانیر کو بھاشا سمان سے نوازا ہے۔ یہ اعزاز ڈاکٹر عباس رضانیر کا انداز ہی نہیں بلکہ پوری اردو دنیا کا اعزاز ہے جس کے لیے میں ان کی خدمت میں مبارک باد پیش کرتا ہوں، ابھی انہیں بہت سارے اعزاز حاصل ہونے ہیں۔ اللہ تعالیٰ سے میری دعا ہے کہ وہ زندہ و سلامت رہیں اور اسی طرح اردو زبان و ادب کی خدمت کرتے رہیں۔

☆☆☆

بالائے سرش ز ہوش مندی می تافت ستارہ بلندی

مولانا اسد اللہ قاسمی

امام الائمہ، خلیفہ راشد، امیر المؤمنین حضرت علی ابن ابی طالبؓ کی مدح سرائی کا ”الہام“ جو عزیزم مولانا ڈاکٹر عباس رضانیر پر ہوا وہ اپنی مثال آپ ہے ایسی جامع الکملات شخصیت صدیوں کے بعد پیدا ہوتی ہے۔:

ہزاروں سال نرگس اپنی بے نوری پہ روئی ہے

تو بن کر ایسے نیر اور منور دیدہ ور آئے

”الشعراء تلامیذۃ الرحمن“ مشہور مقولہ ہے۔ یعنی مخصوص شعراء رحمٰن کے شاگرد

ہیں جن کے دل و دماغ پر رحمٰن کی طرف سے حقائق و معارف کا الہام ہوتا ہے۔

شعراء حضرات کو بخوبی تجربہ ہے کہ جب وہ کلام لکھنے کے لیے آمادہ ہوتے ہیں

تو دل و دماغ چرخ اطلس کی طرح بالکل صاف ہوتا ہے۔ مگر جب قلم لے کر لکھنا شروع

کرتے ہیں تو مضامین کی آمد الہامی انداز سے ہوتی رہتی ہے۔ جس پر شعراء حضرات کو

خود حیرت ہوتی ہے کہ یہ حقائق و پُر معانی تخیلات صفحہ قرطاس پر کیسے آ گئے۔:

این سعادت بروز بازو نیست

تانہ بخشد خدائے بخشندہ

عزیز من محترم مولانا ڈاکٹر عباس رضا نیر جلال پوری میرے محلہ جعفر آباد قصبہ جلال پور کے باشندہ ہیں نیر سلمہ نجیب الطرفین ہیں ان کے والد محترم جناب ماسٹر عزادار حسین ایک علم دوست اور مشہور و کامیاب معلم مرزا غالب اسکول جلال پور میں ریٹائرڈ ہونے تک علمی، اصلاحی، سماجی کارہائے نمایاں انجام دے کر قرب و جوار میں نام پیدا کر چکے ہیں۔ نیر سلمہ کی والدہ محترمہ بھی تعلیم یافتہ اور اسلامی تہذیب سے آراستہ خاتون ہیں۔ اور نانا مرحوم مولانا حکیم انصار حسین کیف کا پوچھنا ہی کیا۔ وہ ایک نہایت ممتاز عالم و فاضل حکیم حاذق اور بے نظیر شاعر تھے۔ دادار فیتھ حسین کر بلائی بھی بہترین مرثیہ خواں تھے۔

ان محترم اور باکمال شخصیات کی نگرانی میں عباس رضا نیر کی تعلیم و تربیت ہوتی رہی۔

عباس رضا نیر نے محلہ کے عام بچوں کی طرح کھیل کود، لہو و لعب میں اپنے قیمتی اوقات ضائع نہیں کئے، وہ لڑائی جھگڑا گالم گلوچ، بیہودہ اقوال و افعال سے بچپن ہی سے کنارہ کش رہے۔ بعینہ علم و ہنر اور ظفر مندی کے کاموں سے عشق تھا۔ عباس رضا نیر اور ان کی ہمیشہ محترمہ خورشید نگار دونوں کو میں نے بچپن میں عربی کی نحو اور صرف کی کتابیں پڑھائی ہیں دونوں کے حافظے اور ذہانت پر مجھے خود اکثر رشک ہوتا تھا۔ میں جب متنبی کا منظوم ترجمہ ”مجتبیٰ“ کرتا تھا تو اکثر میرے سامع اول یہی خواہر و برادر ہوتے تھے۔ میری اس کتاب پر عزیزم ڈاکٹر عباس رضا نیر نے جو مضمون قلمبند کیا ہے اسے پڑھ کر اردو ہی نہیں عربی کے اساتذہ بھی محو حیرت ہو جاتے ہیں۔

عزیز من نے بچپن ہی سے اپنی خداداد ذہانت و سعادت مندی سے نگاہ کی بلندی، سخن کی دل نوازی اور حیات کی پرسوزی کے ساتھ علوم و معارف میں ترقیات کے لیے سفر شروع کیا یہاں تک کہ ان کی خطابت، فصاحت و بلاغت، نثر نگاری، انشا پردازی

اور شاعری میں چار چاند لگے تو آج وہ ڈاکٹر عباس رضا نیر تاباں بن کر عالم میں علمی، تہذیبی، ایمانی روشنی اپنی خطابت و صحافت، انشاء پردازی اور بے نظیر شاعری کے ذریعہ پھیلا رہے ہیں۔

اللہ کرے زور بیان، زور قلم اور زیادہ۔ خداوند سے دعا ہے کہ اس نیر اعظم کی تابانی کو حاسدوں کے شر سے محفوظ رکھ کر مدہم نہ ہونے دے اور ان کے علمی، دینی، سماجی، ادبی، اصلاحی اور نورانی فیضان سے عام انسانیت کو منور اور سرفراز فرمائے۔ آمین یا رب العالمین۔



اعلیٰ قدروں کے پاسدار ڈاکٹر عباس رضانیر

ڈاکٹر محمد ہارون رشید

ڈاکٹر عباس رضانیر جلال پوری کا نام نہ صرف ارض ہند بلکہ امریکہ و لندن، ایران و عراق اور بنگلہ دیش و پاکستان کی علمی دنیا میں بھی احترام اور محبت سے لیا جاتا ہے۔ انہوں نے اپنی عالمانہ نظامت، متوازن خطابت، ایماندارانہ تحقیق، ناقدانہ بصیرت، تدریسی صداقت اور شعری مہارت کی بنا پر کم عمری ہی میں مقبولیت کی وہ منزلیں سرکیں جو کم لوگوں کے حصہ میں آتی ہیں۔ انور جلال پوری کے مطابق ڈاکٹر عباس رضانیر کے نانیہال اور دادیہال دونوں ہی علمی گھرانے ہیں۔ نیر کو انہیں میں سے کہیں سورج کی چمک ملی اور کہیں سے چاند کی دمک۔ نیر جن شرافتوں اور اعلیٰ قدروں کے پاسدار ہیں وہ انہیں اپنے علمی خاندان ہی سے ورثہ میں ملی۔ یہی اردو کا کلچر اور تہذیب ہے اور یہی اسلامی تہذیب بھی ہے۔ ان کے دادا کو بہت سے اشعار یاد تھے اور اکثر لوگوں کو سنایا کرتے تھے اور ان کے نانا بھی ایک اچھے شاعر تھے۔ فن عروض پر ان کی گرفت مضبوط تھی۔ لوگ فنی معاملات اور باریکیوں کے بارے میں ان سے رجوع کرتے تھے۔ ڈاکٹر عباس رضانیر کی علمیت قابلیت اور صلاحیت کا اعتراف بڑے بڑے صاحب علم و نظر کرتے ہیں اس کے باوجود یہ ڈاکٹر نیر کی انکساری ہے کہ وہ آج بھی اپنے چھوٹوں سے

شفقت و محبت اور بڑوں سے احترام و عقیدت سے اس طرح پیش آتے ہیں کہ ان کی اخلاقی بلندی کا بھی قائل ہوئے بنا نہیں رہا جاسکتا۔ وہ بڑے ہوں کہ چھوٹے، خواہ ان کے آبائی وطن جلال پور سے تعلق رکھتے ہوں یا ان کی مادر علمی سے سب انہیں عزت اور محبت کی نظر سے دیکھتے ہیں۔ نیر جلال پوری کی شہرت یوں تو علم کی کئی شاخوں اور شعبوں میں ہے لیکن بحیثیت شاعران کا تخلیق کردہ ”الہام“ (مسدس در مدح جناب امیر حضرت علی ابن ابی طالب) ایک لازوال کارنامہ ہے۔ جو علمی و شعری دنیا میں ہمیشہ نہ صرف یاد کیا جائے گا بلکہ وہ لوگ فخریہ بیان کریں گے جن کا نیر سے ذرا بھی تعلق کسی بھی طرح نکلتا ہوگا۔ حضرت علیؑ کی علمی فضیلتوں کا اس سے بڑھ کر ثبوت اور کیا ہوگا کہ خود پیغمبر اسلام نے انہیں باب مدینۃ العلم کہا ہے۔ جو داماد رسول بھی ہیں اور خلیفہ رسول بھی۔ نہج البلاغہ حضرت علیؑ کے خطبوں کا مجموعہ ہے جس میں دو خطبے ایسے بھی ہیں کہ ایک خطبہ میں عربی کا بنیادی حرف ”الف“ کا استعمال کہیں نہیں ہوا ہے اور دوسرا خطبہ غیر منقوط ہے۔ انہیں خطبوں کو ڈاکٹر عباس رضانیر نے مسدس کی شکل میں کہیں بغیر الف کہیں تحت النقطہ، کہیں فوق النقطہ اور کہیں غیر منقوط صنعتوں میں پورے فنی جمال، جلال اور کمال کے ساتھ اس طرح پرویا ہے کہ مسدس کا فن کہیں مجروح نہیں ہونے پاتا۔ ان میں سے ہر صنعت کے بند نقل نہ کر کے اپنی بات کی دلیل میں صرف ایک بند ہی نقل کرنے پر اکتفا کرتا ہوں:-

چھلکی مئے جمیل اٹھی کہہ کے یا علیؑ
اس کے کرم کی جھیل اٹھی کہہ کے یا علیؑ
کعبے سے سلسبیل اٹھی کہہ کے یا علیؑ
پھر طبع جبریل اٹھی کہہ کے یا علیؑ

ایسا دیا جلا کہ حرم جگمگا اٹھا
ہر سو بگل بجے جو علم جگمگا اٹھا

مذکورہ بند میں جتنے حروف استعمال ہوئے ہیں وہ سب صنعت تحت النقاط میں ہیں۔ نیر جلال پوری نے اپنے اس مسدس میں نہ صرف اپنی عقیدتوں کا اظہار کیا ہے بلکہ مسدس کے فن کو ان منزلوں سے آگے لے جانے کی کامیاب کوشش کی ہے کہ جہاں میر انیس و مرزا دبیر نے چھوڑا تھا۔ ڈاکٹر نیر کے اس الہامی کارنامے پر تفصیلی بات انشاء اللہ پھر کبھی ضرور ہوگی۔ یہ مجھ پر قرض ہے ایک دوست کا اور ایک بھائی کا۔ میں ڈاکٹر عباس رضا نیر کو اردو زبان و ادب کی بے مثل خدمات کے لیے کاشی و دیا پیٹھ میں ہندوستان سماچار کی جانب سے بدست عالی جناب رام نائیک، گورنر اتر پردیش، بھاشاستان سے نوازے جانے پر صمیم قلب سے مبارکباد پیش کرتا ہوں اور امید کرتا ہوں کہ ڈاکٹر عباس رضا نیر یوں ہی علم و ادب کی خدمت میں منہمک رہیں گے اور اپنے خاندان اور مادر علمی کا نام روشن کرتے رہیں گے۔

☆☆☆

ڈاکٹر نیر گونا گوں صفات و کمالات کے حامل عباس رضا نیر

محمد وصی اللہ حسینی

لکھنؤ یونیورسٹی کے شعبہ اردو کے صدر ڈاکٹر عباس رضا نیر جلال پوری گونا گوں صفات و کمالات کے حامل ہیں۔ وہ ایک لائق و فائق اور مشفق استاد کے علاوہ ایک اچھے مقرر، صاحب فکر و نظر قلم کار اور جلسوں و مشاعروں کے ایک کامیاب ناظم ہیں۔ نئی نسل کے ناظموں میں انہیں ممتاز مقام حاصل ہے۔ جلسے یا مشاعرے کو کس طرح کامیابی سے ہمکنار کیا جاتا ہے اس راز سے وہ بخوبی واقف ہیں۔ راقم کو اس کا ذاتی تجربہ ہے۔

ڈاکٹر نیر اردو زبان و ادب کے فروغ کے لیے بہت کوشاں رہتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ جب سے شعبہ اردو کی ذمہ داری ان کے ہاتھوں میں آئی ہے۔ تب سے وہاں علمی و ادبی سرگرمیاں کافی بڑھ گئی ہیں۔ آئے دن شعبہ اردو کے سیمینار اور ادبی جلسے وغیرہ ہوتے رہتے ہیں۔ جس میں طلباء بھی بڑھ چڑھ کر حصہ لیتے ہیں۔ یہ پروگرام طلباء کے لیے بھی بہت مفید ہوتے ہیں۔ کیونکہ ان سے ان کی صلاحیتوں کو جلا ملتی ہے۔ ان کے علمی و ادبی مضامین بھی ملک کے موقر رسائل و جرائد میں شائع ہوتے رہتے ہیں جنہیں قدر کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے۔ راقم کا ذاتی خیال ہے کہ اگر ڈاکٹر نیر دوسری مصروفیات تھوڑی کم کر کے تحریری کام پر توجہ دے دیں تو بڑے مفید کام ہو سکتے ہیں جو آئندہ نسلوں کے لیے

بھی کارآمد ثابت ہوں گے۔ کیونکہ ڈاکٹر نیر فکر و نظر کے حامل ہیں اور ادب کا بہت اچھا ذوق رکھتے ہیں۔

بہت کم لوگوں کو یہ بات معلوم ہے کہ ڈاکٹر نیر مذکورہ خصوصیات کے علاوہ ایک اچھے ذاکر بھی ہیں۔ مجالس کو خطاب کرنے کے لیے ان کو دور دراز سے مدعو کیا جاتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ایام عزائم میں وہ اکثر بیرونی اسفار پر ہوتے ہیں اور مقامی لوگوں کی گرفت میں نہیں آتے۔

ان کی انہیں صلاحیتوں اور خوبیوں کی وجہ سے حال ہی میں ”ہندوستان سماچار“ کی جانب سے انہیں ”بھاشا سمان“ سے نوازا گیا ہے۔ انہیں یہ اعزاز کاشی و دیا پیٹھ بنارس میں منعقدہ ایک تقریب کے دوران ریاست کے گورنر عزت مآب رام نائیک کے ہاتھوں دیا گیا۔ اس سے ڈاکٹر نیر کی علمی اور ادبی صلاحیتوں کا بخوبی اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔ ان کا علمی، ادبی اور تدریسی سفر ہنوز جاری ہے۔ انشاء اللہ آئندہ وہ مزید مفید خدمات انجام دیں گے۔ ”نیا دور“ لکھنؤ کے ایڈیٹر اور رارڈو ناولٹ کی تاریخ، تحقیق اور تنقید میں سنگ میل قائم کرنے والے ڈاکٹر وضاحت حسین رضوی نے ان کے بارے میں بجا طور پر کہا کہ ”اردو زبان و ادب کو ڈاکٹر نیر سے بہت توقعات ہیں جس طرح ڈاکٹر نیر نے اب تک خدمات انجام دی ہیں اس سے امید کی جاتی ہے کہ کامیابی کی مزید منزلیں طے کرنا باقی ہے۔“

ڈاکٹر عباس رضانیہ کو اس باوقار ایوارڈ ملنے پر راقم کی جانب سے بھی بہت بہت مبارکباد اور نیک خواہشات۔

☆☆☆

اکیسویں صدی کے روشن چراغ: ڈاکٹر عباس رضانیہ

نوشاد مومن

۱۹۸۰ء کے بعد درس و تدریس کے باوقار پیشے سے وابستہ اردو کی نئی نسل کے جو معدودے چند لیکچرر آسمان شعر و ادب پر مانند نیر ضوفشاں ہوئے ہیں، ان میں ڈاکٹر عباس رضانیہ بھی ایک ہیں۔ ڈاکٹر موصوف کا تعلق اتر پردیش کے اس مردم خیز خطہ سے بھی رہا ہے جسے فن کشیدہ کاری میں امتیازی حیثیت حاصل ہے۔ یہ کشیدہ کاری جب برتنوں میں کی جاتی ہے تو مراد آباد کے فن کاروں کی فنی بلند یوں کی گواہ بن جاتی ہے اور یہ فن کاری اردو شعر و ادب میں الفاظ کی نشست و برخاست کے توسط سے دہرائی جاتی ہے تو وہ ڈاکٹر عباس رضانیہ کی پہچان بن جاتی ہے۔ اقدار و روایات، عزم و حوصلے اور عصری مسائل و مصائب کے دائرے میں ظہور پذیر اردو شاعری کا یہ صورت گر جب نثری ادب میں اپنے قلم کی جولانیاں دکھاتا ہے تو اپنی ذہانت کو بروئے کار لا کر اپنی نگارش میں خوبصورت الفاظ کو کچھ اس طرح پروتا جاتا ہے کہ اہل زبان بھی رشک کرنے لگتے ہیں۔ کہتے ہیں کہ سماج اور معاشرہ ہر کس و ناکس کو متاثر کرتا ہے لیکن ایک تخلیق کار سماج اور معاشرے کے ساتھ ساتھ اپنے باطن میں اٹھنے والے مدوجزر سے اثر انداز ہوتا ہے اور اس طرح کے باطن میں اٹھنے والی تیز اور مدہم لہریں اس کی تخلیق کی صورت گری میں اہم

کردار ادا کرتی ہیں۔ سماج اور معاشرے کے اس رویے کو عباس رضانی کی کھلی آنکھوں نے جس طور دیکھا اور ان کے دل نے جس طرح محسوس کیا، اسے اپنی فکر کی بھٹی میں تپا کر نہایت چابک دستی اور بڑی ہنرمندی سے غزلیہ فارم میں نظم کر دیا۔ یہی وجہ ہے کہ انہوں نے سستی شہرت حاصل کرنے کے لیے سطحی رومانی شاعری کا سہارا نہیں لیا بلکہ مقصدی شاعری کو اپنی پہچان کا حصہ بنایا۔ ان کے شعری رویے میں اقدار کی حفاظت، اسلاف سے عقیدت اور غم دوراں سے محبت کا اظہار بڑی شد و مد سے ہوتا ہے۔ عباس رضانی خصوصی طور پر اپنے ذاتی تجربات کو شعری پیراہن عطا کرنے کی کوشش کی ہے، اسی لیے ان کی شاعری عصری حالات کی شاعری ہے جس میں اگر ایک طرف حیات و کائنات کے مسائل، سماجی انتشار اور پارہ پارہ ہوتے انسانی وجود کا ماتم ہے، تو دوسری طرف ان نامساعد حالات سے نبرد آزما ہونے کا عزم بھی۔ اپنی شاعری کی اسی سچائی کی بنیاد پر موصوف ایک ایسے عباس ثابت ہوئے ہیں، جسے خلق خدا کی نہ صرف رضا حاصل ہے بلکہ افق ادب کے وہ نیز بھی تصور کئے جاتے ہیں۔

☆☆☆

ڈاکٹر عباس رضانی کو ”بھاشا سماں“ سے نوازے جانے پر شہر نگاراں کے ادبی حلقوں میں خوشی کی لہر

رضوان احمد فاروقی

”بھاشا سماں“ سے نوازے جانے پر ڈاکٹر عباس رضانی کو چہار سمت سے مبارکباد کے پھول پیش کئے جانے کا سلسلہ جاری ہے۔ ۱۵ ستمبر ۲۰۱۶ء کو انہیں ایوارڈ ایک اہم تقریب میں، مختلف زبانوں کے اہم افراد کی موجودگی میں گورنر اتر پردیش عزت مآب رام نائیک کے بدست ملا۔ ۱۶ ستمبر کے بیشتر روزناموں نے اس خبر کو نمایاں کیا تو ادبی حلقوں میں خصوصاً شہر نگاراں میں خوشی کی لہر دوڑ گئی۔

واضح رہے کہ اس سے قبل اس اہم ایوارڈ سے ”نیادور“ کے موجودہ ایڈیٹر تصنیف و تالیف کے کام میں خاموشی مگر سنجیدگی سے منہمک ڈاکٹر وضاحت حسین رضوی کو سرفراز کیا جا چکا ہے۔ دونوں ہی اعلیٰ منصب پر فائز ہیں، عوام و خواص کے رابطے میں ہیں۔ زبان و ادب کے فروغ کا جذبہ دونوں میں بدرجہ اتم موجود ہے۔ اخلاقی قدروں کی پاسداری نے دونوں کو مرکز نگاہ بنادیا ہے۔ نتیجہ یہ کہ سبھی ان کی طرف متوجہ ہیں، خواہ وہ اردو والے ہوں یا ہندی والے، نوجوان نسل کو ان شخصیات کو آئیڈیل بنا کر ترقی کے زینے

سر کرنے چاہئے اور پسینہ خشک کئے بغیر دیوانہ وار منزل کی سمت بڑھنے کے عمل کو جاری رکھنا چاہئے۔ کیونکہ بقول شاعر۔

زینے پہ ترقی کے وہی لوگ چڑھے ہیں
جو خشک کبھی اپنا پسینہ نہیں کرتے

ڈاکٹر عباس رضا نیر ایسے تمام لوگوں کا منہ بند کرنے کے لیے کافی ہیں جو مدارس کے نظام تعلیم کو ناقص یا ازکار رفتہ سمجھتے ہیں۔ یہاں سے فارغ ہونے والے طلباء کو کند ذہن، سست اور کاہل بتاتے ہیں۔ عباس رضا نیر ایک مدرسہ کے ہی پروڈکٹ ہیں۔ اسی لیے ان کی زبان میں جو سلاست، روانی، تدبر اور حکمت کے موتی ہیں وہ عصری علوم سے بہرہ ور پروفیسر صاحبان اور دانشوران کے یہاں تقریباً ناپید ہیں۔ بات ذاکری کی ہو، خطابت و نظامت کی یا نثری و شعری ادب تخلیق کرنے کی، الفاظ عباس رضا نیر کے حضور صف بہ صف کھڑے نظر آتے ہیں۔ اور وہ ان سے حسب ضرورت کام لیتے ہیں۔

ڈاکٹر عباس رضا نیر کو نہ مذہبی تقاریب میں شرکت سے گریز ہے نہ ادبی پروگراموں کا حصہ بننے میں، وہ ہر خانے میں فٹ ہیں۔ بڑی خوش اسلوبی اور ہنرمندی سے اپنی ضرورت کا احساس دلانے میں کامیاب ہیں، خوش اخلاق و خوش گفتار ہیں۔ ملک و بیرون ملک ان کی صلاحیتوں کا سکھ چل رہا ہے، انہیں ہر جگہ تسلیم کیا جا رہا ہے تو رشک و رقابت کے جذبات کا ابھرنافطری ہے لیکن ”اودھ نامہ“ ان کی کامیابیوں کی راہ میں پہلے بھی پھول بچھا چکا ہے اور مسرت کی اس گھڑی میں بھی وہ ان کے خوشگوار مستقبل کے لیے دعا گو ہے اور امید کرتا ہے کہ وہ اپنا علمی، ادبی اور تدریسی سفر یوں ہی جاری رکھیں گے۔ بزم صفی کے صدر ڈاکٹر حضور نواب نے کہا نیر جلاپوری پر ان کے نام اور تخلص کے مکمل اثرات ہیں۔ وہ اسم بامسمیٰ ہیں، ان کی ترقیوں سے دل خوش ہوتا ہے اور ہاتھ دعا کے لیے از خود اٹھ جاتے ہیں کیونکہ اس جواں سال ادیب و خطیب میں جو خوبیاں اور

صفات ہیں وہ ناقابل فراموش ہیں۔ بزرگوں کا ادب، چھوٹوں سے مشفقانہ برتاؤ، اخلاق و ایثار کا جذبہ، علم سے رغبت، شاعرانہ کمالات، خطابت میں مہارت، تصادم سے گریز مذہب کا بھرپور علم۔

اتنا کچھ کسی ایک شخصیت میں یکجا ہو جائے تو اسے ہر سطح پر ہر جگہ نوازا جانا چاہئے۔

ہندوستان سماچار کے ذمہ داران کا یہ عمل گنگا جمنی تہذیب اور اخوت و محبت کے جذبات کو فروغ دے گا۔ دوریاں ختم ہوں گی اور فرقہ پرستوں کے حوصلے پست ہوں گے۔

بزم شمس کے جنرل سکریٹری ڈاکٹر معراج ساحل کے مطابق عباس رضا نیر شعرا دے حوالے سے متاثر کن شخصیت ہیں۔ ناظمین مشاعرہ کی بھیڑ میں اپنی شناخت قائم کرنے میں کامیاب ہیں۔ جو معمولی بات نہیں ہے۔ بزم احساس ادب کے جنرل سکریٹری مرزا شارق لہرپوری ڈاکٹر عباس رضا نیر کو ہندوستان سماچار کی جانب سے بھاشا سامان ملنے پر مسرور ہیں۔ ان کا کہنا ہے کہ وہ ایک تعلیم یافتہ، مؤدب اور باشعور شاعر ہیں۔ نظامت کے حوالے سے بھی وہ اپنے معاصرین میں نمایاں ہیں۔ پھر کیوں نہ شعرائے بزم احساس ادب کی جانب سے انہیں تہنیت کے گلاب پیش کئے جائیں۔

آل انڈیا بزم جوہر کے روح رواں محمد وصی صدیقی نے کہا ایسے جواں سال، متحرک اور باعمل ادیبوں کی حوصلہ افزائی سے اردو فروغ پائے گی۔ کام کرنے والوں کو حوصلہ ملے گا۔ نوجوان اردو سیکھنے، سمجھنے اور زندگی میں برتنے پر متوجہ ہوں گے۔ تو حکومتیں اردو کو اس کا حق دینے پر مجبور ہوں گی۔

بزم نور کے صدر حاجی امتیاز علی راز بھارتی نے کہا کہ اردو کا پرچم جوانوں کے ہاتھوں میں نہ دیا گیا تو وہ زیادہ دنوں تک محفوظ نہ رہ سکے گی۔ جب عباس رضا نیر جیسے

جوانوں کی پذیرائی ہوتی ہے تو دل خوش ہوتا ہے اور امید کی کرن نظر آتی ہے کہ نئی نسل ابھی اردو میں دلچسپی رکھتی ہے۔ امید ہے فرد سے افراد اور افراد سے معاشرہ بنے گا۔

حیدر علوی رقم طراز ہیں۔ اگر آپ کو ایک استاد ایک شاعر، ایک ناظم، ایک نثر، ایک ناقد سے ملنا ہے اس شخصیت کا دیدار کرنا ہے تو آئیے لکھنؤ یونیورسٹی کے اردو ڈیپارٹمنٹ میں طلباء کو پڑھاتے ہوئے یا کتابوں کے درمیان خوش و خرم نظر آنے والے شخص سے ملیں۔ جس کا نام ڈاکٹر عباس رضانیر ہے۔ نظامت میں الفاظ کے نگینے لٹانے والا شخص، شاعری میں مشکل ترین ردیفوں میں اشعار کہنے والا یقیناً معمولی نہیں ہو سکتا کہ جس کا اوڑھنا بچھونا ہی اردو ہو، لفظ باتیں کریں اور باتوں سے خوشبو آئے۔ ان کو بھاشا سامان سے نوازا جائے یا کسی اور ایوارڈ سے مگرا بھی نہ جانے کتنے انعامات اور عہدے ان کی راہ دیکھ رہے ہیں۔

تو شاہیں ہے بسیرا کر پہاڑوں کی چٹانوں پر

ایک طرف انعامات ہیں دوسری طرف اس شخص کا اوڑھنا بچھونا اردو ہے۔

ایک جذبہ ہے اردو کی خدمت کا، اردو جس کی رگ و پے میں دوڑ رہی ہے اور یوں بھی اردو ایک زبان نہیں ایک تہذیب کا نام ہے۔ جینے کا طریقہ اور سلیقہ سکھاتی ہے۔ امید ہے نیر صاحب کا قلم تھکے گا نہیں، ر کے گانہیں اور یہ مصرعہ ان کے پیش نظر رہے گا۔

ابھی عشق کے امتحاں اور بھی ہے

☆☆☆

ڈاکٹر عباس رضانیر: ایک ہمہ جہت شخصیت

مرزا محمد مہدی

عباس رضانیر جلالپوری ایک ایسی شخصیت ہیں کہ جنہوں نے بہت کم وقت میں ترقی کے اتنے منازل طے کیے ہیں جنہیں دیکھ کر لوگوں کو رشک ہوتا ہے۔ لیکن ان کی کامیابیوں کے پیچھے ان کی بے پناہ محنت بھی ہے۔ عباس رضانیر ان چند شہسواران علم و ادب میں ہیں جنہوں نے کم عمری میں ترقی کر کے علوم کی اعلیٰ ڈگریاں حاصل کی ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ بے حد ذہین اور دراک ہیں۔ وہ شاعر ہونے کے ساتھ ہی ایک خوش گفتار خطیب و ناظم مشاعرہ و محافل کی حیثیت سے نہایت مقبول ہیں لیکن تمام کامیابیوں کے باوجود بھی وہ انکسار و ابتسام کی مجسم تصویر ہیں۔ غرور و تمکنت تو شاید وہ جانتے ہی نہیں۔ ہر ایک سے وہ نہایت شائستگی و انکساری سے ملتے ہیں۔ وہ اپنے دوستوں کے باوفا دوست ہیں اور انہیں اپنے رقیبوں سے بھی کوئی شکایت نہیں ہے۔ وہ اپنے شاگردوں سے بھی دوستوں کی طرح ملتے ہیں اور ان کی ہر طرح مدد کرتے ہیں۔ ان کی نگرانی میں کئی ریسرچ اسکالر پی ایچ ڈی کی ڈگری حاصل کر چکے ہیں۔ متعدد طلباء و طالبات ان کی رہنمائی میں تحقیق کے میدان سر کر رہے ہیں۔ انہوں نے اپنا نیا مکان بنوایا تو اس کے ایک حصہ میں لائبریری بھی قائم کر دی تاکہ تشنگان علم و ادب اس سے فیضیاب ہو سکیں۔ وہ مسلسل ادبی سیمیناروں میں شریک ہوتے رہتے ہیں اور تقریباً ۲۰ ممالک کا سفر کر چکے ہیں۔ وہ ذاکر حسین بھی ہیں اور مجلسوں کو خطاب کرنے کئی

ممالک جاچکے ہیں۔ ادبی محفلوں اور مشاعروں کی نظامت کے لیے ان کو خاص شہرت حاصل ہے لیکن حیرت کی بات یہ ہے کہ اتنی مصروفیات کے باوجود بھی وہ کتابوں کی تصنیف و تالیف کرتے رہتے ہیں۔ ان کی کئی کتابیں بھی منظر عام پر آچکی ہیں۔ ان کی خطابت و نظامت ایسی ہے کہ جیسے کوئی ماہر شناور بحر معانی و الفاظ میں اپنے فن کے جوہر دکھارہا ہو اور اب تو ان کی نظامت کے دلدادہ یوپی کے گورنر اور وزیر اعلیٰ بھی ہیں۔ گذشتہ دنوں جب گورنر رام ناتھ کی کتاب کے اردو ترجمہ کا اجرا گورنر ہاؤس میں کیا گیا تھا تو نیر صاحب کو خصوصی طور پر نظامت کرنے کے لیے مدعو کیا گیا تھا۔ وہاں ان کی نظامت سے وزیر اعلیٰ بھی بے حد متاثر ہوئے تھے اور شاید یہی وجہ ہے کہ لکھنؤ میں میٹرو کے افتتاح کے موقع پر وزیر اعلیٰ نے نظامت کے لیے انہیں کا انتخاب کیا۔ دراصل عام طور پر یہ ہوتا ہے کہ اگر کوئی قلم کا جادوگر ہے تو وہ اچھی خطابت نہیں کر پاتا ہے آج بھی ایسے لوگ موجود ہیں جو بہترین ادیب و شاعر تو ہیں لیکن اگر ان سے تقریر کرنے کو کہا جائے تو چند الفاظ سے زیادہ نہیں بول سکتے۔ اسی طرح ایسے بہترین خطیب بھی ہیں جن کی خطابت کے ڈنکے بجتے ہیں لیکن اگر ان کو قلم دے دیا جائے تو چند سطروں سے زیادہ نہیں لکھ سکتے اس بات سے کوئی بھی انکار نہیں کر سکتا۔ ضروری نہیں کہ کوئی اچھا ادیب ہو یا اچھا خطیب ہو اور اچھا شاعر بھی ہو کیونکہ ادب کی یہ اصناف ایک دوسرے سے مختلف ہیں۔ لیکن عباس رضا نیر میں یہ تینوں صفات بدرجہ اتم موجود ہیں۔ ادیب ایسے کہ دودرجن سے زیادہ بہترین کتابوں کی تصنیف و تالیف کی۔ خطیب اور ناظم مشاعرہ و محافل ایسے کہ سامعین پر اس طرح جادو کرتے ہیں کہ لوگ ان کی جادو بیانی سے مسحور ہو جاتے ہیں اور شوکت الفاظ کا ایک دریا ان کے لبوں سے اس طرح جاری ہوتا ہے کہ لوگ محو حیرت رہ جاتے ہیں۔ شاعر ایسے کہ الہام جیسا معرکتہ آرا مسدس لکھ دیا۔ انہوں نے جس غیر منقوٹ بند سے الہام کا آغاز کیا ہے اس کی بیت ہے کہ:

ہر گام سہل ہر دم راہ رسول کر
کوہ مہم کو کاٹ رکاوٹ کو دھول کر

اور شاید یہ ان کی دعا ہی کا اثر ہے کہ ان کی مہمات میں آنے والی تمام رکاوٹیں دھول بن کر اڑ جا رہی ہیں۔ ”الہام“ ڈاکٹر عباس رضا نیر کا وہ شاہکار مسدس ہے جس میں انہوں نے حضرت امیر المومنین علی بن ابی طالب کے نہج البلاغہ میں موجود ایسے نادر و نایاب خطبوں کا ترجمہ کیا ہے جو کہ صنعت غیر منقوٹ اور صنعت حذف حرف الف سے مزین ہیں۔ یعنی ان خطبات میں سے ایک خطبہ ایسے حروف سے مبرا ہے جن میں نقطے ہوں اور دوسرا خطبہ عربی زبان کے کثیر الاستعمال اور نہایت اہم حرف تنجی ”الف“ سے بے نیاز ہے۔ اردو ادب میں یہ پہلا موقع ہے جب کسی شاعر نے ان خطبات کا منظوم ترجمہ کرنے کی ہمت کی ہے اور وہ بھی ان خطبات کی مشکل ترین صنائع لفظی کا پابند ہو کر۔

کہنے کو تو یہ ایک چھوٹی سی بات معلوم ہوتی ہے البتہ اہل زبان ہی سمجھ سکتے ہیں کہ یہ بات کس قدر گراں ہے اور کس قدر اہمیت کی حامل ہے کہ صنف مرثیہ میں ان خطبات کا غیر منقوٹ اور بغیر الف ترجمہ اس انداز سے کرنا کہ خطبات کی روحانیت اور اصل صفت بھی برقرار رہے اور سلاست بھی قائم رہے۔ ڈاکٹر عباس رضا نیر کا یہ ایسا کارنامہ ہے جس سے آسانی سے سمجھا جاسکتا ہے کہ وہ علم ادب کی کن بلندیوں پر فائز ہیں اور اپنے اس کارنامے کے لیے انہیں ہمیشہ یاد رکھا جائے گا۔

اودھ نامہ چونکہ ایک اخبار ہونے کے ساتھ ہی ادبی پرچہ بھی ہے اس لیے اس کی ہمیشہ یہ کوشش رہی ہے کہ وہ علم و ادب کی اعلیٰ شخصیات کو اپنے صفحات میں جگہ دے۔ اودھ نامہ نے ہمیشہ ان شخصیات کو ترجیح دی ہے کہ جنہوں نے علم و ادب کے میدان میں کارہائے نمایاں انجام دیے ہیں۔ حالانکہ اس پر کچھ لوگوں کو اعتراض بھی ہوا لیکن اودھ

نامہ ستائش کی تمنا اور صلے کی پروا کئے بغیر ادب کی خدمت میں منہمک رہا ہے۔ اگر اس نے ایسے کچھ لوگوں کو ترجیح دی ہے تو اس کی وجہ یہی ہے کہ ان حضرات کا علم و ادب میں نمایاں مقام ہے۔ پروفیسر شارب ردولوی، ڈاکٹر فضل امام، مولانا درالحسن، ڈاکٹر قمر جہاں، ڈاکٹر صبیحہ انور، مسرور جہاں اور ڈاکٹر عباس رضا نیران حضرات کی ادبی اور علمی خدمات سے زمانہ واقف ہے ان شخصیات پر اودھ نامہ میں خصوصی صفحات بھی شائع ہوئے ہیں تو کسی ذاتی قربت یا تعلقات کی وجہ سے نہیں بلکہ ان لوگوں میں جو صلاحیتیں ہیں وہ محتاج تعارف نہیں۔ اسی وجہ سے ان اعلیٰ شخصیات کی تخلیقات اودھ نامہ کے صفحات کی زینت بنتی رہتی ہیں۔ آج ڈاکٹر عباس رضا نیر کو اتر پردیش حکومت نے ”لش بھارتی“ ایوارڈ دے کر ان کی علمی و ادبی خدمات کا اعتراف کیا ہے۔ یہ بات بھی قابل ذکر ہے کہ جن نامور شخصیات کے مضامین اودھ نامہ میں شائع ہوتے رہے ہیں ان میں سے تین حضرات یعنی ڈاکٹر شارب ردولوی، ڈاکٹر صبیحہ انور اور ڈاکٹر عباس رضا نیر کو ”لش بھارتی“ ایوارڈ سے نوازا گیا ہے۔

جیسا کہ عرض کیا گیا کہ عباس رضا نیر ایک ہمہ جہت شخصیت کا نام ہے بلکہ یوں کہوں کہ وہ ایک حیرت انگیز شخصیت ہیں۔ وہ بیک وقت شاعر، ادیب، خطیب، ناظم محفل و مشاعرہ ہیں۔ اور یہ تمام صفات ان میں اعلیٰ درجہ کی ہیں اور اب تو وہ ایک نئے روپ میں سامنے آئے ہیں وہ ہے مترجم۔ نیر صاحب نے گورنر اتر پردیش شری رام نائیک جی کی کتاب ”چریویتی چریویتی“ کا ترجمہ ہندی سے جس بہترین انداز میں کیا ہے اس سے انہوں نے اپنے رقیبوں سے بھی اپنی لیاقت و قابلیت کا لوہا منوالیا ہے۔ حالانکہ ان کی کتاب الہام بھی مولاعلیٰ کے خطبوں کا منظوم ترجمہ ہے جو کہ ادبی دنیا میں ایک تاریخی حیثیت رکھتا ہے۔ بلکہ یوں کہوں کہ ”الہام“ بذات خود ایک معجزہ ہے جو کہ قلب نیر پر نازل ہوا اور ان کے قلم سے صفحہ قرطاس پر ظاہر ہوا۔ کئی تنقید نگاروں کا کہنا ہے

کہ نیر صاحب جوش ملیح آبادی سے متاثر نظر آتے ہیں جبکہ میں یہ کہوں گا کہ ان کی شاعری میں جوش کی گھن گرج بھی ہے اور ساتھ ہی انیس و دہیر کی شاعرانہ فنکاریاں بھی ہیں۔ وہ اپنی شاعری میں جن صنعتوں کا استعمال کرتے ہیں آج کے شاعر تو ان صنعتوں سے واقف بھی نہیں ہیں۔ جہاں تک ان کی شخصیت کی بات کی جائے تو وہ ایک مہربان استاد بھی ہیں اور دوست بھی ہیں اور دوست بھی ایسے کہ گورنر اتر پردیش انہیں ہر اسٹیج سے برسر عام اپنا عزیز دوست کہتے ہیں۔ وہ ہمدرد بھی ہیں اور دوسروں کے دکھ درد میں شریک بھی رہتے ہیں ان سے رقابت رکھنے والے ان پر الزام لگانے والے بھی ہیں (کیونکہ یہ الزام کامیابی کی دلیل ہوتی ہے) لیکن نیر صاحب کی زبان پر نہ کوئی شکوہ ہے اور نہ کوئی طعن تشنہ ہے وہ مذہبی بھی ہیں اور سیکولر بھی ہیں اور اس میں کوئی شک نہیں کہ واقعی ڈاکٹر عباس رضا نیر ایک ہمہ جہت شخصیت ہیں۔

کے ساتھ محفل کا مزہ لیتی رہیں۔

ڈاکٹر عباس رضا نیر ایک خوش اخلاق انسان ہیں۔ ان کی کتنی تعریف کروں میرے پاس الفاظ نہیں ہیں بس یوں سمجھئے کہ ایک ہمہ جہت شخصیت ہیں۔

چینی مصری سے ہیں بھری باتیں
دل کو جو چھو گئیں تری باتیں

اس ملاقات کے بعد ہماری نیر جلالپوری سے ان کی بہن کے گھر پر ہی اکثر و بیشتر ملاقات ہوتی رہی۔

ڈاکٹر عباس رضا نیر علمی اور ادبی دنیا کا ایک تابناک نام ہے۔ ہندوستان میں ہی نہیں بلکہ بیرونی ممالک میں پہچانے جانے والے عباس رضا نیر کی شاعری کا لوگ اعتراف کرتے ہیں۔ موصوف نے نظامت اور خطابت کے میدان میں منفرد مقام حاصل کیا ہے۔

مجلسوں، محفلوں اور مشاعروں میں ان کی شرکت کامیابی کی ضمانت سمجھی جاتی ہے۔ ڈاکٹر عباس رضا نیر کی خوبی یہ ہے کہ وہ بہت سادہ زبان میں اپنی بات کو لوگوں تک پہنچا دیتے ہیں۔ ان کے پاس الفاظ کا ذخیرہ ہے۔ وہ اپنے قارئین اور سامعین کے مزاج کو سمجھنے کی پوری پوری صلاحیت رکھتے ہیں۔

ڈاکٹر عباس رضا نیر کا مذہب پر پختہ عقیدہ ہے اور یہ عقیدت بچپن میں والد محترم کے ہمراہ محفلوں اور مذہبی نشستوں میں جانے سے پیدا ہوئی۔ یہ سچ ہے کہ اگر ان کا مذہب پر پختہ عقیدہ نہ ہوتا تو شاید مذہبی شاعری کی اتنی شاندار تخلیق ناممکن تھی۔

ڈاکٹر عباس رضا نیر نے بہت سی مذہبی اور ادبی کتابیں لکھیں۔ ان کے والد انہیں ہمیشہ بچپن سے نصیحت دیتے تھے۔ بیٹا کتابیں ضرور لکھنا اور اچھی کتابوں کا کلکشن ضرور رکھنا۔ والدین کی نصیحت نے آج نیر کو اتنا بڑا مصنف بنا دیا جو اپنے آپ میں ایک

ایک اجلا پیکر ڈاکٹر عباس رضا نیر

فیروز جبین اعظمی

برسوں سے ڈاکٹر عباس رضا نیر سے روبرو گفتگو کرنے کی تمنا آج پوری ہو گئی۔ جب وہ اپنی حقیقی بھانجی کی تقریب سا لگرہ میں آئے ہوئے تھے۔ ان کی بہن محترمہ خورشید نگار نے میرا تعارف ان سے کرایا۔ اور پھر نیر کا تعارف کراتے ہوئے بولیں یہ میرے چھوٹے بھائی نیر ہیں۔ میں بات کاٹتے ہوئے بولی۔ عباس رضا نیر کا نام ہی ان کا مکمل تعارف ہے۔

ڈاکٹر عباس رضا نیر کافی خوش اخلاق انسان ہیں۔ نیر میاں مجھ سے بہت خلوص کے ساتھ ملے۔ ان کی اہلیہ بھی ان کے ساتھ تھیں۔ ان سے مل کر بھی مجھے بے حد خوشی ہوئی۔

ڈائینگ ٹیبل پر بیٹھ کر کھانا کھاتے ہوئے نیر میاں بولے فیروز جبین اپنی کھانا کھانے کا مزہ تو دسترخوان پر ہے۔ میں ہمیشہ دسترخوان پر کھانا کھاتا ہوں۔ بھوک بڑھ جاتی ہے۔ کھانے کے دوران میری نیر میاں سے نہایت شائستہ انداز میں گفتگو ہوتی رہی۔ اور وہ اپنی باجی کے ہاتھ کے بنے ہوئے کھانے کو مزہ لے کے کھاتے رہے۔

کھانے کے بعد چائے کا دور چلا۔ میری فرمائش پر ڈاکٹر عباس رضا نیر نے اپنی چندہ غزلوں کے اشعار سنائے۔ ان کی بہن محترمہ خورشید نگار نے اپنی ایک پیاری سی نظم سنائی۔ آخر میں اس ناچیز نے اپنا کلام پیش کیا۔ نیر میاں کی اہلیہ محترمہ اربہ ہم لوگوں

مثال ہے۔ موصوف نے اپنے گھر میں ایک شاندار معیاری لائبریری بنا رکھی ہے۔ ابھی انہوں نے لائبریری کا نام نہیں رکھا ہے۔ مگر مجھے امید ہے کہ ان کا دولت کدہ جس کا نام ”دبستان“ ہے۔ ایک دن ان کی یہ لائبریری دبستان نام سے مشہور ہوگی۔

ڈاکٹر عباس رضانیہ جن ہستیوں کو کاغذ پر اتارنا چاہتے ہیں پہلے انہیں وہ دل کی گہرائیوں سے پڑھتے اور پھر نئے انداز میں خوبصورت کتاب بنا کر منظر عام پر لاتے ہیں تاکہ قاری کتاب کو شوق سے پڑھے۔ میں نے نیر میاں کی تخلیق ”خواجہ احمد عباس“ پڑھی مزہ آگیا۔ جو باتیں کہیں نہیں پڑھیں وہ عباس رضانیہ کی کتاب میں پڑھنے کو ملیں۔ ڈاکٹر عباس رضانیہ کا تعلق قصبہ جلالپور کے ایک ممتاز علمی خانوادہ سے ہے۔ ان کے والد الحاج ماسٹر عزادار حسین صاحب مرزا غالب انٹر کالج میں ٹیچر تھے جو اب ملازمت سے سبک دوش ہو چکے ہیں۔ اور والدہ انیسہ خاتون مولانا حکیم انصار حسین کیف جلال پوری کی بیٹی ہیں۔

کیف جلال پوری مرحوم عالم دین اور استاد الشعراء تھے۔ عباس رضانیہ کو اپنے جد امجد سے علم و فن کی روشنی ملی۔ موصوف ایک بھائی ایک بہن ہیں۔ بہن محترمہ خورشید نگار ایک بہترین ذاکرہ، نوحہ نگار، اور غزل گو شاعرہ ہیں۔ اور بھائی کاشف رضا عرشی ادبی ذوق و شوق رکھنے والے ہونہار اور ملنسار طبیعت کے مالک ہیں۔

جب نیر عالم وجود میں آئے تو ماں نے سب سے پہلے بیٹے کو گود میں لے کر زیر آسمان یہ دعا کی تھی کہ پروردگار میرے بیٹے کو عالم دین بنانا۔ واقعی ماں کی دعا مستجاب ہوئی اور ماں کی اسی دعا نے نیر کو ایک شہرہ آفاق شخصیت بنانے میں مدد پہنچائی۔

عباس رضانیہ کی ابتدائی تعلیم قصبہ جلال پور میں ہوئی۔ آگے کی تعلیم حاصل کرنے کے لیے وہ لکھنؤ آ گئے۔ ان کے والد محترم جناب الحاج ماسٹر عزادار حسین نے ان کا داخلہ سلطان المدارس میں کروایا۔ وہاں سے اردو، فارسی، عربی کی تعلیم حاصل

کرنے کے بعد انہوں نے مدرسۃ الوداعین سے واعظ کا کورس مکمل کیا۔ نیر نے لکھنؤ یونیورسٹی سے پوسٹ گریجویشن اور ڈاکٹریٹ کی ڈگری حاصل کرنے کے بعد مہاراجہ ہریش چند پنی جی کالج مراد آباد میں لکچرر ہو گئے۔ اور کچھ سال بعد لکھنؤ یونیورسٹی میں آ گئے اور آج اسی یونیورسٹی میں شعبہ اردو کے صدر کی حیثیت سے اپنی خدمات انجام دے رہے ہیں۔

ملازمت کی تمام مصروفیات کے ساتھ ساتھ ڈاکٹر عباس رضانیہ تبلیغ و تدریس اور خدمت دین و ادب انجام دے رہے ہیں۔

ڈاکٹر عباس رضانیہ کی شاعرانہ ہنرمندی ان کی شاعری کو پڑھ کر سامنے آ جاتی ہے۔ موصوف کا مذہبی شاعری اور ادبی شاعری میں خاص مقام ہے۔ نیر میاں کی مذہبی شاعری میں خاص مقام پر ایک بات یاد آگئی جب نیر درجہ دوم میں پڑھتے تھے تو انہوں نے ایک قطعہ کہا تھا:-

ضد نہ کرتو مجھے فردوس میں لے جانے کی

راستہ چھوڑ مجھے کرب و بلا جانا ہے

اپنی جنت کو ابھی اور سجالے رضواں

اس سے اچھا تو مرے گھر کا عزاخانہ ہے

یہ قطعہ اس بات کی دلیل تھا کہ یہ لڑکا ایک دن علم و ادب کی بلندیوں کو چھو لے گا۔ اور واقعی سچ ثابت ہوا سات سال کی عمر میں منبر رسول پر بیٹھنے کا شرف حاصل کرنے والا یہ ننھا سا بچہ نیر آج ڈاکٹر عباس رضانیہ بن چکا ہے۔ جس کی قابلیت اور شہرت کا چراغ ہندوستان کے گوشے گوشے ہی میں نہیں بلکہ بیرونی ممالک میں تاباں ہے۔

ڈاکٹر عباس رضانیر نے اہلیت کی مودت کو دل میں رکھ کر مذہبی شاعری کا سرچشمہ ”الہام“ اور ”دریا چودہ لہروں کا“ کی شکل میں تیار کیا ہے۔ اس سرچشمے سے آنے والی نسلیں ہمیشہ فیضیاب ہوتی رہے گی۔ جس کا ایک بہترین بند پیش نظر ہے کہ:

ایمان ہے علی کہیں اسلام ہے علی
آغاز ہے علی کہیں انجام ہے علی
قرآن کے حرف حرف کا پیغام ہے علی
حد یہ ہے خود خدا کا بھی ہمنام ہے علی

سوئے تو ایک شب میں پیبر دکھائی دے
جاگے تو کردگار کا مظہر دکھائی دے

ڈاکٹر عباس رضانیر کی ادبی شاعری کا اردو ادب میں خاص مقام ہے۔ ان کی تمام غزلیں ان کی تخلیق کی صلاحیت کا اعلیٰ نمونہ ہیں۔ بچپن میں ہی جب انہوں نے انوکھے لب و لہجے کا جب یہ شعر لکھا تھا کہ:

زمانہ دیر میں مانوس مجھ سے ہو شاید
ابھی میں وقت کا اک اجنبی سا لہجہ ہوں

جہی اس بات کا اندازہ ہو گیا تھا کہ جب آغاز شاعری میں شعر گوئی کمال کو پہنچی ہوئی معلوم ہوتی ہے تو انجام کی بلندی کیا ہوگی۔ آئیے اسی بلندی کو پیش کرنے کے لیے کچھ اشعار لکھتی ہوں جو میں نے خود ان کی زبان سے سنے۔:

کیا شکایت کروں بچھڑنے کی
میں نے آواز کب لگائی تھی

جیسے ہوتی ہو دھوپ میں بارش
یوں پسینے میں وہ نہائی ہے
اس کے منہ سے نئی نئی سی لگے
جو کہانی سنی سنائی تھی

کتنی شکلیں ہیں سراہوں کی کوئی کیا جانے
ہینڈ پائپ سے بھی پانی نہیں بالو آئے

عشق کے بھی ادب آداب ہوا کرتے ہیں
گفتگو تجھ سے کرے وہ جسے اردو آئے

اب قلم روکتے ہوئے اتنا کہوں گی۔ اللہ کرے نیر کا تازہ ترین شعری مجموعہ ”آہٹ پانچویں موسم کی“ پورے آب و تاب کے ساتھ آسمان کی بلندیوں کو چھو لے۔
پروردگار نیر میاں پر اپنی رحمت کا سایہ ہمیشہ بنائے رکھے۔ اور صحت و تندرستی کے ساتھ تاحیات ترقی کی راہ پر گامزن رکھے۔ آمین ثم آمین۔

☆☆☆

زندگی

ڈاکٹر عباس رضانیر:

مختصر سوانحی خاکہ اور ادبی خدمات ایک نظر میں

اجے کمار سنگھ

ڈاکٹر عباس رضانیر کا مختصر سوانحی خاکہ کھینچتے ہوئے ان تمام پہلوؤں کو سامنے رکھنا ضروری ہے۔ جو ان کی زندگی میں پیش آئے ہیں۔ ڈاکٹر عباس رضانیر نے ۳۰ جون ۱۹۷۶ء کو جعفر آباد۔ جلال پور، امبیڈکر نگر، یو پی، ہندوستان میں آنکھیں کھولیں۔ ان کی پرورش علمی اور ادبی ماحول میں ہوئی۔ ان کے والد ماجد جناب عزادار حسین صاحب جلال پور کے ایک تعلیمی ادارے مرزا غالب انٹر کالج میں اردو کے استاد رہ کر سبک دوش ہو چکے ہیں۔ ڈاکٹر نیر کے دادا رفیق حسین کر بلائی ایک اچھے مرثیہ خوان اور اچھے شعری وادبی ذوق کے مالک تھے۔ ڈاکٹر عباس رضانیر جلال پوری کے نانا حکیم مولانا انصار حسین کیف جلال پوری ایک گہنہ مشق شاعر ہی نہیں بلکہ ایک مشہور و معروف طبیب بھی تھے۔ کیف جلال پوری نے اپنے بعد اپنے شاگردوں کی ایک بڑی تعداد چھوڑی۔ ان بزرگوں کے سائے میں ڈاکٹر نیر کی تربیت ہوئی۔ خصوصاً اردو شعر و ادب کے گیسو سنوارنے میں استاد الاساتذہ کیف جلال پوری کی تربیت کی بنا پر ڈاکٹر نیر جلال پوری کے شعری جہات میں نئے نئے امکانات روشن ہوئے۔ ڈاکٹر نیر نے جلال پور کے مکتب جعفریہ میں داخلہ لے کر ابتدائی تعلیم حاصل کی۔ مکتب جعفریہ سے فارغ ہونے کے بعد

اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے کے لیے ڈاکٹر نیر نے جامعہ سلطانیہ لکھنؤ میں داخلہ لیا۔ یہاں ۱۴ چودہ برس کی تحصیل علم کے بعد انہیں ’صدر الافاضل‘ اور اس کے بعد مدرسہ الوداعین سے تین سال تعلیم حاصل کرنے کے بعد ’واعظ‘ کی اسناد تفویض ہوئیں۔ اسی قیام کے دوران جدید تعلیم حاصل کرنے کے لیے شیعہ کالج لکھنؤ یونیورسٹی لکھنؤ سے بی۔ اے، ایل۔ ایل۔ بی اور لکھنؤ یونیورسٹی سے اردو میں ایم۔ اے کیا ایم اے کے ایک خصوصی پرچے میں مقالہ بھی لکھا جس کا عنوان ”۱۹۴۷ کے بعد اردو مرثیہ کا ارتقاء“ تھا اسی کے ساتھ شعبہ اردو لکھنؤ یونیورسٹی سے ہی پی ایچ۔ ڈی کی سند بھی حاصل کی۔ تحقیقی مقالے کا موضوع ”اردو شاعری میں علاماتِ کربلا“ تھا۔ یہ مقالہ پروفیسر انیس اشفاق کی زیر نگرانی مکمل کیا گیا۔ دوران تحقیق ۱۹۹۹ میں ڈاکٹر عباس رضا نیر کو ۲۲ برس کی عمر میں ہائر ایجوکیشن کمیشن الہ آباد کے ذریعے اسٹنٹ پروفیسر کے عہدے پر مہاراجہ ہریش چندر پوسٹ گریجویٹ کالج مراد آباد (روہیل کھنڈ یونیورسٹی) میں ترقی ملی گئی۔ درس و تدریس کی تمام تر ترقیات کی منزلوں کے ساتھ ڈاکٹر عباس رضا نیر کو ۲۰۰۶ عیسوی میں اپنی مادر علمی شعبہ اردو لکھنؤ یونیورسٹی میں سینیئر اسٹنٹ پروفیسر کی حیثیت سے ترقی حاصل ہو گئی اور ۲۰۰۸ میں ریڈر کے عہدے پر فائز ہوئے اور فی الوقت ڈاکٹر عباس رضا نیر صدر، شعبہ اردو لکھنؤ یونیورسٹی کے منصب پر فائز ہو کر اپنی سربراہی میں شعبہ اردو لکھنؤ یونیورسٹی کی اہمیت اور توقیر میں چار چاند لگا رہے ہیں۔ قدیم روایات کے مطابق اور جدید علمی ادبی تقاضوں کو ملحوظ رکھتے ہوئے شعبہ کو مزید بلند یوں سے ہم آہنگ کر رہے ہیں اور علمی، ادبی و تحقیقی حلقوں میں اپنی بصارت و بصیرت کا لوہا منوار ہے ہیں۔ یہاں یہ کہنا بے جا نہ ہوگا کہ ہر شخص کی ترقی کے پیچھے کسی نہ کسی خاتون کا کلیدی کردار ہوتا ہے۔ یہاں پر سب سے پہلے تو اسی آغوش کو سلام کرتے ہیں جس میں ڈاکٹر عباس رضا نیر نے آنکھیں کھولیں اور اسی آغوش میں پروان چڑھے۔ اس عظیم المرتبت شخصیت کا اسم گرامی ایسہ

خاتون ہے۔ جنہوں نے ڈاکٹر عباس رضا نیر کی صرف پرورش و پرداخت ہی نہیں بلکہ شخصیت سازی کر کے اپنے جگر گوشے نیر جلال پوری کو عہد حاضر کا نیر تاباں بنا دیا۔ یہاں یہ بھی بتانا ضروری ہے کہ عباس رضا نیر صاحب کا پورا نام ان کے والدین نے منتخب کیا تھا جس کا آخری حصہ آج ’نیر‘ کی شکل میں علمی اور ادبی حلقوں میں اپنے جلوے بکھیر رہا ہے۔ والدہ کے ساتھ ساتھ ڈاکٹر نیر کی بڑی بہن محترمہ خورشید نگار صاحبہ نے ڈاکٹر نیر کو انگلی پکڑ کر چلنا سکھایا۔ مہربان ماں اور چاہنے والی بہن ڈاکٹر نیر کی طبیعت، مزاج، رجحان اور ذوق کے پس منظر کے مطابق بطور شریک حیات اپنی عمیق نگاہی سے ایسا درِ نایاب تلاش کر کے لائیں جو ان کی علمی، ادبی اور مذہبی رہ گزر پر نہ صرف ہمسری کا حق ادا کر رہی ہیں بلکہ ہر مشکل مرحلے کو آسان ترین بنا رہی ہیں اور ان کے حوصلہ کی اڑان کو جلا بخش رہی ہیں۔ ڈاکٹر عباس رضا نیر صاحب ۲۰۰۴ میں رشتہ ازدواج سے منسلک ہوئے ان کی اہلیہ کا نام رخسانہ بانو عرفیت اریبہ عباس ہے جنہوں نے ڈاکٹر عباس رضا نیر کے تمام تر خانگی مسائل کو اپنے جذبہ ایثار سے حل کیا ہے۔ ہونہار اور پیاری پیاری دو بیٹیوں ہل اتی عباس اور انما عباس کی تعلیم و تربیت کی تمام دشواریاں نہ صرف یہ کہ آسان کر کے بلکہ تمام مسائل سے ان کو لاعلم رکھ کر ان کی تمام تر علمی اور ادبی صلاحیتوں کو منظر عام پر لانے کے لیے راہ ہموار کی۔ اللہ تعالیٰ نے ڈاکٹر عباس رضا نیر کو قوتِ بازو کی شکل میں چھوٹا بھائی بھی عطا کیا ہے جن کا نام کاشف رضا عرشی ہے۔

ہم نے یہاں ڈاکٹر نیر کی ذاتی زندگی کا احاطہ کرنے کی کوشش کی ہے۔ ہم ڈاکٹر عباس رضا نیر علمی اور ادبی سفر پر ایک نظر ڈالتے ہیں جو تقریباً ۳۵ دہائیوں پر مشتمل ہے اس میں ڈاکٹر عباس رضا نیر کی ۳۰ تئیں کتابیں منظر عام پر آچکی ہیں اور ابھی بھی ان کے نہ صرف نثری بلکہ شعری کلام کا بھی بڑا حصہ زیر ترتیب ہے اور زیور طبع سے آراستہ ہونے کے مراحل میں ہے جس میں بھگت سنگھ پر ایک ضخیم ناول ”آزاد قیدی“ بھی شامل ہے۔

ان کی ان تصانیف کی تفصیل جواب تک منظر عام پر آچکی ہیں وہ کچھ اس طرح ہیں۔
تخلیقی سطح پر اب تک ڈاکٹر نیر کی چار کتابیں شائع ہو چکی ہیں۔ شعر و ادب کی دنیا میں ڈاکٹر عباس رضانیہ کی پہلی کاوش ”دریا چودہ لہروں کا“ ہے جو ۲۰۰۴ء میں شائع ہوئے والا ڈاکٹر عباس رضانیہ جلاپوری کی مدحیہ شاعری کا مجموعہ ہے۔ نقدی شاعری میں نئی شعری روایت کی داغ بیل اسی مجموعہ سے پڑتی ہے اور منقبت کی شاعری کے لحاظ سے بھی یہ کتاب اہمیت کی حامل ہے۔ اس میں پانچ قصائد اجزائے ترکیبی کے التزام کے ساتھ پیش کیئے گئے ہیں۔ اس کے علاوہ منقبتیں جوئی لفظیات اور نئی شعریات کے ساتھ نقدی شاعری میں ایک مثال قائم کرتی ہیں۔ یہ کتاب ۱۶۷ صفحات پر مشتمل ہے جس میں قصائد کے علاوہ منقبت، سلام، قطعات اور رباعیات بھی شامل ہیں۔

ڈاکٹر عباس رضانیہ کی دوسری کتاب ”شیر خدا کی شادی“ طربہ شاعری ہے۔ یہ کتاب ۲۰۰۵ء میں شائع ہوئی۔ اس میں حضرت علیؑ اور حضرت بی بی فاطمہ زہراؑ کی شادی کے حوالے سے طربہ شاعری کی اصناف سہرا اور رخصتی کے متعلق کلام پیش کیا گیا ہے۔ اس سہرے اور رخصتی کی خوبی یہ ہے کہ اس میں ہندوستانی رسومات کے ساتھ ساتھ آیات قرآنی اور احادیث رسول کو نہایت سلیقہ سے پیش کیا گیا ہے۔

ڈاکٹر عباس رضانیہ کی تیسری تخلیقی ”الہام“ ۲۰۱۶ء میں شائع ہوئی۔ دراصل مرثیہ کے لیے تکنیک کا بہت اہم کردار ہوتا ہے۔ حضرت علیؑ کی مدح میں بڑے معروف مرثیہ گو شاعر جوش ملیح آبادی اور روپ کماری نے جدید مرثیہ میں تکنیکی سطح پر مرثیہ کی ہیئت کے حوالے سے تجربات کیئے ہیں تکنیک کی سطح پر ہی تجربہ کرتے ہوئے ڈاکٹر عباس رضانیہ نے حضرت علیؑ کے غیر منقوہ خطبہ کا غیر منظوم ترجمہ کیا ہے جو رثائی ادب کا نایاب کام ہے یہی نہیں بلکہ اسی مرثیہ میں حضرت علیؑ کے بغیر الف خطبے کا بغیر الف منظوم ترجمہ بھی کیا ہے۔ اس میں کئی صنعتوں کا استعمال پہلی بار ہوا ہے، فوق النقط، تحت النقط، اور بے نقط جیسی

نایاب صنعتوں کا استعمال بڑی خوبصورتی کے ساتھ کیا گیا ہے۔ ڈاکٹر عباس رضانیہ کا چوتھا شعری مجموعہ ”آہٹ پانچویں موسم کی“ کے نام سے ۲۰۱۷ء میں شائع ہوا۔ اس مجموعے میں ڈاکٹر نیر کی سو غزلیں اور سونگے شامل ہیں۔ انگریزی اور ہندی میں بھی اس مجموعہ کلام کے ترجمے ہو چکے ہیں۔ انگریزی میں ترجمے کا کام امریکن اسکالر میتھیو ڈالٹن نے کیا ہے اور اسے ہندی رسم الخط میں پیش کرنے کا شرف راقم الحروف کو حاصل ہے۔ ریفرنس کی حیثیت رکھنے والی اب تک عباس رضانیہ کی چار تصانیف شائع ہو چکی ہیں۔

”ادبی میزان“ جو ۲۰۰۵ء میں شائع ہوئی۔ یہ کتاب تنقید کے میدان میں ڈاکٹر عباس رضانیہ کا نقش اول ہے۔ اس کتاب کے بیشتر مضامین تجزیہ اور تشریح پر مشتمل ہیں جن میں کلاسیکی شعرا کے کلام اور نثری فن پاروں کو سامنے رکھ کر محاکمہ کیا گیا ہے۔ اس لحاظ سے ہم اس کتاب کو مٹی تنقید کے عصری نمونے کے طور پر دیکھ سکتے ہیں۔ آنے والی نسلیں اس سے نہ صرف استفادہ کریں گی بلکہ یہ کتاب ان کے لیئے مشعل راہ کی حیثیت بھی رکھتی ہے۔ اس کتاب میں مشہور و معروف افسانہ نگار منشی پریم چند، مرثیہ نگار میر انیس، مرزا دبیر اور جمیل مظہری وغیرہ کی نظم و نثر کا محاکمہ کیا گیا ہے۔ یہ کتاب ۱۷۳ صفحات پر مشتمل ہے۔

ڈاکٹر عباس رضانیہ کی دوسری اہم تنقیدی کتاب ”خواجه احمد عباس“ ۲۰۱۶ء میں شائع ہوئی۔ یہ کتاب ترقی پسند ادیب اور صحافی خواجه احمد عباس کی شخصیت اور فن کا احاطہ کرتی ہے۔ خواجه احمد عباس کی علمی و ادبی شناخت کے حوالے سے اکادمک تحریروں تو مل جاتی ہیں لیکن ڈاکٹر عباس رضانیہ نے ان کے فکشن، ڈرامے، اور صحافتی کالموں کے ساتھ زندگی کے مختلف پہلوؤں کا احاطہ کر کے بڑا کام کیا ہے۔ ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس نئی دہلی سے شائع ہونے والی ۲۸۶ صفحات کو محیط یہ کتاب خواجه احمد عباس کی تعبیر و تفہیم کے حوالے سے سنگ میل کا درجہ رکھتی ہے۔

یوں تو ڈاکٹر عباس رضا نیز تنقیدی دنیا میں اپنی پہلی تنقیدی کتاب ادبی میزان سے ہی بحیثیت نقاد اپنی شناخت قائم کرنے میں کامیاب ہو گئے تھے لیکن ان کی تیسری تنقیدی تصنیف ”تنقیدی بحثیں“ جو مختلف اوقات پر منعقد ہونے والی کانفرنسیز اور سیمیناروں میں پڑھے گئے تنقیدی مقالوں کا مجموعہ ہے جسے ایجوکیشنل پبلنگ ہاؤس نئی دہلی نے ۲۰۱۶ء میں شائع کیا۔ یہ کتاب ۲۷۸ صفحات پر مشتمل ہے اور اس میں مختلف موضوعات پر تنقیدی مضامین شامل ہیں۔

ڈاکٹر عباس رضا نیز کی چوتھی تنقیدی تصنیف ”رثائی تنقیدیں“ رثائی ادب کی تنقید پر مشتمل ہے۔ یہ کتاب بالواسطہ اور بلاواسطہ دونوں سطحوں پر واقعات کر بلا سے متعلق نثر اور نظم کے مختلف پہلوؤں کے تجزیہ کے اعتبار سے اہمیت کی حامل ہے۔ ۲۲۴ صفحات کو محیط یہ کتاب ۲۰۱۶ء میں ایجوکیشنل پبلنگ ہاؤس نئی دہلی نے شائع کی۔

اب بات کرتے ہیں ترتیب اور تالیف کی تو صرف اپنی کتابیں ہی لکھنا کمال نہیں ہے بلکہ وہ ادب جو کسی سبب سے منظر عام پر نہیں آیا اسے دنیائے ادب کے سامنے لانا بھی ایک بڑا کام ہے جو ڈاکٹر عباس رضا نیز نے بڑی ہی خوبی سے کیا ہے۔ ڈاکٹر عباس رضا نیز نے چودہ کتابیں ترتیب و تالیف کی ہیں۔ ان میں سب سے پہلی کتاب ہے ”ہماری توحید“ ہندی کا پروفیسر شبیہ الحسن نمبر۔ اس میں پروفیسر سید شبیہ الحسن نونہروی سابق صدر شعبہ اردو لکھنؤ یونیورسٹی کی زندگی اور ادبی خدمات پر اس دور کے اکابرین کے مضامین شامل ہیں۔ عرض مرتب کے علاوہ پروفیسر شبیہ الحسن پر درس نظامی کے حوالے سے خود ڈاکٹر نیز کا مضمون اپنے آپ میں نہایت اہمیت کا حامل ہے۔ یہ نمبر ۱۹۹۸ء میں توحید پرکاش لکھنؤ سے شائع ہوا۔

۱۹۹۸ء میں ہی حسینی گروپ آف انڈیا لکھنؤ نے ڈاکٹر عباس رضا نیز کا مرتب کیا ہوا یادگاری مجلہ ”نغمہ توحید“ شائع کیا جس میں امام جعفر صادق اور ان کے شاگردوں

کے علمی اور سائنسی کارناموں پر مشتمل مضامین شامل ہیں۔

تیسری کتاب ”لپ نیلگوں“ یہ تصور حسین زیدی کی شاعری کا مجموعہ ہے جسے ڈاکٹر عباس رضا نیز نے بڑی ہی محنت سے جمع کر کے شائع کیا ہے۔ تصور حسین زیدی ہمارے عہد کے ایک اہم شاعر ہیں لیکن سرکاری ملازمت کے تقاضوں اور نام و نمود کی دنیا سے بے تعلقی کی بنا پر انہوں نے اپنے شعری کلام کو کبھی محفوظ کرنے کی کوئی فکر نہیں کی۔ ڈاکٹر عباس رضا نیز کو ان کے کلام سے عشق ہونے کی وجہ سے ان کا کلام از بر تھا۔ اس مجموعہ کی اہمیت اس لیے بھی ہے کہ اس سے پہلے تصور حسین زیدی کا کوئی دوسرا مجموعہ شائع نہیں ہوا ہے۔ اس مجموعہ کی وجہ سے تصور حسین زیدی اردو ادب میں زندہ جاوید ہو گئے۔ یہ مجموعہ کلام ۱۴۷ صفحات پر مشتمل ہے جو ۲۰۰۰ء میں لکھنؤ سے شائع ہوا۔

ڈاکٹر نیز کی مرتب کردہ چوتھی کتاب ”چراغِ حرا“ ۲۰۰۲ء میں شائع ہوئی۔ جو ۱۱ مشہور و معروف نعت گو شعراء کے آسانی سے یاد رہ جانے والے نعتیہ کلام کا انتخاب ہے۔ اس کتاب کے ذریعہ ہمارے نعتیہ ادب میں ایک خوش گوار اضافہ ہوا ہے۔ اس میں میر انیس، علامہ اقبال، امیر مینائی، احسان دانش، ابن صفی، کیف جلال پوری وغیرہ کا کلام شامل ہے۔ یہ کتاب ۶۴ صفحات پر مشتمل ہے۔

چراغِ حرا کی طرح ہی ”دُرِ نجف“ میں بھی مختلف معروف و مشہور شعرا کے آسان کلام (قطعات) کا مجموعہ ہے۔ یہ قطعات حضرت علیؑ کی شان میں کہے گئے ہیں جس کے ذریعے ڈاکٹر عباس رضا نیز نے نظامت کے فن سے دلچسپی رکھنے والوں کے لیے قابلِ قدر اضافہ کیا ہے۔ اس کتاب میں میر انیس، آتش لکھنؤی، ثاقب لکھنؤی آرزو لکھنؤی وغیرہ کا کلام پیش کیا گیا ہے۔

”ابھی سفر میں ہوں“ سلیم کیفی کی غزلوں اور نظموں کا مجموعہ ہے۔ جسے ڈاکٹر عباس رضا نیز نے مرتب کیا ہے۔ ۱۶۸ صفحات پر مشتمل یہ شعری مجموعہ ۲۰۰۶ء عیسوی میں

مراد آباد سے شائع ہوا۔ سلیم کیفی کا تعلق سرزمین مراد آباد سے ہے۔ جگر کی شعری روایتوں کا احترام کرتے ہوئے نئی شعری رویتوں کی خوبصورت مثال یہ شعری مجموعہ ہے۔

حضرت ابوطالب کا نعتیہ ادب میں جو کام ہے اس کی نشاندہی ڈاکٹر عباس رضا نیر کی کتاب ”عظمت ابوطالب“ سے ہوتی ہے۔ ان کے نعتیہ ادب پر لوگوں نے لکھا ہے لیکن حسن اسلام ہونے کی بنا پر اسلام کی ترویج اور تبلیغ میں جو احسان آپ نے کیا ہے اس کا احاطہ بھی یہ کتاب کرتی ہے اور اس میں بھی مختلف مضامین موجود ہیں یہ کتاب ۲۰۰۹ء شائع ہوئی جو ۱۲۰ صفحات پر مشتمل ہے۔

”کربلا فہمی“ یہ کتاب ۲۰۱۰ء میں شائع ہوئی۔ دراصل اس موضوع پر ڈاکٹر عباس رضا نیر کی کوششوں سے منعقد ہوئے ایک سیمینار میں پڑھے جانے والے مقالات کو جمع کر کے ایک کتاب کی شکل میں پیش کیا گیا ہے۔ جس میں انکا مضمون اور دیباچہ بھی قابل غور ہے۔ اس میں پرانے قلم کاروں کے علاوہ نئے قلم کاروں کی ایک خوبصورت فہرست نظر آتی ہے۔ کتاب کے ان مضامین سے کربلا کی اہمیت، افادیت اور فلسفہ کو سمجھنے میں آسانی ہوتی ہے۔ یہ کتاب ۱۷۲ صفحات پر مشتمل ہے۔

”مجرورج: کچھ یادیں کچھ باتیں“ جو ۲۰۱۵ء میں شائع ہوئی۔ یہ کتاب ہندی اردو ساہتیہ ایوارڈ کمیٹی کے تحت منعقد ہونے والے بین الاقوامی سیمینار میں پڑھے گئے تحقیقی مقالوں کا مجموعہ ہے جسے ڈاکٹر عباس رضا نیر نے جمع کیا ہے۔ یہ بھی واضح رہے کہ پچھلے ۲۵ برس سے لکھنؤ میں ہندی اردو ساہتیہ ایوارڈ کمیٹی سیمینار کا انعقاد کرتی آرہی ہے لیکن اس سے پہلے اس طرح سے کبھی مقالے نہیں جمع ہوئے اس اعتبار سے اس کی اہمیت اور بڑھ جاتی ہے کہ اسی کتاب نے ہندی اردو ساہتیہ ایوارڈ کمیٹی کی طرف سے منعقد ہونے والے سیمینار کے مقالوں کو جمع کرنے کی نئی روایت ڈالی۔ یہ کتاب ۲۲۶ صفحات پر مشتمل ہے اور اس میں پروفیسر ملک زادہ منظور احمد، پروفیسر علی احمد فاطمی سمیت ۱۶

مقالے شامل ہیں۔ ڈاکٹر عباس رضا نیر نے اس کتاب میں اپنے مبسوط مقدمے اور تحقیقی و تنقیدی مقالے سمیت مجروح سلطان پوری کی غزلیں بھی شامل کی ہیں۔

خطوط اپنے عہد کا آئینہ ہوتے ہیں اور خطوط نگاری کے حوالے سے ڈاکٹر عباس رضا نیر کی کتاب ”خطوط بنام ضمیر“ ۲۰۱۵ء میں پاکستان سے شائع ہوئی۔ یہ کتاب علامہ ضمیر اختر نقوی صاحب کو مختلف اوقات میں نامور شعراء، ادباء، سیاسی اور سماجی کارکنوں کے ذریعے لکھے گئے خطوط کو ڈاکٹر عباس رضا نیر نے مرتب کر کے علامہ ضمیر اختر نقوی صاحب کے عوام و خواص سے تعلقات کو اس کتاب کے ذریعے واضح کیا ہے۔ اس کتاب میں تمام مشہور و معروف شخصیات کے خطوط شامل ہیں جن میں: قرۃ العین حیدر، جوش ملیح آبادی، ڈاکٹر جمیل جالبی، پروفیسر نیر مسعود اور پروفیسر شارب رودلوی سمیت کل ۲۷۸ خطوط شامل ہیں۔ یہ کتاب ۸۴۸ صفحات پر مشتمل ہے۔

”فہرست مخطوطات۔ کانگریس لائبریری امریکہ“ اس کتاب کو دیکھنے کے بعد یہ محسوس ہوتا ہے کہ ڈاکٹر عباس رضا نیر کی نظر کا کینوس کتنا وسیع ہے وہ اردو ادب کی حدوں سے باہر نکل کر امریکہ کی لائبریری تک پہنچ گئے اور وہاں کے نایاب مخطوطوں کی فہرست کو جمع کر کے ایک حیرت انگیز کام کیا اور ہم تمام طالب علموں کو یہ سبق بھی دیا کہ صرف اپنے ادب کو ہی نہیں بلکہ دوسری زبانوں کے ادب کو بھی نظر میں رکھنا چاہیے۔ اس کتاب میں جمع کردہ وہ مخطوطے ہیں جنہیں کانگریس لائبریری نے خریدا اور جن کی دنیا میں صرف ایک ہی کاپی موجود ہے۔ یہ کتاب مرتب کر کے ڈاکٹر عباس رضا نیر نے مخطوطات کی اہمیت کو واضح کیا ہے۔ ۳۴۱ صفحات پر مشتمل یہ کتاب ۲۰۱۵ء میں پاکستان سے شائع ہوئی ہے۔

”احساس“ علامہ ڈاکٹر ضمیر اختر نقوی کے رسائل اور اخبارات میں شائع ہونے والے مضامین کا مجموعہ ہے جو ۲۰۱۶ء میں شائع ہوئی۔ علامہ ضمیر اختر نقوی کے بر صغیر کے حالات اور مسائل پر ہندوستان اور پاکستان کے مختلف اخبارات اور رسائل کو

مختلف اوقات میں دیئے گئے انٹرویوز کو جمع کر کے ڈاکٹر عباس رضانیر نے نہایت اہم کام انجام دیا ہے۔ اس کتاب سے علامہ ضمیر اختر نقوی کی فکر و نظر، بصیرت و بصارت اور شخصیت کو سمجھنے میں آسانی ہوتی ہے۔ ۳۷۹ صفحات پر مشتمل یہ کتاب ۲۰۱۶ء میں پاکستان سے شائع ہوئی۔

”اردو ناول اور اودھ“ یہ کتاب ۲۰۱۶ء میں شائع ہوئی۔ لکھنؤ یونیورسٹی شعبہ اردو میں ڈاکٹر عباس رضانیر نے جب سے شعبہ کی سربراہی سنبھالی ہے تب سے وہ ہر سال لکھنؤ یونیورسٹی میں ایک بین الاقوامی سیمینار کا انعقاد کرتے ہیں جس میں پیش کئے جانے والے مقالوں کو جمع کر کے کتابی شکل میں پیش کرنے کی داغ بیل بھی ڈالی گئی ہے یہ کتاب اس سلسلہ کی پہلی کڑی ہے۔ جس میں اودھ میں ناول نگاری اور اردو نثر کی اہمیت اور افادیت کو مختلف مضامین کے حوالے سے پیش کیا گیا ہے۔ یہ کتاب ۲۷۶ صفحات پر مشتمل ہے۔ اس میں ڈاکٹر عباس رضانیر کے بصیرت افروز مقدمہ کے علاوہ علامہ ضمیر اختر نقوی، پروفیسر صغیر افراہیم، پروفیسر علی احمد فاطمی کے مقالے سمیت کل ۲۵ مضامین شامل ہیں۔

ڈاکٹر نیر جلال پوری میں فکر و نظر، تہذیب و روایت اور جدت و ندرت کی جو شع آپ کے نانا ڈاکٹر انصار حسین کیف جلال پوری نے روشن کی تھی۔ ڈاکٹر نیر جلال پوری نے اس روایت کے تحفظ کے ساتھ اس کو عہد حاضر کی معنویت سے جوڑ کر ”کلیات کیف“ اس طرح ترتیب و تدوین کی کہ اس کی اہمیت و معنویت کے ساتھ ساتھ وہ اپنی پوری ندرت کے ساتھ ہمارے سامنے موجود ہے۔ جس کو پڑھنے کے بعد ہم انگشت بدنداں ہو جاتے ہیں کہ اتنے عظیم شاعر کو اگر ڈاکٹر عباس رضانیر جیسا نواسہ نہ ملتا تو یہ نادر کلام آج ہم تک نہ پہنچتا جس کے مطالعہ سے آج ہم شعر و شاعری کی نئی نئی راہوں سے آشنا ہو رہے ہیں جس کا نام ”کلیات کیف“ ہے جو حال ہی میں شائع ہوئی ہے۔

اب بات آتی ہے ترجمہ نگاری کی تو ترجمہ میں ڈاکٹر عباس رضانیر کو کمال حاصل

ہے۔ ترجمہ نگاری بہر حال ایک مشکل فن ہے کیوں کہ جس زبان سے ترجمہ کیا جا رہا ہے اور جس زبان میں ہونا ہے دونوں زبانوں میں مہارت حاصل ہونا چاہیئے اور اس سے دوسری زبانوں کے ادب میں کیا کام ہو رہا ہے ان سے آشنا ہونے کا موقع ملتا ہے۔ جب ہم ترجمہ کئے ہوئے دوسری زبانوں کے ادب کو پڑھتے ہیں تو ہمیں پتہ چلتا ہے کی دوسری زبانوں کا ادب کس سطح تک پہنچ چکا ہے اور اس کا اردو زبان و ادب پر کیا اثر پڑ رہا ہے اور ہماری زبان سے دوسری زبانوں میں کہاں تک ادب منتقل ہو رہا ہے۔

اس سلسلہ میں ڈاکٹر عباس رضانیر کی پہلی کاوش ”آچار یہ رام چندر شُکل“ ہے۔ ڈاکٹر عباس رضانیر نے ہندی ادب کے معروف نقاد اور ادیب آچار یہ رام چندر تیواری کا ساہتیہ اکادمی کا ہندی مونو گراف ”آچار یہ رام چندر شُکل“ اردو میں ترجمہ کر کے پیش کیا اور اردو ادب کے لوگوں کو ہندی سے قریب کرنے کی کامیاب کوشش کی ہے۔ چنانچہ اس کتاب کے ذریعہ اردو کے طالب علم ہندی کے اس معروف ادیب اور نقاد سے واقفیت حاصل کر سکتے ہیں۔ یہ مونو گراف ۲۰۰۶ عیسوی میں ساہتیہ اکادمی نئی دہلی نے شائع کیا ہے۔

”سات قدم آسمان میں“ یہ کتاب ۲۰۱۰ء میں شائع ہوئی۔ یہ کند نیکا کا پڑیا کے گجراتی ناول ”ست پگلاں آکاش ماں“ کا اردو ترجمہ ہے۔ ہم گذشتہ سطروں میں اس بات کا اعتراف کر چکے ہیں کہ ڈاکٹر عباس رضانیر صاحب کی نظر کا کینوس بہت وسیع ہے۔ ناول کا اردو ترجمہ اس بات کی طرف اشارہ کرتا ہے۔ یہ تائینیت (feminism) پر لکھا ہوا ناول ہے۔ اس ناول کے ترجمہ کو پڑھ کر ایسا لگتا ہے کہ یہ اردو میں ہی لکھا گیا ہو اور ایک عورت شیشے کے سامنے کھڑی ہو کے اپنا چہرہ دیکھ رہی ہو اور اپنی زندگی کے مختلف پہلوؤں کے حوالے سے ایک انجام تک پہنچ رہی ہو۔ ترجمہ شدہ ناولوں میں بہر حال یہ ناول اہمیت کا حامل ہے۔ یہ کتاب ساہتیہ اکادمی نئی دہلی سے شائع ہوئی۔ جو ۴۲۴ ر

صفحات پر مشتمل ہے۔

”چریویتی! چریویتی!!“ جناب رام نائیک، گورنر اتر پردیش کا سفرنامہ زندگی ہے۔ خود گورنر صاحب کے مطالبے پر اس کتاب کا اردو میں ترجمہ ڈاکٹر عباس رضا نیر نے بہت ہی سہل انداز میں کیا اس بات کا اعتراف کرتے ہوئے چریویتی چریویتی پر لکھنؤ یونیورسٹی میں ہونے والے مذاکرے میں جناب پروفیسر شارب ردولوی صاحب نے کہا کہ اس کتاب کو پڑھنے سے ایسا محسوس ہو رہا ہے کہ رام نائیک صاحب اردو میں گفتگو کر رہے ہوں یعنی جیسی زبان ایک مراٹھی بولنے والے گورنر کی ہونی چاہیے ویسی ہی زبان میں اس کا ترجمہ کیا گیا ہے، جو اس کتاب کا تقاضہ بھی تھا۔ ۳۰۴ صفحات پر مشتمل یہ کتاب گلن برگ پبلیکیشن نے ۲۰۱۶ میں شائع کی۔

ڈاکٹر عباس رضا نیر کا کمال یہ بھی ہے کہ انہوں نے ادبی کتابوں کی تصنیف، تالیف، ترتیب، تدوین اور ترجمہ تو کیا ہی ہے اس کے علاوہ منفرد شناخت اٹھارٹی، آدھار کارڈ، ہندوستان (یو۔آئی۔ڈی۔اے۔آئی) حکومت ہند کی انگریزی ویب سائٹ کا اردو میں ترجمہ بھی کیا ہے اور یہ اس لیے بھی اہم ہے کہ موجودہ دور میں انتظامیہ سے متعلق اصطلاحات پر بہت کم کام ہوا ہے چنانچہ ڈاکٹر عباس رضا نیر کا یہ ترجمہ آزاد ہندوستان میں اصطلاحات سازی کا پہلا قدم ہے۔ اردو زبان کا دائرہ وسیع کرنے کے لیے ڈاکٹر عباس رضا نیر کے اس ترجمہ کو ہمیشہ قدر کی نگاہ سے دیکھا جائے گا۔

کتابوں کی تخلیق اور ترتیب تو بہر حال اہم ہے لیکن کسی کتاب کا دیباچہ، مقدمہ، تقریظ اور تعارف لکھنا بھی ایک باضابطہ تخلیقی عمل ہے۔ کوئی بھی قاری کتاب سے پہلے دیباچہ یا مقدمہ کو پڑھتا ہے۔ اور وہ دنیاے ادب کو اس کتاب کی نوعیت سے متعارف کراتا ہے گویا ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ کتاب کا مقدمہ، دیباچہ اصل میں کتاب کا آئینہ ہی نہیں بلکہ روح بھی ہوتا ہے۔ ڈاکٹر عباس رضا نیر نے بہت سی کتابوں کے دیباچے،

مقدمے اور تقریظیں بھی لکھی ہیں۔ یہ مقدمے دو نوعیت کے ہیں ایک وہ مقدمے جو ڈاکٹر نیر نے دوسرے مصنفین کی کتابوں پر لکھے ہیں اور ایک وہ جو خود انہوں نے اپنی کتابوں میں تحریر کیے ہیں۔ ان دونوں نوعیتوں کے مقدمے بھی دو مختلف کتابی صورت میں اختیار کر گئے ہیں۔ دوسرے مصنفین کی تصانیف پر لکھے ہوئے مقدمے ”دیباچے“ کے نام سے راقم الحروف نے اور خود اپنی تصانیف و تالیفات پر لکھے ہوئے ڈاکٹر نیر کے مقدمے ”دریچے“ کے نام سے یا سر جمال انصاری نے مرتب کیے ہیں جو ابھی حال ہی میں شائع ہوئے ہیں۔ اسی طرح ڈاکٹر عباس رضا نیر کے تبصروں کا مجموعہ بھی منتظر اشاعت ہے۔

کسی بھی ادبی تخلیقی یا دوسرے کاموں کا اعتراف کرنے کے لیے انکی حوصلہ افزائی بہت ضروری ہے اور کسی بھی کام کے لیے انعام اور اعزاز نہ صرف یہ کہ کسی کو حوصلہ دیتے ہیں بلکہ اس کی ذمہ داریوں کا مزید احساس دلاتے ہیں تو ڈاکٹر عباس رضا نیر کو ان کے ادبی سفر کے دوران تمام قومی اور بین الاقوامی اعزازات بھی حاصل ہوئے ہیں ہم ایک نظر میں ان انعامات اور اعزازات کو دیکھ سکتے ہیں۔ ڈاکٹر عباس رضا نیر کو قومی سطح پر حکومت اتر پردیش کی طرف سے دیا جانے والا سب سے بڑا اعزاز ”لش بھارتی سمان“ ۲۰۱۶ میں ملا اس کے ساتھ ساتھ انہیں شان اودھ، بھاشا سمان، کاویہ شرومنی سمان، ثاقب لکھنوی اوارڈ، رشید احمد صدیقی اوارڈ، ساہتیہ شری سمان، سد بھاؤ ناسمان، جون ایلینا اوارڈ، میکش غازی پوری اوارڈ، عرفان صدیقی ایوارڈ، اتر پردیش اردو اکادمی ایوارڈ اور اودھ پنچ ایوارڈ بھی ملے ہیں۔ ڈاکٹر عباس رضا نیر کو قومی سطح کے علاوہ بین الاقوامی سطح پر علامہ اقبال ایوارڈ، فرینکفرٹ، انجمن اردو ایوارڈ، جرمنی، المرتضیٰ ایوارڈ امریکہ، سیدہ نینب اوارڈ عراق اور انٹرنیشنل رٹائی ادب اوارڈ سے بھی نوازا گیا ہے۔

ڈاکٹر عباس رضا نیر کا علمی و ادبی سفر ہمیشہ سے ایک سمت و رفتار میں چل رہا ہے

جس کا ثبوت یہ ہے کہ ہندوستان ہی نہیں بیرون ملک بھی علمی اور ادبی سفر پر اکثر و بیشتر جاتے رہتے ہیں ہم یہاں پر ان ممالک کی نشاندہی کر کے آپ کے سامنے پیش کر رہے ہیں جس سے یہ اندازہ ہو جائے گا کہ ڈاکٹر عباس رضا نے خدمتِ اردو کے لیے کتنی محنت کر رہے ہیں جن میں چند نام یہ ہیں بنگلادیش، ماریشش، یونین، ایران، عراق، شام، پاکستان، امریکہ، جرمنی، لندن، پیرس، مسقط، بحرین، دبئی، جارجیا، سعودی عرب وغیرہ۔

اس کے علاوہ ڈاکٹر عباس رضا نے صوبائی اور قومی سطح پر مختلف یونیورسٹیوں میں بورڈ آف اسٹڈیز، فیکلٹی بورڈ، ریسرچ کمیٹی، نصابی کمیٹی، اکیڈمک کاؤنسل، ایکریڈیٹو کاؤنسل وغیرہ کے رکن ہیں۔ یوپی، بہار، ایم۔ پی پبلک سروس کمیشن، ہائر ایجوکیشن کمیشن وغیرہ میں بطور سبجیکٹ ایکسپٹ کام کرتے رہے ہیں۔ اسٹنٹ پروفیسر اور ایسوسی ایٹ پروفیسر کی دو درجن سے زیادہ سلیکشن کمیٹیوں میں ایکسپٹ رہ چکے ہیں۔

یہاں ڈاکٹر عباس رضا نے شخصیت اور ادبی خدمات کا ایک خاکہ پیش کیا گیا ہے لیکن استاد محترم ڈاکٹر نیر کا ادبی سفر ابھی تمام نہیں ہوا ہے بلکہ آج بھی یہ ادبی سفر جاری و ساری ہے۔ وہ آج بھی شعر و ادب کی خدمت میں مسلسل مصروف عمل ہیں جس کے سبب موقع موقع سے اچھے اور نایاب مضامین اور شعری تخلیقات اور خوبصورت تراجم منظرِ عام پر آتے رہتے ہیں۔

☆☆☆

ڈاکٹر عباس رضا نے: ایک تاثیراتی خاکہ

مجتبیٰ حسن صدیقی

آتش اور انیس کے وطن لکھنؤ سے مشرق جنوب میں قریب ۱۹۰ کلومیٹر کے فاصلے پر واقع ایک قصبہ ہے جلال پور، جو ہمیشہ ہی سے جائے مردم خیز اور گہوارہ علم و فن رہا ہے۔ اس کی خاک سے بڑے بڑے دانشور، علما، شعرا اور عظیم شخصیتوں نے جنم لیا ہے۔ یہ قصبہ جغرافیائی اعتبار سے تو لکھنؤ سے کافی دور ہے مگر ادبی و تہذیبی اعتبار سے لکھنؤ سے بے حد قریب۔ اس کا مزاج لکھنؤ کے مزاج سے کافی مماثلت رکھتا ہے۔ دونوں کے فکری عوامل کے محرکات کا سرچشمہ بھی ایک ہی ہے۔ گویا اپنے تہذیبی تناظر میں اس قصبہ کو لکھنؤ کا ایک محلہ کہا جاسکتا ہے۔ ڈاکٹر عباس رضا نے تعلق اسی تاریخی، تہذیبی اور ادبی خطہ زمین سے ہے۔

قصبہ جلال پور ڈاکٹر عباس رضا نے کی جائے ولادت تو ہے ہی ان کی نشو و نما اور شخصیت سازی میں اہم اور بنیادی کردار بھی اسی خطہ کا ہے۔ دورِ حاضر میں جب بھی اس قصبہ کا نام آتا ہے تو ذہن پر جو تصویر ابھرتی ہے اس پر ڈاکٹر صاحب کی شخصیت حاوی رہتی ہے۔ ایک عام انسان کی پہچان اس کے وطن سے ہوتی ہے مگر کچھ شخصیتیں ایسی بھی ہوتی ہیں جو اپنے وطن کی شناخت ہوتی ہیں۔ یہ پہلے تو اپنے وطن کی نسبت سے جانے جاتے ہیں مگر اپنی علمی صلاحیت اور خلاقانہ طبیعت کی بدولت دنیائے فن و ادب میں ایک نام پیدا کرتے ہیں اور اپنے وطن کی پہچان بن جاتے ہیں یعنی پہلے وہ اپنے وطن کے نام سے

پہچانے جاتے تھے پھر وطن ان کے نام سے پہچان پانے لگتا ہے۔ بلاشبہ ڈاکٹر عباس رضا نیر کا شمار انہیں شخصیتوں میں ہوتا ہے۔

ڈاکٹر صاحب کی طبیعت اور مزاج میں قلندرانہ شان پائی جاتی ہے۔ انکسار اور سادگی ان کی طبیعت کے جوہر خاص ہیں۔ بلندی اور انکساریہ دوا لسی متضاد چیزیں ہیں جو عموماً ایک شخص میں بیک وقت بڑی مشکل سے جمع ہوتی ہیں۔ یعنی اگر کوئی شخص ذی مرتبہ ہے تو وہ مغرور، متکبر اور احساسِ زعم و برتری کا شکار ہو جاتا ہے۔ مگر ڈاکٹر صاحب کی تعلیم و تربیت ایسے ادبی و مذہبی ماحول میں ہوئی ہے کہ جس کی بدولت ان کی شخصیت افتخار اور انکسار کے حسین امتزاج کا مظہر بن گئی ہے۔ جیسے جیسے ڈاکٹر نیر عظمت اور بلندی کے منازل طے کرتے جا رہے ہیں جیسے پھل آنے پر شاخیں اور زیادہ خم دار ہو جاتی ہیں، ان کی خاک ساری اور انکساری کی سطح بھی بلند ہوتی جا رہی ہے۔

ڈاکٹر صاحب کے لباس اور زندگی کے طور طریقوں میں تو سادگی پائی جاتی ہے مگر شخصیت میں ایسی دلکشی ہے کہ جو ایک بار بھی ان سے گفتگو کرتا ہے بس انہیں کا ہو کر رہ جاتا ہے۔ جب کرسی پر بیٹھ کر لکچر دیتے ہیں تو ایسا لگتا ہے جیسے میرامن جامع مسجد کی سیڑھیوں پر بیٹھے ہوئے باغ و بہار سنا رہے ہیں۔

میانہ قد، چوڑی پیشانی، سر پر متوسط مگر مضبوط بال، بڑی بڑی خوددار آنکھیں، ہلکا سا نولا رنگ، پر اعتماد چہرہ، ہلکی باریک مونچھیں، خوشی ڈاڑھی، لب پروردِ الہی، نگاہوں میں گہمیرتا اور ہاتھ میں بیگ لئے ہوئے جب یونیورسٹی میں داخل ہوتے ہیں تو ہر دیکھی ہوئی چیز کا مشاہدہ اس انداز سے کرتے ہیں کہ جیسے کوئی مفکر مطالعہ کائنات میں مصروف عمل ہے۔ ذرے میں کائنات دیکھنے کی کوشش انہیں سرگرم عمل رکھتی ہے جس کا اظہار ان کی شاعری کے نت نئے موضوعات اور عنوانات میں نظر آتا ہے۔

ڈاکٹر عباس رضا نیر کی ذات اپنے آپ میں کسی انجمن سے کم نہیں۔ وہ

روایت کی پاسداری کرتے ہوئے عصری طاقتوں کو صحت مند عناصر کے ساتھ پیش کرنے والے ایک بہترین شاعر بھی ہیں اور عمدہ نثر نگار بھی۔ ایک معتبر ناقد ہونے کے ساتھ ساتھ دیانت دار مترجم بھی ہیں۔ وہ مرتب بھی ہیں اور مولف بھی، خاکہ نگار بھی ہیں اور سوانح نگار بھی ساتھ ہی شعلہ بیان خطیب بھی ہیں اور مشاعروں کو کامیابی سے ہم کنار کرنے والے، سحر انگیز ناظم بھی اس کے ساتھ ہی وہ ایک شفیق استاد اور نیک انسان بھی ہیں۔ غرض جس بھی گوشہ ہائے ادب کی طرف نظر کرو ڈاکٹر صاحب کا پرچم لہراتا ہوا ملتا ہے جس کی بصیرت افروز ہوائیں ادب کے طلبہ میں اعتماد اور جوش پیدا کرتی ہیں۔

ڈاکٹر صاحب کی شاعری کا زیادہ تر حصہ نقدی شاعری پر مشتمل ہے۔ جہاں انہوں نے پاکیزہ جذبات و احساسات کو ندرت بیان اور جدت ادا کے ساتھ پیش کر کے حمد، نعت، منقبت، سلام، قصیدہ اور مرثیہ نگاری میں عقیدتوں کے چمن قائم کئے ہیں تو ساتھ ہی غزل و نظم و رباعی اور دیگر اصنافِ سخن میں اپنے امتیازات کا لوہا بھی منوایا ہے۔ ان کی غزلیں جدید لب و لہجہ کی ترجمانی کرتی ہیں لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ انہوں نے غزل کے مزاج سے چھیڑ چھاڑ کی یا غزل کے فن کو مجروح کیا ہے بلکہ اسے عصری تقاضوں سے ہم آہنگ کر کے شعری امکانات کے نئے درجے و اکائے ہیں۔ جہاں تک تنقیدی نگارشات کی بات ہے تو ان کے تنقیدی مضامین ایک الگ زاویہ نگاہ سے ادب کو دیکھتے ہیں۔ ان مضامین سے افہام و تفہیم کے میدان میں ایک نئے باب کا اضافہ ہوا ہے۔

ڈاکٹر نیر نے ترجمہ نگاری کے فن میں دیانت داری سے کام لیتے ہوئے نہ صرف دوسری زبان کے فن پاروں کا اردو زبان کی رواں دواں اور سلیس نثر میں بلکہ منظوم ترجمہ بھی کیا ہے اور اپنی خلافتِ قوت کی بدولت تخلیقی رنگ بھی دے دیا

ہے۔ مترجم کی حیثیت سے انہوں نے دوسری زبان کے ادب کو اردو ادب کے ذخیرے میں شامل کر کے اردو ادب کے کینوس کی توسیع کی ہے یہ ان کا بہت بڑا کارنامہ ہے۔

بات اگر مشاعروں میں نظامت کی کی جائے تو ڈاکٹر نیر کی نظامت مشاعروں کی کامیابی کی ضمانت ہوتی ہے۔ موقع محل کا صحیح اندازہ، خطے کی علمی و ادبی تاریخ سے کما حقہ و بعینہ سامعین کے مزاج تک رسائی، زبان و بیان پر ماہرانہ قدرت، حاضر جوابی اور تسلسل بیان کی خصوصیات سے آراستہ انسان ہی اس میدان میں کامیاب ہو سکتا ہے۔ ڈاکٹر صاحب میں یہ تمام خوبیاں بدرجہ اتم موجود ہیں۔ شاعروں کی تعداد کتنی ہی کیوں نہ ہو، جو چند جملے شاعر کی تمہید میں بولے جاتے ہیں ڈاکٹر عباس رضا نیر ہر شاعر کے مزاج اور مرتبے کے اعتبار سے الگ الگ جملے استعمال کرتے ہیں جو جذبات اور حقیقت سے مزین ہوتے ہیں۔ مثلاً کسی کے لیے ”رشتوں کے رکھ رکھاؤ کا شاعر“ تو کسی کے لیے ”ادبی روایتوں اور تہذیبی ثقافتوں کے امین“ تو کسی کے لیے ”شریعت کو شعریت میں ڈھالنے کا ہنر رکھنے والے شاعر“ جیسے بے شمار جملے جو شاعر کی شخصیت اور فن کے عکاس ہوتے ہیں ان کی زنجیل سخن میں موجود رہتے ہیں۔ جن کو بر محل استعمال کرنے کا ہنر انہیں خوب آتا ہے۔

ڈاکٹر عباس رضا نیر کی شخصیت اور فن کا احاطہ کرنا مجھ جیسے ناقص فہم اور محدود علم رکھنے والے طالب علم کے نزدیک جوئے شیر لانے کے برابر ہے اور ان پر کوئی رائے قائم کرنے کی جرأت کرنا آفتاب کو چراغ دکھانے کی مانند ہے پھر بھی اتنا ضرور کہوں گا کہ ڈاکٹر عباس رضا نیر جب بھی اشہب قلم کو فکر کا تازیانہ لگاتے ہیں تو ایک نئی راہ وجود میں آتی ہے جس کے راہی بھی وہی ہیں رہبر بھی وہی اور وہی منزل بھی۔ مگر ہاں، ان کا ہر نقش قدم کسی مشعل راہ سے کم نہیں ہے۔

☆☆☆

ابھی بچپن نظر آتا ہے تری باتوں میں

خورشید نگار

ہر انسان کی شخصیت سازی میں والدین کی آغوش تربیت، اجداد کے افکار و نظریات اور گھر کے ماحول کی کارفرمائی ہوتی ہے۔ انسان کی فطرت اور مزاج پر خون اور دودھ کے اثرات کی شمولیت کا انکار نہیں کیا جاسکتا۔ میری ماں کی آغوش میں جب میرے چھوٹے بھائی عباس رضا نیر نے آنکھیں کھولیں تو بچے کے معصوم چہرے پر ماں کی نظریں جم گئیں۔ بڑی اور خوبصورت آنکھیں، کشادہ پیشانی، ستواں ناک، گول چہرہ، گندمی رنگت، شکر رب کے ساتھ ماں کے ہونٹوں پر دعاؤں کے گلاب کھل اٹھے۔

”پالنے والے میرا بچہ بڑا ہو کر عالم بنے اور میرے ابا جان کے علم کی میراث کو زندہ رکھے کیونکہ میں بھائی سے محروم ہوں لہذا میرے بیٹے کو ہی اس قابل بنانا۔“

اسی پاکیزہ جذبے کے ساتھ نہایت اہتمام و احتیاط سے نیک نیر کی پرورش ہوئی۔ والد صاحب ایک محنتی اور دیانت دار مدرس ہیں جو اب ملازمت سے سبک دوش ہو چکے ہیں۔ گھر پر والدہ بھی ایک زمانے تک بچوں کو پڑھاتی رہیں اور ہمیشہ ماں باپ دونوں کا یہی جذبہ رہا کہ اگر ہم دیگر بچوں کو تعلیم کی دولت دیں گے تو ہمارے بچے بھی انشاء اللہ علم کی راہ میں ترقی کریں گے۔ بے شک ایک ماں کی آغوش اپنے بچے کے لیے سب سے بڑی دانشگاه ہے۔

واقعاً ہمارے والدین نے ہمارے چھوٹے سے مٹی کے گھر کو پودوں کی ہریالی اور پھولوں کی خوشبوؤں سے ایسا خوشگوار بنا دیا تھا جو علمی ماحول کے لیے نہایت سازگار تھا۔ والدین کو ہمیشہ اس بات کا خیال رہا کہ بچوں کو مطالعے کے دوران گھر کے ضروری امور سے دور رکھیں۔ لہذا اکثر وہ معمولی مگر ضروری کاموں کو خود انجام دیا کرتے تھے۔

ہمارے کچے مکان کی جلتی ہوئی لائین کی مدھم روشنی میں ہی نیر کو الفاظ و معنی کے باطن میں اترنے کا سلیقہ ملا۔ پھولوں کی اوٹ میں تتلیاں تلاش کرتے ہوئے ہم سنوں کی معصوم مسکراہٹ کو شاعری میں جگہ دینے کا ہنراپنے گھر کے گلشن سے ہی سیکھا۔ والدین کی بامشقت زندگی نے محرومیوں سے سمجھوتے کا حوصلہ بخشا۔ مادرگرامی کا تکیہ ”کلامِ ہمت مرداں مدد خدا“ میرے بھائی کے جذبہ محنت کو ہمت عطا کرتا رہا وہ علامہ اقبال کے اس شعر:

مٹادے اپنی ہستی کو اگر کچھ مرتبہ چاہے

کہ دانہ خاک میں مل کر گل گلزار ہوتا ہے

گو گنگنا کر اپنی تھکن کو ہلکا کر لیا کرتی تھیں۔ والدین کی مہربان آنکھوں کے زیرِ کرم، ان کے صلیج چہروں سے پھوٹی دعاؤں کی کرنوں اور ان کی مشفقانہ قریبوں کی خوشبوؤں کے سہارے نیر زندگی کی دھوپ کو سائے کی طرح اوڑھ کر آگے بڑھتے رہے اور سرد و گرم کا سامنا کرتے رہے۔ ماں باپ کی خودداری نے نیر کی ایسی پرورش کی تھی کہ انہوں نے کبھی اپنی انا کو مصلحت کی صلیب پر قربان نہیں ہونے دیا اور باعزت زندگی گزارتے رہے۔

زندگی یقیناً امیدوں، حسرتوں، خوشیوں، مایوسیوں اور خواب و خیال سے عبارت ہے۔ ہر شخصیت کی مختلف جہات ہوا کرتی ہیں۔ موصوف کی کتاب زندگی اور اس کے مختلف عناوین کے ابواب ورق ورق اور حرف حرف ہماری آنکھوں کے سامنے ہیں۔ بچپن کی تصویریں کا البم، خواہشوں کی پرواز، روٹھے منانے کا تسلسل، دلی شرارتیں، طفلانہ شوخیاں، جذبات کا خوبصورت بانگین، ظرافت کی رم جھم اور ہنسی مذاق وغیرہ وغیرہ

سب کچھ بہت عزیز بھی ہیں اور منفرد سرمایہ بھی۔ یہ الگ بات ہے کہ اپنی بے پناہ مصروفیات کے باعث کافی کافی عرصہ تک ملاقات نہیں ہو پاتی لیکن جذبے کی شدت میں کبھی کمی نہیں آنے دیتے۔ میں ہی نہیں خانوادے کے دوسرے افراد اور اہل وطن سے جتنی دیر کے لیے بھی ملتے ہیں ہینگی کی لذت کو دل میں بسا کر ملتے ہیں۔ ہمیشہ محبتیں بانٹنا اور محبتیں بٹورنا، کمن لہجے میں بزرگ باتیں کرنا سب کچھ اپنی مثال آپ ہے۔ ان کی زیر لب مسکراہٹ اور محبت بھری اپنے پن کی باتیں پڑوسیوں اور رشتہ داروں سبھی کے دلوں کو مومہ لیتی ہیں۔ نیر کے مزاج کی خوبی یہ ہے کہ انہوں نے اپنوں سے ملے زنجموں اور خراشوں کو بھی خندہ پیشانی سے قبول کیا ہے۔ آداب نشست و برخاست، رشتوں کا رکھ رکھاؤ، ماں بہنوں کے درمیان بہت ہی سادہ اور نظریفانہ انداز گفتگو، اساتذہ کی عزت، بزرگوں کی دعائیں لینا، شاگردوں سے محبت، بچوں کی حوصلہ افزائی، یہی وہ خوبیاں ہیں جو انہیں ہر دلعزیز بنائے ہوئے ہیں۔

نیر بہت متکسر المزاج انسان ہیں۔ علم کی راہ میں کمالات حاصل کرنے کا ایک راز یہ بھی ہے کہ انہوں نے ہر صاحب علم کی قدر کی ہے اور کسب فیض کی کوشش کی ہے۔ ہمارے نانا جان حکیم مولوی انصار حسین کیف مرحوم کی علمی، ادبی اور دینی شخصیت کے اثرات ان پر بہت واضح نظر آتے ہیں اور ان کی نصیحتوں نے ان کے روشن مستقبل کی راہ ہموار کی۔ نانا جان کی حکیمانہ اور منطقی گفتگو سے بچپن ہی میں ذہن کے درتچے وا ہونے لگے تھے۔ وہ حکیم ملت علامہ اقبال کے شیدا تھے انہوں نے شاعر مشرق کے بہت سے اشعار سنا کر ہمیں حفظ کرادیئے تھے۔ غالب اور دیگر شعرا کے فلسفیانہ اشعار کی گتھیوں کو سلجھانے کا گربھی ہم نے انہیں سے سیکھا۔

سچ ہے کہ حوصلہ افزائی کے چند الفاظ کبھی کبھی انسان کی زندگی بدل دیتے ہیں۔ والد صاحب بھی چند الفاظ نیر کی حوصلہ افزائی میں دہراتے رہتے۔ ”بیٹا ہمارا بڑا ہو کر

کتا میں ضرور لکھے گا۔ کتا میں انسان کو مرنے کے بعد بھی زندہ رکھتی ہیں۔“ والد صاحب نے کثیر تعداد میں کتابوں کا ذخیرہ کیا تھا۔ گھر میں مال و دولت کا فقدان ضرور تھا مگر کتابوں کے بندوبست میں کبھی کوئی کمی واقع نہ ہوئی۔ یہی وہ عمل تھا جس کو نیر مزید آگے بڑھاتے رہے۔ درجہ دوم ہی میں پڑھ رہے تھے کہ شاعری کا آغاز ہوا وہ بھی ان مصرعوں سے۔

اس پر نہ ہنسیں آپ کہ بچہ ہوں میں
کہنے میں ابھی شعر کے کچا ہوں میں

بچپن ہی سے رکھتا ہوں علیٰ سے الفت
حق بات زباں پر ہے کہ سچا ہوں میں

عزاداری کی تہذیبی روایات کے مطابق نیر سلمہ بھی سات سال کی عمر میں ہی نہ صرف یہ کہ منبر رسول پر بیٹھنے لگے بلکہ پورے ضلع میں حدیث خوانی کے لیے مدعو کیے جانے لگے۔ فرصت کے اوقات میں والدین اور ہم بھائی بہن بیٹھتے تو اکثر شعری نشست جیسی کیفیت پیدا ہو جاتی۔ ہم ایک دوسرے کو اپنے اپنے اشعار سناتے۔ والد گرامی کے ساتھ ساتھ والدہ گرامی بھی باذوق خاتون ہیں لہذا والدین کی جانب ہماری داد طلب نگاہیں اٹھ بھی جاتیں اور دعاؤں سے نوازی بھی جاتی تھیں۔ نیر جب بھی مجالس و محافل کے لیے ذہنی آمادگی کرتے تو اپنے خیالات ہم سب سے ضرور share کرتے اور ان کی ایک بڑی خوبی یہ بھی ہے کہ گھر میں ہوں یا سفر میں وہ اپنی روزمرہ کی مصروفیات سے والدین کو ضرور مطلع رکھتے ہیں اور ان کی دعائیں لیتے رہتے ہیں۔ شروع شروع میں تو وہ اپنی تخلیقات کو بذات خود ہم سب کو سناتے تھے مگر آج اللہ کا شکر ہے کہ ان کی مصروفیات اس قدر بڑھ گئیں اور تخلیقات میں اتنی وسعت اور وفور پیدا ہو گیا ہے کہ اب ہم ان کی تخلیقات سے اخبار و رسائل و کتب کے ذریعے آگاہ ہوتے رہتے ہیں اور خوش ہوتے رہتے ہیں۔

ہمیشہ نیر نے رشتوں کا پاس و لحاظ رکھا اور وقت کی بہت قدر کی۔ ہمارے لڑکپن

میں جب ہم باورچی خانے میں ہوتے تو خود بھی کھڑے ہو جاتے۔ چاہتے تو صرف گفتگو ہی کرتے رہ جاتے مگر نہیں.... باتیں بھی ہوتی رہتیں اور سبزیاں بھی کٹ جاتیں۔ نیر کو بچوں سے بھی بہت پیار ہے خود ان کی بیٹیاں ہوں یا دیگر بچے، سبھی ان سے مانوس رہتے ہیں۔ بچوں سے بچوں جیسی باتیں کرنا، ان کے ساتھ کھیلنا، روٹھے ہوئے بچوں کو منانا اور بڑی آسانی سے ان کی ناراضگی کو دور کر دینا، ان کی نفسیات کو سمجھ کر بچوں کو خوش کرنے کا ہنر بھی خوب جانتے ہیں۔ جب کبھی وہ گھر میں سکون سے بیٹھتے ہیں تو ان کا یہ شعر یاد آ جاتا ہے کہ:

مرے مزاج کو مصروفیت پسند مگر
کبھی کبھی بڑی فرصت میں رہنا چاہتا ہوں

مگر ایسا موقع شاذ و نادر ہی میسر آتا ہے۔ نیر بے حد مصروف اور بامشقت زندگی گزار رہے ہیں، شوق مطالعہ اس قدر کہ اگر کوئی نئی کتاب ہاتھ آجائے تو جب تک مکمل نہ ہو جائے سکون ہی نہیں ملتا۔ اپنے فرائض کی انجام دہی میں دن کو دن اور رات کو رات نہیں سمجھتے ہیں اور وہی انتھک کوششوں کا نہ ٹوٹنے والا سلسلہ ہے۔ شانے تھکن سے چور ہوئے جاتے ہیں، انگلیاں دکھنے لگتی ہیں، مگر قلم ہے کہ نہیں رکتا ہے۔ کسی شاعر پر جب یہی کیفیت گذرتی ہے تو وہ کہنے کا حقدار بھی ہو جاتا ہے۔

موتیوں میں تولیں گے لوگ میرے لفظوں کو
انگلیاں تراشی ہیں تب قلم بنایا ہے

میں جب بھی اپنے بھائی نیر کو تصور میں لاتی ہوں تو اس کی تصویر کچھ اس طرح ابھرتی ہے۔ مسافروں کی گرد، مسافروں کی تھکن، رتجگوں کا خمار، ذمہ داریوں کا بوجھ، فکر و خیال کی متلاشی نظریں، پھر کسی اگلے وعدے کی وفا کے لیے پابہ رکاب، نیر کی یہی وہ صورت ہے جو تمام اہل خانہ کی نگاہوں میں ہمہ وقت گردش کرتی رہتی ہے۔

جن کے رتبے ہیں سوا ان کو سوا مشکل ہے

کبھی کبھی نیر کے سامنے پیچیدہ صورت حال Complications پیدا ہو جاتی ہیں اور ان نامساعد حالات میں انہیں ایک سہارے کی ضرورت محسوس ہوتی ہے۔ شکر پروردگار کہ جس نے انہیں قوت بازو کی شکل میں کاشف رضا عرشی جیسا ہونہار چھوٹا بھائی عطا کیا ہے جو ہر اندیشے میں ان کے لیے سینہ سپر ہو جاتا ہے اس کا وجود نیر کے لیے ایک ڈھارس ہے۔

ہم اہل خانہ تمام اہل قلم حضرات کی اعلیٰ ظرفی اور قدردانی کو سلام کرتے ہیں، خصوصاً والدین کی دعائیں ان کے لیے جنہوں نے نیر کو ستائشی اور دعائیہ کلمات سے نوازا۔ ان اخبارات و رسائل اور ادارے کا شکریہ جو نیر کی ترقی کو تحریر اور تصویر دے کر تاریخ کا حصہ بنا رہے ہیں۔

علامہ ضمیر اختر صاحب کا یہ جملہ کہ ”عباس رضا نیر ہندوستان کے ادبی سفیر ہیں جو ادب کے ذریعہ اہلبیت کی تہذیب کو پوری دنیا میں پھیلا رہے ہیں۔“ پڑھ کر سرشکرا الہی میں جھک گیا اور محسوس ہوا کہ والدین کی وہ نیک امیدیں پوری ہو رہی ہیں جو نیر کے مستقبل سے وابستہ ہیں۔

اللہ انہیں ہمیشہ باصحت رکھے تاکہ اسی طرح سرگرم عمل رہیں۔ میں اکثر سوچتی ہوں کہ نیر کا معمول بھی کتنا غیر معمولی ہے۔ نہ کھانے پینے کا کوئی مقررہ وقت، نہ سونے جاگنے کی کوئی Routine، کون سی مٹی کے بنے ہیں، مطالعے کا خط سوار ہوتا ہے تو نیند حرام ہو جاتی ہے۔ آنکھیں سو جاتی ہیں پھر بھی ناگوار تھکن کو خوشگوار بنا کر، پہلو بدل بدل کر اپنا عمل جاری رکھتے ہیں۔ اور ”نرم دم گفتگو گرم دم جتو“ کی منہ بولتی تصویر نظر آتے ہیں۔ ہاں مگر تھکن کا احساس کم ہو جاتا ہے جب چاہنے والوں کے دست تحسین آفریں پیٹھ تھپتھا دیا کرتے ہیں۔

یاباب شہر علم! آپ سے اپنے بھائی کی رہنمائی و مشکل کشائی کے لیے التجا ہے۔ آمین۔

☆☆☆

﴿۴۳۷﴾

ڈاکٹر عباس رضا نیر: معاصر شعرا کی نظر میں

کلب عباس اشہر

اردو ادب کی امت میں اپنے پیہروں پر دیر سے ایمان لانے کی روایت اور اپنے محسنوں کو دیر سے پہچاننے کی عادت سی رہی ہے۔ اردو قوم کی اکثریت اپنے محسن ادیب کی زندگی میں موقع بہ موقع حوصلہ افزائی اور تشویق کرنے کے بجائے فاتحہ خوانی کی رسم ادا کرتے ہوئے ان کے لیے تحسین و تجئید کے کلمات ادا کرتی ہے۔ اور بقول شاعر اردو کے اکثر ادباء یہی کہتے ہوئے اس دار فانی سے رخصت سفر باندھتے ہیں:

زمانہ بڑے شوق سے سن رہا تھا
ہمیں سو گئے داستاں کہتے کہتے

لیکن موجودہ اردو نسل کے مختلف مضمون نگاروں، تبصرہ نویسوں، نثر نگاروں اور معتبر شاعروں نے اردو ادب کے عظیم خدمت گزار ڈاکٹر عباس رضا نیر کی ادبی شخصیت کا اعتراف اور ان کے ادبی کارناموں کو سراہتے ہوئے جس بے باکی سے اپنے اپنے خیالات کا اظہار کیا ہے وہ اس بات کے گواہ ہیں کہ موجودہ اردو نسل ڈاکٹر عباس رضا نیر کو بڑے شوق و غور سے سن بھی رہی ہے اور سمجھ بھی رہی ہے اور خود استاد عزیز ڈاکٹر عباس رضا نیر بھی اپنی پے در پے علمی و ادبی مایہ ناز تخلیقات کے ذریعہ یہ پیغام دے

﴿۴۳۸﴾

رہے ہیں کہ اگر میرے مخاطبین مجھے شوق سے سُن اور سمجھ رہے ہیں تو میں بھی اردو ادب کی ہمہ جہت خدمت کے لیے پوری طرح بیدار ہوں۔ غالباً اسی جذبہ کے تحت انہوں نے نہ صرف یہ کہ ادب کے مختلف میدانوں میں قدم رکھا بلکہ جس میدان میں داخل ہوئے اس میں شہرت و مقبولیت کی معراج کو پہنچ گئے۔ شعر و شاعری ہو یا نثر نگاری، ترجمہ نگاری ہو یا تنقید نگاری، خطابت ہو یا نظامت غرض ہر صنف اور ہر میدان میں اپنی الگ شناخت قائم کرنے میں کامیاب رہے۔ نظامت کا فن تو ان کی شخصیت سے کچھ اس طرح جو گیا ہے کہ ”نظامت“ کا لفظ سنتے ہی ذہن میں ڈاکٹر عباس رضانیر کا نام نامی ابھر آتا ہے۔

ڈاکٹر عباس رضانیر کی انہی علمی و ادبی خدمتوں کے قابل قدر تسلسل کو سراہتے ہوئے ڈاکٹر پیکر جعفری اتر ولوی جہاں صدق بیانی سے اپنے خیالات کو اشعار کا جامہ عطا کرتے ہیں وہیں ان کی زندگی کے مختلف اخلاقی پہلوؤں اور درس و تدریس کے میدان میں ان کی نمایاں کارکردگیوں پر نظر رکھتے ہوئے بڑی سچائی سے تہنیت پیش کرتے ہیں:-

کیا صحنِ ادب کو فکر سے گلزارِ نیر نے
کھلائے ہر طرح کے پھول سے اشعارِ نیر نے

یہ ان کے حوصلے کی عزم کی سچی گواہی ہے
چنے ہیں راستے چلنے کو جو دشوارِ نیر نے

معلم، دیدہ ور نقاد، شاعر، ناظمِ اعلیٰ
بنایا لمحہ لمحہ کس طرح باکارِ نیر نے

جگر کی روشنائی سے رواں کر کے قلم اپنا
بکھیرے ہیں نظر کے سامنے افکارِ نیر نے

خطابت اور نظامت کا چلا کر ہر طرف سکہ
کہے ہیں بے تحاشہ قیمتی اشعارِ نیر نے
کبھی اوجِ ثریا پر کبھی عرشِ معلیٰ پر
بلند اتنا کیا تحنیل کا معیارِ نیر نے

صدارتِ شعبہٴ اردو کی یہ آواز دیتی ہے
شعورِ علم کو کیسے کیا بیدارِ نیر نے

کہیں تنقید پر باتیں، کہیں الہام کے چرچے
بنایا ہے قلم کو اس طرح دُر بارِ نیر نے

شعاعِ نیرِ تاباں پہ قرباں چاند، سورج ہیں
چمک کر یہ دکھایا دہر کو ہر بارِ نیر نے

رہا پاس ادب اتنا، کیا ناز ادب اتنا
خوشی سے سن لیے بے ربط بھی اشعارِ نیر نے

ہوا ہے معتقد ان کا ملا اک بار جو پیکر
دیا ہے چاہنے والے کو اتنا پیارِ نیر نے

پیکر جعفری کا کلام پڑھنے کے بعد ایسا محسوس ہوتا ہے کہ شاعر کو عدمِ فرصتی کے اس دور میں ایک فردِ واحد کے اندر ایک معلم، دیدہ ور نقاد، شاعر، ناظم، ادیب و خطیب غرض مختلف شخصیتوں کا اجتماع نظر آ رہا ہے۔ اور اردو ادب ہی نہیں بلکہ عالمی ادب میں ایسی فرد کا وجود نایاب نہیں تو کیا ضرور ہے۔ لیکن شاعر کے خیال کے مطابق یہ

سب کچھ اسی سچے عزم و حوصلہ کے سبب ہے جو ہمہ وقت ڈاکٹر عباس رضانیہ کو ادبی سرگرمیوں میں منہمک رکھتا ہے۔

اسی طرح دور حاضر کے ایک اور معروف شاعر رفعت شیدا صدیقی دنیائے ادب کے نیر تاباں ڈاکٹر عباس رضانیہ کی ادبی تجلیوں اور اردو ادب کی گونا گوں خدمتوں کا اعتراف کرتے ہوئے کچھ اس خوبصورتی سے اپنے تاثرات کا اظہار کرتے ہیں کہ ہر مصرع ڈاکٹر عباس رضانیہ کی علمی، ادبی اور اخلاقی زندگی کی عمارتوں کے مختلف دروازوں کا ایک ایک پٹ کھولتا چلا جاتا ہے:

تہذیب کا جھومر ہیں عباس رضانیہ
اخلاص کا پیکر ہیں عباس رضانیہ

اعزازِ حسین بھاشا سمان مبارک ہو
تعلیم کا جوہر ہیں عباس رضانیہ

لکھے گا مورخ بھی خدماتِ ادب اک دن
تاریخِ منور ہیں عباس رضانیہ

تم ان کو کسی صورت قطرہ نہ سمجھ لینا
دراصل سمندر ہیں عباس رضانیہ

اس درجہ جگر سوزی، کی شعبہ اردو میں
ہیں نقش ہر اک دل پر عباس رضانیہ

الفاظ پروئے ہیں اشعار میں بے نقطہ
صد رشکِ سخنور ہیں عباس رضانیہ

اردو کی حویلی کی تزئین نگاری میں
آداب کا جھومر ہیں عباس رضانیہ

ہندی کے گیانی بھی پڑھتے ہیں جسے شیدا
اردو کا وہ بینر ہیں عباس رضانیہ

”تہذیب کا جھومر، اخلاص کا پیکر، تعلیم کا جوہر، تاریخِ منور، صدر رشکِ سخنور، اردو کا بینر“ جیسی لفظیات اور تشبیہات و استعارات کے سہارے شاعر نے ڈاکٹر عباس رضانیہ کی ہمہ جہت شخصیت اور آپ کی ہمہ گیر ادبی خدمات کو جس جامعیت سے بیان کیا ہے وہ موجودہ اردو نسل میں نیر شناسی کے جذبات کی خاطر خواہ موجودگی کا پتہ دیتی ہے۔

یوں تو ڈاکٹر عباس رضانیہ کی تقریباً ہر تخلیق دورِ حاضر کے ادباء و شعراء کی توجہ کا مرکز رہی ہے لیکن شعری تخلیق میں آپ کا رثائی کلام ”الہام“ جو حضرت علیؑ کے غیر منقوط خطبہ کا غیر منقوط منظوم ترجمہ ہے اور جو مذہبی، ادبی اور تکنیکی سطح پر اپنی انفرادیت کے باعث مقبولیت و شہرت کی انتہا کو پہنچا ہوا ہے، ادباء و شعراء کی خاص توجہ کا مرکز بنا ہوا ہے۔ اور میری اس بات کی تصدیق اُن عبارتوں سے بھی ہوتی ہے جو ڈاکٹر عباس رضانیہ کی ادبی خدمات و تخلیقات پر تبصرہ اور اپنے تاثرات کا اظہار کرتے ہوئے تبصرہ نویسوں، نثر نگاروں اور شاعروں نے اپنی تحریروں میں جہاں اور تخلیقات کا ذکر کیا ہے وہیں ”الہام“ کو نہ صرف یہ کہ خصوصیت کے ساتھ یاد کیا گیا ہے بلکہ بعض مضامین اور تاثراتی اشعار تو آپ کے رثائی شاہکار ”الہام“ ہی کو بطور خاص اپنا موضوع بنائے ہوئے ہیں۔ انہیں میں ایک معتبر شاعر ناز پرتاپ گڑھی ہیں جنہوں نے رباعی کی ہیئت میں مسدس (الہام) کی خوب داد دی ہے۔ یہ رباعیاں ”الہام“ کے تئیں شاعر کے نجی جذبات کی سچی ترجمان بھی ہیں اور الہام گو کے حسنِ اعتقاد کا مظہر بھی:

تسلیم تری خامہ فرسائی کو
”الہام“ میں تخلیق کی گہرائی کو

عباس رضا نیر میں تجھ پہ نثار
اب کون چھوئے گا تری دانائی کو

”الہام“ کی کیفیات کے سائے ہیں
جو نیر کے حصے میں آئے ہیں

خطباتِ علی مولّا جو نظم ہوئے
لگتا ہے یہ اللہ نے لکھوائے ہیں

کچھ قید نہیں صبح پڑھو شام پڑھو
رحمت کا پاؤ گے انعام پڑھو

ہے نادِ علیؑ والا روحانی کیف
عباس رضا نیر کا ”الہام“ پڑھو

☆☆☆

”الہام“ کے انداز ہیں کیسے کیسے
تہہ میں کوئی جائے تو نہ واپس ابھرے

مستعمل صنعتیں تو کچھ ایسی ہیں
معدومِ ادب تھیں جو اک مدت سے

☆☆☆

لبریز عقیدت سے ہے ”الہام“ یہ جان
پڑھنے سے اسے ہوتا ہے تازہ ایمان

ہیں بحرِ مضارع میں اوزان اس کے
شہکار یہ بخشش کا ہوگا سامان

شاعر نے اپنی مذکورہ بالا رباعیوں میں ”الہام“ کے دیگر خصوصیات کے ساتھ
اس میں برقی گئی ان صنعتوں اور اس تکنیک کی طرف اشارہ کیا ہے جو ادب میں ایک
مدّت سے غائب تھیں۔ انھیں گمشدہ صنعتوں کو ایک بار پھر بڑے اعتماد کے ساتھ ڈاکٹر
عباس رضائی نے جدید اردو نسل سے روشناس کرایا ہے۔

ادب پاروں کی قدروں کے تعین میں تخلیق کار کی شخصیت کا مطالعہ ضروری
نہیں تو سودمند ضرور ہے۔ درست ہے کہ ہمیں کس نے کہا ہے سے نہیں، کیا کہا گیا
ہے، سے سروکار ہونا چاہئے لیکن یہ بالکل ایسا ہی ہے جیسے ہم کسی ایکٹر کی ایکٹنگ کے
ذریعہ کسی اہم شخصیت کے حقیقی کردار کو صد در صد دیکھنے کی کوشش کریں جو کہ ناممکن
ہے۔ کیونکہ ایکٹر میں کبھی بھی حقیقی کردار کے وہ حقیقی احساسات و جذبات نہیں
آسکتے۔ اسی طرح کسی ادبی تخلیق کے سہارے تخلیق کار کے صد در صد ان احساسات
و جذبات کو درک نہیں کیا جاسکتا جو تخلیق کے وقت اس پر حاوی تھے۔ لیکن اگر تخلیق کار
کے اخلاق و کردار اور اس کی خاص عادات و اطوار کا علم ہو تو تخلیق کی معنویت کا
ادراک قدرے آسان ہو جاتا ہے۔ یہی وہ مقام ہے جہاں موجودہ اردو نسل کو
”دریا چودہ لہروں کا، ادبی میزان، آہٹ پانچویں موسم کی، الہام، رثائی تنقیدیں“
اور ڈھیر ساری دوسری تخلیقات کے تخلیق کار کو جاننے اور پہچاننے کے پیرایے یا یوں
کہا جائے کہ نیر شناسی کی اہمیت واضح ہو جاتی ہے۔ اور یہ مشکل کام مضمون نگاروں

ساتھ ساتھ شعراء نے بھی اپنے ذمہ لیا ہے۔ رثائی ادب کے تعلق سے عصر حاضر کے معروف شاعر ذوالفقار جلال پوری نے ڈاکٹر عباس رضا نیر کی انسانی، اخلاقی، ادبی خصوصیات کو اپنی نظم میں بڑی خوبصورتی کے ساتھ علامتی پیرایہ میں بیان کیا ہے:

وہ ایک نیر

چمک رہا ہے

جہاں کو پر نور کر رہا ہے

نہ رک رہا ہے نہ تھک رہا ہے

وہ اپنے محور پر چل رہا ہے

حیات افزا کرن ہے اس کی

چمن چمن ہے اسی سے رنگت

وہ روشنی بانٹتا ہے سب کو

وہ کوہ و صحرا ہو یا بیاباں

وہ غیر کا گھر ہو

یا محل ہو کسی دھنی کا

رشی کی کٹیا ہو

یا ہو محراب مسجدوں کی

سبھی پہ اس کی نگاہ یکساں

سبھی ہیں اس کے لیے برابر

فلک کے نیر کی ہے یہ عظمت

اسی سے پر نور کل جہاں ہے

ہے ایک نیر زمین پر بھی

ہے جس سے میرے وطن کی زینت
یہ اپنی محنت سے اور لگن سے
نئے جزیرے تلاش کرتا
نئے مضامین کے گل کھلاتا
نئی کتابوں میں رنگ بھرتا
نئے نئے زاویے ادب کے نکالتا ہے
قلم کو دے جب بھی اپنے جنبش
تو راز سر بستہ گزشتہ
کرے وہ نوکِ قلم سے افشا
زبان اس کی
ہے صاف شستہ
نپا تلا ہے بیان اس کا
زبان کھولے
تو موتی رولے
سمندروں کی تہوں میں اترے
کبھی فلک کی بلندیوں پہ
پراپنے تو لے
کبھی خطابت کو روشنی دے
کبھی نظامت کو دلکشی دے
کبھی سلاموں کو تازگی دے
کبھی وہ نوحوں کو زندگی دے

کبھی سجائے وہ مرثیوں کو
 کبھی غزل کو عروج بخشے
 ہر ایک دھڑکن ہے وقف اس کی
 فروغِ علم و ادب کی خاطر
 ہمیشہ کرتا ہے وہ یہ کوشش
 زمیں کے ذروں میں نور بھردوں
 اور ان میں اتنا شعور بھردوں
 کہ آسمان کے سبھی ستارے
 زمیں کے ذروں سے نور مانگیں
 لبوں پہ اس کے
 یہی دعا ہے
 مرے خدا
 مجھ کو دے دے کچھ اتنی طاقت
 فلک کے نیر کی طرح میں بھی
 پیام دیتا ہوں
 زمانے کو روشنی کا
 ادب کے گلشن کو دوں میں سوغات تازگی کی
 کہ جیسا نیر ہے نام میرا
 کروں میں ویسا ہی کام مولا
 یہ ذہن و دل کی پکار بھی ہے
 ترانہ ذوالفقار بھی ہے

اسی طرح جدید نظم کے ایک نمائندہ شاعر طارق قمر جن کا برسوں سے اردو ادب
 کے ساتھ میڈیا اور صحافت سے بھی گہرا رشتہ ہے، ان کی زبانی ایک ایسی خوبصورت نظم
 سننے کو ملتی ہے جو زبان و بیان، لب و لہجہ کی دلکشی کے ساتھ ساتھ ڈاکٹر عباس رضانیر کی
 تخلیقی و تنقیدی کاوشوں اور آپ کی تقریباً تمام علمی و ادبی سرگرمیوں کی طرف اشارہ کرتی
 ہے۔ پہلی بار جب میں نے یہ خوبصورت سی جامع و مانع نظم ڈاکٹر عباس رضانیر کی ایک
 ساتھ تین کتابوں کی رسم اجرا کے موقع پر خود شاعر کی زبانی سنی تو ایسا محسوس ہوا گویا یہ نظم
 نہیں بلکہ ڈاکٹر عباس رضانیر کے ادب پر قلم کا ادبی سفر نامہ ہے جس میں ان کے انتھک
 قلم کی روداد کو مناسب لفظیات کی مدد سے بیان کیا گیا ہے۔ نظم پیش ہے:

عجب قلم ہے یہ اک قلم جو جناب نیر کے ہاتھ میں ہے
 اس اک قلم کے ہی دائرے میں اداس نسلوں کی داستانیں
 اجاڑ صدیوں کے فاصلے ہیں
 اس اک قلم نے ہی طے کئے ہیں ہزار صحرا شکست اقدار رفتگاں کے
 ہزار نو حے لکھے ہیں اس نے فرات جاں تیرے تشنہ گاہ کے
 اس اک قلم کے ہی تشنہ لب پر شکست دل کی حکایتیں ہیں
 کتاب نیر کے ہر ورق پر لہو سے تحریر آیتیں ہیں
 ہیں اس قلم کی ہی دسترس میں ہزار افکار دلربائی
 حکایت دل، حکایت جاں، حکایت درو آشنائی
 ہزار رشتوں میں جاگزیں ایک رشتہ اعتبار اس کا
 رواں دواں ہے تمام صدیوں میں لمحہ انتظار اس کا
 یہ وہ قلم ہے جو ترجمان ہے تمام اسرار زندگی کا
 یہ وہ قلم ہے جو نور حق ہے، چراغ ہے بزم تشنگی کا

کہیں یہ مرہم بنا ہے یہ اور کہیں پرتلوں ہو گیا ہے
یہ دشمنوں کے لیے بھی اکثر خلوص و ایثار ہو گیا ہے
سوال بیعت اٹھا ہے جب بھی سراپا انکار ہو گیا ہے
یہ اک قلم جو جناب نیر کے ہاتھ میں ہے

اسی قلم کو دلوں میں نورِ نوائے عرفاں کی لوجگانے کی آرزو ہے
اس اک قلم کو ہی خاک و دھتِ ہنراڑانے کی آرزو ہے
غم و الم کی غزل بنانے کی آرزو ہے
سلام لکھنے کی اور سنانے کی آرزو ہے
یہ نوحہ گر بھی ہے نوحہ خواں بھی یہی قلم ہے
ادب کی قدروں کا ترجمان بھی یہی قلم ہے
یہ اک قلم جو جناب نیر کے ہاتھ میں ہے

یہ وہ قلم ہے جو مسجدوں اور مندروں میں دعا کے دیک چلا رہا ہے
امام گاہوں میں خانقاہوں میں اپنے سر کو جھکا رہا ہے
کہیں اذانیں بھی دے رہا ہے کہیں بھجن بھی سن رہا ہے
یہ گردوارے سے آ رہا ہے، یہ اک کلیسا میں جا رہا ہے
سبق و وفا کا پڑھ رہا ہے زبانِ اردو بچار رہا ہے ادب کا پرچم اٹھا رہا ہے۔

یہ اک قلم جو عظیم رہبر کے ہاتھ میں ہے
ادب کے پیکر کے ہاتھ میں ہے
نقیب منبر کے ہاتھ میں ہے
سلام طارق کا اس قلم کو
یہ اک قلم جو جناب نیر کے ہاتھ میں ہے

طارق قمر کی زبانی ڈاکٹر عباس رضا نیر کے قلم کی کہانی سننے کے بعد اب
صاحبِ قلم کی ہمہ جہت شخصیت اور ان کے متنوع ادبی و علمی کارناموں کی داستان اور
ادب کی دنیا میں اُس صاحبِ قلم کے ادبی مقام کی داد دیتی ہوئی نظم بھی ملاحظہ ہو جو ہاشم
جلالپوری کے افکار کا نتیجہ ہے:

زمانہ کیوں نہ کرے احترامِ نیر کا
ادب کے عرش پہ روشن ہے نامِ نیر کا
کبھی بھی مٹ نہیں سکتا سلامِ نیر کا
فضا میں گونج رہا ہے کلامِ نیر کا

وہ شاعری ہو، نظامت ہو یا خطابت ہو
ہر ایک فن میں ہے اعلیٰ مقامِ نیر کا
قلم سے ہوتی رہے روزِ اک نئی تخلیق
یہی تو کام ہے ہر صبح و شامِ نیر کا
وہ شاعری ہو کہ ہو ترجمہ کہ ہو تنقید
ہر ایک نقش ہے نقشِ دوامِ نیر کا

لبوں سے جس کو لگائے ہوئے ہیں اہلِ ادب
شراب ہے اگر اردو تو جامِ نیر کا
ہر ایک صنفِ ادب پر ہے دستِ رس ان کی
بہت حسین ہے ہر اہتمامِ نیر کا

یہ سلسلہ نہیں محدود عصرِ حاضر تک
ہر ایک نسل پہ ہے فیضِ عام نیر کا

ہے ان کے نام میں عباس اور رضا ہاشم
بہی سبب ہے جو اونچا ہے نام نیر کا

ہاشم جلالپوری کی مذکورہ نظم کے ایک دو شعر تو زباں زد خاص و عام ہو چلے
ہیں۔ جو بڑی سادگی و روانی سے ڈاکٹر عباس رضانی کی علمی و فنی مہارت کو بیان کرتے
ہیں مثلاً یہ دو شعر:

وہ شاعری ہو نظامت ہو یا خطابت ہو
ہر ایک فن میں ہے اعلیٰ مقام نیر کا

وہ شاعری ہو کہ ہو ترجمہ کہ ہو تنقید
ہر ایک نقش ہے نقشِ دوام نیر کا

عباس رضانی عصر حاضر کے ان خوش نصیب شاعروں و ادیبوں میں ایک اہم
مقام اس لیے رکھتے ہیں کہ ان کی شخصیت اور فن پر نثر میں تو لکھا ہی جا رہا ہے ساتھ ہی
ساتھ شاعری کی شکل میں بھی ان کی شخصیت و فن کو پرکھنے کی کوشش کی جا رہی ہے۔ اسی
سلسلے کی ایک کڑی سید انور جمال انور کی درج ذیل نظم میں بھی ڈاکٹر عباس رضانی کی
شخصیت و فن پر فنی بصیرت کے ساتھ روشنی ڈالی گئی ہے۔

تحقیق میں یکتا ہیں عباس رضانی
ہر بھیڑ میں تنہا ہیں عباس رضا نیر

عالم ہیں مقرر ہیں استاد ہیں شاعر ہیں
کیا جانے کیا کیا ہیں عباس رضانی

ہم جب بھی ملے ان سے پایا ہمہ تن مشفق
اخلاقِ سراپا ہیں عباس رضانی

جو علم کا طالب ہو مل کر تو ذرا دیکھے
اک علم کا دریا ہیں عباس رضانی

حالات کی کیسی ہی پرزور تمازت ہو
شاگرد پہ سایہ ہیں عباس رضانی

کس درجہ میں شاداں ہوں کیا عرض کروں انور
آج انجمن آرا ہیں عباس رضانی

ڈاکٹر عباس رضانی کی علمی و ادبی خدمات کو خراج تحسین پیش کرنے کا یہ سلسلہ
بڑا طویل ہے جو ملک و بیرون ملک تک پھیلا ہوا ہے۔ اور جیسا کہ شروع میں ذکر ہوا،
اقدار نیر کی برسی اور داد و تحسین کا یہ سلسلہ جہاں نثری صورت میں اپنی قابل توجہ طوالت
رکھتا ہے وہیں شعری روپ میں بھی نیر شناسی اور نیر فہمی کا یہ سلسلہ اب تک ادب کے بہت
سے اوراق رنگین کر چکا ہے۔ جو ڈاکٹر عباس رضانی کے قابل قدر تخلیقی اور تنقیدی
کارناموں اور مختلف فنون میں آپ کی مہارت کے پیش نظر بے اساس نیر ستائی پر محمول
نہیں کیا جاسکتا۔ بلکہ یہ پہلو بھی اردو شعر و ادب میں ڈاکٹر نیر کے ادبی مرتبے کے تعین
کے لیے ایک اور روشن جہت قائم کرنے کا معنوی التزام ہے۔

☆☆☆

عباس رضانیر کی سرپرستی میں شعبہ اردو لکھنؤ یونیورسٹی کی ادبی سرگرمیاں

محمد شاہد رضا

لکھنؤ یونیورسٹی کا شعبہ اردو اپنے قیام سے ہی مشاہیر اساتذہ کا مرکز و محور رہا ہے۔ شخصیات کے اعتبار سے پروفیسر سید مسعود حسن رضوی ادیب، پروفیسر احتشام حسین، پروفیسر آل احمد سرور، پروفیسر نور الحسن ہاشمی، پروفیسر شجاعت علی سندیلوی، پروفیسر سید شبیہ الحسن، پروفیسر سید محمود الحسن اور پروفیسر سید انیس اشفاق عابدی اور موجودہ وقت میں صدر شعبہ اردو ڈاکٹر عباس رضانیر ہیں جو عالمی شہرت یافتہ شخصیت کے حامل ہیں۔ ڈاکٹر عباس رضانیر نے اپنی قائدانہ صلاحیت سے شعبہ اردو کی شان و شوکت و عالمی شناخت کو صرف محفوظ ہی نہیں کیا بلکہ اس میں مزید چار چاند لگائے اور بین الاقوامی (لندن، پیرس اور امریکہ وغیرہ) کے ادبی دورے کر کے شعبہ اردو کی عالمی شناخت کو برقرار رکھا۔

یوں تو شعبہ اردو میں ابتدا سے ہی ادبی تقاریب کا انعقاد ہوتا رہا ہے۔ مختلف مواقع پر سمینار و کانفرنس بھی شعبہ اردو کے ماتحت منعقد ہوتے رہے ہیں۔ لیکن جولائی ۲۰۱۲ء جب سے شعبہ اردو ڈاکٹر عباس رضانیر کے زیر نگرانی آیا تب سے شعبہ اردو کی ادبی سرگرمیوں میں مزید اضافہ ہو گیا ہے۔ یہ شعبہ ادبی رجحان سازی میں اہم کردار نبھا رہا ہے۔ قیام شعبہ اردو سے جولائی ۲۰۱۲ء تک اور ڈاکٹر عباس رضانیر کے زیر نگرانی

جولائی ۲۰۱۲ء سے اگست ۲۰۱۷ء تک شعبہ اردو میں ادبی سرگرمیوں کا اگر جائزہ لیا جائے تو یہ نتیجہ برآمد ہوگا کہ ۵۰ سال کے وقفے میں اتنی ادبی تقاریب کا انعقاد نہیں ہو سکا جتنے ۵ سال کے دورانیہ میں ڈاکٹر عباس رضانیر کے زیر صدارت ادبی تقاریب کا انعقاد ہوا۔ اور اس کا بین ثبوت ”قدم بہ قدم“ ہے۔ ”قدم بہ قدم“ یہ ایک ادبی تقاریب کی ایک تاریخی دستاویز ہے جو شعبہ اردو کی جانب سے شائع ہوئی ہے۔ دو جلدوں میں شائع ہونے والی دستاویز بعنوان ”قدم بہ قدم“ میں تاریخوار ایک ایک تقریب محفوظ ہے۔ اور کچھ اہم پروگراموں کو انٹرنیٹ (Youtube) پر بھی دیکھا جاسکتا ہے۔ اس دستاویز کے سہارے میں ”شعبہ اردو کی ادبی سرگرمیاں“ کے عنوان سے کچھ ادبی تقاریب کو تاریخوار ذیل میں پیش کیا جا رہا ہے۔

پروفیسر انیس اشفاق صاحب کی سبکدوشی کے بعد ۲۶ ستمبر ۲۰۱۲ء کو شعبہ اردو کے مسعود حسن رضوی سمینار ہال میں ”اردو ٹیچنگ اینڈ ریسرچ انسٹی ٹیوٹ اور خواجہ معین الدین چشتی اردو، عربی، فارسی یونیورسٹی کے اشتراک سے ”اردو شعراء کی انسائیکلو پیڈیا“ کے عنوان سے پانچ روزہ ورکشاپ کا پانچواں اور آخری پروگرام شعبہ اردو میں اختتام پذیر ہوا۔ جس کی صدارت پروفیسر انیس اشفاق صاحب نے کی اور نظامت کے فرائض شعبہ اردو کے استاد ڈاکٹر عباس رضانیر نے ادا کی۔ مہمان ذی وقار کی حیثیت سے آئے ماہر لسانیات پروفیسر نصیر احمد خاں نے کہا کہ ورکشاپ کے شرکاء نے پانچ دنوں کی محنت کے بعد ہر عہد کے شعراء کے سوانحی کوائف اور شعری خدمات سے متعلق ایسی دستاویز تیار کی ہے جو اختصار اور جامعیت کا مثالی نمونہ ہوگی۔

شعبہ اردو میں کاظم علی خاں کے انتقال پر ایک تعزیتی جلسہ میں ڈاکٹر کاظم علی خاں مرحوم کو خراج عقیدت پیش کیا گیا۔ پروفیسر انیس اشفاق نے اپنے صدارتی کلمات میں ان کو خراج عقیدت پیش کرتے ہوئے کہا کہ اردو کی دنیا کے تحقیق میں جن صاحبان

قلم نے اپنی ادبی ریاضت اور عالمانہ متانت سے تحقیق کے چراغ روشن کئے ان میں کاظم علی خاں کا نام بہت نمایاں ہے۔

کاظم علی خاں نے میر، غالب، سودا، مصحفی، نسخ، انیس، دبیر اور نسیم پر لکھنؤ کے تعلق سے جو تحقیقی کام کیا ہے اردو کا ہر محقق اس کا معترف ہے۔ ڈاکٹر عباس رضانیر نے نظامت کے فرائض انجام دیتے ہوئے کہا کہ اپنی اہم اور گرانقدر تحریروں کے ذریعہ کاظم علی خاں نے بہت جلد اعتبار حاصل کر لیا۔ اس موقع پر مختلف کالج کے اردو استاذہ نے بھی اپنے خیالات کا اظہار کیا۔

۲۰۱۲-۲۰۱۳ء کو لکھنؤ یونیورسٹی کے مالویہ ہال میں ”ملک الشعراء دوار کا پرشاد افق“ کی حیات و خدمات کے عنوان سے ایک سمینار کا انعقاد کیا گیا جس کی صدارت سابق استاد شعبہ اردو لکھنؤ یونیورسٹی پروفیسر ملک زادہ منظور احمد نے کی اور مہمان خصوصی کی حیثیت سے عزت مآب بی۔ ایل جوشی گورنر اتر پردیش شامل ہوئے۔ مہمان اعزازی کے طور پر جی۔ بی پٹنا تک وائس چانسلر لکھنؤ یونیورسٹی، ڈاکٹر سدھا کرادیب، ڈاکٹر ہندی سنسٹھان یوپی، سینئر صحافی و افسانہ نگار عابد سہیل، پروفیسر شارب ردولوی شریک ہوئے۔ سمینار کی نظامت ڈاکٹر عباس رضانیر نے کی۔ سمینار میں خطاب کرتے ہوئے مہمان خصوصی عزت مآب گورنر اتر پردیش بی۔ ایل جوشی نے کہا کہ ”اردو زبان کسی مذہب یا ذات کی زبان نہیں ہے۔“ پروفیسر ملک زادہ منظور احمد نے صدارتی تقریر کرتے ہوئے کہا کہ ”دوار کا پرشاد افق نے اردو زبان و ادب کے فروغ کے لیے ہر ممکن کوشش کی ہے اور تاریخ گواہ ہے کہ اردو زبان و ادب میں منظوم صحافت کی ابتدا آپ ہی کی مرہون منت ہے۔ آپ کا عظیم کارنامہ ”رامائن کا“ اردو ترجمہ کرنا ہے۔ لکھنؤ یونیورسٹی کے وائس چانسلر جی۔ بی پٹنا تک نے کہا کہ دوار کا پرشاد افق کی شاعری جدید و قدیم کا ایک حسین سنگم ہے۔ انہوں نے کلاسیکل اردو ادب کو جدید تصورات سے مزین کر دیا۔ اس کے

علاوہ دیگر مقررین نے اپنے خیالات کا اظہار کیا اور شہر کے معززین نے اپنی حاضری درج کرا کے پروگرام کو کامیاب کیا۔

۸/ فروری ۲۰۱۳ء کو شعبہ اردو میں مشہور پاکستانی شاعرہ فہمیدہ ریاض کا پر جوش استقبال اور طے شدہ پروگرام کے تحت ایک ادبی نشست منعقد ہوئی۔ پاکستان کی معروف ادیب و شاعرہ فہمیدہ ریاض نے اپنی ادبی زندگی کا سفر نامہ پیش کرتے ہوئے کہا کہ ”میری تحریریں میرے ہنگامہ خیز اور پر آشوب مسائل کی آئینہ دار ہیں۔ میں نے ان انسانی اور سماجی اقدار کی ترجمانی کی ہے جن کا تحفظ ہم سب پر واجب ہے۔ اس عہد کی ستم دیدہ اور مظلوم عورت میری نظموں کا مرکزی موضوع ہے۔“ ظلم کے خلاف احتجاج اور مزاحمت میری زندگی کا بنیادی اصول ہے اور اسی اصول کی پیروی کی پاداش میں مجھے دوبار اپنے ملک سے جلاوطن ہونا پڑا۔ پروفیسر انیس اشفاق نے کہا کہ ”فہمیدہ ریاض کی شاعری میں احتجاج اور مزاحمت کے عنصر بہت نمایاں ہیں۔“ تقریب کی نظامت ڈاکٹر عباس رضانیر نے کی۔ اپنی نظامت کے درمیان انہوں نے فہمیدہ ریاض کی شاعری کی اہمیت و معنویت پر سیر حاصل گفتگو کی۔ ۱۲/ مارچ ۲۰۱۳ء کو شعبہ اردو کے مسعود حسن رضوی سمینار ہال میں ڈاکٹر تقی عابدی کی کتاب ”دیوان رباعیات انیس“ کا اجرا کرتے ہوئے آل انڈیا مسلم پرسنل لا بورڈ کے نائب صدر ڈاکٹر کلب صادق نے کہا کہ یہ کتاب ڈاکٹر تقی علی عابدی کا عظیم کارنامہ ہے۔ پروفیسر شارب ردولوی نے ڈاکٹر تقی عابدی کی کتاب پر اظہار خیال کرتے ہوئے کہا کہ عابدی صاحب نے ادب کا سائنسی تجزیہ کیا ہے آج ان جیسا نقاد اور مدون نہیں ہے۔ میر انیس کی تمام رباعیات کی تدوین کے ساتھ ہی اس کی موضوعاتی تقسیم بھی کی ہے اردو ادب بالخصوص رثائی ادب کے لیے ان کی خدمات قابل تحسین ہیں۔ معروف صحافی اور ادیب شاہنواز قریشی نے کہا کہ ڈاکٹر عابدی نے فیض احمد فیض، فراق گورکھپوری، علامہ اقبال اور مرزا غالب وغیرہ پہ بہت کام کیا ہے۔

پروفیسر انیس اشفاق نے صنف رباعی میں لکھنؤ کی مرکزیت اور ڈاکٹر عابدی کے کارناموں پر تفصیل سے روشنی ڈالی۔ ڈاکٹر عابدی نے بتایا کہ میر انیس کی رباعیات کی تعداد ۵۷۹ ہے جبکہ فارسی کے عظیم شاعر عمر خیام نے صرف ۱۲۹ رباعیات ہی لکھی ہیں۔ جسٹس حیدر عباس رضا کی صدارت میں ہونے والی اس تقریب کی نظامت ڈاکٹر عباس رضانیر نے کی۔

۲۶ اگست ۲۰۱۳ء کو شعبہ اردو میں غیر ملکی طلباء کے ایک وفد سے خطاب کرتے ہوئے ڈاکٹر عباس رضانیر نے کہا کہ صحت اور وقت انسان کے لیے عظیم نعمت ہے۔ انہوں نے کہا کہ طالب علم کا تمام وقت حصول علم میں صرف ہونا چاہئے اور عملی میدان میں اترنے سے پہلے اپنے آپ کو ہر طرح کی صلاحیتوں سے آراستہ کر لینا چاہئے۔ اور سخت جدوجہد سے ہی کامیابی ممکن ہے۔

۲۶ ستمبر ۲۰۱۳ء کو شعبہ اردو کے سمینار ہال میں ایم۔ اے سال اول کے طلباء کے استقبالیہ تقریب سے خطاب کرتے ہوئے صدر شعبہ اردو ڈاکٹر عباس رضانیر نے بتایا کہ یہاں سے مایہ ناز شخصیات وجود میں آئی ہیں جنہوں نے نہ صرف ملک بلکہ عالمی سطح پر یونیورسٹی کا نام روشن کیا۔ شعبہ اردو میں طلباء کی طرف سے منعقد ہونے والی تقریبوں کے سلسلے میں بھی ڈاکٹر عباس رضانیر کی کوشش یہ ہوتی ہے کہ اس کو ایک ادبی نہج دے دیا جائے تاکہ طلباء کے ادبی ذوق کو جلا مل سکے۔

۱۲ اکتوبر ۲۰۱۳ء کو شعبہ اردو کے سمینار ہال میں ”بیرونی ملکوں میں اردو کی صورتحال“ کے عنوان سے پروفیسر صابرہ حبیب کے توسیعی خطبے کا اہتمام ہوا۔ اپنے توسیعی خطبہ میں انہوں نے بتایا کہ خوش آئند بات یہ ہے کہ اردو نہ صرف ایشیاء میں بولی اور سمجھی جاتی ہے بلکہ دیگر ممالک اور نوآبادیات میں بھی اردو بولنے اور سمجھنے والوں کی بڑی تعداد ہے۔ پروفیسر صابرہ حبیب نے طلباء و طالبات سے خطاب کرتے ہوئے کہا کہ

اردو ایک زندہ زبان ہے جو ہماری تہذیب کی پروردہ ہے اس تقریب کی نظامت صدر شعبہ اردو ڈاکٹر عباس رضانیر نے خوش اسلوبی سے انجام دی۔

۲۲ اکتوبر ۲۰۱۳ء کو شعبہ اردو کے سمینار ہال میں پروفیسر وسیم بیگم کا توسیعی خطبہ بعنوان ”ہندوستان میں آزادی کے بعد غزل کا تہذیبی پس منظر“ منعقد ہوا۔ پروفیسر وسیم بیگم نے ہر عہد کے شاعروں کے اشعار کی مثالیں پیش کیں اور کہا کہ شاعری میں اگر مسلم شعراء نے مہا بھارت، ہولی، دیوالی، دھرا کو موضوع بنایا ہے تو غیر مسلم شعراء نے مکہ، مدینہ اور کربلا کو اپنی شاعری میں جگہ دی ہے۔ صدر شعبہ اردو ڈاکٹر عباس رضانیر نے بتایا کہ پروفیسر وسیم بیگم شعبہ اردو مولانا آزاد نیشنل یونیورسٹی لکھنؤ کیپس کی انچارج ہیں اور اردو غزل کی تنقید میں آپ کی سات کتابیں منظر عام پر آچکی ہیں۔ غزل کی تحقیق و تنقید آپ کا خاص موضوع ہے۔

۸ فروری ۲۰۱۴ء کو شعبہ اردو کے سمینار ہال میں کناڈا سے آئے مشہور ڈرامہ نگار ”جاوید دانش“ کے اعزاز میں ایک ادبی نشست کا اہتمام ہوا۔ مہمان خصوصی جاوید دانش نے بتایا کہ نوآبادیات میں اردو بڑی تیزی سے پھیل رہی ہے۔ اس اعزازی تقریب میں مشہور ناول نگار و افسانہ نویس مشرف عالم ذوقی نے کہا کہ اردو اصلاً شہر نگاراں کی مرہون منت ہے۔ اگر واجد علی شاہ اس زبان کو لے کر عوام میں نہ جاتے تو اردو اس شکل میں ہمارے سامنے نہ ہوتی۔ قائم مقام وائس چانسلر اے۔ پی۔ سین گپتا نے صدارت کرتے ہوئے کہا کہ اردو ایک ہمہ جہت اور شیریں زبان ہے جس کے فروغ سے ہماری تہذیبی روایات کو فروغ ملے گا۔

اس موقع پہ دیگر دانشوران و مفکرین نے بھی اپنے اپنے خیالات کا اظہار کیا اور اردو کے مستقبل کی تابناکی، بقاء و ترویج کے لیے ہمہ وقت تیار رہنے کی تلقین بھی کی۔

۱۶ اپریل ۲۰۱۴ء کو شعبہ اردو کے سمینار ہال میں الوداعیہ تقریب بعنوان ”منشی

پریم چند اور افسانہ کی روایت“ کی تقریب میں بحیثیت مہمان خصوصی پروفیسر علی احمد فاطمی صدر شعبہ اردو والہ آباد یونیورسٹی نے اپنے خطاب میں طلباء و طالبات کو تلقین کرتے ہوئے کہا کہ غور و فکر کا عمل بھی کسی بھی شعبہ میں کامیابی کی ضمانت ہے۔ انہوں نے کہا کہ غور و فکر کے بعد جس طرح بہت سی مصنوعات و ایجادات سامنے آتی ہیں اسی طرح ادب میں موضوعات سامنے آتے ہیں۔ ایک بڑا فنکار صرف انقلابی قدم ہی نہیں اٹھاتا بلکہ وہ انحرافی قدم بھی اٹھاتا ہے۔ پریم چند نے ایسے دور میں دیہات کی زندگی کو اپنا موضوع بنایا جب دو بڑے ناول جن کا تعلق شہر سے تھا مقبولیت کے آسمان پر تھے۔ انہوں نے کہا کہ امرا و جان ادا اور فردوس بریں کی موجودگی اور گل و بلبل کی شاعری کے درمیان دیہات، گوبر، چھپر، قرض اور مفلسی کی باتیں کرنا بڑی جگر کاوی کی بات تھی مگر پریم چند نے پرانی ڈگر سے انحراف کیا اور ادب میں انقلاب پیدا کر دیا۔ انہوں نے کہا کہ فلشن تو پہلے سے موجود تھا مگر جدید فلشن کے بانی پریم چند ہیں۔ صدر شعبہ اردو ڈاکٹر عباس رضانیر نے خطبہ استقبالیہ کے ساتھ اظہار تشکر بھی کیا اور انہوں نے کہا کہ ادب ایک ایسا تناور درخت ہے جس کی جتنی آبیاری کی جائے گی اتنا ہی زیادہ وہ پھل دے گا۔

۲۵ ستمبر ۲۰۱۴ء کو شعبہ اردو کے سمینار ہال میں ”اردو افسانے کا نیا منظر نامہ“ موضوع پر ایک ادبی تقریب کی صدارت کرتے ہوئے ڈاکٹر عباس رضانیر صدر شعبہ اردو نے کہا کہ اردو زبان میں آج افسانے کی بڑی اہمیت ہے چھوٹے کینوس کا یہ بڑا فن ہے۔ فن میں ترسیل نہایت ضروری ہوتی ہے اسی ترسیل کے لیے فن کی ہیئت اور تکنیک میں تبدیلیاں رونما ہوتی رہتی ہیں۔ ہمارے افسانے کے موضوعات میں نہ صرف آفاقیت آتی ہے بلکہ آج کا اردو افسانہ دوسری زبانوں کے افسانے سے کہیں آگے ہے۔ مہمان خصوصی کی حیثیت سے شریک ہوئے چودھری چرن سنگھ یونیورسٹی کے صدر شعبہ اردو ڈاکٹر اسلم جمشید پوری نے اپنی ایک کہانی ”پانی اور پیاس“ سنائی جس پر مکالمہ بھی ہوا اور

سوالات بھی قائم ہوئے۔ ڈاکٹر اسلم جمشید پوری نے تمام سوالات کا تشفی بخش جواب دیتے ہوئے کہا کہ دراصل تخلیق وجود میں آنے کے بعد وہ قاری اور ناقد کی ہو جاتی ہے اس پر تخلیق کار کا کوئی حق نہیں رہ جاتا۔ ہاں یہ ضرور ہے کہ اگر کوئی بات سمجھ میں نہیں آئی یا کسی جز سے کوئی اختلاف ہو تو تخلیق کار سے سوالات کیے جاسکتے ہیں اور یہی سوالات فن کو جلا بخشتے ہیں اور فن میں نہ صرف توسیع ہوتی ہے بلکہ وہ نئی آب و تاب کے ساتھ سامنے آتے ہیں۔

۲ دسمبر ۲۰۱۴ء کو شعبہ اردو کے سمینار ہال میں سید احتشام حسین کی ۳۷ ویں برسی پر ایک سمینار کو خطاب کرتے ہوئے پروفیسر ملک زادہ منظور احمد نے کہا کہ احتشام حسین ایک ایسی شخصیت کا نام ہے جس کے اندر تضاد نہیں تھا۔ ان کا ظاہر و باطن ایک تھا۔ وہ ایک کامیاب استاد کے ساتھ ہی نظریہ ساز ناقد بھی تھے۔ صدر شعبہ اردو ڈاکٹر عباس رضانیر نے احتشام حسین کے حیات اور کارناموں پر اجمالی روشنی ڈالی۔ مہمان خصوصی کی حیثیت سے شریک ڈاکٹر جعفر عسکری نے اپنے والد سے متعلق گفتگو کرتے ہوئے کہا کہ وہ حقیقی نقاد و تخلیق کار تھے۔ وہ خالص مشرقی نقاد ہونے کے ساتھ مشرقی انسان بھی تھے اس تقریب میں ادب نواز حضرات اور شعبہ اردو کے طلباء و طالبات نے شرکت کی۔

۲۳ مارچ ۲۰۱۵ء کو شعبہ اردو اور ترقی اردو کونسل نئی دہلی کے اشتراک سے لکھنؤ یونیورسٹی کے مالویہ ہال میں دو روزہ بین الاقوامی سمینار بعنوان ”اودھ کے ناولوں میں مسلم معاشرت کی عکاسی“ کا افتتاح مہمان خصوصی سفیر ہند برائے ایران ڈی۔ پی شریواستو اور لکھنؤ یونیورسٹی کے وائس چانسلر ایلین۔ بی نمس نے شمع روشن کر کے کیا۔ اس موقع پر سابق وزیر تعلیم ڈاکٹر عمار رضوی، پروفیسر رشی پانڈے، پروفیسر صاحب علی (ممبئی) اور پروفیسر شارب ردولوی نے اسٹیج کو رونق بخشی، مہمان خصوصی سفیر ہند برائے

ایران ڈی۔ پی ثریو استو نے اپنے خطاب میں کہا کہ اودھ کی تہذیب دنیا کی نرالی تہذیب ہے۔ انہوں نے کہا کہ متعدد تہذیبوں کو میں نے بہت قریب سے دیکھا ہے لیکن جو کشش اودھ کی تہذیب میں ہے وہ کسی دوسری تہذیب میں نہیں ہے۔ انہوں نے کہا کہ ناول اور کہانیوں سے انسانی اقدار کا سبق ملتا ہے اور تہذیبی وراثت سے آگاہی حاصل ہوتی ہے۔ مہمان ذی وقار ڈاکٹر عمار رضوی نے کہا کہ اودھ کی پوری تہذیب میں مسلم معاشرت کی عکاسی ہے۔ یہ مسلم معاشرہ ہی تھا جس نے ہر طبقہ اور ہر مذہب کے ماننے والوں کا دل جیتا، رواداری اور آپسی ہم آہنگی مسلم معاشرت کا لازمی جز ہے۔ ہمارے اردو ناول نگاروں نے اودھ کی تہذیب کی عکاسی کرتے ہوئے مسلم معاشرے کی رواداری کو خصوصی طور پر ملحوظ رکھا۔ انہوں نے کہا کہ یہاں کی زبان بھی ایسی تہذیب و ثقافت کی علامت ہے جس نے ایسا معاشرہ تشکیل دیا جہاں کوئی یہ سمجھ بھی نہیں سکتا تھا کہ کس شخص کا تعلق کس مذہب سے ہے دراصل یہ آپسی ہم آہنگی کا ہی نتیجہ تھا۔ وائس چانسلر ایس۔ بی۔ نمس نے کہا کہ یہ ایک ایسا موضوع ہے جس پر صدر شعبہ اردو ڈاکٹر عباس رضا نیر نے سمینار کا انعقاد کر کے اودھ کو اپنی جڑوں سے واقفیت کا موقع فراہم کیا ہے۔ اس طرح کے سمینار وقتاً فوقتاً ہوتے رہنا چاہئے جس میں یونیورسٹی ہر ممکن تعاون کرے گی۔ مہمانوں کے خیر مقدم کے بعد صدر شعبہ اردو ڈاکٹر عباس رضا نیر نے موضوع کا تعارف کراتے ہوئے کہا کہ اودھ کی معاشرت ایک ایسا گلدستہ ہے جس میں ہر قسم کے پھول ہیں جن کی خوشبو صدیوں سے مشام جاں کو معطر کر رہی ہے۔ افتتاحی اجلاس کے بعد ہونے والے تکنیکی سیشن کی صدارت پروفیسر شارب ردولوی اور پروفیسر صاحب علی ممبئی یونیورسٹی نے کی جب کہ افسانہ نگار صبیحہ انور نے ”ناولوں میں اودھ کا معاشرہ“ کے موضوع پر اپنا مقالہ پیش کرتے ہوئے کہا کہ رتن ناتھ سرشار نے اپنے ناول میں جیتے جاگتے اودھ کی عکاسی کی ہے۔ حالیہ ناولوں میں انہوں نے پروفیسر انیس اشفاق کے

ناول ”دھیارے“ کا تذکرہ کرتے ہوئے کہا کہ یہ ایسا ناول ہے جس میں آج کے لکھنؤ کی معاشرت کی عکاسی کی گئی ہے۔ پروفیسر شارب ردولوی نے صدارتی خطبہ میں اودھ میں لکھے گئے ناولوں اور ان میں مسلم معاشرت کے پیش کردہ تمام پہلوؤں پر سیر حاصل گفتگو کی۔ پروفیسر صاحب علی ممبئی یونیورسٹی نے کہا کہ یہ اچھوتا موضوع ہے جس پر ابھی تک سمینار نہیں ہوئے لیکن یہاں کے صدر شعبہ نے اس طرف توجہ دی اور اودھ کی معاشرت کو سمجھنے اور سمجھانے کے لیے اس دوروزہ سمینار کا اہتمام کیا۔

۳ مارچ کو دوروزہ بین الاقوامی سمینار کا دوسرا اجلاس شعبہ اردو کے سید مسعود حسن رضوی سمینار ہال میں زیر صدارت پروفیسر ملک زادہ منظور احمد، پروفیسر احسن الظفر، ڈاکٹر عارف ایوبی، علامہ ضمیر اختر پاکستان، منعقد ہوا جبکہ مقالہ نگار کی حیثیت سے مختلف شہروں کی مختلف یونیورسٹیوں سے آئے ہوئے اردو اساتذہ نے بہترین مقالے پیش کیے اور سامعین کو اودھی تہذیب اور مسلم معاشرت کے گونا گوں گوشوں سے متعارف کرایا۔ ماہنامہ نیادور کے ایڈیٹر ڈاکٹر وضاحت حسین رضوی نے استقبالیہ خطبہ پیش کیا اور مہمان خصوصی سابق ممبر کونسل (MLC) الحاج سراج مہدی نے مہمانوں کا استقبال کیا۔ اجلاس کے آخری سیشن کی صدارت کرتے ہوئے پاکستان کے مشہور و معروف خطیب و شاعر اور ادیب علامہ ضمیر اختر نقوی نے کہا کہ ”ادب و تہذیب کی زندگی میں بہت اہمیت ہے۔ ادب زندہ ہے تو قوم زندہ ہے مسلمانوں کا مذہب عرب سے آیا لیکن تہذیب یہاں بنی ہے۔ عرب، ایران اور دہلی میں آج اردو پڑھی جاتی ہے، مشاعرے ہوتے ہیں تو یہ تہذیب یہاں سے پہنچی ہے۔ ہندوستان میں گنگا جمنی تہذیب اکبر کے زمانے سے شروع ہوئی اور اودھ میں اپنے عروج کو پہنچی۔ اسی تہذیب کے ذریعہ مسلمانوں نے اودھ پر ڈھائی سو سال حکومت کی۔ اس دور میں ایک بھی ہندو، مسلم یا شیعہ، سنی جھگڑا نہیں ہوا۔ پاکستان میں یہ تہذیب ختم ہوئی تو وہاں دہشت گردی پھیل گئی۔

پاکستان میں تہذیب نہیں ہے صرف سیاست ہے۔ ہندوستان ایک حقیقت ہے پاکستان ایک خواب ہے۔ علامہ نے ہندوستان خصوصاً اودھ کی تہذیب کو دنیا کی بہترین تہذیب قرار دیا۔ اور اس تہذیبی وراثت کی بقاء و تحفظ کے لیے ایک ادارہ قائم کرنے کی بھی تلقین کی۔ دوروزہ بین الاقوامی سمینار کے کنوینر اور صدر شعبہ اردو ڈاکٹر عباس رضانیر نے اپنے تشکراتی کلمات میں ”اودھ کے اردو ناولوں میں مسلم معاشرت کی عکاسی“ کے موضوع کی معنویت کو مختلف پہلوؤں سے اجاگر کیا اور تمام شرکاء کا تہہ دل سے شکریہ ادا کیا۔

۱۷ اپریل ۲۰۱۵ء کو شعبہ اردو کے سمینار ہال میں پروفیسر محمد زماں آزرہ سابق ڈین کشمیر یونیورسٹی نے اپنے توسیعی خطبے ”دور حاضر میں تہذیب کے سامنے پیش آنے والے چیلنجز“ کے موضوع پر بتایا کہ زبان تہذیب کی جڑ ہے اور رسم الخط زبان کی جان ہے اور آج یہ دونوں خطرات سے دوچار ہیں ایسے میں تہذیب کو بچانا اس دور میں بہت مشکل ہے۔ انہوں نے کہا کہ زبان اور تہذیب کا مسئلہ کسی ایک قوم سے وابستہ نہیں بلکہ قوموں سے ہے۔ صدر شعبہ اردو ڈاکٹر عباس رضانیر نے استقبالیہ پیش کرتے ہوئے مہمان خصوصی پروفیسر محمد زماں آزرہ کا تعارف کرایا۔

پروفیسر محمود الحسن سابق صدر شعبہ اردو نے صدارت کرتے ہوئے توسیعی خطبے کے موضوع کی اہمیت و افادیت پر اظہار خیال کرتے ہوئے کہا کہ وہی قومیں زندہ رہتی ہیں جو اپنی تہذیب کے تحفظ و بندوبست کا انتظام کرتی ہیں۔ اردو ایک زبان ہی نہیں ہے بلکہ ایک تہذیب بھی ہے۔

۸ مارچ ۲۰۱۵ء کو شعبہ اردو کے سمینار ہال میں ایک تہنیتی نشست کا اہتمام کیا گیا۔ مشہور فکشن نگار مشرف عالم ذوقی کو قطر کا عالمی فروغ اردو ادب ایوارڈ ۲۰۱۵ء ملنے پر ایک تہنیتی پروگرام ہوا۔ جس میں مشرف عالم ذوقی کو اس انعام کے لیے منتخب کیے جانے پر خوشی کا اظہار کرتے ہوئے ان کو مبارکباد پیش کی گئی۔ جلسے کی صدارت صدر

شعبہ اردو ڈاکٹر عباس رضانیر نے کی۔ انہوں نے کہا کہ اردو ادب میں مشرف عالم ذوقی کا اہم مقام ہے۔ ہماری دعا ہے کہ وہ اس طرح اردو فکشن کو اپنی نگارشات سے مالا مال کرتے رہیں۔

۲۵ اپریل ۲۰۱۵ء کو شعبہ اردو کے سمینار ہال میں پروفیسر صغیر افراہیم کا توسیعی خطبہ بعنوان ”سرسید کے رفقاء کی عصری معنویت“ منعقد ہوا۔ پروفیسر صغیر افراہیم نے اپنے توسیعی خطبے میں بتایا کہ سرسید نے جو کارنامہ انجام دیا اس میں ان کے رفقاء کا بڑا اہم کردار ہے۔ اگر مخلص رفیق نہ ملتے تو سرسید اتنا بڑا کارنامہ انجام نہ دے پاتے۔ انہوں نے بتایا کہ علی گڑھ تحریک میں صرف مردوں کا ہی اہم کردار نہیں ہے بلکہ خواتین نے بھی بڑی قربانیاں دیں۔ مہمان ذی وقار کے طور پر پروفیسر سیمیا صغیر شعبہ اردو علی گڑھ مسلم یونیورسٹی نے شرکت کی اور صدارت صدر شعبہ فارسی پروفیسر عارف ایوبی نے کی اور نظامت کے فرائض صدر شعبہ اردو ڈاکٹر عباس رضانیر نے انجام دیئے۔

۲۸ اپریل ۲۰۱۵ء کو شعبہ اردو کے سمینار ہال میں عالمی یوم کتاب کے موقع پر دوروزہ سمینار بعنوان ”منشی نول کشور بحیثیت پبلشر، مصنف اور صحافی“ منعقد ہوا۔ پہلے اجلاس کے مہمان خصوصی عالیجناب مولانا سعید الرحمن اعظمی (منبر ندوۃ العلماء) و جناب فرید محفوظ قدوائی (وزیر حکومت اتر پردیش) تھے۔ جبکہ صدارت پروفیسر خان مسعود احمد (وائس چانسلر خولجہ معین الدین چشتی اردو عربی، فارسی یونیورسٹی) نے فرمائی اور مہمان اعزازی کی حیثیت سے ڈاکٹر دنیش شرما (میسر لکھنؤ) جناب مظفر حسین (وائس چیئرمین این۔سی۔پی۔یو۔ ایل حکومت ہند) جناب مولانا محمد خالد ندوی اور ڈاکٹر رنجیت بھارگو (پدم شری) نے شرکت فرمائی۔

مولانا سعید الرحمن اعظمی منبر مدرسہ ندوۃ العلماء نے منشی نول کشور کی خدمات کو سراہا اور کہا کہ منشی نول کشور ایک عہد ساز شخصیت کا نام ہے جو اپنی خدمات کے سبب ہمیشہ

یاد رکھے جائیں گے۔

پروفیسر خان مسعود احمد وائس چانسلر خواجہ معین الدین چشتی عربی، فارسی، اردو یونیورسٹی نے اپنے صدارتی کلمات میں بتایا کہ منشی نول کشور نے قومی یکجہتی اور ہم آہنگی کی ہمیشہ علمبرداری فرمائی ہے۔ اس کا بین ثبوت یہ ہے کہ انہوں نے بلا تفریق مذہب و ملت کئی ہزار کتابیں شائع کی ہیں۔ پہلے اجلاس کی نظامت پروفیسر صابرہ حبیب نے کی۔

دوسرے دن کے سمینار کی صدارت پروفیسر ایل۔ بی نمسے وائس چانسلر لکھنؤ یونیورسٹی نے کی مہمان خصوصی کی حیثیت سے ڈاکٹر انیس انصاری سابق وائس چانسلر خواجہ معین الدین چشتی اردو، عربی، فارسی یونیورسٹی نے شرکت فرمائی۔ نواب میر جعفر عبداللہ وڈاکٹر عصمت ملیح آبادی نے اپنا اپنا مقالہ پیش کیا جسے سامعین نے بہت سراہا۔ پروفیسر ایل۔ بی نمسے وائس چانسلر لکھنؤ یونیورسٹی نے اپنے صدارتی کلمات میں کہا کہ منشی نول کشور کی مطبوعات کا شعبہ اردو کے تحت ڈیجیٹلائزیشن کرایا جائے گا۔ یونیورسٹی انتظامیہ اردو زبان و ادب کے فروغ کے لیے ہمہ وقت تیار ہے۔ یہ زبان بہت خوبصورت اور میٹھی زبان ہے جو رابطہ کی حیثیت رکھتی ہے۔ ایسی زبان کو فروغ دیا جانا نہایت ضروری ہے۔ صدر شعبہ اردو ڈاکٹر عباس رضا نے اپنے تعارفی کلمات میں بتایا کہ کم عمری میں منشی نول کشور کے والد نے ان سے کہا کہ تم زندگی میں کچھ نہیں کر سکتے ہو۔ یہ بات ان کے دل پر اثر کر گئی اور انہوں نے گھر چھوڑ دیا اور آخر وقت تک گھر میں قدم نہیں رکھا۔ انہوں نے عہد کر لیا کہ لائق بن کر گھر جاؤں گا۔ بعد میں انہوں نے صحافت کا میدان اپنے لیے چنا اور اودھ اخبار نکالا بعد میں لاہور کے ایک اردو اخبار میں چار سال تک کام کیا۔ پھر مطبع نول کشور قائم کر کے اس کی شاخیں اہم شہروں میں قائم کیں۔ قرآن شریف، احادیث، گیتا، رامائن، اپنشد وغیرہ بھی چھاپیں۔ تقریباً ۵۰۰۰ کتابیں اس پریس سے شائع ہوئیں اس میں صرف ۲۰۰۰ کتابیں اردو کی تھیں باقی

دیگر زبانوں کی کتابیں تھیں۔

یہ دوروزہ قومی سمینار شعبہ اردو لکھنؤ یونیورسٹی اور نیشنل بک ٹرسٹ آف انڈیا کے اشتراک سے منعقد ہوا تھا۔

۳۰ اگست ۲۰۱۵ء کو شعبہ اردو میں آل انڈیا تعلیم گھر کے فاصلاتی نظام تعلیم کی نشست منعقد کی گئی جس کی صدارت ماہر لسانیات پروفیسر نصیر احمد خاں نے کی۔ پروفیسر نصیر احمد خاں نے نشست کے اغراض و مقاصد سے روشناس کیا۔ صدر شعبہ اردو ڈاکٹر عباس رضا نے پروفیسر نصیر احمد خاں کا استقبال اور تعارف کراتے ہوئے فاصلاتی نظام تعلیم کی اہمیت و افادیت پر روشنی ڈالی۔

۲۰ نومبر ۲۰۱۵ء کو شعبہ اردو کے سمینار ہال میں ڈاکٹر عباس رضا نے اعزاز میں ایک تہنیتی جلسہ کا انعقاد ہوا۔ شعبہ اردو کے تمام طلباء و طالبات کی طرف سے اس اعزاز کی جلسہ کا انعقاد ہوا۔ اس جلسے میں بطور مہمان خصوصی نوجوان لیدیہ رجناب محمد عباد اور اسٹوڈنٹ لیڈر راہل سنگھ شامل ہوئے۔ واضح رہے کہ ڈاکٹر عباس رضا نے تنظیم ہندوستان سماچار وارانسی، کی طرف سے بدست عزت مآب رام نایک گورنر اتر پردیش ”بھارتی بھاشا سمان“ سے سرفراز کیا گیا۔ اپنے تشکراتی کلمات میں صدر شعبہ اردو ڈاکٹر عباس رضا نے کہا کہ ”کوئی بھی ایوارڈ اپنے آپ میں ایک خاص اہمیت رکھتا ہے۔ میرے لیے اس ایوارڈ کی اہمیت اس لیے بھی بہت زیادہ ہے کیونکہ یہ ایوارڈ مجھے اردو زبان و ادب کے حوالے سے دیا گیا ہے۔ پورے ہندوستان میں اردو زبان سے متعلق نمایاں ادبی شخصیات میں سے مجھے اس ایوارڈ کے لیے منتخب کیا جانا میرے لیے باعث فخر ہے۔“ محمد عباد نے کہا کہ ڈاکٹر عباس رضا نے ہمارے لیے مشعل راہ ہیں۔ انہوں نے طلباء و طالبات کو تلقین کرتے ہوئے کہا کہ سخت محنت و مشقت سے آپ لوگ بھی اس مقام پر پہنچ سکتے ہیں۔

۱۴ اکتوبر ۲۰۱۵ء کو شعبہ اردو کے سمینار ہال میں طلباء و طالبات کی جانب سے استقبالیہ تقریب کے ذیل میں ”عصر حاضر میں اقبال کی معنویت“ پر ڈاکٹر عباس رضا نیر کے دورہ جرمنی سے واپسی پر مذاکرہ کا انعقاد ہوا۔ جرمنی میں مقیم معروف قلم کار سید عارف نقوی نے اپنے صدارتی خطبے میں کہا کہ آج جرمنی میں اقبال اتنا ہی پڑھے اور سمجھے جاتے ہیں جتنا کہ گوٹے، نیشے اور دوسرے جرمن فلسفی اور ادباء، صدر شعبہ اردو ڈاکٹر عباس رضا نیر نے شعبہ اردو کی جانب سے سبھی طلباء و طالبات کا خیر مقدم کرتے ہوئے یہ امید ظاہر کی کہ وہ اردو زبان و ادب کے ساتھ ساتھ شعبہ اردو کے لیے بھی خوش گوار ماحول پیدا کرنے میں پیش پیش رہیں گے۔ علامہ اقبال کی عصری معنویت پر گفتگو کرتے ہوئے انہوں نے کہا کہ فی زمانہ عالمی سطح پر جس طرح کا انتشار برپا ہے ایسے میں علامہ اقبال کے افکار اور نظریات سارے جہان کے لیے حوصلہ افزا پیغام دیتے ہیں۔ بطور مہمان خصوصی شعبہ عربی اور اسلامیات کے استاد ڈاکٹر قمر اقبال نے اس موقع پر جلسہ کو خطاب کرتے ہوئے کہا کہ اقبال کے افکار میں حیات و کائنات کے بنیادی موضوعات موجود ہیں۔ ان کی فکر مشرقی اقدار اور اسلامی روایات کا حسین امتزاج ہے۔

۱۵ اکتوبر ۲۰۱۵ء کو شعبہ اردو کے سمینار ہال میں راجیو پرکاش ساحر کے افسانوی مجموعے ”ایک بھگے لمحے کی لمبی سڑک“ پر نشست ہوئی۔ صدر شعبہ اردو ڈاکٹر عباس رضا نیر نے اپنے صدارتی خطبے میں کہا کہ کوئی بھی تخلیق کار اپنے رواں وقت کے مسائل و موضوعات کو نظر انداز کر کے اور اپنے تہذیبی دھارے سے الگ ہو کر بڑا تخلیق کار نہیں بن سکتا ہے۔ راجیو پرکاش ساحر دورِ حاضر کے ایسے افسانہ نگار ہیں جن کے افسانوں میں جذبے کی صداقت اور بیان کی آمیزش کی بھرپور عکاسی ملتی ہے۔ گیارہ افسانوں پر مشتمل یہ افسانوی مجموعہ اردو افسانہ نگاری کے بیش بہا ذخیرہ میں اضافہ ہے۔ تقریب میں دیگر مقررین نے بھی اظہار خیال کیا اور راجیو پرکاش ساحر کو ان

کے افسانوی مجموعے کی اشاعت کے سلسلے میں مبارکباد پیش کی۔

۲۹ جنوری ۲۰۱۶ء کو شعبہ اردو میں مشہور صحافی و ادیب عابد سہیل کے انتقال پر تعزیتی جلسہ ہوا جلسے کی صدارت صدر شعبہ اردو ڈاکٹر عباس رضا نیر نے فرمائی۔ صدر شعبہ اردو نے بہت خوبصورت انداز میں عابد سہیل کا تعارف پیش کیا اور انہیں خراج عقیدت پیش کرتے ہوئے کہا کہ عابد سہیل بڑی ہمہ جہت شخصیت کے حامل تھے۔ ترقی پسند تحریک سے وابستہ ہونے کے باوجود بھی ادبی گروہ بندیوں سے آزاد رہے اور ہر مکتب فکر سے وابستہ ادیبوں کی تخلیقات کو اپنے رسالے میں شائع کر کے ادب کے تئیں اپنی وسیع انظری کا ثبوت فراہم کیا۔ لکھنوی تہذیب کی باقاعدہ نمائندگی کرنے والے عابد سہیل اب ہمارے درمیان نہیں رہے لیکن ان کی تحریریں نئی نسل کی تعمیر و تشکیل میں اہم کردار ادا کرتی رہیں گی۔ عابد سہیل نے اپنے پیچھے بہت بڑا علمی و ادبی ورثہ چھوڑا ہے جو ان کو ہمیشہ زندہ رکھے گیا۔

پروفیسر احمد عباس ردولوی، پروفیسر عصمت ملیح آبادی اور دیگر مقررین نے بھی خراج عقیدت پیش کیا۔

۱۵ اپریل ۲۰۱۶ء کو شعبہ اردو میں عالمی اردو کانفرنس کی تیاریوں کے سلسلے میں ایک نشست کا اہتمام کیا گیا۔ دو اور تین مئی کو عالمی اردو کانفرنس لکھنؤ یونیورسٹی کے مالویہ ہال میں ہوئی۔ تیاریوں کا جائزہ لیتے ہوئے مشاورتی مجلس کا انعقاد کیا گیا۔ جس کی سرپرستی پروفیسر شارب ردولوی اور صدارت ڈاکٹر عمار رضوی نے فرمائی۔ اس نشست میں مختلف امور کی ذمہ داریاں اتفاق رائے سے تقسیم کی گئیں تاکہ یہ دوروزہ عالمی اردو کانفرنس بحسن و خوبی اپنی کامیابی کی منزل تک پہنچ سکے۔

۲۷ اپریل ۱۶ کو شعبہ اردو کے سید مسعود حسن رضوی سمینار ہال میں طلباء و طالبات کی جانب سے الوداعیہ تقریب کا انعقاد ہوا۔ تقریب کی صدارت صدر شعبہ اردو

ڈاکٹر عباس رضانیر نے کی۔ طلباء و طالبات کو مبارک باد پیش کرتے ہوئے ڈاکٹر عباس رضانیر نے نصیحت آمیز تقریر کرتے ہوئے طلباء کے بہتر مستقبل کی طرف رہنمائی بھی کی۔ اس موقع پہ کئی طلباء و طالبات نے مختلف موضوع پر اپنے اپنے مقالے پیش کیے۔ مہمان خصوصی کی حیثیت سے شریک ہونے والے پروفیسر احمد عباس ردولوی نے طالب کی جانب سے بہترین مقالے پیش کرنے پر مبارک باد دی اور مزید محنت و جدوجہد کی تلقین فرمائی۔ انہوں نے کہا کہ اردو زبان ایک شیریں اور تہذیب و ثقافت کی زبان ہے۔

۲۹ اپریل ۲۰۱۶ء کو شعبہ اردو میں پروفیسر ملک زادہ منظور احمد کے انتقال پر خراج عقیدت پیش کیا گیا۔ صدر شعبہ اردو ڈاکٹر عباس رضانیر نے خراج عقیدت پیش کرتے ہوئے کہا کہ پروفیسر ملک زادہ منظور احمد اپنی علمی صلاحیت، ادبی خدمات، سماجی روابط اور سیاسی سوجھ بوجھ کی بنیاد پر شہرت و مقبولیت کی ان منزلوں تک پہنچنے جہاں کم لوگ ہی پہنچتے ہیں۔ لیکن ان سب کے باوجود ملک زادہ صاحب میں منکسر المزاجی اس حد تک تھی کہ اردو رابطہ کمیٹی کے جلسوں میں وہ سب کے ساتھ زمین پر بیٹھ جایا کرتے تھے صرف ایک ناظم مشاعرہ کی حیثیت سے ملک زادہ صاحب کو پیش کرنا ان کی شخصیت کی تفہیم اور ان کے ادبی خدمات کے ساتھ بددیانتی ہوگی۔ کیونکہ وہ ایک متنوع شخصیت کے مالک تھے۔

۲۷ مئی ۲۰۱۶ء کو شعبہ اردو لکھنؤ یونیورسٹی اور مولانا آزاد انسٹی ٹیوٹ آف ہیومنٹینئر، سائنس اینڈ ٹکنالوجی محمود آباد کے اشتراک سے دوروزہ عالمی اردو کانفرنس لکھنؤ یونیورسٹی کے مالو پور آڈیٹوریم میں بدست عزت مآب رام نایک گورنر اتر پردیش افتتاح ہوا۔ اس موقع پر انیگرل یونیورسٹی کے چانسلر ڈاکٹر سعید الرحمن اعظمی، لکھنؤ یونیورسٹی کے وائس چانسلر پروفیسر ایس۔ بی۔ نمسے، انیگرل یونیورسٹی کے وائس چانسلر پروفیسر وسیم اختر، پروفیسر شارب ردولوی، اور جرمنی سے تشریف لائے عارف نقوی سمیت ملک

ویرن ملک کے متعدد دانشور اور مجاہدان اردو نے حصہ لیا۔ اس موقع پر گورنر اتر پردیش نے کہا کہ اردو ایک شاندار زبان ہے۔ اتر پردیش میں آنے کے بعد معلوم ہوتا ہے کہ اردو مخصوص لوگوں کی نہیں بلکہ عام آدمی کی زبان ہے انہوں نے کہا کہ تمام ہندوستانی زبانوں کو جوڑ کر ملک کو متحد رکھنے کا کام کریں اور اس اتحاد کے لیے دانشوروں اور صاحبان قلم کو پیش قدمی کرنا چاہئے۔ اردو پڑھنے والوں کو بھی روزگار مل سکتا ہے یہ اعتماد اردو پڑھنے والوں میں پیدا کرنے کی ضرورت ہے۔ انہوں نے کہا کہ اردو کو صرف تقریروں سے نہیں روزگار سے جوڑ کر آگے بڑھانے کی کوشش کریں۔ انہوں نے چاہا کہ ریاست کے ۲۵ یونیورسٹیوں کے چانسلر کی حیثیت سے وہ آئندہ ہونے والے وائس چانسلروں کے اجلاس میں اردو کی ترقی سے متعلق گفتگو کریں گے۔ گورنر صاحب نے کہا کہ اردو کی بہترین کتابوں کا ترجمہ دیگر زبانوں میں بھی کیا جائے اور دیگر زبانوں کی اچھی کتابوں کا اردو میں ترجمہ ہونا چاہئے۔ انہوں نے کہا کہ ہندوستان مختلف زبانوں کا ملک ہے گورنر صاحب نے ہندی کو اردو کی بڑی بہن قرار دیتے ہوئے کہا کہ مراٹھی اور دیگر ہندوستانی زبانیں آپس میں بہنیں ہیں۔ انیگرل یونیورسٹی کے چانسلر ڈاکٹر سعید الرحمن اعظمی نے کہا کہ اردو ایک بین الاقوامی زبان ہے جس کے بولنے والے پوری دنیا میں ملتے ہیں ہندوستان کی آزادی کی لڑائی میں اردو کا اہم کردار رہا ہے۔ اسکول سے لے کر پارلیمنٹ تک اردو زبان کا استعمال کیا جاتا ہے۔ انہوں نے کہا کہ قومی یکجہتی میں اردو زبان بے حد اہم کردار ادا کرتی ہے۔ اس موقع پر سابق وزیر اور بین الاقوامی اردو کانفرنس کے صدر ڈاکٹر عمار رضوی نے مہمانوں کا استقبال کرتے ہوئے اردو کی ترقی کے سلسلے میں اپنے خیالات کا اظہار کیا۔ اس موقع پر ایک یادگاری خصوصی مجلے کے علاوہ پانچ اردو کتابوں کا اجراء کیا گیا اسی کے ساتھ مہمانوں کی خدمت میں یادگاری نشانات بھی پیش کئے گئے۔ کانفرنس کے کنوینر صدر شعبہ اردو ڈاکٹر عباس رضانیر نے اتر پردیش میں اردو میڈیم

اسکول کھولے جانے کا مطالبہ بھی حکومت اتر پردیش سے کیا۔ اور نئی نسل کو مخاطب کرتے ہوئے کہا کہ ہماری نسل کو اردو سے قریب کرنے کی ضرورت ہے اردو کو صرف اسکول، کالج، یونیورسٹی اور مدارس تک ہی محدود نہیں کرنا چاہئے بلکہ ضرورت اس بات کی ہے کہ گھر گھر اردو پڑھنے اور پڑھانے کا ایک سلسلہ ہونا چاہئے۔ کانفرنس کی نظامت پروفیسر صابرہ حبیب نے بحسن خوبی انجام دی۔

۸/ اگست ۲۰۱۶ء کو صدر شعبہ اردو ڈاکٹر عباس رضا نیر کی تین کتابوں ”رثائی تنقیدیں“، ”تنقیدی بحثیں“ اور ”خواجہ احمد عباس“ کا اجرا بدست گورنر اتر پردیش عزت مآب جناب رام نایک عمل میں آیا۔ یہ تقریب رسم اجرا لکھنؤ یونیورسٹی کے مدن موہن مالویہ آڈیٹوریم میں منعقد ہوئی۔ اس موقع پر سابق وزیر ڈاکٹر عمار رضوی، پروفیسر شارب ردولوی، وائس چانسلر لکھنؤ یونیورسٹی پروفیسر ایل۔ بی۔ نمسے، انور جلالپوری اور وقار رضوی سمیت شہر کے معززین نے شرکت فرمائی۔ اس تقریب میں ڈاکٹر عباس رضا نیر کے والد محترم نے بھی خصوصی طور پر شرکت فرمائی۔ واضح رہے کہ اس عظیم تقریب رسم اجرا میں شہر کے ادیبوں اور دانشوروں سے نہ صرف یہ کہ مالویہ ہال کچھا کچھ بھرا تھا بلکہ دوسو سے زائد سامعین ہال کے باہر موجود تھے۔ اور سب کا کہنا تھا کہ ہم نے رسم اجرا کی اتنی شاندار تقریب اس سے پہلے نہیں دیکھی۔

۱۲/ اگست ۲۰۱۶ء کو شعبہ اردو کے سید مسعود حسن رضوی سمینار ہال میں ”اردو بہ حیثیت دفتری زبان“ کے عنوان سے ایک توسیعی خطبہ ہوا۔ پروفیسر شہاب عنایت ملک صدر شعبہ اردو جموں یونیورسٹی نے توسیعی خطبہ دیتے ہوئے بتایا کہ دوسری ریاستوں کی بہ نسبت کشمیر میں اردو زبان نے ترقی کی جو راہیں طے کی ہیں اس کا بنیادی سبب یہ ہے کہ ابتداء ہی سے کشمیر کے راجاؤں اور مہاراجاؤں نے اردو کی سرپرستی کی ہے۔ اور آج بھی اردو کی ترقی کا سبب یہ ہے کہ وہاں کی پہلی سرکاری زبان اردو ہے۔ اور

کشمیر کے تینوں حصوں میں جو مختلف زبانیں بولی جاتی ہیں ان کو جوڑنے کا کام اگر کسی زبان نے کیا ہے تو وہ اردو ہے۔

اس ادبی تقریب کی صدارت کر رہی شعبہ اردو بنارس ہندو یونیورسٹی کی سابق صدر پروفیسر قمر جہاں نے کہا کہ اردو کی موجودہ صورتحال پر صرف تشویش کا اظہار نہیں کرنا چاہئے بلکہ ہمیں عملی میدان میں آ کے اردو کے لیے کچھ کرنے کی ضرورت ہے۔ مہمان خصوصی کی حیثیت سے پروفیسر احمد عباس ردولوی اور مہمان ذی وقار کی حیثیت سے پروفیسر عصمت ملیح آبادی نے شرکت فرمائی۔

۳۰/ اگست ۲۰۱۶ء کو شعبہ اردو کے سمینار ہال میں نئی شاعری پر شاعر احمد وصی کے لیے ایک مذاکرہ منعقد ہوا۔ نئی اردو شاعری کے حوالے سے گفتگو کرتے ہوئے ممبئی سے آئے مقبول شاعر احمد وصی نے کہا کہ جب کسی شاعر کی اپنے معاشرے سے ذہنی ہم آہنگی اس قدر بڑھ جائے کہ وہ اپنے زمانے کے احساسات کی ترجمانی کرنے لگے تو ایسے میں اس کی شاعری میں نئے تصورات اور نئی قدروں کا آنا لازمی ہے جسے نئے شعری شعور کے طور پر جانا جاتا ہے۔ اس موقع پر جلسے کے صدارتی کلمات ادا کرتے ہوئے ڈاکٹر احمد ابراہیم علوی نے کہا کہ آج کی شاعری میں نئے مسائل اور معاملات کی بھرمار ہے۔ ہمارا معاشرہ تہذیبی سطح پر تبدیلیوں سے دوچار ہو رہا ہے۔ ایسے میں شعرا کو ذات کے حصار سے باہر نکل کر معاشرے کے معیار کے مطابق نئے خیالات لانے ہوں گے تبھی نئی شاعری معاشرے میں اپنا پیغام پہنچا سکے گی۔ صدر شعبہ اردو ڈاکٹر عباس رضا نیر نے احمد وصی کا تعارف کراتے ہوئے کہا کہ خطہ اودھ کے ان شعرا میں احمد وصی کا نام اس لیے بھی اہم ہے کہ انہوں نے جدید اردو شاعری میں اہم مقام حاصل کرتے ہوئے ہماری فلمی دنیا میں بھی مجروح سلطان پوری، خمار بارہ بنکوی جیسے اہم شعرا کی روایت کو برقرار رکھا ہے۔ ڈاکٹر عصمت ملیح آبادی اور ڈاکٹر احمد عباس ردولوی سمیت دیگر

دانشوران نے بھی نئی اردو شاعری کے حوالے سے سیر حاصل گفتگو کی جسے سامعین نے بہت سراہا۔

۲۶ ستمبر ۲۰۱۶ء کو قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان اتر پردیش اردو اکادمی اور شعبہ اردو لکھنؤ یونیورسٹی کے اشتراک سے دوروزہ بین الاقوامی اودھ ادبی فیسٹیول کا افتتاح لکھنؤ یونیورسٹی کے مدن موہن مالویہ آڈیٹوریم میں ہوا۔ افتتاحی اجلاس کی صدارت لکھنؤ یونیورسٹی کے وائس چانسلر پروفیسر ایل۔ بی نمے نے فرمائی۔ پروفیسر ایل۔ بی نمے نے اپنے صدارتی خطبے میں کہا کہ اودھ سارے بھارت میں اردو زبان و ادب کے ساتھ ہی تہذیب کی ایک اعلیٰ مثال ہے اور لکھنؤ کی تہذیبی روایت اس کا گہوارہ ہے۔ مہمان خصوصیت کی حیثیت سے سابق وزیر ڈاکٹر عمار رضوی شریک ہوئے۔ کناڈا سے تشریف لائے اردو کے مشہور و معروف ادیب اور نقاد ڈاکٹر تقی عابدی نے کلیدی خطبہ پیش کیا۔ انہوں نے بتایا کہ سرزمین اودھ نے تہذیبی اور روایتی اقدار کے ساتھ ساتھ تحقیقی اور لسانی سطح پر عظیم ادبی سرمایہ پیدا کیا ہے۔ اردو زبان و ادب کا تصور اودھ کے ادبی سرمائے کے بغیر ممکن نہیں ہے۔ صدر شعبہ اردو ڈاکٹر عباس رضا نے نظامت کے فرائض انجام دیتے ہوئے دوروزہ اودھ ادبی فیسٹیول کے اغراض و مقاصد پر روشنی ڈالتے ہوئے کہا کہ شعبہ اردو اودھ کی تاریخ اور تہذیبی وراثت کو نبھانے اور اس کے ادبی اقدار کے تحفظ و فروغ کے لیے ہمہ وقت کوشاں ہے۔ افتتاحی دور کے اجلاس کے بعد شروع ہوئے پہلے تکنیکی اجلاس کی صدارت پروفیسر آصفہ زامانی، پروفیسر فضل امام رضوی، پروفیسر صابرہ حبیب، ڈاکٹر صبیحہ انور اور ڈاکٹر انیس انصاری نے کی۔ ملک و بیرون ملک سے آئے مقالہ نگاروں نے اپنے اپنے مقالے پیش کیے۔ ڈاکٹر صبیحہ انور نے اپنے صدارتی کلمات میں سوال اٹھایا کہ لکھنؤ کی علمی، ادبی اور شعری دلکشی میں کمی کیوں آئی اور اس کا کھویا ہوا وقار کیسے واپس آئے گا۔ ڈاکٹر انیس انصاری نے اپنے صدارتی کلمات

کے ذریعہ محققین کے سامنے یہ تجویز رکھی کہ ۱۷۵۷ء اور ۱۸۵۷ء کی جنگوں کا اردو کے ادیبوں اور شاعروں نے کیا اثر قبول کیا اس پر تحقیق ہونا چاہئے۔ پروفیسر صابرہ حبیب نے مقالہ نگاروں اور شاعروں کی تعریف کرتے ہوئے یہ سوال بھی قائم کیا کہ مسائل بتانے والے حل کیوں نہیں بتاتے۔ پدم شری پروفیسر آصفہ زامانی نے ”لکھنؤ میں اردو ادب کل آج اور کل“ کے موضوع پر اپنے خیالات کا اظہار کیا۔ پروفیسر فضل امام رضوی نے اپنے صدارتی بیان میں کہا کہ اودھ صرف لکھنؤ نہیں ہے اور شعور فکر کا نام تہذیب ہے۔ اردو کے صحیفہ کمال کی آخری آیت میر انیس تھے۔ اس موقع پر شعبہ اردو کے اساتذہ، ریسرچ اسکالرز اور تمام طلباء و طالبات سمیت شہر کی مشہور و معروف علمی و ادبی شخصیات نے شرکت کی۔

دوروزہ بین الاقوامی اودھ ادبی فیسٹیول کے دوسرے دن کے اجلاس شعبہ اردو کے سمینار ہال میں منعقد ہوا۔ پہلے اجلاس کی صدارت پروفیسر شارب ردولوی نے کی۔ انہوں نے اپنے خطاب میں کہا کہ اردو میں مرثیہ اور افسانہ اودھ کی دین ہے۔ آپ اگر اس کی تاریخ اٹھا کر دیکھیں تو نہ صرف ابتدائی نقوش بلکہ اس کا عروج بھی آپ اودھ میں ہی دیکھیں گے۔ پریم چند ہوں یا سدرشن ان کا تعلق اسی سرزمین اودھ سے رہا ہے۔ دوسرے صوبوں پر تہذیبی اور ادبی اعتبار سے اودھ کو برتری حاصل رہی ہے۔ انہوں نے کہا کہ شعبہ اردو لکھنؤ یونیورسٹی کو اودھ پر ایک پروجیکٹ بنانے کی ضرورت ہے۔ دوسرے سیشن سے خطاب کرتے ہوئے ڈاکٹر عمار رضوی نے کہا کہ اودھ کی تہذیب اپنا ایک مقام رکھتی ہے۔ یہ تہذیب جسے ہم گنگا جمنی تہذیب کہتے ہیں اسی اودھ کی دین ہے۔

دوسرے اجلاس کی صدارت پروفیسر قمر جہاں، رخسانہ لاری، نعیم انیس، شہناز قریشی اور نواب میر جعفر عبداللہ نے مشترکہ طور سے کی۔ میر جعفر عبداللہ نے اودھ کی تاریخ

پر روشنی ڈالتے ہوئے شاہان اودھ کی خدمت جلیلہ کا تذکرہ کیا۔ ڈاکٹر رخسانہ لاری نے اودھ کی ادبی خدمات کا تذکرہ کرتے ہوئے یہاں کی تہذیب اور زبان و بیان پر خصوصی گفتگو کی۔ کلکتہ سے تشریف لائے ڈاکٹر نعیم انیس نے اپنی صدارتی تقریر میں اس اجلاس میں پڑھے گئے تمام مقالوں پر تجزیاتی گفتگو کرتے ہوئے کہا کہ لکھنؤ یونیورسٹی کا شعبہ اردو اور اس سے وابستہ تمام اراکین مبارکباد کے مستحق ہیں کہ انہوں نے ایک اہم موضوع پر یہ بین الاقوامی فیسٹیول کا اہتمام کیا۔ سابق صدر شعبہ اردو بنارس ہندو یونیورسٹی پروفیسر قمر جہاں نے اپنے صدارتی کلمات میں صدر شعبہ اردو لکھنؤ یونیورسٹی اور دوروزہ بین الاقوامی ادبی فیسٹیول کے کنوینر ڈاکٹر عباس رضا نیر کو مبارکباد دیتے ہوئے کہا کہ یہ ادبی فیسٹیول بہت کامیاب و کامران رہا ہے۔ انہوں نے کہا کہ لکھنؤ کی تہذیب پورے عالم میں مشہور ہے لیکن آج یہ تہذیب بدلتی جا رہی ہے ہمیں اس کی حفاظت کرتے ہوئے نئی نسل میں منتقل کرنے کا فریضہ انجام دینا چاہئے۔ شکریہ کے کلمات پروفیسر احمد عباس ردولوی نے ادا کیے۔ سمینار کے شرکار میں مشہور و معروف علمی و ادبی شخصیات سمیت شعبہ اردو کے اساتذہ و طلباء و طالبات نے اپنی حاضری درج کرائی۔

۲۸ فروری ۲۰۱۶ء کو لکھنؤ یونیورسٹی کے مالویہ آڈیٹوریم میں اردو رائٹرز فورم و شعبہ اردو لکھنؤ یونیورسٹی کے تحت گورنر اتر پردیش عزت مات عالیجناب رام نائیک جی کی کتاب ”چریوتی چریوتی“ کے اردو ترجمہ پر ایک عالیشان تقریب کا انعقاد ہوا۔ مہمان خصوصی کی حیثیت سے شریک ہوئے گورنر اتر پردیش جناب رام نائیک جی نے اپنے مخصوص انداز میں تقریر کو خطاب کرتے ہوئے کہا کہ اردو کسی خاص مذہب کی زبان نہیں ہے۔ یہ ملک میں ہندی کے بعد سب سے زیادہ بولی جانے والی زبان ہے۔ گورنر صاحب نے کہا کہ کچھ لوگ اردو کو ایک مخصوص مذہب سے جوڑنے کی کوشش کرتے ہیں جو بالکل غلط ہے۔ کیونکہ نشی پریم چند، فراق گورکھپوری، کنور مہندر سنگھ بیدی اور گوپی چند

نارنگ وہ نام ہیں جنہوں نے اردو کے فروغ میں اہم کردار ادا کیا اور ان کی تخلیقات آج کسی بھی اہل اردو کی تخلیقات سے کم نہیں ہیں۔ گورنر صاحب نے تقریب کے اہتمام کے لیے منتظمین کا شکریہ ادا کیا۔ صدر جلسہ پروفیسر شارب ردولوی نے کہا کہ ”چریوتی چریوتی“ انسانوں کو زندگی کا راستہ دکھانے والی کتاب ہے۔ کتاب پڑھنے میں ترجمہ نہیں بلکہ لگتا ہے کہ رام نائیک خود بول رہے ہیں۔ اتنے سلیس اور خوبصورت اردو ترجمہ کے لیے میں ڈاکٹر عباس رضا نیر کو مبارکباد پیش کرتا ہوں۔ کتاب میں نوجوانوں کے لیے گرمتر ہے جس میں ناممکن جیسا کوئی لفظ نہیں ہے۔ سابق وزیر ڈاکٹر عمار رضوی نے کہا کہ یہ کتاب موجودہ وقت میں سیاست کرنے والوں کے لیے ایک سبق ہے۔ یہ کتاب زبان، فکر اور قبولیت کے نظریہ سے مکمل ہے۔ انہوں نے کہا کہ رام نائیک نے پہلے عمل کیا تب کتاب تحریر کی ہے۔ پروفیسر آصفہ زامانی اور معروف شاعر انور جلالپوری سمیت شہر کے علمی و ادبی شخصیات نے پُر خلوص شرکت فرمائی۔ گورنر صاحب نے کہا کہ آج بھی اردو والوں کی کثیر تعداد کے سامنے مالویہ ہال چھوٹا پڑ گیا۔

۶ جنوری ۲۰۱۷ء کو شعبہ اردو کے سمینار ہال میں ایک توسیعی خطبہ یاد ملک زادہ منظور احمد منعقد ہوا۔ کناڈا سے تشریف لائے معروف محقق اور ادیب ڈاکٹر سید تقی عابدی نے ملک زادہ منظور احمد یادگاری توسیعی خطبے میں بیان کیا کہ غالب نے انداز بیان کے ترقی پسند شاعر تھے کلام غالب کی باقاعدہ تفہیم کے لیے غالب کے مزاج کو سمجھنا اور غالب کی شاعری میں سو منات خیال کو درک کرنا بے حد مشکل ہے۔ ”غالب کا انداز بیان“ کے عنوان سے منعقد اس یادگاری خطبے کی صدارت انیگرل یونیورسٹی کے وائس چانسلر پروفیسر سید وسیم اختر نے کی۔ اس تقریب کے مہمان خصوصی پروفیسر شارب ردولوی نے کہا کہ غالب کے کلام کو سمجھنے کے لیے فارسی زبان سے آشنائی ضروری ہے۔ غالب کے انداز بیان کی انہوں نے اردو شاعری کے ساتھ ساتھ فارسی کلام میں بھی

نشانہ ہی کی۔ انہوں نے کہا کہ غالب ایک الہامی شاعر ہیں۔ عبدالرحمن کے قول ”ہندوستان کی دو الہامی کتابیں ہیں ایک وید مقدس اور دوسرے دیوان غالب“ کے پس منظر میں کہا کہ یہ بات غالب پہلے ہی اپنی شاعری میں کہہ چکے ہیں“

آتے ہیں غیب سے یہ مضامین خیال میں
غالب صریر خامہ نوائے سروش ہے

شعبہ اردو کے صدر ڈاکٹر عباس رضا نے نظامت کے فرائض انجام دیتے ہوئے مرزا غالب اور ملک زادہ منظور احمد کے مختلف کارناموں پر بالتفصیل روشنی ڈالی۔ اس ادبی نشست میں شہر کی علمی و ادبی شخصیات سمیت شعبہ اردو کے اساتذہ اور طلباء و طالبات نے شرکت فرمائی۔

۲۱ فروری ۲۰۱۷ء کو شعبہ اردو کے سمینار ہال میں عالمی یوم مادری زبان کے موقع پر ایک ادبی تقریب منعقد ہوئی جس کی صدارت پروفیسر احمد عباس ردولوی نے کی۔ انہوں نے اپنی صدارتی تقریر میں کہا کہ انسان ترقی کی منزل کمال تک اسی وقت پہنچتا ہے۔ جب وہ ماں کی دعاؤں کے زیر سایہ آگے بڑھتا رہے اسی طرح ادب و فن بھی اسی وقت پائیدار ہوتا ہے جب وہ اپنی مادری زبان میں وجود میں آئے۔ مہمان خصوصی شعبہ اردو لکھنؤ یونیورسٹی کے صدر ڈاکٹر عباس رضا نے تمثیلی پیرائے میں ایک ماں اور اس کی دو بیٹیوں کی کہانی سنائی۔ مادر وطن ہندوستان اور ہندی اردو اس کی دو بیٹیوں کی تاریخ ابتداء سے اس عہد تک بیان کرتے ہوئے طلبہ کو مادری زبان میں تصنیف و تالیف کی کوشش کا شوق دلایا۔ پی۔ ڈی۔ ایف ریسرچ اسکالرز ڈاکٹر منتظر مہدی نے نیر صاحب کی شخصیت پر روشنی ڈالتے ہوئے کہا کہ ڈاکٹر عباس رضا نیر صاحب ایک اچھے نقاد، شاعر اور ناظم ہی نہیں بلکہ ایک عظیم انسان بھی ہیں۔ اس تقریب کی نظامت ایم۔ اے۔ سال دوم کے ہونہار طالب علم سید غلام عباس رضوی نے بحسن و خوبی انجام دی۔

۲۳ فروری ۲۰۱۷ء کو شعبہ اردو کے سمینار ہال میں ہارون شامی کے شعری مجموعہ ”عکس“ کا اجراء ہوا۔ پروفیسر شارب ردولوی نے اپنی صدارتی تقریر میں کہا کہ شاعری انسان کے جذبات کی ترجمانی کرتی ہے اور انسانی جذبات کا احاطہ اتنا وسیع ہے کہ اس کی نمائندگی کرنا آسان نہیں ہے۔ آج ہم جس عہد سے گزر رہے ہیں اس میں محض عاشقانہ اور لب و رخسار کی شاعری ممکن نہیں ہے۔ ہارون شامی کی شاعری پر روشنی ڈالتے ہوئے کہا کہ ان کی غزل میں شاعری کی نئی تراکیب اور نئی ایجادات کے ساتھ موجودہ عہد کی مختلف کیفیات کی نشان دہی ملتی ہے۔ صدر شعبہ اردو ڈاکٹر عباس رضا نے ہارون شامی کے شعری مجموعہ ”عکس“ کا مختصر تعارف پیش کرتے ہوئے کہا کہ ان کی شاعری میں سادہ بیانی کے ساتھ ماضی کی روایتوں کا بھرپور احترام ملتا ہے۔ ڈاکٹر احمد عباس ردولوی نے کہا کہ موجودہ دور میں جہاں ادبی تقریبات زمانے کے ساتھ نئی شکل لے رہی ہیں، زبان و تہذیب مسلسل زوال پذیر ہو رہی ہے ایسے میں عام فہم لفظیات کے ساتھ حالات حاضرہ پر گہری نظر رکھتے ہوئے ہارون شامی نے جدید شاعری میں الگ شناخت قائم کی ہے۔ ڈاکٹر عصمت ملیح آبادی نے کہا کہ اردو شاعری کے میدان میں ہارون شامی کی شناخت ایسے شریف شاعر کی ہے جن کی شاعری میں ماضی پرستی اور رومانیت کی نئی تراکیب ساتھ دیکھنے کو ملتی ہیں۔ اس کے علاوہ معروف صحافی ڈاکٹر احمد ابراہیم علوی، سینئر صحافی قطب اللہ نے اردو زبان و ادب کے حوالے سے اہم گفتگو کی۔

۴ اپریل ۲۰۱۷ء کو لکھنؤ یونیورسٹی کے مالویہ آڈیٹوریم میں ”شیم کہت اردو فکشن ایوارڈ“ کے حوالے سے شاعر فاطمہ ایجوکیشنل ٹرسٹ اینڈ سوسائٹی کی جانب سے بہ اشتراک شعبہ اردو لکھنؤ یونیورسٹی ایک عظیم الشان و باوقار ادبی تقریب کا انعقاد ہوا۔ بحیثیت مہمان خصوصی گورنر اتر پردیش رام نائیک جی شریک ہوئے۔ ”فکشن کی سچائیاں“ موضوع پر اردو کے مشہور و معروف نقاد، ادیب و شاعر شمس الرحمن فاروقی نے کلیدی خطبہ

پیش کیا۔ تقریب کی صدارت سابق وزیر عمار رضوی نے کی۔ لکھنؤ یونیورسٹی کے شعبہ اردو کے سربراہ ڈاکٹر عباس رضا نیر کی نظامت میں ہونے والی اس تقریب میں گورنر رام نائیک کے ہاتھوں ڈاکٹر شمیم کلہت اردو فکشن ایوارڈ، سال ۲۰۱۵ء کا ایوارڈ بالترتیب کو لکاتہ سے آئے سید محمد اشرف بھوپال سے اقبال مجید اور شری نگر کی ڈاکٹر ترنم ریاض کو پیش کیا گیا۔ شعاع فاطمہ ایجوکیشنل ٹرسٹ اینڈ سوسائٹی کے روح رواں پروفیسر شارب ردو لوی نے استقبالیہ خطبہ پیش کرتے ہوئے کہا کہ یوں اردو میں بہت سے ایوارڈ دیئے جاتے ہیں لیکن اردو فکشن کے لیے یہ پہلا ایوارڈ ہے۔ وائس چانسلر لکھنؤ یونیورسٹی ایس۔ پی۔ سنگھ نے اپنے خطاب میں کہا کہ ڈاکٹر عباس رضا نیر کے پرپوزل پر شعبہ اردو کی عمارت کو مزید دو منزل اور بنایا جائے گا۔ ٹرسٹ کے صدر سید وقار رضوی، جرمنی سے آئے ڈاکٹر عارف نقوی نے بھی اپنے خیالات ظاہر کیے۔ تقریب میں مذکورہ شخصیات کے علاوہ شعبہ اردو الہ آباد یونیورسٹی کے سابق صدر پروفیسر فضل امام رضوی، پروفیسر علی احمد فاطمی، پروفیسر صابرہ حبیب، ڈاکٹر صبیحہ انور سمیت شہر کی اہم شخصیات موجود تھیں۔

۱۸ اگست ۲۰۱۷ء کو شعبہ اردو کے سمینار ہال میں ”ادب اور دانشوری“ عنوان سے پروفیسر نیر مسعود یادگاری خطبہ منعقد ہوا۔ لندن سے تشریف لائے معروف فلسفی اور فقیہ علامہ سید عقیل الغروی نے تاریخ ساز کلیدی خطبہ پیش کیا۔ اپنے کلیدی خطبے میں کہا کہ پروفیسر نیر مسعود اپنے آپ میں دبستان بھی تھے اور دبستان بھی، ہم نے آپ نے میر انیس کو نہیں دیکھا ہے نہ نیر مسعود نے دیکھا تھا لیکن جس طرح انہوں نے میر انیس کی سوانح لکھی ہے اسے پڑھ کر قاری کے سامنے میر انیس اپنے مختلف انداز میں زندہ اور متحرک نظر آنے لگتے ہیں۔ انہوں نے پروفیسر نیر مسعود کے فن کی جہات پر مختلف زاویوں سے روشنی ڈالی۔ انہوں نے کہا کہ نیر مسعود کے بہت سے افسانے خواب پر مبنی ہیں۔ خواب کو سمجھنے کی ضرورت ہے انہوں نے تفصیل میں جاتے ہوئے کہا کہ خواب میں

ہم اپنے آس پاس کے لوگوں اور ماحول سے بے خبر ہوتے ہیں لیکن ایک نئی دنیا میں جیتے ہیں، آنکھ کان منہ بند ہوتے ہوئے بھی ہم دیکھتے سنتے اور بولتے ہیں۔ اس سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ اس مادی جسم کی دنیا کے علاوہ بھی کچھ ماورائی حقائق ہیں، انہیں ماورائی حقائق کو ایک دانشور دریافت کرتا ہے۔ نیر مسعود کے افسانے ضلالت، رذالت اور رکاکت کی طرف نہ لے جا کر نفس کی طہارت کی طرف لے جاتے ہیں۔ نئی نسل کی تربیت ادب کے ساتھ کی جانا چاہئے کیونکہ اعلیٰ ادب انسان کو انسان بناتا ہے۔ انہوں نے شاعری کے بارے میں کہا کہ ایک دانشور ہی شاعری کرتا ہے۔ شاعر اگر دانشور نہیں ہے تو وہ صرف قافیہ پیمائی ہی کر سکتا ہے۔ کیونکہ شاعری شعور سے ہوتی ہے شعرا سے نہیں۔ نیر مسعود کے افسانے حقائق حیات و کائنات پر غور و فکر کی دعوت دیتے ہیں۔ اس باوقار تقریب کی صدارت لکھنؤ یونیورسٹی کے وائس چانسلر ایس۔ پی۔ سنگھ نے فرمائی۔ پروفیسر شمس الرحمن فاروقی بطور مہمان خصوصی شریک ہوئے اور بصیرت افروز تقریر فرمائی۔ نظامت صدر شعبہ اردو ڈاکٹر عباس رضا نیر نے کی۔ کلمات تشکر اودھ نامہ کے چیف ایڈیٹر سید وقار رضوی نے ادا کیے۔ اس موقع پر شہر کی عظیم ترین علمی و ادبی شخصیات نے شرکت فرمائی۔

۲۴ اگست ۲۰۱۷ء کو شعبہ اردو کے سمینار ہال میں ”پنجاب اور اردو“ عنوان سے توسیعی خطبہ کا اہتمام کیا گیا۔ پنجاب یونیورسٹی کے پروفیسر ناشر نقوی نے اپنے توسیعی خطاب میں کہا کہ آج ہندوستان میں جتنی بھی تہذیبیں موجود ہیں ان ساری تہذیبوں کی ایک جھلک کہیں نہ کہیں پنجابی تہذیب میں ضرور دیکھنے کو ملتی ہے۔ اردو زبان و ادب سے یہاں کا رشتہ ہمیشہ سے ہی گہرا رہا ہے۔ انہوں نے کہا کہ سرزمین پنجاب گیان اور دھیان کے ساتھ ساتھ صوفی اور سنتوں کی سرزمین ہے۔ یہاں سے عشق کی عظیم روایات کی نشوونما ہوئی ہے جو کہ اردو شعر و ادب کا اہم جز ہے۔ صدر شعبہ اردو ڈاکٹر عباس رضا نیر نے پروفیسر ناشر نقوی کا تعارف پیش کرتے ہوئے کہا کہ ان کا تعلق

اثر پردیش میں ادبی حیثیت سے زرخیز علاقہ امروہہ سے ہے جسے سرزمینِ مصحفی بھی کہا جاتا ہے۔

گزشتہ تیس برس سے پنجابی یونیورسٹی پٹیالہ میں درس و تدریس کے ساتھ ساتھ پنجابی تہذیب و ادب کا وسیع مطالعہ رکھنے والے پروفیسر ناشر نقوی دودرجن سے زائد کتابوں کے مصنف ہیں۔ ہندوستانی صوفیانہ روایت پر بھی ان کی کئی اہم کتابیں اور مضامین شامل ہیں۔ وہ ایک اچھے شاعر بھی ہیں۔ اپنے صدارتی کلمات میں پروفیسر سید احمد عباس ردو لوی نے کہا کہ اردو زبان میں ہماری تہذیبی شناخت پوشیدہ ہے۔ اس موقع پر شعبہ اردو کے پی ڈی ایف اسکا لرز ڈاکٹر عبید الرحمن اور ڈاکٹر منتظر مہدی نے بھی اپنے خیالات کا اظہار کیا۔ پروفیسر ناشر نقوی سے پنجاب میں اردو شعر و ادب اور اردو فکشن کی موجودہ صورتحال کے متعلق سوالات قائم کیے جس کا انہوں نے تسلی بخش جواب دیا۔

ڈاکٹر عباس رضانی کی سرپرستی میں شعبہ اردو لکھنؤ یونیورسٹی کی ادبی سرگرمیوں کا جو مختصر خاکہ پیش کیا گیا ہے اگر اس خاکے میں تمام جزئیات کو شامل کیا جاتا تو ایک مکمل دفتر وجود میں آسکتا تھا لیکن طوالت سے بچنے کے لیے ایک مختصر جائزہ پیش کیا گیا ہے لیکن اس مختصر جائزے سے یہ اندازہ لگانا مشکل نہیں ہے ڈاکٹر عباس رضانی کی سرپرستی میں شعبہ اردو نے اپنی بہترین روایت کو برقرار ہی نہیں رکھا بلکہ اس میں توسیع کی کوشش کی۔ اور یہ کوشش مسلسل جاری بھی ہے یہی تسلسل کسی بھی شعبے کی کامیابی کی بہترین علامت ہے۔

☆☆☆